پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

جلد (۵)	جنوری ۱۹۳۹ء	نمبر (۱۰)

فہرست مضامین

ایڈیٹوریل		۱
موزونی طریقِ تعلیم	شیخ خادم محی الدین	۷
بچے کی سیرت کیسے بنتی ہے	میرزا مقبول بیگ	۱۶
ہمارے اُستاد	ایم سکندر خاں	۲۷
تعلیم کی تحریکِ جدید کی تاریخی شخصیتیں	بشیر احمد ڈار	۳۹
انجمنِ مشاغل	ہنسراج	۵۱

سوہن سنگھ صاحب ذیلدار، ٹھاکر بیلی رام صاحب صوبیدار، ٹھاکر سوہن سنگھ صاحب جمعدار، ٹھاکر بسنت سنگھ صاحب نمبردار، پنڈت لچھو رام صاحب وکاندار پر مشتمل ایک کمیٹی مرتب کی گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دینے کی ذمّے داری لی۔ ٹھاکر بیلی رام صاحب صوبیدار نے اپنی سرائے واقع بڑوہ میں بوڈران کی عارضی رہائش کی اجازت ہیڈ ماسٹر صاحب کی درخواست پر دے دی۔

ایک سب کمیٹی "تعلیم بالغان" بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کی درخواست پر ٹھاکر سوہن سنگھ صاحب ذیلدار، ٹھاکر بسنت سنگھ صاحب نمبردار، پنڈت لچھو رام صاحب وکاندار، ٹھاکر کرم چند صاحب نمبردار، و ہیڈ ماسٹر صاحب پر مشتمل مرتب کی گئی۔

آخر میں صاحب صدر کی مختصر اور مؤثر تقریر کے بعد جملہ حاضرین کا شکریہ ادا کیا گیا اور ممبران اسکول اسٹاف کی طرف سے چائے پیش کی گئی اور جلسہ برخاست ہوا۔

گوپی رام سیکرٹری

مدرسہ بالغان رائے کوٹ

اس اسکول کے ایک جلسے میں ۹ نومبر ۳۹ء کو صاحب ڈپٹی کمشنر ضلع لدھیانہ نے بالغان کو خواندگی کی اسناد اور انعامات تقسیم کرتے ہوئے، مندرجہ ذیل ریمارک تحریر کیے:۔

"میں اس مدرسے کے کام سے بہت خوش ہوا۔ کام اس سے بہت زیادہ تسلی بخش ہے، جو مجھے زبانی بتایا گیا تھا۔ یہ مدرسہ اپنی قسم کا ایک نمونے کا مدرسہ ہے۔ ہیڈ ماسٹر اور مدرسین نے سرگرمی کے ساتھ لاثانی کام کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ رائے کوٹ کی میونسپل کمیٹی اس کام کے لیے مستقل مالی امداد دے گی۔ تاکہ یہ کام جاری رہے۔ میں ہیڈ ماسٹر اور مدرسین کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں۔"

ظفروال گورنمنٹ ہائی اسکول

مسٹر ڈبلیو ایچ ایف آرم سٹرانگ صاحب ایم اے، آئی ای ایس اور شیخ محمد شریف صاحب ایم اے، انسپکٹر مدارس لاہور ۲۸ر نومبر ۳۹ء کو ۱۲½ بجے ظفروال گورنمنٹ ہائی اسکول میں تشریف فرما ہوئے۔ تاکہ مدرسہ ہٰذا کی عمارت کی رسم افتتاح ادا کریں۔ سکاؤٹ طلبہ نے آپ کا استقبال کیا۔ مدرسے کے دروازے کا قفل کھولنے کے بعد آپ نے اسکول کی سجی سجائی عمارت میں گشت لگائی۔ مہمانِ محترم نے ماس ڈرل کو ملاحظہ فرمایا۔ شہر اور مضافات کے لوگ اس مبارک رسم کو دیکھنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ لالہ دیوکی نندن صاحب ہیڈ ماسٹر نے اسکول کی کارگزاری کے متعلق مختصر رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ صاحب موصوف نے بحیثیت صدر حاضرین کے سامنے تقریر دلپذیر فرمائی۔ مقامی طلبہ پرائمری مدارس کو مٹھائی تقسیم کی گئی اور جلسہ کامیاب رہا۔

گورنمنٹ ہائی اسکول پھلور

اسکول یونین کے زیرِ اہتمام مدرسہ ہٰذا کے ہال میں پنڈت امرناتھ صاحب نے ۲۵ر نومبر ۱۹۳۹ء کو ایک لیکچر ہوابازی کے موضوع پر جادو کی لالٹین کے ذریعے دیا۔ لیکچرار صاحب نے ہوابازی کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ موجودہ ہوائی سفر میں اب خطرہ نہیں رہا۔ دشمن پر مشین گن کے ذریعے بم برسانے اور ہوائی چھتری کے ذریعے زمین پر اترنے کی تصاویر بہت دلچسپ تھیں۔ حاضرین کی موجودگی سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

تعلیمِ جدید کی کانفرنس اور نمائش

نیو ایجوکیشن فیلوشپ (جمعیتِ تعلیمِ جدید) نے ۲۳ تا ۲۵ر فروری ۱۹۴۰ء کو سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور میں ایک تعلیمی کانفرنس اور بچوں کی تیار کی ہوئی مصنوعات کی نمائش کے انعقاد کا اہتمام کیا ہے۔ یہ نمائش تین حصوں پر مشتمل ہوگی۔ ہر حصے کے بہترین تخلیقی کام کے لیے طلبہ کو انعامات اور مدارس کو اسناد تقسیم کی جائیں گی۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان اور ہیڈ مسٹریس صاحبات مدارس سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ

3 APR
'2 AI
2012
21

ایڈیٹوریل

گزشتہ چند سال سے یورپ اور امریکہ میں "تعلیم جدید" کے متعلق بہت کچھ کہا اور
جا چکا ہے۔ ہندوستان بھی کم و بیش ڈیڑھ صدی سے یورپ کے خوانِ نعمت کا
زہ چیں ہے اور اس لیے یہاں بھی تعلیم جدید کے متعلق ماہرین تعلیم طرح طرح کی باتیں
ہ رہے ہیں۔ ماہرینِ تعلیم سے قطع نظر کر لیجیے، ہندوستان کے سیاسی لیڈر مسٹر گاندھی کی
سنیے۔ انھوں نے پروفیسر ڈیوی کے اصول تعلیم کی اتباع میں واردھا نظامِ تعلیم کو
اکٹر ذاکر حسین صاحب کی کمیٹی کی معرفت پیش کیا ہے۔ ہر صوبے میں بھی حکومت نے
ہی صوبائی خود مختاری کا اعلان مروجہ اصول اور نظامِ تعلیم کی جانچ پڑتال کے لیے کمیٹیاں
بنا کر کیا ہے۔ غرضکہ یورپ، امریکہ اور چشم بد دور ہندوستان میں بھی تعلیمِ جدید کا خیر مقدم
لیا جا رہا ہے۔

یہ تعلیمِ جدید کیا ہے؟

انسان کی عادت ہے کہ متضاد خیالات اور مختلف عقائد رکھے اور اُن کی تبلیغ کرے۔
ہم اصول اور جزوی باتیں، غرضکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس اختلاف پسندی سے خالی
نہیں۔ کوئی شہنشاہیت کا مداح ہے اور کوئی جمہوریت کے گیت گاتا ہے۔ کوئی سرمایہ داری
یں دنیا کی فلاح کے خواب دیکھتا ہے اور کوئی اشتراکیت میں۔ کوئی مذہب کا دلدادہ ہے،
لوئی مذہب سے بیزار۔ لیکن ہر ایک اپنے خیال اور عقیدے کی اہمیت پر مُصر ہے۔ یہ
تفرقہ اور اختلاف تعلیم کے میدان میں بھی موجود ہے۔ یہاں بھی مروجہ طریقۂ تعلیم کے حامی ایک

ہمیشہ کے لیے بڑی عزت سے یاد کیا جائے گا، جبکہ اس کے سالانہ جلسہ تقسیمِ انعامات کی کرسی صدارت کو مسٹر جی، ڈی سوندھی ایم اے، آئی ای ایس گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے ہندوستانی پرنسپل نے زینت بخشی۔ اُن کی آمد پر لالہ کرپا رام ایم اے، ہیڈ ماسٹر اسکول ہذا اور ممبرانِ مینیجنگ کمیٹی نے اسکول بینڈ اور سکاؤٹ طلبہ کی حاضری میں استقبال کیا۔ جلسے کی کارروائی کے آغاز پر صاحبِ موصوف کو ایک ایڈریس پیش کیا گیا۔ زاں بعد اسکول کے جمناسٹک گروپ نے حاضرین کو اپنے عجیب و غریب کھیلوں سے محظوظ کیا۔ پھر ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسکول کی سالانہ رپورٹ مفصل طور پر پیش کی۔ جس میں اسکول کے نہایت شاندار نتائج، اسکول اسکاؤٹس کی وادیٔ کشمیر کی سیر، اسکول میں میوزک کلاس کا کھلنا اور لڑکوں کی جسمانی ترقی کے لیے مکمل انتظامات کا ذکر خاص طور پر کیا۔ بعد ازاں دلچسپ نظموں، مزاحیہ اور ادبی تقریروں اور شاندار گانوں کا ایک بہترین پروگرام طلبائے اسکول کی طرف سے پیش کیا گیا۔ عزیز بلدیو طالب علم جماعت ہفتم کی مؤثر تقریر سے خوش ہو کر ڈاکٹر نرائن سنگھ جی، ایم بی بی ایس نے دو روپیہ کا قابلِ قدر عطیہ عزیز مذکور کو اسی موقع پر عطا فرمایا۔

تقسیمِ انعامات سے پہلے مسٹر جی، ڈی سوندھی نے ایک شاندار تقریر فرمائی۔ انھوں نے ہیڈ ماسٹر اور سٹاف کو اسکول کی ہر لحاظ سے شاندار ترقی پر مبارک باد دی۔ وہ اس بات پر بڑے خوش ہوئے کہ اُن کے پرانے اسکول کی عمارت بڑی شاندار بن چکی ہے۔ جس میں کھیلنے کے لیے بڑے بڑے وسیع میدان موجود ہیں۔ اُنھوں نے اسکول میں میوزک کلاس کے کھلنے کو بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اُنھوں نے فرمایا کہ اسکول ہٰذا نے پنجاب یونیورسٹی کے لیے جو کہ اسکولوں میں میوزک کے شروع کیے جانے کے سوال پر ابھی غور کر رہی ہے، ایک مثال قائم کر دی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مستحق طلبہ کو اپنے دست مبارک سے انعامات عطا

3 APR
'2 AI
2012
21

طرف ہیں اور تعلیم جدید کے مبلغ دوسری طرف۔ مروجہ تعلیم کے پیروکار کہتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد داخلی اور شخصی خصائص کی تربیت ہے۔ دنیا والوں نے ہزاروں سالوں کی پیہم کوشش سے علم کا خزانہ بھر دیا ہے۔ ہمارا کام ہے کہ ان اطلاعات سے طلبہ کو مالا مال کر دیں۔ گزری ہوئی نسلوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ آنے والی نسلوں میں بھی بڑے بڑے کام کرنے کی استعداد پیدا کر دیں اور بڑے بڑے کاموں کی تعریف یہ ہے کہ ہم انھیں بڑا کہیں۔ ہمارا قائم کردہ اخلاق کا معیار موجود ہے۔ مدرسہ کو چاہیے کہ اسی "اخلاق" کو رواج دے۔ ایک اخلاق پر ہی کیا منحصر ہے۔ جو چیزیں صدیوں کی کوشش کے بعد حاصل ہوئی ہیں، وہ سب کی سب ایسی ہیں کہ آنے والی نسلیں اُنھیں حاصل کریں۔ قصہ مختصر مروجہ معیارِ زندگی پر پورے اُترنے کے قابل ہو جائیں۔ آج جو بچہ ہے، وہ کل بڑا ہو جائیگا۔ آج جو علم حاصل کر رہا ہے، کل وہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائیگا۔ آج جو کچھ بھی زندگانی سے حاصل ہو، کل وہ دوسروں کی زندگی کے لیے بہم پہنچائیگا، یعنی مدرسہ ایک کارخانہ ہے، جہاں ایک مشین تیار کی جا رہی ہے تاکہ وہ مشین کل کی دنیا میں مفید ثابت ہو۔

جب تعلیم اور تدریس کا یہ طور ہو، تو ظاہر ہے کہ ان سے بہرہ ور ہونے کے لیے متعلمین میں کچھ صفات خاص ہونی چاہییں، جو اجمالاً یہ ہو سکتی ہیں۔ طالب علم کی طبیعت اور اُس کے مزاج میں ہمواری ہو۔ وہ جس کام پر لگایا جائے، اس پر لگ جائے۔ اُسے جو بات بتائی جائے، اُسے مان لے۔ اس کے آگے جو اصول بھی پیش کیے جائیں، ان پر آمنّا اور صدّقنا کہے۔ پھر اس کے علاوہ طالب علم میں بہرہ مند ہونے کی استعداد بھی موجود ہو۔ اطاعت اس کی سرشت میں ہو۔ ان سب کے لیے ذریعہ کتابیں ہیں۔ کتابیں علم کا خزینہ ہیں۔ طالب علم انھیں پڑھے اور جذب کر لے۔ جس حد تک متعلم یہ سب کچھ خود کر سکتا ہے

تختِ طاؤس

مصنفہ

مولوی محمد عبداللطیف خان کشتہ قادری

یہ کتاب مولانا کشتہ قادری کی ہفت سالہ تحقیقی و تفتیشی مساعی کا نتیجہ ہے۔ تختِ طاؤس عہدِ مغلیہ کی زرگری، جواہر تراشی و خوش مذاقی کا مرقع تھا اور اُس کی صنعت، صنعتِ ایران و ہندوستان کی دلآویز سنگم تھی۔ جس کی زیارت کے لئے دُور دُور کے ملکوں کے لوگ صعوباتِ سفر ہنسی خوشی برداشت کر کے آتے اور تازگیِ نظر و تفریحِ قلب تحیر کا پرشاد لے کر جاتے اور یہ تبرک مدت دراز تک ان کو تر زبان و خوش بیان رکھتا تھا۔ کتاب ہذا اسی بے مثل تخت کے وقائع تاریخی پر مشتمل ہے۔ حقیقتاً اس تخت کے پردے میں ایشیائی دماغی لطافتوں کے سینکڑوں مرقعے چھپے ہوئے تھے۔ جن کو منظرِ عام پر لا کر مولانائے موصوف نے ملک اور قوم پر ایک زبردست احسان کیا ہے اور اُن کی یہ کدو کاوش قابلِ شکرگزاری ہے۔

ہمارے یہاں کی بہت کم تاریخی کتب ایسی ہیں، جن میں وسعتِ مطالعہ، غور و تحقیق، تفتیش، تنقید، علمی و منطقی استدلال و آزادہ خیالی سے کام لیا گیا ہو اور اُن مؤلفین و مصنفین نے روایت و درایت کی علمی جانچ پڑتال کی ہو۔ اپنی طبیعت سے کسی نتیجے پر پہنچے ہوں۔ پیچیدہ مسائل کو تقسیم و تحلیل کرتے ہوئے کوئی انکشاف کیا ہو اور اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھا کر اس طرح ترتیب دیا ہو کہ اُن کی حالت نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مگر پیشِ نظر کتاب تاریخ "تختِ طاؤس" ان تمام اوصاف سے متصف ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

3 APR
2 AI
R 2012
21

کرے اور جو کچھ وہ از خود حاصل نہیں کر سکتا، اُسے مدرس سے حاصل کرے۔ یعنی مدرس علم اور کتابوں کا کارندہ ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ سلیم الطبع اور اطاعت شعار نوجوانوں میں کتابوں میں لکھے ہُوئے علم کو بھر دے۔ مختصراً مدرسے کی حیثیت یہ ہے کہ وہ ہمارے گھروں اور دوسرے معاشرتی اور تمدنی اداروں سے مختلف ہے۔ وہاں عالم بالا سے نازل ہونے والے ضبط و نظام کا رواج ہے۔ وہاں کتابوں سے حاصل ہونے والا علم متاعِ حیات ہے، وہاں چیزوں کو رٹ لینے کا نام تحصیلِ علم ہے، وہاں دور از کار اور غیر متعلق اطلاعات اور استعداد زندگی کے سفر کے لیے زادِ راہ بنا کر پیش کی جاتی ہیں، استقلال یا بہ الفاظ دیگر جمود سے مدرسے کی بنیادیں محکم ہیں۔

تعلیمِ جدید استقلال اور جمود پر خندہ زن ہے۔ دنیا بدل رہی ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کسی شے کو ثبات نہیں، اس لیے تعلیم بھی ایسی ہونی چاہیئے، جو اس تغیر پسند دنیا کے ساتھ ساتھ قدم اُٹھا رہی ہو۔ علم بنفسِ خود کوئی اہم اور وقیع چیز نہیں۔ یہ صرف ذریعہ ہے، زندگی کو کامیاب بنانے کا۔ اس لیے تعلیمِ جدید کی نگاہ علم یا علم کے خزانوں یعنی کتابوں پر نہیں۔ اس کی نگاہ انسانی زندگی پر ہے اور انسانی زندگی بھی اس جماعت کی نہیں، جو آج جوان ہے، بلکہ اس جماعت کی جو کل جوان ہوگی۔ اب رہا مدرس، جو کتابی علم کو پیش کرنے کا ذمے دار ہے، اس کی حیثیت بھی بدل جاتی ہے۔ وہ کتابی علم کو صرف زندگی کے تجربوں کی صورت میں پیش کرنے کا مجاز رہ جاتا ہے۔ اس کا قائم کردہ ضبط و انتظام بھی محض قید ہے اور بے گناہ کو قیدی بنانے کا اور قید رکھنے کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں۔

ظاہر ہے کہ مروجہ تعلیم اور جدید تعلیم کے اصول اور نظام میں بہت فرق ہے اور یہ ممکن نہیں کہ دونوں بیک وقت ایک ہی جگہ قائم اور جاری رہ سکیں۔ اس لیے ماہرِ تعلیم

دیہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لئے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس کا مضمون حال ہی میں ورنیکلر فائنل کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لیے مخصوص ہوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر کوئی جامع کتاب نہ تھی۔ طلبہ کی اس دقت کا احساس کرتے ہوئے زرِ کثیر صرف کر کے مجوزہ اسکیم کے عین مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ بہ سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب برائے جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے۔ جس کی عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے اور ہر امر کو روزمرہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ تصاویر سے واضح کیا گیا ہے اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے۔ سلسلہ ہذا طلبہ کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔ اس کے مطالعے سے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان و دیگر سائنس کے مدرسین اصحاب اپنے مدارس میں جاری کرا کے جہاں ہمیں ممنون و مشکور فرمائیں گے، وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبودی میں بھی خوشی محسوس کرینگے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت ۵ آنے ۸ پائی
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	″ ۵ ″ ۲ ″
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	″ ۷ ″ ۱۰ ″
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	″ ۱۴ ″ ۲ ″

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

کے لیے ضروری ہے کہ اس فرق کی نوعیت معلوم کرے اور اس تجزیہ کے بعد سیدھے اور سچے اصول کا اعلان کر دے۔ ایسی صورت میں بالعموم یہ ہوا کرتا ہے کہ متضاد اصولوں کے اجزا میں سے کچھ اُدھر سے اور کچھ ادھر سے لے کر ایک نیا راستہ بنا لیتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے ایک کمزور اور بیکار اصولِ تعلیم رواج پا جائیگا۔ اگر یہ اصلاح ممکن ہوتی، تو اس قدر بنیادی اختلافات رونما ہی نہ ہوتے۔ آئیے ان اختلافات میں سے چند اہم اختلافات کو فرداً فرداً جانچیں۔

مدرسے کا ماحول

ہر شخص جانتا ہے کہ ایسی جگہ جہاں بہت سے بچّے اکٹھّے ہوں، وہاں ایک ضبط اور انتظام کی ضرورت ہے۔ یہ ضبط اور انتظام مدرسہ کے قوانین کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے کہ سزا اور ایک حد تک استبداد مدرسہ میں رائج ہو۔ میں خود بھی ضبط او انتظام کا نہایت ہی حامی ہوں۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ ضبط و انتظام مدرسے کا قائم کیا ہُوا نہ ہو۔ یہ عالم بالا سے نازل نہ ہُوا ہو، بلکہ یہ بچوں کا خود قائم کردہ ہو۔ اُن کی اپنی دنیا کا پیدا کیا ہوا ہو۔ مثالاً یوں ملاحظہ فرمائیے۔ تفریح کی چھٹی ہوتی ہے۔ بچے جماعتوں کے کمروں سے نکل نکل کر بھاگتے ہیں اور میدان میں پہنچ کر فٹ بال کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہاں اُستاد کا حکم او استبداد قائم نہیں۔ کھیلتے کھیلتے ایک بچّہ فٹ بال کو ہاتھ میں لے کر بھاگتا ہے۔ موافق اور مخالف فریق دونوں یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ قانون کی خلاف ورزی ہوئی۔ فرد کے قصور کی سزا تمام جماعت برداشت کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ یعنی ایک قانون جس کو رائج کرنے کے لیے اُستاد موجود نہیں ہے بچے خود رائج کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ایک کھیل کو اختیار کر لینے کے ساتھ ساتھ اس کے قانون اور اس کے متعلق پابندیاں بھی اختیار کر لی گئی ہیں۔ اگر یہ پابندیاں نہیں ملا

باتیں، تو کمیل بھی نہیں ہو سکتا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر بچے کسی چیز کو اختیار کر لیں، تو اُس کی
ذمّے داریوں کو بھی پیشِ نظر رکھیں گے۔ یعنی بچوں کی اپنی بنائی ہوئی "سماج" قوانین کو اس لیے
تسلیم کر لیتی ہے کہ وہ قوانین عالم بالا سے نازل نہیں ہوئے۔ مدرسے کے ضبط و انتظام میں
بھی یہی بچوں کی سماج کار آمد اور مفید ہو سکتی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ خارجی ضبط
کے بدلے وہ ضبط بروئے کار آتا ہے، جو بچوں کی سرشت اور ان کی جبلّت میں مضمر ہے
اور یہی ضبط مدرسے کے ہر انتظام کا کفیل ہو سکتا ہے۔ ؟

کتابیں

آپ نے جو مضامین مدرسے اور کالج میں پڑھے تھے، اُن میں سے آج کیا کیا آپ کی زندگی میں کار آمد ثابت ہو رہے ہیں۔ آپ کا وسیلہ معاش خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس سے آپ کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نہایت محنت سے حاصل کیا ہوا نام نہاد سونا اور چاندی، یعنی آپ کا کتابی علم آج آپ کے لیے کم و بیش بیکار ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں ڈگری کی بدولت آج ملازم ہوں اور اپنی معاش کماتا ہوں۔ بیشک آپ کی ایم، اے کی ڈگری آپ کی خوش قسمتی سے اس وقت بازار معاش میں فروخت ہو سکی تھی، لیکن اس وقت بھی بہت سے ایسے تھے، جن کی ڈگری کے گاہک پیدا نہ ہو سکے تھے یا اگر گاہک ملے تھے، تو اُنھوں نے سودا بہت سستا کیا تھا۔ لیکن یہ مان لینے کے بعد بھی میرا سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ وہ علم جو آپ نے حاصل کیا تھا۔ وہ نام نہاد لازوال ودیعت جو آپ نے جمع کی تھی، اس سے آپ کیا فائدہ اُٹھا رہے ہیں؟

میرا یہ مطلب نہیں کہ کتابیں جلا دی جائیں۔ اسلاف کے علم سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔ وہ علم تو آئندہ حاصل ہونے والے علم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ دی روز کے

کے بغیر امروز ممکن نہیں اور امروز کے بغیر فردًا ذہن میں نہیں آسکتا۔ میں یہ سب کچھ تسلیم کرتا ہوں، مگر میری گزارش تو یہ ہے کہ بچے کی زندگی سے غیر متعلق، بچّے کی خصوصیات اور خواہشات سے نا آشنا علم کام کی چیز نہیں۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج بچے کے تجربات زندگی پر منحصر ہونے چاہییں۔ کتابیں اس زمانے کے لیے اُٹھا رکھیے۔ جب بچے کے تجارب زندگی اتنے وسیع ہو جائیں کہ عام زندگی میں اور اُن میں تفریق باقی نہ رہے۔

اُستاد

کھیل کے میدان اور فٹ بال کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ کھیل کی بے قاعدگیوں کا معلوم کرنے والا ایک "ریفری" ہوتا ہے۔ اُستاد بھی ایک ریفری ہے، جو بچوں کے مسلمہ اصول زندگی کی بے قاعدگیوں کا اعلان کرنے پر مامور ہے۔ اس کے زیادہ قوی ہاتھ بچوں کی مدد کے لیے ہر وقت موجود ہیں۔ وہ عالم بالا کا نمائندہ نہیں۔ وہ بچوں کی زندگی کا اہم جز ہے، جو حسب ضرورت اور حسب موقع مفید ثابت ہوتا ہے۔

یہ سب کیونکر ہو؟ یہ سب معمولی اصلاح سے نہیں ہو سکتا۔ تعلیم جدید کے یہ اصول کوئی حل پیش نہیں کرتے۔ یہ تو صرف اہم مسائل پیش کرتے ہیں۔ ان مسائل کا حل کرنا اور ان گتھیوں کا سلجھانا سماج کا کام ہے۔ سماج میں سب سے اہم ہماری حکومتیں ہیں، جو ایسے اُستاد پیدا کرنے کا انتظام کرینگی، جو ان اصولوں پر کاربند ہو سکیں۔ وہ اُستاد نئی ذہنیت کے لوگ ہونگے۔ اُن کے مدرسے نئے ماحول سے لبریز ہونگے۔ غرضکہ ہر چیز موجودہ سے مختلف ہوگی۔ البتہ بچے یہی ہونگے اور انشاء اللہ ان کا مستقبل زیادہ شاندار، کامیاب اور خوش و خرّم ہوگا۔

موزونی طریقِ تعلیم

از

شیخ خادم محی الدین لیکچرر، سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

(گزشتہ سے پیوستہ)

لَے تال کی پیمائش

اب طلبہ کو علم ہو جائیگا کہ موسیقی کی ہر صورت ایک خاص طولِ وقت کے ٹکڑوں میں قسم کی گئی ہے۔ انھیں سکھانا چاہیے کہ کسی ساز پر بجائے ہوئے گیت کے ٹکڑوں کو ونکر شمار کیا جا سکتا ہے۔ آٹھ سے سولہ ٹکڑوں کا طولِ وقت دریافت کر لینا کافی ہے۔ ں طرح انھیں باترتیب اور موزوں طریق سے قوتِ خیال کی مشق ہو جائیگی اور تخیل کی شو و نما بھی ہوگی۔ درمیانی رفتار سے مندرجۂ ذیل مشقیں آسانی سے کی جا سکتی ہیں:۔

۱۔ چند مقررہ "باروں" کے ساتھ مارچنگ کرو اور اتنی ہی "باروں" کے عرصے تک ٹھیرے رہو۔ اسی طرح مارچنگ اور توقف کو جاری رکھو (اس مشق میں ہر دو اقسام کی حرکت و باہم تبدیل کیا جا سکتا ہے)۔

۲۔ چند مقررہ "باروں" کے بموجب فوروڈ (آگے کی طرف) مارچ کرو اور اتنی ہی مرتبہ پیچھے کی طرف۔ اسی کے مطابق مشق کرتے جاؤ۔ (اس مشق میں بہت سی تبدیلیاں اور پھیر و بدل دیا جا سکتا ہے)۔

۳۔ مذکورہ بالا حرکات کو جاری رکھتے ہوئے "ہاپ" کا حکم ملنے پر ایک "بار" کے عرصہ کے برابر ٹھیر جاؤ اور پھر چلنے لگو۔

۴۔ اسی طرح "ہاپ" کے حکم پر ایک "بار" یا اس سے زیادہ "باروں" کے عرصے تک، آگے یا پیچھے مارچ کرو۔

واضح ہو کہ اگر رفتار تیز کی جائے، تو مشق نمبر ۳ و ۴ کا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم ان کو جاری رکھنا چاہیے، کیونکہ ان کے ذریعے بچوں میں چوکس رہنے کا مادّہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ سروں یا ان کے مطابق ضربوں کو بلند آواز سے ہرگز شمار نہ کیا جائے۔ بچوں کے لبوں میں حرکت پیدا نہ ہو۔ سروں کا شمار ذہنی طور پر کیا جائے۔ البتّہ باروں کی تعداد ابتدا میں بلند آواز سے گنی جا سکتی ہے۔ مثلاً ۴/۴ کی لے میں، شمار کا طریق یہ ہونا چاہیے:۔

۱ — — — | ۲ — — — | ۳ — — — | ۴ — — — |

یعنی ایک، دو، تین، چار کے اعداد کو باری باری، تین تین مرتبہ ٹھیر کر پکارا جائے۔ یہاں لکیروں سے وقفہ یا ٹھیراؤ کا عرصہ مراد ہے، جس کے برابر ہر مرتبہ توقف اور قیام کیا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ اوپر دی ہوئی شکل میں چار باریں ہیں اور شمار کے لیے سولہ ماترے ہیں، لیکن صرف چار ماترے بول کر ظاہر کیے جائیں گے اور بارہ ماترے خاموشی سے۔

وردی

موزونی ورزش کے دوران میں جماعت کی ایک مخصوص وردی ہو، تو مناسب ہے۔ اگرچہ معمولی اوقات میں، جبکہ یہ مشقیں مدرسے کے کام کا ایک جزو قرار دی جائیں، کسی خاص وردی کی ضرورت نہیں۔ لیکن حرکات کو آزادی اور آسانی کے ساتھ کرنے کے لیے جہانتک ممکن ہو، لمبی جرابیں یعنی سٹاکنگ نہیں پہنانی چاہییں۔ بوٹ کے بجائے ہلکے سیاہ رنگ کے

تے پہننے چاہییں۔ سفید موزے ہوں۔ ان کے ذریعے بچے ان تمام ورزشوں کو آسانی کے ساتھ کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ یک رنگی کی وجہ سے جماعت دیکھنے میں بھلی معلوم ہوگی۔ سفید نکر کے ساتھ سفید قمیض یا خاکی قمیض کے ساتھ سفید نکر یا رنگدار قمیض کے ساتھ سفید نکر ہو تو بہت مناسب ہے۔ بہرحال وردی کا انتخاب، نقل و حرکت کو آسان بنانے اور پیمائش، دونوں اصولوں کے مطابق کرنا چاہیے۔ یہ بھی لحاظ رہے کہ وردی پر زیادہ دام صرف نہ ہوں۔ انگریزی مدارس میں بعض لڑکے اُستاد کی ہدایت کے بموجب سستے داموں جوتے خود سی کر تیار کر لیتے ہیں۔ ایسے جوتے سال بھر تک کام دے سکتے ہیں، بشرطیکہ صرف ورزش ہی کے وقت پہنے جائیں۔ اسی طرح موزے بھی تیار کیے جا سکتے ہیں۔

سُروں کی پیمائش

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے لَے کو ماپنے کے لیے کروچیٹ کا سُر اکائی تصوّر کر لیا گیا ہے۔ اس کا قیام ایک ماترے کی ضرب کے برابر ہوتا ہے، یعنی ۱/۴ سُر۔ ہندی موسیقی کی اصطلاح میں اُسے لگھو کہتے ہیں۔ ایسے دو سُروں کا مجموعہ گرو کہلاتا ہے۔ جسے انگریزی میں منم (Minim) کہتے ہیں۔ یعنی ۱/۲ سُر۔ اس کا قیام دو ماتروں کے برابر ہے۔ تین کروچیٹ مل کر پلُت بنتا ہے، یعنی ۳/۴ سر۔ اور اس کا قیام تین ماتروں کے برابر ہے۔ اسی حساب کے چار ماتروں کے برابر کا سُر سیمی بریو (Semibreve) یا گرو پلُت کہلائیگا اور رواج میں یہ سب سے لمبا سُر ہے۔ باقی سُر اسی کے اجزا یا کسر سمجھنی چاہییں۔ گو اصل شمار کروچیٹ ہی کو اکائی مان کر کیا جاتا ہے۔

مروجہ سُروں میں چند ایسے بھی ہیں، جو کروچیٹ کے اجزا ہیں۔ مثلاً نصف سُر کو دُرت یا کوایور (quaver) کہتے ہیں۔ اس کی کسر ۱/۸ ظاہر کی جاتی ہے۔ تہائی کروچیٹ یا

۱/۱۲ سرولن ماترے کے برابر ہے، جسے ہم ورت یا ٹرپلیٹ (Triplet) کہتے ہیں۔ اسی حساب سے سیمی کوایور یا ۱/۱۶ سُر اَنو ورت کہلاتا ہے اور سب سے تیز مروجہ سُر ڈیمی سیمی کیوَر یا ڈرت ہے، جس کی حسابی علامت ۱/۳۲ ہے۔

موزونی ورزش کی غرض سے مذکورہ بالا اقسام کے سُروں کی وقتی پیمائش کا سمجھنا طلبہ کے لیے ازبس ضروری ہے۔ یہ پیمائش پہلے پاؤں کی حرکات کے ذریعے سکھانی چاہیے۔ اس کے بعد پاؤں اور بازوؤں کی حرکات کو شامل کرانا چاہیے۔ مارچنگ کے دوران میں طلبہ کو کروچیٹ کا تصور پاؤں کی ضرب سے ہو چکا ہے۔ اب دُرت یا کوایور سکھانا چاہیے۔ ساز پر اُستاد یا بینڈ کا کوئی رُکن پہلے کروچیٹ سُر والی دو ایک "باریں" بجائے اور پھر دو ایک دُرت سر کی باریں۔ ان باروں کو سن کر طلبہ پاؤں کو دگنی رفتار سے آسانی کے ساتھ زمین پر ماریں گے، کیونکہ دُرت سُر کروچیٹ کا نصف ہے اور اس کا عرصۂ قیام بھی نصف ہے۔ مثلاً اگر چار لگھُو پر چار مرتبہ ضرب لگائی ہو، تو اتنے ہی عرصے میں آٹھ ضربیں دُرت سر کی لگائی جائینگی۔ اگر لے کی رفتار تیز ہو، تو طلبہ اپنی ایڑیاں اُوپر اٹھا کر فقط پنجوں سے باآسانی ضرب لگا سکتے ہیں، اس کے بعد ہاپ کے حکم پر، جماعت کروچیٹ سے کوایور کی ضرب میں اپنی حرکت کو بدل دیگی یا کوایور سے کروچیٹ کی طرف آجائیگی۔

اس مشق کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ تمام جماعت کو دو دائروں میں تقسیم کردو۔ ایک بیرونی دائرہ، دوسرا اندرونی، دونوں دائروں (یعنی اندر باہر) کے طلبہ کا رُخ ایک دوسرے کے بالمقابل ہونا چاہیے۔

اب بینڈ بجتا ہے۔ تمام طلبہ کروچیٹ کے انداز سے پاؤں کی ضرب لگاتے ہیں۔ ہاپ یا "باہر والے۔ دو" کے حکم پر، بیرونی دائرے کے لڑکے دُرت یا دوہری ضرب لگانے

تے ہیں اور اندرونی دائرے کے لڑکے فقط کروچیٹ ہی کو اگلی ضرب سے ظاہر کرتے
۔ اس کے بعد پھر ہاپ یا اندر والے۔ "دو" کہا جاتا ہے، تو ضرب کا سلسلہ ایک دوسرے
ے اُلٹ ہو جاتا ہے اور اسی طرح ادل بدل کرنے سے دونوں اقسام کے سروں کا قیام
خوبی ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ اس مشق میں تبدیلیاں کرنے کے اور بھی طریقے ہیں لیکن
ان ان کا بیان کرنا طوالت کا موجب ہوگا[1]۔ موزونی طریق کی خوبیوں میں ایک خوبی یہ ہے
استاد ان ورزش کی مشقوں کو کئی طرح سے تبدیل کر سکتا ہے۔ کسی مشق کو ایک ہی طرح نہیں
انا چاہیے، مبادا دلچسپی مفقود ہو جائے۔ یہاں مذکورہ بالا ورزش کی ایک تبدیلی کی طرف
ارہ کیا جاتا ہے۔ باہر کا دائرہ کروچیٹ کے دو ٹکڑے (بار) سُن کر پاؤں کی ضرب جاری
ھتا ہے اور دو باروں کے عرصے کے برابر سکوت اختیار کرتا ہے۔ اسی سکوت کی حالت
ں، اندرونی دائرہ دُرت سروں کی سولہ ضربیں دو باروں کے عرصے میں لگاتا ہے اور پھر دو
روں کے دوران میں قیام کرتا ہے۔ اس تمام عرصے میں سازوں کی آواز جاری رہنی چاہیے۔
لحاظ رہے کہ طلبہ ہاپ کے حکم پر کان لگائے رکھیں اور بے توجہ نہ ہو جائیں۔

اس تمام عمل کے بعد اُستاد کو اگلی مشق کے لیے تیاری کرنی چاہیے۔ جو یہ ہے کہ لڑکے
زوؤں کو ہلا کر تو کروچیٹ کا اظہار کریں اور پاؤں سے کوایور کی ضرب لگائیں۔ اس مشق میں
مشکل پیش آئیگی کہ پاؤں کی حرکت، بازو کی حرکت سے دو چند ہے۔ لیکن تھوڑی سی مشق
سے یہ رفع ہو جائیگی۔

---

[1] اس طریق یعنی موزونیات کے متعلق مزید تفصیل درکار ہو، تو مصنف موسیو الکر ڈ کی اصل کتاب
لاحظہ فرمائیے۔ جس کا نام ہے "موزونیات بحیثیت فن اور تعلیم" (Eurhythmics, Art and Education)۔
ایک اور کتاب Eurhythmics of Jacques-Dalcroze دیکھیے جسے کنسٹبل اینڈ کمپنی نے شائع کیا ہے۔

منم یعنی کروو سُر کے مطابق جو حرکات کی جاتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:۔
ایک قدم آگے بڑھاؤ اور اس کے بعد گھٹنا جھکاؤ۔ یہ خیال رہے کہ جھکاؤ جھٹکا دے کر نہ کیا جائے، بلکہ ہلکا سا ہو، ورنہ بدزیب دکھائی دے گا۔

اس کے بعد منم، کروچیٹ اور کواور سے متعلقہ ضربات کو باہم ترکیب دے کر سکھانا چاہیے۔ مثلاً ایک بار میں بازوؤں کی چار حرکات (کروچیٹ سروں کے مطابق) اور پاؤں کی دو دو حرکات (منم کے مطابق) عمل میں لائی جائیں، تو ان حرکات کی باہم مطابقت کافی مشکل ثابت ہوگی۔ ہر بار کی چوتھی ضرب پر بازو اوپر اُٹھائے جائیں گے اور اس کے ساتھ گھٹنے کو جھکایا جائیگا۔ پس بازوؤں اور ٹانگوں کو مختلف اطراف میں حرکت دینے کے لیے کافی مشق درکار ہوگی۔

سیمی بریو یا لگھہ ثلث سب سے طویل سُر ہے۔ اس کے مطابق ضربات اور ان عرصہ جانچ کر جسمانی حرکات کرنا ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

ایک کے حکم پر بائیں قدم کو آگے بڑھاؤ۔

دو کے حکم پر دایاں پاؤں آگے رکھا جاتا ہے اور اس کی انگلیاں نیچے کی طرف جھکی رہتی ہیں اور زمین پر ہلکی پڑتی ہیں۔

تین کے حکم پر دایاں پاؤں پیچھے کی طرف، دائیں ہاتھ کے رُخ پر ہلایا جاتا ہے۔ اس کی انگلیاں نیچے کے رُخ جھکی رہیں اور بائیں پاؤں کے برابر آکر زمین کو چھوئیں۔

چار کے حکم پر دایاں پاؤں، بائیں پاؤں کی طرف، ایک رُخ پر لایا جائیگا۔ (ان چاروں احکام کے مطابق چار کروچیٹ ہوئے، جن سے ایک سیمی بریو مرکب ہے)۔

اب دوسرا سیمی بریو شروع ہوتا ہے۔ دوبارہ احکام دینے کے بجائے طلبہ کو از خود

ں سُر کے چار وقفے یا کروچیٹ معلوم کرنے اور انھیں کے مطابق حرکات ظاہر کرنے کا موقع
و۔ مثلاً اس سُر کے بجتے ہی ایک کا حکم ملا، ساتھ ہی دایاں پاؤں آگے بڑھا۔ دو کا عرصہ
ہن میں رکھا گیا۔ مگر ساتھ ہی بایاں پاؤں آگے بڑھا کر پنجہ زمین پر دائیں پاؤں کے ساتھ
ملایا۔ پھر تین کے ذہن میں رکھے ہوئے عرصہ میں بایاں پاؤں پچھلی طرف ہٹا کر بائیں رُخ پر
رکھا اور چار کے عرصے میں بایاں پاؤں دائیں کے ساتھ ملایا اور مشق کو جاری رکھا۔

اس مشق میں چار چار ضربوں کا شمار کرتے ہوئے، مذکورۂ بالا دستور کے مطابق مارچنگ لیا جاتا ہے۔ اُستاد اس مشق کے دوران میں سابقہ واقفیت کے بموجب، تبدیلی پیدا کرنے کی غرض سے، کروچیٹ، منم، ٹرپلیٹ وغیرہ سروں کو، سیمی بریو کے ساتھ شامل کر کے حرکات کی مختلف اقسام پیدا کر سکتا ہے۔ بہتر ہو کہ طلبہ کو از خود انفرادی حرکات کرنے کا موقع دیا جائے، بشرطیکہ وہ لَے کو قائم رکھیں۔

جو طرزِ عمل سیمی بریو کے متعلق اختیار کیا گیا ہے۔ کم و بیش وہی پُلٹ (مساوی تین کروچیٹ) کے ساتھ جاری رکھا جا سکتا ہے۔

سُروں کی حرکتی نشان دہی میں جو اصول مدِ نظر رکھا گیا ہے، وہ مختصراً یہ ہے کہ ہر اُس سُر کے ساتھ، جو بینڈ کے کسی ساز (بنسری وغیرہ) پر بجایا جائے، ایک قدم بڑھایا جاتا ہے اور جہاں ایک سُر کو ایک ماترے سے زیادہ عرصے تک ٹھیرا گیا ہو، وہاں وقفہ رہتا ہے یعنی جسم سکون کی حالت میں رہتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ گھٹنا جھکایا جائے اور یا پنجوں کو ٹھیراؤ کے وقت ہلکے ہلکے پٹخا جاتا ہے۔

ساز کے متعلق ہدایات

موزون طریق کے بموجب، تمام ابتدائی ورزش کی غرض سے نغموں کا انتخاب بعض

قومی گیتوں یا اسکولی اور مارچنگ کے گیتوں سے کیا جاتا ہے۔ جوں جوں یہ مشقیں رواں ہوتی جائیں، اُستاد کو ان کا ساتھ دینے کے لیے خود بعض نغموں کا اختراع کرنے کا ڈھنگ سیکھنا چاہیے۔ بعض معلمین کو، جو یہ طریق اپنے مدرسے میں جاری کرنے کے مشتاق ہوں، شاید یہ امر مانع آئے کہ وہ موسیقی سے بے بہرہ ہیں اور پھر نغموں کی ایجاد تو اور بھی مشکل فن ہے۔ لیکن تھوڑی سی توجہ اور مشق سے ایک کور ذوق آدمی بھی یہ کام چلا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں پولیس اور فوج کے اَن پڑھ دیسی سپاہیوں کو انگریزی بینڈ باجہ بجانے میں خاصی مہارت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اُنھیں مقررہ علاماتِ موسیقی کو سمجھنے اور ان کے مطابق سُروں کو باجے میں سے نکالنے کی لگاتار مشق کرائی جاتی ہے۔ اگر ا، ب، ت وغیرہ علامات کی شناخت اور آوازوں کو بچہ اور بوڑھا اخذ کر سکتا ہے اور اُنھیں الفاظ اور جملوں میں ترکیب دے کر استعمال کر لیتا ہے، تو کروچیٹ کواور وغیرہ کی علامات کو دیکھ کر ان سُروں کو باجے میں سے نکال لینا کیا مشکل ہے؟ البتہ غور طلب امر یہ ہے کہ کیا ہم اسکول کے بینڈ یا موزونی ورزش کے لیے انگریزی علامات کے بموجب انگریزی گانوں یا "طرزوں" سے کام لیں یا نغموں سے۔ چونکہ اس طریق میں مقررہ نغموں کے بجائے، نت نئے نغمے اختراع کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں طریقِ علامات کو درمیان میں لا کر خواہ مخواہ اپنے آپ کو پابند نہیں کر لینا چاہیے، بلکہ بلا واسطہ طور پر ابتدا میں مروجہ نغموں سے کام لینا چاہیے، جن سے طلبہ پہلے ہی آشنا ہوں۔ یہ گویا طلبہ کی سابقہ واقفیت ہے، جس سے مدرس کو فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اس کے بعد جوں جوں مشق ہوتی جائے، نئے نغمے پیدا کیے جائیں۔ اس کام میں مدرس اور طلبہ دونوں کو دلچسپی پیدا ہو جائیگی۔

اب رہا ساز کا مسئلہ۔ بالعموم یورپین مدارس میں موزونی ورزشِ پیانو کی مدد سے کرائی جاتی ہے اور یہ ساز اس لیے موزوں سمجھا گیا ہے کہ اس کے سروں میں ہارمونیم کی طرح تسلسل نہیں ہوتا، بلکہ ایک سُر پر انگلی کی ضرب لگانے سے اس کی آواز نکلتے ہی بند ہو جاتی ہے اور اس کے بند ہو جانے پر، کروچیٹ منم وغیرہ کے قیام کا اندازہ کرنے کی عادت شروع ہی سے پڑنے لگتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں پیانو کے اختیار کرنے میں دو رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ اوّل تو یہ ساز بہت قیمتی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ عموماً عمارت کے اندر اس کی ساخت کے دوران میں سکھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی ڈیل ڈول بہت بڑی ہے ہمارے گرم ملک میں اسکول کی ورزش کھلی ہوا میں کرائی جاتی ہے اور یورپ میں اکثر بند ہال کمرے میں۔ اس لیے یہی مناسب ہے کہ ہم اپنے موجودہ مروجہ اور سستے ساز سے کام لیں اور وہ ساز بنسری ہے، جس پر سروں کی روک تھام پیانو کی مانند کی جا سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ دو اقسام کے ڈھول، جو مدارس میں رائج ہیں، یعنی شتری اور بڑا ڈھول، کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ اگر نغموں کو خالص ہندی رکھنے کے بجائے "موڈرن" بنانے کا شوق ہو، تو مدرس نوویلو (Novello) کے شائع کیے ہوئے موسیقی کے قاعدے کی مدد لے سکتا ہے۔ یا ہیڈ ماسٹر کسی فوج کے پینشن یافتہ بینڈ والے کو کچھ عرصے کے لیے سستے داموں ملازم رکھ سکتا ہے، جو اسکول کے ڈرل ماسٹر کو نفیری یا بنسری پر انگریزی نغمے بجانے سکھائے۔

(باقی آئندہ)

بچے کی سیرت کیسے بنتی ہے

از

میرزا مقبول بیگ بدخشانی، بی اے، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

بچے کی سیرت میں دوسرے بچوں کا تعلق

ہم نے اپنے مضمون کی پچھلی قسطوں میں اس بات پر ہی غور کیا تھا کہ اُستاد اور والدین بچے کی سیرت بنانے میں کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس بات پر ہم نے ابھی تک نظر نہیں ڈالی کہ بعض باتیں ایسی بھی ہیں، جو ان بزرگوں سے تعلق نہیں رکھتیں، بلکہ ان کا تعلق دوسرے بچوں کی رفاقت سے ہوتا ہے۔ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے، دوسرے بچوں کا ساتھ بھی اس کے لیے ضروری ہوتا جاتا ہے۔ دوسرے بچوں سے ہماری مراد یہ نہیں کہ وہ اس کے ہم عمر ہی ہوں، بلکہ ہماری مراد ایسے بچوں سے بھی ہے، جو عمر میں اس سے قدرے بڑے ہوں اور ایسے بچوں سے بھی جو عمر میں اس سے چھوٹے ہوں۔ بچے کی عمر کے پہلے سال میں دوسرے بچوں کا ساتھ کچھ ضروری نہیں ہوتا۔ سال کے آخری تین مہینوں میں البتہ ان بچوں سے تھوڑا بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن یہ بچے اس ننھے سے کچھ ہی زیادہ بڑے ہونا چاہئیں۔ گھر بھر میں اگر بچہ اکیلا ہو، اس کا کوئی ہم عمر یا اس سے قدرے بڑی عمر کا کوئی لڑکا موجود نہ ہو، تو آپ دیکھیں گے کہ وہ چلنا پھرنا بھی دیر میں سیکھیگا، باتیں بھی دیر میں کرنا شروع کرے گا۔ بچے دوسرے بچوں کی پیروی آسانی کے ساتھ کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس بزرگوں کی ہر

نہ ہوتی ہے، چلنے پھرنے بات کرنے میں ان کے خاص خاص ڈھب ہوتے ہیں،
لیے ان کی پیروی کرنا بچوں کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک سال کے بچے کی نشوونما
یے صحیح نمونہ چالیس بیالیس برس کا مرد نہیں، بلکہ تین سال کا بچہ ہے۔ تین سال کی عمر
بچے کی حرکتیں اور باتیں عام طور سے ایسی ہوتی ہیں، جو ایک سال کے بچے کو پسند
۔ جوان یا بڑے بوڑھے تو اس کے لیے فوق الانسان ہوتے ہیں، نہ ان کی باتیں ہی
ہیں آئیں، نہ ان کے سنجیدہ کھیلوں ہی میں یہ دلچسپی لے سکے۔ بچے، بچوں کو ہی اپنے
تریب سمجھتے ہیں، انھیں کو وہ زیادہ چاہتے ہیں اور انھیں سے وہ اٹھنا بیٹھنا پسند
نے ہیں۔ ان کے فعل اور اُن کی باتیں چھوٹوں کی خواہشوں کے لیے تحریک کا موجب
اتی ہیں۔

بچوں کو ان کے کھیل کے متعلق اگر پورا پورا اختیار دے دیا جائے، تو وہ اپنی عمر
بچوں میں کھیلنا پسند نہیں کرینگے، بلکہ اپنے سے زیادہ عمر کے بچوں کے کھیل میں جا کر شریک
لے۔ کیوں نہ ہو، اس میں ان کی بڑائی ہے۔ لیکن یہ بڑی عمر کے بچے بھی تو اپنے بڑوں
جا کر کھیلنا پسند کرینگے، چھوٹوں سے کھیلنا، وہ بھی اپنی شان کے شایاں نہ سمجھیں گے۔
کا نتیجہ ظاہر ہے کہ مدرسے میں، گلیوں کے چوراہوں میں یا پڑاؤ میں، جہاں عام طور سے
ر کے بچے جمع ہو جاتے ہیں، بڑے بڑوں کے ساتھ کھیلنے لگتے ہیں اور چھوٹے چھوٹی عمر
لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کے دلوں میں یہ تڑپ تو
نا ہے کہ بڑوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہوں۔ لیکن یہ حسرت دل کی دل میں رہ جاتی ہے۔
ریا اس سے ہم یہ اندازہ کرتے ہیں کہ بڑی عمر کے بچوں سے سیکھنے اور حاصل کرنے کا عمل آسانی
ساتھ گھر ہی میں شروع ہو سکتا ہے۔ گھروں میں سب سے بڑا بچہ ایک ہی ہوتا ہے باقی

سب اس سے چھوٹے ہوتے ہیں چھوٹوں کو تیار کیا ہوا راستہ مل جاتا ہے۔ ان کو تو پیروی کرنا ہوتی ہے اور بس، اس لیے انھیں بڑی آسانی رہتی ہے۔ لیکن گھر کے بڑے بچے کو اپنا راستہ آپ بنانا پڑتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی ایسا بچہ نہیں ہوتا، جس کے نقش قدم پر چل سکے۔ اس لیے وہ خسارے میں رہتا ہے، تو گویا دوسرے بچوں سے سیکھنے اور حاصل کرنے کے فن سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ جوں جوں گھرانے چھوٹے ہوتے جاتے ہیں، نقصان بڑھتا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ رواج ہو چلا ہے کہ ادھر بیاہ ہوا، اُدھر میاں بیوی گھر چھوڑ الگ کہیں جا بسے۔ اس صورت میں ہر گھر کا ہر پہلا بچہ بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے بڑے بچوں کی تعداد زیادہ ہی زیادہ ہوتی جاتی ہے اور اس لحاظ سے یہ خسارہ بھی بڑھتا جاتا ہے تو گویا چھوٹے چھوٹے اور الگ الگ گھرانوں کی یہ تقسیم بچوں کی تربیت میں روک ڈالنے کا موجب ہوتی ہے۔

بچے سے زیادہ عمر کے بچے، اس سے چھوٹی عمر کے بچے اور اس کے ہم عمر اور ہم جماعت بچے سبھی اس کے لیے کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن بڑی اور چھوٹی عمر کے بچوں کا فائدہ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، گھر کی چار دیواری تک محدود رہتا ہے۔ بڑی عمر کے بچوں کا فائدہ یہ ہے کہ اُن کی وجہ سے ان بچوں کے دل میں ایسی امنگیں پیدا ہوتی ہیں، جو پوری بھی ہو جا سکتی ہیں۔ ایک بچہ پوری پوری سرگرمی کے ساتھ کوشش کرتا ہے کہ اپنے اندر ایسی قابلیتیں پیدا کرے، جن سے بڑے اُسے اپنے ساتھ کھیلنے کا اہل سمجھ لیں۔ زیادہ عمر کے بچے جب ایک بچے کے ساتھ کھیلتے ہیں، تو انھیں بناوٹ اور تصنع سے کام لینا پڑتا۔ ان زیادہ عمر کے بچوں کو یہ خیال ہرگز نہیں ہوتا کہ جن بچوں سے ہم کھیل رہے ہیں وہ بہت چھوٹے ہیں اور ہمیں بھی ان کو راضی کرنے کے لیے انھیں کی طرح بن جانا چاہیے۔

ں کے سے کھیل کھیلنا چاہییں۔ لیکن جب زیادہ بڑی عمر کے لڑکے یا جوان مرد ان سے
لگیں گے، تو ان کے کھیل میں سراسر بناوٹ ہوگی۔ وہ اپنے لیے نہیں کھیلیں گے،
بچے کو خوش کرنے کے لیے کھیلیں گے۔ بچہ اس بات کو پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ بناوٹ
م لے کر آہستہ سے گیند اپنے بچے کی طرف پھینکیں گے کہ وہ ہٹ لگانے میں کامیاب
، تو وہ ہٹ لگا کر خوش تو ہو جائیگا، لیکن سچی خوشی اسے اس وقت حاصل ہوگی کہ کوئی
وٹ اس کی طرف گیند پھینکے اور وہ ہٹ لگانے میں کامیاب ہو جائے۔ بلا بناوٹ گیند
ینے والا اس کا ہم عمر ہی ہو سکتا ہے یا اس سے کچھ زیادہ عمر کا۔

ایک بچہ خوشی خوشی اپنے سے بڑے بھائی یا بہن کا حکم مانتا ہے۔ ان کی بڑائی یا
ست کو وہ دلی شوق سے قبول کرتا ہے۔ اتنی زیادہ فرمانبرداری وہ بڑے بوڑھوں کو بھی
ں کرنا چاہتا جتنی ان کی کرتا ہے اور اگر اپنے بزرگوں کے رعب اور دبدبے کا اُسے
ں نہ ہو، تو ممکن ہے، وہ ان کی فرمانبرداری کرے ہی نہیں۔

بچے کے دل میں یہ خیال بھی موجود رہے کہ میں دوسروں سے کمزور ہوں اور ان کے
ں میں شامل ہونے کا بھی اسے موقع ملے۔ یہ گویا دوسرے بچوں ہی کی صحبت میں حاصل
ہے۔ لیکن اگر گھر کے بزرگ انھیں یہ باتیں سکھانے لگیں، تو انھیں مشکلات کا سامنا
اہے۔ وہ اگر چاہیں کہ یہ باہمی مدد، صحیح معنوں میں باہمی مدد ہو، تو اس کے لیے انھیں
تی اور درشتی اختیار کرنا پڑیگی۔ یا اگر وہ ظاہرا صورت پر ہی مطمئن ہو جائیں، تو بناوٹ
کام لینا ہوگا۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ سچی باہمی مدد اور بناوٹی باہمی مدد کو بالکل ہی
نداز کر دیا جائے، بلکہ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ بے ساختگی جو دو ہم عمر بچوں کے کھیل
ہوگی، وہ بچے اور بزرگ کے کھیل میں نہیں ہوگی اور اگر تھوڑی بہت ہو بھی، تو وہ زیادہ

دیر تک قائم نہیں رہ سکیگی اور اس سے دونوں پارٹیاں حظ نہیں اٹھا سکیں گی۔

بڑی عمر کے بچے چھوٹوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے بہت سودمند ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بچے کے دل میں خاص خاص تحریکیں پیدا ہوتی ہیں اور خاص خاص امنگیں اٹھتی ہیں اور اگر یہ بڑی عمر کے بچے کچھ مہر و محبت سے کام لیں، تو بزرگوں کی نسبت زیادہ اچھی طرح اور زیادہ آسانی کے ساتھ مشکلات کو دور کر سکتے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم میں آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ طالب علم اپنے سے اونچی جماعت کے طلبہ سے بعض ایسی کارآمد باتیں جان لیتے ہیں، جو فن تعلیم کے ماہر بھی انھیں اچھی طرح سے نہیں بتا سکتے تھے۔

چھوٹی عمر کے بچے کا ساتھ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ خاص کر جب وہ تین سال سے چھے سال تک کے ہوں۔ یہ فائدے اخلاقی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب تک بچہ ایک بالغ کی نگرانی میں رہتا ہے، اسی کے ساتھ وقت کا بیشتر حصہ گزار دیتا ہے اور اُسے چند ایسی باتوں کا پتہ نہیں چل سکتا، جو بچے کے لیے نہایت ہی ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ طاقتور کو کمزور سے کیسے سلوک کرنا چاہیے؟ ایک بچے کو ہمیں سکھانا پڑتا ہے کہ چھوٹے بہنوں اور بھائیوں کی چیزوں کو چھیننا نہیں۔ اگر وہ خود خوشی سے دیں، تو لے لو، یا یہ کہ اگر تمھارے بنائے ہوئے مکان پر اتفاقیہ کسی چھوٹے بچے کا پاؤں آپڑے، تو ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تم غصے میں آکر اسے مارنے لگو۔ اگر تمھارے پاس ضرورت سے زیادہ کھلونے ہیں، جو اس وقت تمھارے استعمال میں نہیں، تو ان سے چمٹے نہیں رہو۔ اگر کوئی دوسرا ان سے کھیلنا چاہے، تو خوشی خوشی دے دو۔ یہ بڑی ہی بری بات ہے کہ تم کھلونوں کا ذخیرہ لیے بیٹھے رہو اور ساتھ کھیلنے والوں کو مانگنے سے ایک کھلونا بھی نہ دو۔ ہمیں انھیں یہ بھی بتانا ہے کہ اگر تم چھوٹے بچوں کو جھنجھوڑوگے، تو انھیں تمھاری اس حرکت سے تکلیف ہوگی اور اگر تمھاری کسی بات پر ناراض ہو کر رونے لگیں، تو تمھیں ندامت اور اظہار افسوس کرنا چاہیے ان کے

آنسو پونچھنا چاہییں۔ ایک چھوٹے بچے کی حفاظت کرنے کے لیے دوسرا اس سے زیادہ عمر کا بچہ، اپنے سے بڑے کے ساتھ بے تکلفی اور بے باکی سے گفتگو کرسکتا ہے۔ لیکن اسی قسم کی بے باکی اور بے تکلفی دوسرے موقعوں پر جائز نہیں سمجھی جاتی۔

یہ سبق بے حد مفید ہیں اور کسی دوسری صورت میں ممکن نہیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے کہ چھوٹے بچے ساتھ ہوں اور اخلاق کی یہ تعلیم ان کی موجودگی میں دی جائے۔ اگر آپ اپنے بچے کو اس قسم کی اخلاقی تعلیم زبانی ہی دیتے رہیں گے، تو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ وقت بھی ضائع ہوگا، بچوں کو بھی پریشانی ہوگی اور آپ کو بھی کوفت ہوگی۔ ہر بات عمل کے ذریعے سکھانا چاہیے، جو موقع اور محل کے عین موافق ہو۔ ہم اور آپ جس تعلیم کو اخلاقی تعلیم کہتے ہیں، اس کو بچہ بالکل ایسا ہی محسوس کرتا ہے کہ آپ گویا اُسے ہدایت کر رہے ہیں کہ کشتی کیونکر چلائی جاتی ہے۔ اگر آپ دونوں چپو ہاتھ میں لے کر کشتی کھینے لگیں، تو بچہ بہت جلد کشتی کھینا سیکھ جائیگا اور اگر کشتی کھینے کے متعلق آپ اُسے علمی باتیں بتاتے رہیں، تو وہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی کے ساتھ کشتی کھینا نہیں سیکھ سکیگا۔ اس کی مشکلات میں کمی جبھی ہوگی کہ آپ کوئی عملی مثال اس کے سامنے رکھیں۔ جس بچے نے اپنے بزرگوں کو مہر و محبت سے پیش آتے دیکھا ہے، وہ ضرور ان کی مدد کریگا۔ لیکن اگر بزرگ خود بچوں سے محبت اور نرمی کا سلوک نہ کریں اور بچے سے یہ اُمید رکھیں کہ چھوٹوں سے اچھا سلوک کرے۔ تو یہ کچھ زیادتی ہے۔ آپ جتنی بھی کوشش کریں گے، رائیگاں جائیگی۔ یہ بچہ اس صورت میں چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کریگا۔ آپ نے ایک مشہور کہاوت سنی ہوگی۔ ایک بچے کو گڑ کھانے کی عادت ہوگئی تھی۔ اس کی والدہ اس بات کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ گاؤں میں ایک ملا جی تھے۔ ان کی عقلمندی کا شہرہ پھیلا ہوا تھا۔ وہ جو کہہ دیتے تھے لوگ چپ چاپ اس پر عمل کرتے تھے۔ لیکن گڑ آپ کو بھی بہت بھاتا تھا۔ بچے کی ماں ان ملا جی کے پاس گئی اور کہنے لگی۔ یہ بچہ گڑ بہت کھاتا ہے۔ آپ کرم کر

ابھی فارغ ہی ہوئے تھے۔ تھوڑا سا پاس بھی رکھا تھا۔ فرمانے لگے کسی دوسرے دن تشریف لائیں۔ بچہ گڑ کھانے کی عادت چھوڑ دیگا۔ وہ ایک دن کے بعد وہ عفیفہ پھر ملّا جی کی خدمت میں آئی۔ اب کے ملّا جی نے بچے کو ہدایت کر دی۔ ان کی ہدایت کا خاطر خواہ نتیجہ ہوا۔ بچے نے گڑ کھانا چھوڑ دیا۔ آپ جانتے ہیں۔ پہلے ملّا جی نے ہدایت کرنا کیوں مناسب نہ سمجھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے وہ خود گڑ تناول فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے اسے بُرا سمجھ کر پہلے خود چھوڑا اور پھر دوسرے کو اس کے چھوڑنے کی ہدایت کی۔

اگر کسی بچے کی والدہ اس کی ناک پونچھنے لگے اور وہ چینا چلّانا شروع کر دے، تو والدہ کو چاہیے، اس کے بڑے بھائی کو بتائے کہ ناک صاف رکھنے سے کیا کیا فائدے ہیں۔ ورنہ ممکن ہے یہ بڑا لڑکا احتجاج کرنے لگے کہ آپ ناحق سختی کیوں کر رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے سلوک کو بجا ثابت نہیں کر دیں گے، تو اُسے یقین ہو جائیگا کہ آپ کی سختی بے جا ہے اور آپ اسے بھی ظلم اور سختی کی طرف مائل کر دیں گے اور پھر اسے باز نہیں رکھ سکیں گے۔

تو گویا ہم نے دیکھ لیا کہ بچے کے لیے بڑوں کا ساتھ بھی فائدہ مند ہے اور چھوٹوں کا ساتھ بھی۔ لیکن ہم عمر بچوں کا ساتھ ان دو سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ بچوں کو یہ سکھانا بڑا ہی ضروری ہے کہ برابر کے ساتھیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ ہم روزمرّہ میں اکثر دیکھتے ہیں کہ انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے ساتھ برابر کا سلوک نہیں کرتے۔ یہ تفاوت ہرگز قدرتی نہیں ہے۔ اگر ہم اس تفاوت کو خیرباد کہہ سکیں، تو بڑی ہی اچھی بات ہے۔ امیر لوگ اپنے نوکروں کو بہت دنی خیال کرتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ یقیناً اس رویے سے مختلف ہوتا ہے، جو وہ اپنی سماجی زندگی میں دوسروں سے اختیار کرتے ہیں لیکن کسی بڑے عہدے دار کسی نواب یا کسی بڑے رئیس کے سامنے جاتے ہوئے یہ بھی اپنے آپ کو ادنیٰ سمجھنے لگتے ہیں یہاں پہنچ کر ان کا رویہ کچھ اس قسم کا ہو جاتا ہے کہ انھیں اپنی خودداری کا خیال بھی نہیں رہتا۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے

خادم اور مخدوم کو دیکھ کر ایک ہی قسم کا احساس دل میں پیدا ہونا چاہیے اور دونوں کے ساتھ برابر کا سا سلوک روا رکھنا چاہیے، خود دارانہ اور باوقار۔ بچپن ایک ایسا سلسلہ مدارج قائم کر دیتا ہے، جس میں بناوٹ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے یہی بہترین موقع ہے کہ بچے اپنے بچپن کا وقت ہم عمروں کے ساتھ گزاریں اور انھیں مساوات کی ایسی عادتیں ڈالی جائیں، جو آئندہ زندگی میں عام لوگوں کو پسند آئیں۔ ہر قسم کے کھیل بھی اپنی ہی عمر کے بچوں میں اچھی طرح سے کھیلے جاتے ہیں۔ اسکول کے کھیلوں میں جو مقابلہ ہمیں نظر آتا ہے، وہ بھی ایک ہی عمر کے بچوں میں ہوتا ہے۔ طالب علموں میں ہر ایک کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہوتی ہے، جتنی دوسرے ان کو دیں۔ ہو سکتا ہے، دوسرے لڑکے انھیں پسند کریں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے انھیں اچھا نہ سمجھیں، لیکن اس بات کا دار و مدار ان کی اپنی سیرت اور ان کی اپنی ہمت پر ہوتا ہے جو ماں باپ بچے کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتے ہیں، وہ ان کے لیے ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں، جس میں دلجوئی اور نازبرداری کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔ لیکن جو ماں باپ بچے سے بالکل ہی محبت نہیں کرتے، وہ ان کے لیے ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں، جہاں خودروی اور آمد بالکل دب کر رہ جاتی ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ ہمارے بچے جبر و تعدی کیے بغیر رواداری سیکھ لیں اور یہ بھی چاہیں کہ ان کے دلوں میں غلامانہ احساس بھی پیدا نہ ہوں، تو یہ سب اچھی طرح سے ہم عمر بچوں کے ساتھ گھلنے ملنے میں ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ چند باتیں ہیں، جن کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کو اپنے ماں باپ کے ساتھ تنہا وقت گزار دینے میں اتنے زیادہ فائدے حاصل نہیں ہوتے، جو انھیں اچھے اسکول میں حاصل ہوتے رہیں۔

ان دلیلوں کے علاوہ ایک اور دلیل بھی ہے اور یہ دلیل ان سب میں زیادہ ضروری ہے

بچے کے دل اور دماغ میں کھیل کا بڑا ہی گہرا جذبہ ہوتا ہے۔ پہلے دو ایک سال گزر جانے کے بعد اس جذبے کی تسکین صرف دوسرے بچوں اور بچیوں کے ساتھ کھیلنے میں ہی ہو سکتی ہے۔ کھیل کے بغیر بچہ کھچا کھچا اور دبا دبا سا رہتا ہے۔ زندگی کی مسرتوں کو بیٹھتا ہے، حسین انسانی حرکتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں غم اور تشویش جگہ پکڑتی جاتی ہے۔ خوشی کے لیے اس کے سینے میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔ ہر چیز جسے وہ غور سے دیکھتا ہے، اسے افسردہ کر دیتی ہے۔ ایک بچے کو کھیل اور تفریح سے اگر آپ بالکل ہی منع ہی کر دیں اور اس کی جگہ بھی آپ اس کو کتابوں کے مشغلے میں لگائے رکھیں، تو اس سے یہ تو ممکن ہے کہ وہ ثقہ عالم بن جائے۔ لیکن اس کی تربیت کے بہت سے پہلو ایسے ہونگے، جو تشنہ رہ جائیں گے۔ ملا باقر داماد کے متعلق روایت مشہور ہے۔ آپ بچے ہی تھے کہ آپ کو زبان دانی کا درس ملنا شروع ہوا۔ کچھ بڑے تو ریاضی شروع ہوا۔ کچھ اور زیادہ عمر کے ہوئے، تو صرف و نحو، فلسفہ وغیرہم مضمون شروع کرائے گئے۔ دن اور رات کا بیشتر وقت لکھنے پڑھنے میں گزر جاتا تھا۔ آپ کی تربیت میں کھیل کو کوئی دخل نہ تھا۔ گویا کھیل کا احساس سرے سے مٹا ہی دیا گیا تھا۔ سالہا سال کی محنت اور کاوش کے بعد جب آپ نے تعلیم کا نصاب پورا کر لیا اور دوسرے بزرگوں نے آپ کے سر پر فضیلت کی دستار رکھ دی، تو آپ خوشی خوشی باہر نکلے، اس انداز سے کہ علم و فضل آپ کی راہ صاف کرتے ہوئے چلتے تھے۔ سامنے آپ کو بچے کھیلتے نظر پڑے۔ بچوں نے اپنے کپڑے اتار کر زمین پر رکھے ہوئے تھے۔ حضرت بھی ان کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ دستار پاس ہی کے ایک درخت کے کھکھ میں رکھ دی اور بچوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہو گئے۔ بعض انسانی نفسیات سے بے بہرہ لوگوں نے آپ سے سوال بھی کیا "مولینا یہ کیا ہے؟" آپ نے جواب دیا "میں اب وہ علم سیکھنا چاہتا ہوں جو مجھے

مل نہیں سیکھا۔ جان سٹوارٹ مل کی تربیت بھی کچھ اسی صورت سے ہوئی تھی۔ آپکو
ا برس کی عمر میں ہی لاطینی کی تعلیم شروع کرادی گئی تھی۔ آپ بچپن کی ایک معمولی
ں اور آزادانہ دل لگی سے بھی ناواقف تھے۔ آپ اپنے سوانح حیات میں لکھتے ہیں ۔
ں بچپن میں لوگوں کو گانا گاتے اور سازہ بجاتے سُنتا تھا۔ مجھے اس خیال سے بہت سخت
ِانی کوفت ہوتی تھی کہ موسیقی کے یہ سُر ایک دن سارے کے سارے ختم ہو جائیں گے اور
ئی موسیقی نہیں بن سکیگی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا وہم غلبہ عصبی کمزوری کی علامت ہے۔
ن سٹوارٹ کی بحث جب کبھی اس کے والد کے ساتھ ہوتی تھی اور جب وہ ایسی دلیل
ں کرتا تھا، جس سے اس کے والد کی منطق پر زد پڑتی تھی، تو کچھ اس طرح سُن کر نادم
جاتا تھا، جیسے کہ کبھی کبھی گھوڑا آپ ہی آپ ڈر کر بدک جاتا ہے۔ اور اپنی دلیل کی قوتوں
دیا خود ہی گھٹا دیتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اگر اس کا واسطہ برابر کے آدمیوں سے پڑتا، تو اُس
دماغی صلاحیت میں اور زیادہ ترقی ہوتی اور اس کا تخیل اور زیادہ طبع زاد ہو جاتا۔ اس کے
ملق آپ کی رائے کچھ ہی ہو لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ زندگی سے
ذ اُٹھانے کی اہلیت اس میں اور زیادہ ہو جاتی۔ برٹرینڈ رسل لکھتا ہے کہ سولہ سال تک
ری تعلیم بھی بالکل تنہائی میں ہوئی تھی۔ بچپن کی عام مسرتوں سے میں بھی محروم کر دیا گیا تھا۔
غ ہوا، تو میرے دل میں خودکشی کا خیال آ آ کے رہ جاتا تھا۔ مجھے خودکشی کا خیال اس
یے آتا تھا کہ مادی حرکتوں کے اٹل قانون نے میرے جسم کو ترکیب دے رکھی ہے۔ اس میں
ے کوئی دخل نہیں۔ میرا ارادہ محض ایک فریب ہے۔ جب مجھے اپنے ہم عمروں کے ساتھ
ے کا اتفاق ہوا تو سب مجھے اکھڑ مزاج اور خود پسند کہتے تھے۔ بڑی حد تک یہ بات صحیح
ی تھی اور کافی مدت تک مسرت مجھ سے ملی رہی۔

کلیہ قاعدوں کی کوئی نہ کوئی استثنا بھی ہوتی ہے۔ اُوپر کی دلیلوں کے باوجود میں تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ بعض بچے اور بچیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جنھیں مدرسے میں نہ بھیجنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ ان میں انفرادیت بڑے زور کی ہوتی ہے اور نہایت ہی اہم درجہ رکھتی ہے۔ ایک بچے کی اگر جسمانی حالت خراب ہو۔ لیکن دماغی قوتیں صحیح و سالم ہوں، تو اُس کے لیے اچھے گھر کی چار دیواری ہی زیادہ مناسب ہوتی ہے۔ اسے اوسط درجے کے طلبہ کے ہجوم میں بھیجدینا غلط ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں پہنچ کر ان کے ہاتھوں اسے ایسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے، جو اُسے پاگل ہی بنادیں۔ اکثر ہم دیکھتے ہیں، جن کی دماغی حالت بہت زیادہ اچھی ہوتی ہے، ان کی صحت اچھی نہیں ہوتی۔ اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے خاص احتیاط برتنا چاہیے اِس کا علاج یہ نہیں کہ اسے اسکول کے بعض اُن گھڑ، اجڈ ساتھیوں سے ملا دیا جائے، جہاں ہر وقت وہ اسے اذیت ہی پہنچاتے رہیں۔ یہ کمزوری اکثر بچپن کی بے احتیاطی کا نتیجہ ہوتی ہے چھوٹی عمر کے بچّوں کو اگر تھوڑی بہت عقل سکھا دی جائے، تو وہ یقیناً سب کے سب دوسرے بچوں کے ساتھ کو بہت پسند کرینگے۔ لیکن بعض ایسے بھی ہونگے، جو یہ پسند نہیں کرینگے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہونگے، جو غیر معمولی انفرادیت کے مالک ہونگے۔ انھیں اسکول بھیجنا درست نہیں۔ انھیں کسی ایک کی نگرانی میں رکھنا ہی مناسب ہوگا۔

ہمارے اُستاد

از

ایم۔ سکندر خاں، گورنمنٹ ہائی اسکول قصور

کہتے ہیں "ہر کسے را بہر کارے ساختند" لیکن موجودہ کساد بازاری کا برا ہو، جس نے
ارے فارغ التحصیل نوجوانوں کے لیے مناسب اور نامناسب، دلپسند اور غیر دلپسند پیشوں
ا تمیز کو مٹا دیا۔ عام حالات میں جب تک ایک نوجوان کالج کی فضا میں ماں باپ کے گاڑھے
پسینے کی کمائی پر ہاتھ صاف کرتا رہتا ہے، وہ احمقوں کی بہشت میں زندگی بسر کرتا ہے اور
سے معلوم نہیں ہوتا کہ کالج سے نکلنے کے بعد جب زمانہ اُسے آڑھے ہاتھوں لیتا ہے، تو آہستہ
ہستہ اس کے سنہرے خوابوں کا سلسلہ جن کے اندر وہ کبھی اپنے آپ کو آئی سی ایس،
ر کبھی پی سی ایس، دیکھا کرتا تھا، منتشر ہو جاتا ہے اور جب وہ بالکل نا امید ہو جاتا ہے، تو
ں کا کوئی صلاح کار آہستہ سے اسے یہ کہہ دیتا ہے، دوست فی الحال ٹیچری کیوں نہیں کر لیتے۔

فی زمانہ ہماری درسگاہوں میں ایک حصّہ ان حضرات کا بھی دکھائی دیتا ہے، جو یہاں
نے میں خود تو رضامند نہ تھے، لیکن نامساعدتِ روزگار نے انھیں "ٹیچری" کرنے پر مجبور
ر دیا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے تمام پیشہ ور بھائی جبراً و قہراً اُستاد بنے
یں۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی اس جماعت میں کئی دیانتدار اور فرض شناس افراد
جود ہیں، جنھیں قضا و قدر نے اسی "فن شریف" کے لیے پیدا کیا تھا۔

وہاں ہمارے اداروں میں انھیں دو قسم کے اساتذہ درس و تدریس میں مشغول ہیں۔

جو یا تو فطری رجحان سے یہ پیشہ قبول کر چکے ہیں اور یا زمانے نے انھیں اس جگہ زبردستی
ٹھونس دیا ہے لیکن ان سطور میں میرا مطلب اساتذہ کرام کے عیب و ثواب پر نظر ڈالنا نہیں
بلکہ میں یہاں ایسے امور پر بحث کرنا چاہتا ہوں، جن کے ہونے سے اُستاد کی ذات ممتا
اور نمایاں اور جن کے نہ ہونے سے وہ بے حیثیت اور بے قدر ہو جاتی ہے، یعنی یہاں مج
اُستاد کی شخصیت سے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

"شخصیت" ایک جامع لفظ ہے اور اُس کے اندر اُستاد کی شکل وصورت، اس کا علم
یا بے علمی، اس کا تجربہ یا عدم تجربہ، اس کا ذوق یا بے ذوقی، پیشہ ورانہ حیثیت سے اس کی
قابلیت یا ناقابلیت، اس کا ضبط و انتظام اور طلبہ کے ساتھ اس کا سلوک وغیرہ وغیرہ سبھی کچھ
شامل ہیں اور چونکہ میں کامیاب اور ناکامیاب اساتذہ کا ایک معیار قائم کرنا چاہتا ہوں اس
اس جگہ میں ان سب امور کا فرداً فرداً ذکر کروں گا۔

شکل وصورت۔ شکل وصورت کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ قدرت نے جسے
جاہا ویسا بنا دیا اور اس میں کسی ردّ و بدل کا امکان نہیں۔ لیکن وہ حضرات اساتذہ جو بد قسمتی
سے اپنی شکل وصورت میں کوئی قدرتی نقص رکھتے ہوں، جو طلبہ کے نقطۂ نظر سے خاص طور
پر تفریح کا باعث یا مضحکہ خیز ہو۔ اگر وہ بھی اپنے جسم کی صفائی کا خیال رکھیں گے اور متانت
اور سنجیدگی کی طرف پوری توجہ دینگے۔ جماعت کے روزمرہ کے کام میں دلچسپی لیں گے اور
اپنے ادائے فرائض میں دسترس پیدا کر لیں گے، تو انھیں اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کوئی مشکل نہ ہوگی
لیکن جہاں شکل وصورت کسی کے بس کی بات نہیں ہے، وہاں لباس بڑی حد تک
بس کی بات ہے اور بعض اوقات شکل وصورت سے بڑھ کر لباس اُستاد صاحبان کی تحقیر یا تضحیک
کا باعث بن جاتا ہے۔ کئی صاحبان لباس میں پرانی وضع کے پابند ہیں اور کئی طرز جدید کے

لیکن کچھ بھی ہو، ہمارا لباس ہمیشہ صاف ستھرا، اصولِ صحت اور ضروریاتِ موسم کے مطابق ہونا چاہیے اور اس میں گنگا جمنی ترکیبیں نہ ہوں، یعنی مشرقی اور مغربی طریقوں کی نامناسب ملاوٹ نہ ہو۔ جو صاحب لباس کی درستی کو ضروری نہیں سمجھتے یا جن کا لباس میلا اور نامناسب ہوتا ہے، وہ خاموش طریقے پر طلبہ کے اندر بھی لباس کی صفائی اور درستی سے بے توجہی اور بے پروائی پھیلانے کے ذمے دار ہوتے ہیں۔

لیکن ہمیں لباس کے معاملے میں سادگی اور کفایت شعاری کو کبھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ بعض حضرات جو کالج کی فضا سے ابھی ابھی باہر نکلے ہیں، عام طور پر بیش قیمت لباس پہننے اور ریشمی رومال، نکٹائی اور خوشبو استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں، اس سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ نوعمر و نوخیز طلبہ، جو خاموشی سے اپنے گرد و پیش کی چیزوں سے موثر ہوتے رہتے ہیں، اُستاد کی تقلید کرنا چاہیں گے اور اس قسم کی تقلید فی زمانہ نہ صرف ان کے والدین پر ہی ایک بارِ گراں ثابت ہوگی، بلکہ بسا اوقات ان کے اخلاق پر بھی نامناسب اثر ڈالے گی۔

اُستاد کا علم۔ ہم نے اسکولوں اور کالجوں میں جو کچھ پڑھا، اس کا بڑا مقصد یہی تھا کہ عام اس سے کہ ہم تلاشِ روزگار میں کامیاب ہوں یا نہ ہوں، ہمارے دل و دماغ علم کی روشنی سے منور ہو جائیں اور اب جبکہ ہم اپنی باری سے نونہالانِ ملک و قوم کو تعلیم دے رہے ہیں، تو ہمارا منشا بھی یہی ہونا چاہیے کہ ہم ان کے دل و دماغ کو منور کر دیں اور اس طرح ایک شمع سے دوسری شمع اور ایک مشعل سے دوسری مشعل روشن ہوتی جائے۔ لیکن اگر ہم اپنے درسی فرائض سے کماحقہٗ سبکدوش ہونا چاہتے ہیں اور ان بچوں کے دماغ کو فی الواقع منور کرنا چاہتے ہیں، جو ہماری کفالت میں ہیں، تو ہمیں درسی کتب کے مطالعے کے

ساتھ ساتھ اپنی عام واقفیت کو روز بروز بڑھاتے رہنا چاہیے۔ بچوں میں سوال پوچھنے کا ایک ابھرتا اور بڑھتا ہوا شوق ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ اس قسم کے ادق اور سٹپٹا دینے والے سوالات کر بیٹھتے ہیں کہ اگر اُستاد ان کا جواب دیتا ہے، تو غالباً اُسے خود ہی اس کی درستی کے متعلق شک ہوتا ہے اور اگر نہیں دیتا، تو اُس کی اُستادی میں فرق آتا ہے اور بعض حضرات تو بجائے اس کے کہ بچے کے بڑھتے ہوئے شوق کی داد دیں، اس کے اس قسم کے فطری سوالوں سے جب اپنا قافیہ تنگ ہوتا دیکھتے ہیں، تو نہایت درشتی سے اسے خاموش کر دیتے ہیں اور اس طرح اس کی ذہنی نشوونما کا سلسلہ منقطع کر دیتے ہیں۔

پس ضروری ہے کہ ہم لوگ جو فنِ تعلیم سے کسب معاش کرتے ہیں، اپنے علم کے دائرے کو وسیع اور روز بروز مکمل اور اکمل کرتے چلے جائیں۔ اخبارات اور رسائل، علمی، درسی، جدید معلومات کی کتابیں ہماری نظروں سے گزرتی رہیں اور گو ہمیں یہ پیشہ اختیار کیے ایک عرصہ ہی ہو گیا ہو اور ہمیں اپنے درسی مضامین پڑھانے میں پوری پوری قدرت ہو پھر بھی لازم اور بہتر یہی ہے کہ ہم ہر سبق سے پہلے تیاری کر لیں اور طلبہ کے متوقع اور غیر متوقع سوالات کے لیے تیار رہیں۔ جو اُستاد اپنے آپ کو اس روزمرہ کی تیاری سے بالاتر سمجھتا ہے وہ اپنی قابلیت کے اندازے میں غلطی کرتا ہے اور اویر سویر اس پر عیاں ہو کر رہیگا کہ ایک اوسط قابلیت والا لیکن مستعد اُستاد، ایک اعلیٰ قابلیت کے مالک، مگر غیر مستعد اُستاد سے بازی لے جائیگا۔

دیکھا گیا ہے کہ جوں جوں ہماری ملازمت کا سلسلہ دراز اور ہمارا تجربہ وسیع ہوتا جاتا ہے، ہمارا مبلغِ علم اس کے ساتھ ساتھ ترقی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ایک حدِ عمر گزر جانے کے بعد فطری طور پر انسان کے قوائے ذہنی سست ہو جاتے ہیں اور

شش اور محنت کا جذبہ کمزور ہو جاتا ہے یا شاید یہ سمجھ لیتے ہوں۔ چونکہ ہم روزانہ فرائض
ے بہ حیثیتِ مجموعی تسلی بخش طریق پر سبکدوش ہو رہے ہیں، اس لیے ہمیں اپنے دائرۂ علم کو
یع کرنے کی ضرورت نہیں یا شاید محکمۂ تعلیم میں ذرائعِ ترقی کو محدود اور مسدود دیکھ کر مزید
دِ سر خریدنے اور سعی کرنے کا حوصلہ نہ پڑتا ہو۔ ان ذہنی ہنگاموں کے خاموش ہونے کی
ئی سی وجہ بھی ہو، لیکن اس کی اہمیت ایک واہمہ سے بڑھ کر نہ ہونی چاہیے۔ تجربے کے
ملو بہ پہلو معلومات کے دائرے کو وسیع کرتے رہنا کیا جوانی میں اور کیا پیرانہ سالی میں ایک
نہ قلبی اطمینان کا باعث ہوتا ہے۔ جب تک ہم مدرسے کے اندر درس و تدریس کے شغل
ں بسر اوقات کر رہے ہیں۔ علم کی وسعت روزمرہ کے فرائض میں ہماری ممد و معاون ہوگی۔
ں کے ذریعہ ہم اپنے سبق کو زیادہ دلچسپ، زیادہ پر از معلومات اور اپنے طلبہ کے لیے زیادہ
دمند بنا سکیں گے اور اگرچہ محکمہ شاید اپنی مجبوریوں کی بنا پر ہماری بڑھتی ہوئی قابلیت
ر تجربے اور علم کی داد نہ بھی دے، تو کیا ہم علم کو علم کی خاطر حاصل کرنے سے رک جائیں گے۔

ہمارے بعض احباب ایسے بھی ہیں، جو بزعمِ خود اپنے آپ کو "ہمچو ما دیگرے نیست" کا مصداق
ر اپنی رائے اور علم کو گولڈ اسمتھ کے دیہاتی اُستاد کی مانند ہمیشہ کے لیے صائب اور مکمل
سمجھتے ہیں۔ ان صاحبان کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ علم کسی کیفیت جمود کا نام
ہیں، جو قطبی ستارے کی طرح ایک ہی جگہ پر قائم رہے، بلکہ یہ ایک بڑھتی، بدلتی اور پھیلتی
ئی چیز ہے۔ فنِ تعلیم کی سائنس روز افزوں ترقی پر ہے۔ ماہرانِ نفسیات مزید تحقیق کر رہے
یں۔ طلبہ کی ذہنی کیفیت سے متعلق زیادہ زیادہ معلومات حاصل کی جا رہی ہیں۔ پرانے نظریے
و کل تک قابلِ قبول و معقول تھے، آج بیں پشت ڈالے جا رہے ہیں۔ نئے زمانے میں نئے
سلسلے اور نئے تعلیمی طریقے ایجاد ہو رہے ہیں۔ اس لیے اگر آپ [illegible] علوم ہی کیوں نہ ہوں،

فنِ تعلیم کی نئی کتابیں جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں، آپ کی توجہ کی محتاج ہیں اور ان کا مطالعہ آپ کے علم میں مسرت خیز، مگر ضروری اضافہ کیے بغیر نہیں رہیگا۔

تجربہ۔ میں تجربے کا مطلب زیادہ وضاحت سے بیان کرسکوں گا۔ اگر میں لفظِ علم سے اس کا مقابلہ کروں۔ عام معنوں میں لفظِ علم سے مراد وہ "واقفیت" یا "آگہی" ہے جسے ہم درس وتدریس کے ذریعے یا اپنے طور پر پڑھ کر یا سنکر حاصل کریں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں فلاں بات کا علم ہے، تو اس سے ہمارا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہم اس کے متعلق کچھ پڑھ یا سُن چکے ہیں۔ لیکن تجربہ پڑھنے یا سُننے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ عمل سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے ذریعے ہم اپنے علم کے عیب وثواب پرکھتے ہیں کہ آیا جو کچھ ہم نے کتابوں سے اخذ کیا یا اور ذرائع سے سیکھا، وہ عملی زندگی میں کہاں تک درست اور قابلِ قبول ہے۔

جہاں تجربے اور علم میں فرق ہے، وہاں تجربے اور مشق میں بھی فرق ہے۔ یعنی فنِ تعلیم میں تجربے کار ہونا اور کہنہ مشق ہونا دو مختلف باتیں ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی صاحب کئی سالوں سے ایک خاص جماعت میں ایک خاص مضمون، مثلاً آٹھویں جماعت میں تاریخ جغرافیہ پڑھاتے رہے ہیں، تو ضروری ہے کہ اس مضمون کو پڑھانے میں انھیں مہارت، اپنا مطلب سمجھانے میں انھیں آسانی اور جماعت میں زیادہ سے زیادہ فی صدی نتائج دکھانے میں اُنھیں سہولیت ہوگئی ہو اور یہ مہارت اور آسانی اور سہولیت اُن کی ایک لمبی مدت کی مشق کا نتیجہ ہوگا، جو وہ روز بروز ایک ہی مضمون پڑھانے میں کرتے رہے ہیں۔ لیکن میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ تجربہ عمل سے حاصل ہوتا ہے۔ بولنے یا پڑھنے یا سُننے سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں بات میرے تجربے میں نہیں آئی۔ آپ کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ نے اس کے متعلق کچھ پڑھا یا سُنا نہیں ہے، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ آپ نے اس چیز کو کبھی عمل

ہیں دیکھا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ کہنہ مشقی اور تجربے کاری دو مختلف کیفیتیں ہیں۔

گزارش ہے کہ اساتذہ صاحبان کا تجربہ درس و تدریس سے متعلق نہیں ہوتا، بلکہ طرزِ تعلیم سے
ق ہوتا ہے۔ درس و تدریس میں آسانی تو مشق سے ہوتی ہے اور گو مشق بھی تجربہ کی طرح ایک
ن کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے، لیکن جہاں مشق کا تعلق ایک بات کے اعادے اور اس کے
بار دہرائے جانے سے ہے۔ تجربے کا تعلق اس ذہنی کیفیت سے ہے، جس کا احساس آپ کو
مولِ تعلیم اور عمل مشق کے بعد ہوتا ہے۔ گویا کہ تجربہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے، جسے آپ حصولِ
م اور عملِ مشق سے گزر جانے کے بعد نتیجے کے طور پر حاصل کرتے ہیں۔

مدتِ مشق بڑھنے کے ساتھ ساتھ اساتذہ کا تجربہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ یہ تجربہ جیسا کہ
ض کیا جا چکا ہے، محض طرزِ تعلیم سے متعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے انھیں طلبہ کی ذہنیت کا علم،
یمی نفسیات میں دسترس، جماعت کے غیر متوقع معاملات کے سلجھانے میں قدرت اور طلبہ کی
ہی کمزوریوں کا اندازہ لگانے اور ان کا علاج کرنے میں سہولت ہو جاتی ہے۔ تجربہ کار اُستاد
رسے کے اندر ایک ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں، جو تعلیمی اعتبار سے بہت ارفع ہوتی ہے اور
س کے اندر طلبہ کے دل و دماغ نشو و نما پاتے اور پھولتے پھلتے رہتے ہیں۔

جب اساتذہ نو مشقی اور فنی خامیوں کی حد سے گزر کر کہنہ مشق اور تجربے کار ہو جائیں،
یادہ نخلستانِ تعلیم میں ایک شجرِ بارور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیمی ادارہ اس قسم کے
ضرات کی رہبری اور تجربے سے فائدہ اُٹھائے بغیر زیادہ ترقی نہیں کر سکیگا۔ آج کل ہمارے
جوان ہم پیشہ احباب اپنی نئی تعلیم کے زعم میں ایسے استادانِ کار کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان
صاحبان کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ کی قابلیت بجا اور مسلمہ ہے۔ لیکن ان پیرانہ سال ماہرانِ
ن کو بھی حقیر نہ جانیے۔ اگر آپ کے اندر گرمیٔ خون اور جولانی کی زیادتی ہے، تو وہ کہنہ مشقی اور

تجربہ کاری اور وسعتِ نظری کا ایک دفینہ ہیں اور سالک ہونے کے اعتبار سے وہ اپنی پیشہ
'زاہ ورسم و منزلہا' سے بھی بے خبر نہیں ہیں۔

اب مجھے حضرات اساتذہ کے علمی ذوق اور درسی قابلیت سے متعلق کچھ عرض کرنا ہے
میں نے سطورِ مندرجہ بالا میں جہاں ان کے مبلغ علم پر کچھ سپردِ قلم کیا ہے، وہاں کنایۃً علمی ذو
کا بھی ذکر آ گیا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ہم اسی حالت میں اُستاد کہلانے کے مستحق ہیں۔ جب
اپنے علم کا دائرہ روز بروز وسیع کرتے رہیں اور اپنے طَلَبہ کی دلچسپی اور ذہنی نشو و نما کے
نئی نئی معلومات بہم پہنچاتے رہیں۔ عیاں ہے کہ یہ ایسی حالت میں ہو سکیگا۔ جب ہمارا علمی ذ
زندہ ہوگا اور ہم اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کرتے رہیں گے اور کتب بینی کے شغل کو قائم رکھیں
اس جگہ مَیں صرف اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہمارے اندر بے ذوقی نے ایک مرتبہ بھی ٹھکانا
لیا اور ہماری طبیعت میں نئی معلومات اور شغلِ مطالعہ کی طرف سے بے اعتنائی ہو گئی تو ہم کا
اساتذہ کے معیار سے بہت نیچے گر جائیں گے۔

دیکھا گیا ہے کہ کبھی کبھی ایسے حضرات جو اپنی علمیت کے لحاظ سے کسی صورت میں بھی
قابلِ تحقیر نہیں ہوتے، بلکہ اپنے حلقۂ احباب میں اپنی معلومات کے باعث معزز اور معتقد رسمجھے
جاتے ہیں۔ جب انھیں طلبہ کے روبرو فی الواقع کچھ کہنے یا پڑھنے کا موقع ہوتا ہے، تو ناکام رہ جا
ہیں۔ اس کمزوری کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اوّل تو میں عرض کرونگا کہ شاید آپ نے اپنے پیشے
کے انتخاب کرنے میں غلطی کی ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کے دل میں کسرِ نفسی زیادہ اور خود اعتماد
کا جذبہ کمزور ہے۔ لیکن اگر میرے اندیشوں کے خلاف آپ اپنے ۔۔۔ میں اسی پیشے کے لیے بدرجہ
اتم موزوں و مناسب ہیں اور آپ کے اندر خود اعتمادی بھی ہے اور باوجود اس کے آپ سبق پڑھا
ہوئے اپنے فرائض سے کماحقہٗ سبکدوش نہیں ہوتے، تو اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکت

اختلاف رائے کی سختی اُمیدواروں کو بھگتنا پڑتی ہے۔

(۳) امتحان اُور طالب علم۔ اگر یہ بات سچ ہے کہ زندگی کی باقاعدگی ہی زندگی کی کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے، تو ہمارے امتحان طلبہ میں باقاعدگی پیدا نہیں کرتے۔ شاذ و نادر ہی کوئی طالب علم ایسا ہوگا، جو امتحان کو پیشِ نظر رکھ کر اس کے لیے باقاعدہ پڑھائی کرے۔ اساتذہ اُور طلبہ پر یہ حقیقت خوب واضح ہے کہ دو چار ماہ پہلے پڑھائی کرنے سے امتحان کے لیے بخوبی تیاری ہو سکتی ہے۔ اس لیے عام حالات میں اگر امتحان مارچ میں ہو، تو دسمبر سے پہلے کام شروع نہیں کیا جاتا لیکن جب کام شروع کیا جاتا ہے، تو اُس کی رفتار ایک چڑھے ہُوئے سیلاب کی مانند ہوتی ہے، جو ہر لحظہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اور چونکہ امتحان اب خطرناک طریق پر قریب ہی آجاتا ہے۔ اس لیے ہر اُستاد طلبا کو احکام اور کام کے بوجھ سے لادتا ہے۔ حساب اُور انگریزی اُور جنرل نالج اُور دیگر مضامین کے اساتذہ کے مابین رسہ کشی ہوتی ہے کہ کون طلبہ سے زیادہ کام لے سکتا ہے اُور کون اُنھیں اسکول کے اوقات سے پہلے یا پیچھے روک سکتا ہے۔ غرضکہ اندھا دھند پڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ طلبہ کے دماغ پر جب ہر مضمون کی تیاری کا بوجھ ایک ہی مرتبہ پڑ جاتا ہے، تو اُن کی حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے اور وہ بطائف الحیل اپنی کھیل بچانے اُور اساتذۂ کرام کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُور بعض تو ان ایّام میں کام کی زیادتی کے باعث بیمار ہو جاتے ہیں۔

کیا آپ کو کبھی ایک چڑھتے ہُوئے دریا کی کیفیت نظارہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جس کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے دیہات آباد ہوں اُور جن کے رہنے والے یہ جان رہے ہوں کہ بہت پانی کی بے پناہ موجیں اُن کی بستیوں کو گھیر لینگی۔ پھر وہاں ایک سراسیمگی اور پریشانی اور بدحواسی کا عالم ہوتا ہے اُور وہ لوگ ایک ناقابلِ بیان سرگرمی اُور شدّت سے اپنے جان و مال کو بڑھتے ہُوئے سیلاب سے بچانے کے لیے سعی و کوشش کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حالت امتحان سے پہلے طلبہ کی ہو جاتی ہے۔

بجالائیں اور جب تک یہ نہیں ہوگا، جماعت میں ضبط قائم رکھنے کی کوشش سودمند نہ ہوگی۔

وہ بات جو سب سے زیادہ طلبہ کے دل میں اُستاد کی عزت پیدا کرتی ہے اُس قابلیت اور اندازِ تعلیم ہے اور جو اُستاد اپنے روزانہ مشاغل کی بجاآوری کے لیے آمادہ و مستعد رہتا ہے۔ طلبہ کی ذہنی نشوونما کے لیے مناسب کوشش کرتا رہتا ہے اور سز اور درشت کلامی کو اپنا اصولِ کار نہیں بناتا۔ طلبہ ضرور اُس کی عزت کرتے ہیں اور جماعت میں اس کا ضبط خود بخود قائم رہتا ہے لیکن اس کے خلاف جو صاحبان اپنے سبق کے لیے تیاری بھی نہیں فرماتے اور سزا اور سخت گیری سے زیادہ کام لیتے ہیں، طلبہ ان کی جانب سے بے پروا اور غیر مودّب ہو جاتے ہیں۔ ان کا سبق توجہ سے نہیں سُنتے، کیونکہ ان میں انھ کوئی دلچسپی دکھائی نہیں دیتی۔ پھر اُن کے عجیب عجیب نام رکھے جاتے ہیں اور اگر مبذو توجہ کے لیے اُستاد زیادہ سختی سے کام لیتا ہے، تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا یہ طرزِ عم پہلے تو طلبہ کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کر دیگا اور اگر وہ پھر بھی باز نہیں آئیگا، تو یہ نفرت کا جذبہ ترقی کرتے کرتے مدرسے سے نفرت اور انتہائی حالتوں میں تعلیم سے نفرت کی صورت اختیار کریگا۔

پس جماعت میں ضبط قائم رکھنے کے لیے اُستاد کا پہلا اور آخری فرض اپنی ذات سے متعلق ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ پیشتر اس کے کہ وہ طلبہ سے اپنے احکام بجالا کی توقع رکھے، وہ اپنے آپ کو عزت اور احترام اور حکم دینے کے قابل ثابت کرے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ ضابطہ اور منتظم اُستاد صاحبان کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ دوسروں کے دل میں اعتماد اور احترام پیدا کرنا ہر بشر کا کام نہیں ہے بلکہ یہ ایک

ـداۓ دین ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ ایک ایسی شے نہیں ہے، جسے ہم توجہ اور کوشش
سے حاصل نہ کر سکیں۔ اگر ہم اپنے اندر اس ضروری چیز کی کمی محسوس کرتے ہوں، تو ہمیں خوش
ـزاجی، خوش کلامی، طلبہ کے ساتھ ہمدردی، ان کی ذہنی نشو و نما اور صحت کی جانب توجہ،
ـن کے اطمینان وغیرہ وغیرہ امور سے اس کمی کو پورا کرنا چاہیے۔

طلبہ سے سلوک ۔ میرے اس مضمون کی آخری سرخی اُستاد صاحبان کا طلبہ سے
سلوک ہے۔ میں نے جہاں سطورِ مندرجۂ بالا میں سکول اور جماعت کے ضبط و انتظام سے متعلق
ـچھ عرض کیا ہے، وہاں کسی حد تک اُستاد اور طلبہ کے باہمی تعلق اور سلوک پر بھی اظہارِ خیال
ـیا ہے، لیکن مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، پورے طور پر نہیں کر سکا۔

کہتے ہیں پرانے زمانے میں اُستاد اور شاگرد کے تعلقات بالکل باپ بیٹے کے سے
ـوتے تھے۔ اُستاد اپنے شاگرد کو اولاد کی مانند اور شاگرد اپنے اُستاد کو بمنزلہ والد سمجھا کرتے
تھے۔ چنانچہ ہمارے رسولِ اکرم صلعم کی حدیث بھی ہے کہ ہر لڑکے کے تین باپ ہوتے ہیں۔
ـیک وہ جس کے ہاں وہ پیدا ہوا۔ دوسرا وہ جس کے ہاں اس کی شادی ہوئی اور تیسرا وہ
ـس نے اُسے پڑھایا اور پڑھانے والے اُستاد کا رتبہ ان تینوں میں سب سے زیادہ ہے۔
ـو اُس نے ایک لفظ ہی کیوں نہ پڑھایا ہو۔

لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ تعلیم کے عام ہو جانے اور طلبہ کی کثرت کے باعث
ـستاد شاگرد میں ذہنی، قلبی اور ذاتی تعلق جو تعلیم کی جان ہے، پیدا نہیں ہو سکتا۔ یا کم از کم
ـام حالات میں اس کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس کثرتِ تعلیم نے ایسے شاگرد پیدا کر دیے،
ـو اُستاد کی خدمت کا عوض "بل" سے ادا کرنا چاہتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اُستاد صاحبان
ـیں بھی شاذ و نادر ہی کوئی ایسی ہستی دکھائی دیتی ہے، جو ہدیہ دل پیش کیے جانے

کے قابل ہو۔

لیکن اگر ہم نے فنِ تعلیم کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنایا ہے، تو ہمیں اس ذریعہ کو "روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر" تک ہی محدود نہیں کر دینا چاہیے بلکہ ہمیں لازم ہے کہ کسبِ معاش کے ساتھ ساتھ اس میں زیادہ ترقی، کامیابی اور نیک نامی حاصل کریں۔ میں اساتذہ کرام کی فنی ترقی اور کامیابی پر بہت کچھ عرض کر چکا ہوں۔ یہاں مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر ہم اُستاد بنے ہیں، تو فی الحقیقت ہمیں طلبہ کے ساتھ ایک قلبی تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ ہمارے دل میں اُن کے لیے پدرانہ شفقت، عفو اور رحم ہو۔ ہم ان کی ترقی کو اپنی ترقی اور ان کے نفع کو اپنا نفع سمجھیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم محبت اور عفو کے جذبے سے اس قدر مرعوب ہو جائیں کہ "درشتی و نرمی بہم در بہ است" کے ضروری اصول کو پسِ پشت ڈال دیں۔ لیکن ہماری درشتی اور نرمی میں ایک اصلاحی کیفیت ہو اور جس طرح ایک بچہ باپ سے پٹتا ہے، مگر پھر بھی اسے باپ کہتا ہے۔ ماں کی سختی اُٹھاتا ہے، لیکن پھر بھی اسی کی گود میں بھاگا جاتا ہے، اسی طرح ہماری درشتی سے لذت اندوز ہونے کے باوجود بھی طلبہ کا ہمارے ساتھ ایک ایسا قلبی تعلق ہو جائے کہ وہ ماں باپ کی مانند ہمارے ممنون ہوں اور بڑے ہو کر جب وہ اسکول اور اپنے زمانۂ تعلیم کو یاد کریں، تو ہمارا نام ادب اور احترام سے لیں۔

تعلیم کی تحریک جدید کی تاریخی شخصیتیں

از

بشیر احمد ڈار، ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

روسو نے نفسیاتی اختلافات اور انفرادیت کے متعلق بہت کم بحث کی ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سے اہم مسائل جو ان اختلافات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ہمیشہ اُس کی نظر کے سامنے رہے اور اُس نے گاہے بگاہے مختلف جگھوں پر ان پر بحث کی۔ "ایک انسان کے لیے پروں کی ضرورت ہے اور دوسرے کے لیے زنجیروں کی۔ ایک قسم کے آدمی زنجیروں سے رام ہوتے ہیں، تو دوسری قسم کے زجر و توبیخ سے۔ ایک سے علوم کی انتہائی منازل طے کرائی جاتی ہیں اور دوسرے کے لیے حرف اُٹھانا بھی جرم کی پرورش کرانا ہے۔ ایسے مسائل کے لیے اس نے دو حل پیش کیے ہیں۔ پہلا حل امیل (Emile) میں غیر واضح طور پر موجود ہے۔ امیل کی تعلیم و تربیت ایک خاص معلم کے سپرد کی گئی، جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ اس کام کے لیے وقف کر دیا ہے، وہ ہر اُس ماحول کو حسب منشا شکل دیتا ہے، جو بچے کی سیرت اور نفسی زندگی پر اثرانداز ہو سکتا ہے لیکن اگرچہ ایسے خاص انتظام سے نفسیاتی اختلافات کی حفاظت کا بندوبست ہو جاتا ہے، پھر بھی اس مسئلے کا صحیح حل نہیں۔ روسو کا دوسرا اور بہتر جواب اس کی کتاب New Heliose میں موجود ہے۔ اس کتاب میں اُس نے دو لڑکوں اور ایک لڑکی کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے، جو روشن خیال ماں باپ کی نظروں کے سامنے آزادی کی فضا میں نشوونما پاتے ہیں۔ بچوں کو اپنے تجربوں سے فائدہ

اُٹھانے کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ اس تمام واقعہ کا مقصد جیسا کہ خود روسو نے امیل میں ایک جگہ ذکر کیا ہے، یہ ہے کہ "بچے کے صحیح معلم اس کے والدین ہیں" یعنی بہترین تعلیم اس کے خانگی ماحول ہی میں ہو سکتی ہے۔ خاندان کی حیثیت تعلیمی نقطۂ نگاہ سے فطرت اور سماج کے درمیان ہے اور اسی ماحول میں بچہ اپنی خصوصی ہستی کی نشوونما کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر حاصل کر سکتا ہے اور اس کے باوجود بعد میں سماج کا رکن ہو سکتا ہے۔

امیل کا اصلی موضوع اختلافاتِ عمر کی بحث ہے، جہاں تک اس بحث کا تعلق تعلیم سے ہے اگرچہ موجودہ تحقیقات کی روشنی میں روسو کی اس بحث میں چند ایک غلطیاں موجود ہیں۔ تاہم اس بحث نے تعلیمی معاملات میں ایک بالکل نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ اس اصول کی بنا پر کہ عمر کے ہر حصے کی خصوصیات علیحدہ علیحدہ ہیں، روسو نے طالب علمی کے زمانے کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور ہر زمانے کی تعلیمی ضروریات بیان کرنے سے پہلے اُس نے ہر حصۂ زندگی کی خصوصیات واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان چار زمانوں کی تقسیم اُس نے دو اصولوں سے کی اور اُس نے افراد کی نشوونما اور نسلِ انسانی کے ارتقا کی مماثلت کو تقسیم کیا۔ دوم، اس کے نقطۂ نگاہ سے بچپن کا زمانہ دماغی سکون (Passivity) وجمود کا دور ہے۔ اپنے قوائے کی نشوونما کے بعد وہ اس درجے سے ترقی کر کے فعالیت کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ پہلا دور معصومیت (Infancy) کا ہے، جو پیدائش سے لے کر دو برس کی عمر تک ہے۔ بچہ اس عمر میں بالکل حیوان ہے۔ اُسے اپنے مختلف احساسات میں کوئی تمیز نہیں ہوتی اور نہ اُسے اپنا ہوش ہوتا ہے۔ دوسرا دور بچپن کا ہے، دو سے بارہ برس کی عمر تک۔ اس زمانے میں بچے کی زندگی نسلی ارتقائی درجے کے مقابلے میں وحشی کی سی ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کا سارا دارومدار احساسات پر ہوتا ہے اور عقلی اور اخلاقی پہلو سے بالکل ناآشنا جسمانی ضروریات اس کی راہنما ہوتی ہیں۔ تیسرا دور قبل بلوغت (Pre-adolescence) بارہ سے پندرہ

Acc No. ...4555 ...
Date...............

مل ہے۔ اس عمر میں وہ آزادی اور خود اعتمادی کے ساتھ زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اس
ال روبن سن کروسو کی سی ہوتی ہے۔ جسمانی طاقت کے بڑھنے سے قوائے عقلیہ بھی ظاہر
نے ہیں اور حال و مستقبل کا امتیاز اُسے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے موجودہ اعمال
تقبل کی ضروریات کی روشنی میں دیکھے۔ اس کا ضمیر ابھی ظاہر نہیں ہوتا اور اس کے
اعمال کی بنیاد خود غرضی ہوتی ہے۔ چوتھا دور بلوغت کا ہے، جو پندرہ برس سے شادی
وقت یعنی پچیس برس کی عمر تک ہے۔ اس دور میں قوائے جنسی کا ظہور ہوتا ہے اور اس
ساتھ اس کی روح میں ایک نئی تڑپ محسوس ہوتی ہے اور حقیقی معنوں میں معاشرتی زندگی
غاز ہوتا ہے۔ ضمیر کا حکم زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے اور نیکی کرنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔

عمروں کی اس تقسیم کے مطابق روسو نے تعلیم کی اسکیم پیش کی۔ اس اسکیم میں سب سے
ہ کار آمد خیال جو روسو نے پیش کیا۔ یہ ہے کہ بلوغت کے وقت بچوں کی فطرت اور طبیعت
ایسی ایک تبدیلیاں ہوتی ہیں، جن کے باعث تعلیم میں بھی اس کے مطابق تغیرات ہونے
ہیں، لیکن اس نے غلطی یہ کی ہے کہ بچپن کے دور کو بعد کے زمانے سے بالکل مختلف قرار
ہے اور بچپن میں اخلاقی اور عقلی قوے کی موجودگی سے انکار کیا ہے۔

(ا) پیدائش کے وقت سے تعلیم شروع ہوتی ہے، جبکہ بچہ ابھی جسمانی ضروریات
مطابق حرکات کرتا ہے۔ اس دور میں معلم کا صرف یہ کام ہے کہ بچے کو اپنے تجربے سے سبق
یکھنے دے اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ کرے۔ اس عمر میں کھانے، بولنے چلنے کے لیے
اسے کورانہ نقل اور ذاتی کوشش کے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

روسو نے اس دور کی رسمیات کے خلاف بہت پُر جوش غصے کا اظہار کیا ہے لباس
بندش، آزادی کی رکاوٹ اور باہر آنے جانے سے منع کرنا، سبھی باتوں کو بُرا کہا ہے بچوں

کی فطری جبلتوں کے اظہار پر ناراضگی کا اظہار اور مار پیٹ، جبکہ بچوں کو ابھی کسی غلطی یا گناہ کی سزا حاصل کرنے کی علت کا بالکل اندازہ ہی نہیں ہو سکتا، سبھی کچھ ایسے افعال ہیں، جن کا بچوں کی تربیت پر بہت بُرا اثر ہوتا ہے۔ اس نے دیہاتی زندگی کی مبالغہ آمیز تعریف لکھی ہے اور کھیلوں اور آزادی کی بہت تاکید کی ہے۔ "ایک کمزور جسم ہر قسم کے تمرّد کی آماجگاہ ہے اور طاقتور اطاعت و فرمانبرداری کا نمونہ۔ جسمانی کمزوری نفسانی خواہشات کی پرورش کا نمونہ ہوتی ہے۔" "تمام بدی کا منبع کمزوری ہے۔ ایک بچہ تبھی بُرا ہوتا ہے، جب وہ کمزور ہو۔ اُسے طاقتور بناؤ اور وہ نیک ہو جائیگا۔ وہ جو ہر کام کر سکتا ہے، بدی اس سے سرزد نہیں ہوتی۔"

(ب) بارہ سال کی عمر تک تعلیم محض منفی ہونی چاہیے۔ اس دور میں نیکی یا سچائی کی تعلیم دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے دل کو بدی اور اس کے دماغ کو باطل سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس دور میں بچہ اخلاقی نقطۂ نگاہ کو نہیں سمجھ سکتا، اس لیے اُسے اخلاقی تعلیم نہیں دینی چاہیے۔ دو حالتوں میں اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ جب اخلاقی حقائق کو مادی واقعات کی شکل میں پیش کیا جائے۔ مثلاً غصّے کو بخار سے تشبیہ دی جائے یا بچے کو اس کی بد اخلاقی کے نتائج بھگتنے سے متنبہ کیا جائے۔ انھیں وجوہات کی بنا پر اس دور میں مدرسے کے عام مضامین کی تعلیم بھی بے معنی ہے۔ زبان، جغرافیہ، تاریخ حتیٰ کہ کہانیوں کی تعلیم میں ایسے واقعات کی طرف اشارہ ہوتا ہے، جو بچوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں اور اگر پڑھائے جائیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بچہ محض خالی الفاظ کی تعلیم حاصل کر رہا ہے مفہوم اس کے دماغ میں نہیں سما سکتا۔ اس دور میں صحیح تعلیم یہی ہے کہ جسمانی ورزش کے ذریعے حواس کی تربیت کی جائے۔ غور و فکر مشق حاصل کرنے کے لیے لازم ہے کہ جسم [illegible]

حواس وغیرہ کو مشق میں لائیں۔ چونکہ یہ تمام چیزیں قوائے عقلیہ کے ذرائع ہیں، حواس کی
تربیت کے لیے خاص کر یہی وقت موزوں ہے۔ حواس ہی وہ قوائے ہیں، جو سب سے پہلے
اپنا کام شروع کرتے ہیں اور حدِ کمال تک پہنچ جاتے ہیں اور اسی لیے ان کی تربیت کی طرف
سب سے پہلے توجہ دینی چاہیے۔ حواس کی تربیت کا مطلب صرف یہی نہیں کہ ان کو استعمال
کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعے رائے قائم کرنے کا طریقہ بھی سیکھا جائے۔
مثال کے طور پر قوتِ بینائی کی تربیت مندرجۂ ذیل مشقوں سے ہو سکتی ہے۔ فاصلے کا ماپنا اور
اندازہ لگانا، اشیا کا نقشہ، عملی ہندسہ اور گیند کے کھیل وغیرہ۔ ایک بات کی خاص طور پر روسو
نے تاکید کی ہے کہ تمام تربیت کھیل کے ذریعے ہونی چاہیے۔ بچے کی خواہش کے بغیر کسی قسم
کا جبر نہیں ہونا چاہیے۔

(ج) بچپن اور قبلِ بلوغت کے درمیانی زمانے میں Curiosity اور پیش بینی کا
نشو ونما ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس لیے اس وقت سائنس کی تعلیم کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔ اس کے
دو طریقے ہیں۔ بچّہ اپنے ارد گرد کی دنیا کا خاص شوق رکھتا ہے۔ اس شوق کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے
جغرافیے سے آغاز کرنا چاہیے۔ دوسری طرف سورج کو دیکھ کر کئی ایک سوالات بچے کے دل
میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے علم ہیئت سے آغاز کرنا چاہیے۔ ان دونوں کے بعد
علم طبیعیات کے اہم اصول آتے ہیں۔ اس تمام تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ اس کو علم سے بہرہ ور
کیا جائے، بلکہ اس کے دل میں علم حاصل کرنے کا ذوق پیدا کیا جائے۔ اس کا طریقہ ذاتی تحقیق
(discovery) ہے۔ اس کا کام سائنس سیکھنا نہیں، بلکہ سائنس کے اصولوں کو معلوم
کرنا اور دریافت کرنا ہے۔ یہی ایک ذریعہ ہے، جب ہمارا فرض ہے کہ بچوں کو تحصیل علم کی طرف
راغب کریں۔ لیکن علم کا معیار صرف عملی فائدہ ہے۔ اگر کوئی مضمون ایسا ہے، جس سے ہمیں کسی

قسم کے عملی فائدے کی توقع نہیں، تو اس کی تحصیل پر وقت صرف کرنا بچوں کی عمر ضائع کرنا ہے۔
"ہمیں ابتدائی تعلیم سے ہر وہ مضمون خارج کر دینا چاہیے، جو انسانی مذاق کے مطابق نہیں
اور صرف انہی کی تحصیل ہونی چاہیے، جو ہماری فطری جبلتوں کے مطابق ہوں"۔ روسو کا یہ اصول
شاید اس کے زمانے میں اتنا قابلِ عمل تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، جتنا کہ اب ہمارے زمانے میں۔
لیکن اس تحصیل علم کے ہوتے ہوئے بھی روسو "کتابی علم" کا دشمن ہے۔ صرف روبن سن کروسو
(Robinson Crusoe) کی کتاب روسو کے نزدیک قابلِ مطالعہ ہے، جس میں فطری
زندگی کا بہترین نمونہ دکھایا گیا ہے۔

علم کے علاوہ روسو نے اس دور میں بچوں کو دستکاری سکھانے پر بہت زور دیا۔
اس کا مقصد صرف یہ نہیں کہ وہ کسی دستکاری سے آگاہ ہو کر ایک آزادانہ ذریعہ آمدنی حاصل
کر سکے، بلکہ اس لیے کہ عوام میں جو دستکاری کے خلاف ایک عام نفرت پیدا ہو چکی ہے
وہ بچوں کی طبیعت سے نکل جائے۔ روسو نے دستکاری کی تعلیمی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے
اس کے بہت سے عمرانی فوائد گنائے ہیں، لیکن شاید وہ دستکاری کے نفسیاتی فوائد سے آگاہ
نہیں، جن کی بنا پر آج کل پروفیسر ڈیوی (Dewy) اور دیگر مفکرین نے ایسے مضامین کو
داخل نصاب کرنے پر زور دیا ہے۔ اس قسم کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا علم محدود ہے لیکن
جتنا کچھ بھی ہے، وہ اس کا اپنا ہے اور کوئی چیز اسے نیم ملا کی طرح نہیں آتی۔

(د) اس وقت تک بچے کے جسم، حواس اور دماغ کی تربیت کا سامان کیا جاتا رہا ہے
اس دور میں ضرورت ہے کہ اس کے دل کی تربیت کی طرف توجہ کی جائے۔ اب تک بچے کی تعلیم
صرف اس حد تک محدود تھی۔ اس کے تمام اعمال کی بنیاد خود غرضی ہے اور اس کی تعلیم کی
علت غائی تکمیل انسانیت۔ اب اس کو معاشری زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی جا رہی ہے

ں کی بنیاد دوسروں سے محبت اور علت فلق جذباتی ترقی اور اخلاقی تکمیل ہے۔ وہ پہلا شخص
ہے جس نے بلوغت کے دور کی تعلیمی اہمیت کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ بدقسمتی سے اس دور
عام درسی تعلیم ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ صحیح تعلیم و تربیت کے لیے یہی زمانہ زیادہ سازگار اور
ہے۔ اس وقت تک امیل کی تربیت معاشری ماحول سے علیحدہ ہوتی رہی اور اسے دیگر
جنسوں سے ملنے اور ان کے نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ اس نے شاید
تک خدا کا نام بھی نہیں سنا۔ اب سے اس کی تعلیم تمام تر مذہبی اور اخلاقی ہوگی۔ اس سے
بتر ہم جنسوں سے ملنا محض خارجی حالات پر مبنی تھا۔ اب اس کی ملاقاتیں جذباتی تجربے اور
ہمدردی کی وجہ سے ہوں گی۔ تعلیم کا تمام مفہوم ہی یکسر بدل جاتا ہے۔ "انسان کے لیے مناسب
مطالعہ دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات کا ہے۔ جب اس کی تمام زندگی کا دار و مدار جسمانی
ضروریات اور احساسات تک محدود ہے، تو اس کی نظر بھی اشیا کے مطالعے تک محدود ہے،
ن کے ساتھ اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ یہ اس کے بچپن کا کام ہے۔ جب اسے اخلاقی زندگی کا
احساس ہو جائے، تو اس کا فرض ہے کہ اس وقت وہ اپنے ہم جنسوں کے تعلقات پر غور کرے۔
کیونکہ اس کی باقی ماندہ زندگی میں یہ کام بہت اہم ہے۔"

خود غرضی میں نیکی اور بدی دونوں مضمر ہیں۔ اس وقت ہمارا فرض ہے کہ اس کے
نیک پہلو کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ "دل کی پہلی حرکات سے ضمیر کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ محبت
اور نفرت کے اولیں احساس سے نیکی اور بدی کے تصورات تشکل پذیر ہوتے ہیں۔ پہلے دور میں
منفی تربیت سے اس کی فطری شرم و حیا کو برقرار رکھنے سے مقصد صحیح طور پر حاصل ہو سکتا ہے۔
یہ وعظ و نصیحت سے نہیں بلکہ انسانی میل جول، معلم کی ذاتی زندگی اور مثال اور تاریخ
کے مطالعے سے ہی بخوبی سکھایا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس اصول کو دہرانا ہوگا

کبھی نہیں اُکتا سکتا کہ بچوں کی تمام تر تعلیم بجائے لفظوں تک محدود رہنے کے عمل پر مبنی ہونی چاہیے۔ جو چیز وہ اپنے تجربے کی مدد سے حاصل کر سکیں، انھیں کتابوں سے سیکھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے"۔ اس کے باوجود روسو نے کبھی اس خطرناک اصول کی تعلیم نہیں دی کہ بدی سے محفوظ رہنے کے لیے اس کے خوفناک نتائج کا تجربہ حاصل کرنا چاہیے۔ کوئی ایسا اصول نہیں جو اپنے یا دوسروں کے تجربوں سے سیکھا نہ جا سکے۔ اگر کوئی تجربہ خطرناک ہو، اُس میں سے خود گزرنے کے بجائے تاریخ سے سبق سیکھا جا سکتا ہے"۔ ایسے حالات میں کو نہ صرف بدی سے بچنے کی تعلیم دی جا سکتی ہے، بلکہ ان کو نیکی کرنے کے طریقے سے روشناس کیا جا سکتا ہے۔ غریب اور مظلوموں کی ہمدردی اور مدد اس کا اوّلیں فرض ہے۔ اگرچہ اپنے حقوق کو تسلیم کرانے اور دوسروں کے حقوق کے تحفظ کے متعلق بہت مستقل مزاج مگر اس کا ہر کام صلح و آشتی پر مبنی ہوگا۔

ایسے ہی طریقے سے بچے کی مذہبی تربیت ہونی چاہیے۔ پندرہ برس کی عمر میں روح کے وجود سے ناواقف ہوتا ہے اور شاید اٹھارہ برس کی عمر بھی مناسب وقت نہیں اُسے روح کی ہستی سے آشنا کیا جائے۔ کیونکہ وقت سے پہلے واقف ہو جانے سے ا چیز کا امکان ہے کہ وہ اس کی صحیح ماہیت کو کبھی بھی نہ سمجھ سکے"۔ خدا کے تصور کے متعلق روسو کا یہی خیال ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چھوٹی عمر میں اگر بچے کو خدا کا تصور دیا جائے، تو وہ انسانی شکل و اعضا میں محدود کر دیتا ہے، جو یقیناً خدا کی شان کے شایاں نہیں۔ خدا ا روح کا تصور صرف اسی وقت بچوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے، جب ان میں قوائے عق بیدار ہو چکے ہوں اور ان میں ایسے تصورات کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو چکی ہو۔ بیشتر اس کے کہ یہ مضمون ختم کیا جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند ایک ا

کی تشریح کر دی جائے، جو روسو کے تعلیمی اصولوں میں بہت اہم درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن
مفہوم عام طور پر واضح نہیں ہوتا۔ پہلا اصول منفی تعلیم کا ہے، جو بچے کی زندگی کے دوسرے
ں تربیت کا ایک اہم اصول ہے۔ اٹھارھویں صدی میں انسانی اور خاص کر بچے کی فطرت
متعلق عام طور پر جو نظریہ رائج تھا اور جس کو اس زمانے کی کورانہ مذہبی تعلیم نے بہت کچھ
یت دے رکھی تھی۔ روسو نے اس کے خلاف بڑے جوش کے ساتھ جہاد کر دیا۔ انسان
ثابد سمجھا جاتا تھا۔ مذہبی تربیت اور تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ اس فطرتِ بد کو ہمیشہ کے لیے
کر دیا جائے اور اس کی جگہ ایک نئی فطرت پیدا کی جائے۔ روسو اس کے خلاف کہتا ہے:
لیم کا پہلا قدم بالکل منفی ہونا چاہیے۔ اس تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ صداقت اور نیکی کی
ہم دی جائے، بلکہ یہ ہے کہ دل کو بدی اور دماغ کو غلطی سے محفوظ رکھا جائے۔" اس کے
دیک بچے کی تمام تر تعلیم کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی اپنی فطرت، اس کے اپنے قوے اور اس
اپنی فطری جبلتوں کو ظاہر ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس کی مرضی اور منشا کو کچلنا کسی حالت
ں درست نہیں۔ ان حالات میں یہ چیز واضح ہے کہ منفی تعلیم کا مفہوم یہ نہیں کہ بچے کو کسی
ہم کی تعلیم نہ دی جائے، بلکہ یہ تھا کہ بچے کی تعلیم مروجہ نظامِ تعلیم اور اصولوں کے بالکل برعکس
رنی چاہیے۔ ایمیل (Emile) پر کئی ایک اعتراضات کے جواب کے سلسلے میں وہ ایک
ط میں لکھتا ہے: "میں مثبت تعلیم کا مفہوم یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے بچے کو وقت سے پہلے
پختہ بنانے کی کوشش کی جائے اور اس کو وہ اصول سکھائے جائیں، جن کی تعلیم ایک بالغ
آدمی کے لیے ہونی چاہیے۔ منفی تعلیم سے میری مراد یہ ہے کہ علم سکھانے سے پہلے ان اعضا
کو سنوارا اور مکمل کیا جائے، جن کے ذریعے علم کی تحصیل ہو سکتی ہے اور جو اس کی تربیت سے
فوا... [illegible] منفی تعلیم [illegible]

کی تعلیم نہیں ملتی، وہ صرف بدی سے بچاتی ہے۔ وہ صداقت کا سبق نہیں پڑھاتی، وہ صرف باطل اور غلطی سے محفوظ رکھتی ہے۔ وہ بچے کو اس راستے پر گامزن ہونے کے لیے مائل کرتی ہے، جو اس کو صداقت کی طرف لے جائے۔ جب وہ اس کی ماہیت سمجھنے کے قابل ہو اور اس طرح نیکی کی طرف جب اس میں اس صفت کے سمجھنے اور اس سے محبت کرنے کی قوت پیدا ہو جائے۔"

دوسرا اہم اصول "تعلیم مطابق فطرت" ہے۔ لفظ فطرت کچھ ایسا مبہم سا ہے کہ اس کے معنی کا تعین آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ ایمیل میں فطرت کا لفظ تین مختلف حیثیتوں میں استعمال ہوا ہے، جن کو واضح کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ اس کتاب کا آغاز ان لفظوں سے ہوتا ہے:
"ہر ایک چیز جو خالقِ فطرت پیدا کرتا ہے، اچھی ہوتی ہے، لیکن جونہی وہ انسانی ہاتھوں میں پہنچی، اس کی فطرت صحیحہ مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔"

پہلا اور اہم مفہوم عمرانی ہے۔ "معاہدۂ عمرانی" میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک اعلیٰ تمدنی ریاست (State) بہتر سیاسی اصول پر قائم ہو سکتی ہے اور اس طرح اٹھارھویں صدی کی معاشری زندگی سے زیادہ بہتر زندگی کا وجود عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ ایمیل میں اس نے ایسی تعلیم کا نقشہ کھینچا ہے، جس کی بنیاد معاشرت کے دقیانوسی اصولوں، مدرسے کی بے معنی روایات اور بچے کی فطرت سے ناواقفیت پر نہیں، بلکہ انسان کی صحیح فطرت کے علم پر ہو۔ جس طرح اس نے "معاہدۂ عمرانی" میں اس چیز کی تعلیم دی کہ انسان کے حقوق صرف وہی ہیں، جو اس کی فطرت کے قوانین کے مطابق ہوں، اسی طرح "ایمیل" میں تعلیم بھی وہی پیش کی، جو ان قوانین کے ماتحت ہو۔ "فطرتی انسان" سے مراد وحشی نہیں، بلکہ وہ انسان جو اپنی فطرت کے قوانین کی روشنی میں زندگی بسر کرتا ہو۔ ان قوانین کی تحقیق فطرت کے دوسرے اصولوں کی طرح کی جا سکتی ہے۔ جب فطرتی تعلیم کا مفہوم یہ لیا جائے، تو اُس سے معاشرے کی مخالفت ایک

ں امر ہے۔"ہم کو چاہیے کہ ہم بچّوں کو انسان اور شہری بنانے میں کسی ایک کو اختیار کرلیں۔
نکہ یہ دونوں مقصد ایک ہی وقت حاصل نہیں ہوسکتے"۔لیکن یہ بات ذہن نشین کرلینی
ہیے کہ اس بیان میں معاشرے کا مطلب صرف اس کے زمانے کی "مہذب" سوسایٹی سے ہے۔
"فطرت" کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ قدیم جذبات، فطری جبلّتیں اعمال انسانی کے لیے
بنیاد بن سکتے ہیں۔ بہ نسبت غور وفکر، عقل اور تجربے کے۔"فطرت سے میری مراد انسان
وہ حالت ہے، جو دوسرے کے خیالات اور تجربات کا اثر قبول کرنے سے تبدیل نہ ہوچکی ہو فطرت
یہ مفہوم نفسیاتی ہے۔ اسی بنا پر روسو تعلیمی معاملات میں "عادت" ڈالنے کے خلاف ہے۔
رف ایک عادت بچے میں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کسی قسم کی کوئی عادت نہ
لے۔ عادت سے مراد کام کرنے کا وہ خاص طریقہ ہے، جو دوسروں کی دیکھا دیکھی کیا جائے۔

فطرت کا تیسرا مفہوم طبیعاتی کہا جا سکتا ہے۔اس سے مراد حیوانی فطرت ہے۔ اُس
ی تعلیم کے اثر کو زائل کرنے کے لیے جو انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے، ضروری ہے کہ بچے
بہت سا وقت جانوروں، نباتات اور مظاہرِ قدرت کے مطالعے میں گزرے۔ روسو فطرت
بے لوث عاشق تھا اور اسی کی تعلیم کے زیر اثر انگلستان اور فرنگ کے دیگر ممالک میں علم
ب میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا، جس نے مظاہرِ قدرت کے ساتھ ایک عجیب قسم کی محبت
یدا کرنے کی کوشش کی۔ خود روسو کا تصور اتنا شاندار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اپنے زمانے کے
عاشرے سے بہت بیزار تھا۔ اس لیے اس نے ایک تارک الدنیا کی سی زندگی بسر کرنے پر
ہت زور دیا۔ اخلاقی اور جسمانی دونوں حیثیتوں میں اس کا قول تھا کہ شہر انسانی نسل کے لیے
برستان کا حکم رکھتے ہیں۔"

جان لاک (JHON LOCKE) شاید پہلا شخص ہے جس نے موجودہ دور میں ادبی

تصنیفات میں عوام کی توجہ کو بچوں کی طرف مبذول کرایا۔ لیکن اس عزت کا سہرا روسو کے سر ہے کہ اُس نے اپنے تمام تعلیمی نظریوں کی بنیاد بچے کی فطرت پر رکھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روسو کو بچوں کی فطرت کا صحیح علم نہیں تھا اور اُس کی محبت محض جذبات پر مبنی تھی۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ صرف اس کے ہاتھ میں تعلیم کا مدعا، عمل اور اس کے ذرائع سبھی بچے کی زندگی اور اُس کے تجربات کے اندر محدود کر دیے گئے۔ تعلیم کی ہر سیڑھی کا مدعا بچے کا مناسب ارتقا ہے، بچے کی فطرت اور ارتقا ہی تعلیم کے عمل کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور بچوں کے تجربات سے فائدہ اُٹھا کر ہی اسے تعلیم دی جا سکتی ہے۔ پسٹالوسی (PESTALOZZI)، فروبل (FROEBEL) وغیرہ کی اصلاحات کا ماخذ روسو کی نظری تعلیم ہی تھی۔ غرضکہ اُنیسویں صدی کی تمام تعلیمی ترقی کی بنیاد روسو کی تعلیم پر ہے۔ روسو نے فطرت کے تین مختلف مفہوم پیش کیے تھے۔ تعلیم کی تمام نئی تحریکوں کی بنیاد انھیں تین نظریوں کے مطابق ہوئی۔ فطرت کا ایک مفہوم نفسیاتی تھا، جس کے مطابق فطرت سے مراد انسان کی جبلتیں اور اس کے پیدائشی جذبات تھے۔ اس سے بعد میں تعلیمی نفسیات کا آغاز ہوا۔ اس کے نمائندے پسٹالوسی، فروبل اور ہربرٹ (HERBART) ہیں۔ اس تحریک کے مطابق تعلیم ایک فطری عمل ہے، جس کا آغاز انسانی جبلتوں سے ہونا چاہیے اور بچوں کی فطرت کے مقتضا کے مطابق ہونا لازمی ہے۔ اس طرح روسو کی اس تعلیم نے کہ تعلیم کا مواد اور ذریعہ قدرت کے مظاہر اور اشیاء ہونے چاہییں۔ موجودہ دور میں سائنٹیفک تحریک کو تقویت دی۔ روسو کا تیسرا اصول یہ تھا۔ تعلیم سے بچہ اس قابل ہو کہ وہ سماج میں زندگی بسر کر سکے تاکہ ہر فرد اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے سماج کے ذخیرے میں کچھ اپنی طرف سے ایزاد کرے اور اپنے ہم جنسوں کی ضرورت کے وقت مدد کر سکے۔ اس اصول نے بعد میں ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی، جس کو ہم معاشری کہہ سکتے ہیں اور جس تحریک کا بہترین نمائندہ اس وقت جان ڈیوی

انجمنِ مشاغل

از

ہنسراج ورنیکلر ٹیچر، کرسچن ہائی اسکول، کھرڑ

کسی جنس کی قیمت کا اندازہ عام طور سے دو باتوں سے لگایا جاتا ہے۔ اول بلحاظ ضرورت، دوم خوبی اور پائداری۔ چونکہ ہماری جنس قوم یا ملک کے وہ بچے ہیں، جن کو ہمیں قیمتی بنا کر دنیا کے بازار میں بھیجنا ہے۔ اس لیے اگر ہماری تیار کردہ جنس دنیا کے بازار میں کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی یا اونے پونے بکی، تو سمجھ لیجیے کہ ہماری محنت اور وقت ضائع ہوا اور قوم کی دولت بھی لُٹی۔

موجودہ زمانے کی بیکاری اور کساد بازاری کا پہلا سبب تو یہی ہے کہ لوگ ہاتھ سے کام کرنا عار سمجھتے ہیں اور وقت کے صحیح مصرف سے ناواقف ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہم نے جنس کو تیار کرتے وقت مذکورہ بالا باتوں کا خیال نہ رکھا۔ جس کی وجہ سے ہم نے عوام ہی کو تعلیم سے بیزار نہیں کیا۔ بلکہ ہماری اوقاتِ فرصت سے بے پروائی اور نفسیاتی اصولوں سے بے نیازی نے ماہرینِ تعلیم کو بھی اُلجھن میں ڈال رکھا ہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ گورنمنٹ نئے نظریے اور لوائحِ عمل ہمارے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں، مگر ہم ہیں کہ اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی تضیعِ اوقات سمجھتے ہیں۔ بلکہ لکیر کے فقیر بنے ہوئے اپنی گاڑی کے بیلوں کو اندھا دھند ہانکے چلے جاتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ راستے میں کہاں کہاں نشیب و فراز ہیں اور کون کون سے طریقے ہیں جن سے ہم آسانی سے منزلِ مقصود پر پہنچ کر نکل سکتے ہیں۔

اندریں حالات ہمارا فرض ہے کہ ایسی تجاویز عمل میں لائیں، جو عوام کی بیزاری دُور کرنے اور ماہرینِ تعلیم کی خوشنودی کا باعث ہوں اور ہم بے خوف و خطر اپنی گاڑی کو منزلِ مقصود پر پہنچا سکیں۔ مگر ہماری تجاویز اُسی صورت میں مفید ہو سکتی ہیں، جبکہ ہم دنیا کی مانگ سے باخبر رہیں اور ہر عمر کے بچوں کے جذبات سے واقف۔

موجودہ نصاب کے ہوتے ہُوئے اسکول ٹائم میں مانگ سے باخبر رہنا اور بچوں کے جذبات سے واقفیت بہم پہنچانا اگرچہ ہے تو مشکل، لیکن جب ہمارے نصب العین کے ساتھ ساتھ ہمارا دلی انہماک اور سعی و کوشش ہونگے، تو ان مشکلات پر قابو پانا ہمارے لیے آسان ہو جائیگا۔ ہم ان مشکلات پر غالب آنے کے وسائل سوچیں گے اور سوچ بچار سے اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہمیں اوقاتِ فرصت سے استفادہ کرنا چاہیے۔

بنا بریں میں نے ۱۹۳۵ء میں ایک انجمنِ مشاغل (Hobbies Club) قائم کی۔ تاکہ بچوں میں اُن اوصاف کی بنیاد رکھی جا سکے، جن کا وجود قیمتی بننے کے لیے نہایت ضروری ہے اور ساتھ ساتھ ایسی خواہش پیدا کر دی جائے، جس سے وہ اپنے پوشیدہ جوہر کو چمکانے میں کوشاں نظر آئیں۔ یا یوں کہیے کہ ہمارا مدعا بچے کو کامل انسان بنانا ہے۔ جس کی صلاحیت اُس میں موجود ہے اور اُس کی تربیت ہمارا کام ہے۔ اس اہم کام میں کامیاب ہونے کے لیے درجِ ذیل مقاصد کو مدِ نظر رکھنا چاہیے، جن کو کلب ہذا بطریقِ احسن پورا کر دیتی ہے۔

مقاصد ۱- اوقاتِ فرصت کا بہترین استعمال۔ ۲- اپنی مدد آپ کرنا۔

۳- تعلیمی کمی پوری کرنا۔ ۴- صنعت و حرفت کی قدر و قیمت

۵- دیہات سدھار۔ ۶- قدرت سے محبت۔

۷- ہر حالت میں سچائی پر کاربند رہنا۔ ۸- پابندیٔ اوقات [illegible]

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون کون سے فطری اور اساسی اصول ہیں، جو اس انجمن کے قیام

ث ہیں :-

رجحان - بچے فطرتاً کوئی نہ کوئی شغل رکھتے ہیں، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ بچے کے گرد و
ایسی اشتغالی فضا پیدا کریں، جو اُس کی آئندہ زندگی کو کامیاب اور بامراد بنانے میں مددگار
یہ یاد رکھیے کہ ہر عمر اور ماحول کے بچوں کے مشاغل مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس
کی ہے کہ مشاغل مفید ہونے کے علاوہ بچوں کی عمر اور ماحول کے ایجابی تاثرات کا لحاظ رکھ کر
ن کیے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بچے کا رجحان کسی ایسے شغلے کی طرف ہو، جو آپ کے مروجہ
غل میں نہ ہو۔ مگر ہو وہ بھی مفید۔ تو اس صورت میں آپ کا فرض ہوگا کہ اُسے اُس کے پسندیدہ
سے باز رکھنے کے بجائے ایسے وسائل بہم پہنچائیں، جو اُس کی کامیابی اور کامرانی میں ممد و
کار ثابت ہوں۔ البتہ اگر بچہ کسی غیر مفید اور مخرب اخلاق مشغلے میں شغف رکھتا ہو، تو آپ کا پہلا
یہ ہے کہ اس کو موجودہ شغل سے باز رکھنے کی مناسب تدابیر عمل میں لائیں اور ساتھ ساتھ کسی مفید
میں اُس کی توجہ مبذول کریں۔ مثلاً اگر آپ کسی ایک بچے میں اپنے ہم مکتب طلبہ کو مارنے پیٹنے کا
ان دیکھیں، تو اُسے بڑھ چلنے اور دوسروں پر سبقت لے جانے کے شوق میں منتقل کرنے کی کوشش
یں یا اُسے مشکلات پر غالب آنے کے خیال میں تبدیل کریں۔

اس موقع پر ضروری ہے کہ بچے کے طبعی میلان اور جذبات کا ٹھیک اندازہ کرنے کے لیے
کے گھریلو حالات اور والدین کے خیالات سے واقفیت بہم پہنچائی جائے۔

زادی - ہر قول اور فعل میں آزادی بچے کا پیدائشی حق ہے۔ اس کے چھننے سے بچے پر پژمردگی اور
رونی طاری ہو جاتی ہے۔ ترقی رک جاتی ہے۔ تجربے کے لیے کسی بچے سے اس کا کھلونا چھین کر
یکھو اس لیے ضروری ہے کہ مشاغل کے انتخاب میں بھی وہ آزاد ہو۔ پھر جب بچہ رضا و رغبت کسی

مشغلے کا انتخاب کر کے کلب میں شامل ہو، تو اُس سے کلب کے مہتمم کے نام اقرار نامہ کی صورت میں ایک درخواست لی جائے، جو کلب کی فائل میں چسپاں رہے۔ درخواست کا فائدہ یہ کہ وہ اپنے مجوزہ مشغلے میں کامیاب ہونے کی حتی المقدور کوشش کریگا اور کلب کے لیے مفید رکن بن سکیگا۔ مگر یہ بات یاد رکھیے کہ بچوں اور بالغوں کی آزادی میں فرق ہے۔ اس لیے ابتدا میں ہمیں بچوں کی آزادی کا لحاظ رکھنا چاہیے اور اُسی کو آہستہ آہستہ آزادی کے صحیح مفہوم میں تبدیل کرنا چاہیئے۔

اشتراکِ عمل۔ یہ جذبہ بچوں میں عام طور پر دوسرے سال کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد انانیت کے غلبے سے تکبر اور خود پسندی پیدا ہوتے ہیں۔ اُس وقت بچوں میں ذمے داری کا احساس تو کم ہوتا ہے۔ مگر تمام بنیادی جذبات طاری ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جو بعد میں مناسب امتزاج سے پیچیدہ شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اشتراکِ عمل بھی انہی ابتدائی جذبات کے مناسب ادغام کا نتیجہ ہے، جو گیارہ بارہ سال سے زائد عمر کے انسانوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ چھوٹی عمر کے بچے جب چلنے پھرنے، کودنے پھاندنے کے اہل ہو جاتے ہیں، تو وہ اکثر اس جذبے سے مغلوب ہو جاتے ہیں جس کی عام مثال ہے کہ گھر کا اکیلا محافظ بچہ اپنے پسندیدہ لوازم سے دل بہلا رہا ہے، مگر اچانک کسی دوسرے شناسا بچے کی آواز گلی یا کوچے میں سن لیتا ہے اور اپنے گھر کے نفع و نقصان کو بالائے طاق رکھ کر اُس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اب وہ دونوں مل کر اپنا مشترکہ شغل جاری کرتے ہیں یا اپنے دوسرے ساتھیوں کی تلاش کرتے ہیں تاکہ اپنے مجوزہ شغل میں حظ اٹھا سکیں۔ مگر بڑی عمر کے انسانوں میں یہ بھی انتہائی صورتیں اختیار کر لیتا ہے، جس کا نتیجہ کلبوں اور انجمنوں کا قیام ہے۔ ہوبیز کلب کی اساس اسی جذبے پر ہے۔

انعام کا شوق۔ یہ ایک ایسا عالمگیر جذبہ ہے، جو ہر عمر کے انسانوں پر ہر وقت مسلط رہتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی کام کیا جاتا ہے، تو طبیعت اُس کا صلہ چاہتی ہے۔ یہی صلہ انعام کا شوق ہے جس کا

کام کو کام کی خاطر کرنا نہیں جانتے۔ اس جذبے سے نمایاں طور پر مغلوب نظر آیا کرتے ہیں۔
یے ضروری ہے کہ مشاغل میں حصّہ لینے اور دلچسپی قائم رکھنے کے لیے بچوں کو انعام کا شوق
ئے۔ مگر انعامات دیتے وقت خیال رکھا جائے کہ وہ نقدی کی صورت میں نہ ہوں۔ کیونکہ
یسے انعامات بچوں کی عادات خراب کرنے کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ اُن کے لیے تو آفرین یا
ش کہنا۔ جماعت میں درجہ بڑھانا۔ خوبصورت استعدادی نشان دینا یا تحریری سند
ی کافی ہے۔ ہوبیز کلب کے ممبروں کو اُن کی تیار کی ہوئی چیزیں بھی بطور انعام دی جا سکتی ہیں۔
ہ محسوس کریں کہ ہم نے اچھا کام کیا ہے۔ لیکن اگر مشاغل میں اشتیاق پیدا کرنے کے لیے
ذیل شکل کے فارموں پر عمل کیا جائے، تو نہایت خوشگوار نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔
ے متعلق میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ متواتر تین سال سے کامیاب ہو رہے ہیں۔
تے رہیں گے۔ بشرطیکہ حسب ضرورت تبدیلی ہوتی رہے۔ نمونہ فارم اور استعدادی نشانات ملاحظہ ہوں۔

استعدادی نشانات منجانب ۔۔۔۔ اسکول ۔۔۔ طالب علم ۔۔۔ جماعت ۔۔۔

نمونہ

تیرنے والا	گانے یا بجانے والا	صفائی والا	ہل چلانے والا

کبڈی کھیلنے والا	فٹ بال کھیلنے والا	ڈک ٹینس کھیلنے والا	ہاکی یا گلی کھیلنے والا	ڈرل کرنے والا

موڑ یا مٹی بنانے والا	سائیکل چلانے والا	جلد ساز	دکاندار	دستکاری سے پرکھنے والا	کاغذ یا مٹی کے کھلونے بنانے والا

ش خوان	خوش نویس	حساب دان	عام معلومات رکھنے والا	ریڈکراس سوسائٹی کا ممبر	رنگریز	کب یا اسکاؤٹ

طریقِ عمل۔ ان فارموں کو کمرے میں لگایا جائے۔ ہر ایک خانے میں چسپاں کرنے کے لیے مخصوص نشانات ہوں۔ طلبہ کسی مشغلے کا ہفتے وار امتحان مقررہ سلیبس کے مطابق دیا کریں۔ ممتحن کامیاب طلبہ کو اپنے دستخط کر کے نشانات استعدادی دے دیا کرے، جن کو وہ اپنے اپنے فارم پر چسپاں کریں۔ اس طرح سے ہر ایک بچے کی انفرادی ترقی کا مرقع تیار ہوتا رہیگا، جس سے والدین اور اُستاد بچے کے مذاق کا اندازہ کر سکیں گے اور کمزوری معلوم کر کے اُسے دور کرنے کا وسائل بہم پہنچا سکیں گے۔ اب ہم مشاغل لکھیں گے، جن کو رواج دیا جا سکتا ہے ۔ یہ چار شقوں میں منقسم ہیں :۔

۱۔ جسمانی مشاغل ۔ "تندرستی ہزار نعمت ہے" یہ ایک مشہور اور مقبولِ عام مقولہ ہے جس سے ہمارے ہم پیشہ بھائی علمی طور پر تو بخوبی واقف ہیں، مگر عملی طور سے بالکل بے بہرہ اور کورے ہیں۔ اسی سبب سے اُن کا تمام وقت کتابی علوم کی ٹھونس ٹھانس میں کٹ جاتا ہے، جس کے باعث بچے کا جسم سوکھ کر کانٹا بن جاتا ہے اور طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اس سنہرے اصول کو بھی بھلا بیٹھتے ہیں کہ صحیح دماغ صحیح جسم میں ہوتا ہے۔ ان کی بھول اور بے پروائی سے اکثر بچے اپنی عمر سے پہلے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو جاتے ہیں اور جو بچ جاتے ہیں، اُن کے لیے زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جسمانی مشاغل کا شوق پیدا کرنا ہمارا اوّلیں فرض ہے۔ ان سے بچوں کی صحت اور اخلاق بنتا ہے۔

اس لیے اگر اسکول ٹائم کے باقی گھنٹوں کی طرح ایک پیریڈ جسمانی کھیلوں یا پلے فار آل (Play for all) کا بھی شامل کر دیا جائے، تو نہایت مفید ہوگا۔ ذیل کے مشاغل میں سے چند ایک کو مقامی حالات کے مطابق جاری کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ٹی کھیلنا، اُونچی اور لمبی چھلانگیں لگانا، مگدر ہلانا، کشتی لڑنا، گتکا اور ونگہ بازی، پالا، چیچو، [illegible]

ال، کرکٹ، والی بال، ڈک ٹینس، رگر بیچ، رسے، پول اور درخت پر چڑھنا، سائیکل

، تیرنا وغیرہم۔

۔ تفریحی مشاغل۔ اگرچہ جسمانی، اخلاقی اور تمدنی مشاغل سے بھی تفریح ہوتی ہے لیکن اس
ے میں صرف وہ مشاغل ہیں، جن سے بچوں کی محض تفریح طبع مقصود ہے۔ مثلاً مختلف قسم
اٹ، پَر، سکے، تصاویر اور کتابیں جمع کرنا۔ رنگا رنگ پھول پھل اُگانا اور البم تیار کرنا،
و سیاحت کرنا، موسیقی کی انجمن بنانا اور وائرلیس کے ذریعے دل بہلانا وغیرہ۔

یہ تمام ایسے مشاغل ہیں، جو بچے کی واقفیت کا دائرہ وسیع کرتے ہیں۔ خوبصورتی کا
ق پیدا کرتے ہیں اور قدرت سے محبت بڑھاتے ہیں۔ نیز بچے کے فطری جذبات تقلید،
یق و تجسس اور اعجوبہ پسندی کو اُبھارنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

۔ اخلاقی مشاغل۔ ہماری تعلیم کا مقصدِ اولیٰ تربیتِ اخلاق ہے، جس سے ایک بچہ
انیت سے نکل کر انسانیت میں قدم رکھتا ہے اور ترقی کرتا ہوا خدا کی یگانگت میں داخل
ا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ بچوں میں ایسے مشاغل کی داغ بیل ڈالی جائے، جو اُن کو
م، ملنسار، راست باز، ہمدرد اور خدمت گزار بنا دیں۔ اس کے لیے اسکاؤٹنگ اور
راس اور دیہات سدھار کا کام دل خوش کن نتائج پیدا کریگا۔ ڈرامہ کرانا اور بدیف
یے کا کھیل کھلانے سے بچوں میں زبان پر حاوی ہونے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ شیریں
ی اور خندہ روئی سے پیش آنے کی صفات جاگزیں ہوتی ہیں۔

۔ تمدنی مشاغل۔ ہر شخص مدنی الطبع ہے اور اپنی قوتِ لایموت پیدا کرنے کے لیے مجبور ہے
جن کی ضروریات باہمی امداد یا اشتراک کے ذریعے پوری ہو جاتی ہیں، اس کی بہت
[illegible] کہ ان کو مفید [illegible]

ضروریات کی رغبت دلائی جائے تاکہ موجودہ تعلیمی سسٹم کی کمی پوری ہوسکے اور زمانۂ حال کی بڑھتی ہوئی بیکاری اور کساد بازاری کا انسداد ہو۔ کھجور کے پتّوں اور شہتوت کی شاخوں سے ٹوکریاں تیار کرنا، مونڈھے بنانا، جلدیں باندھنا، مٹی اور کاغذ کے کھلونے تیار کرنا، لکڑی کی اشیا تیار کرنا اور اُن پر خوش ساختہ رنگ کرنا، کپڑے سینا، صابون بنانا، کپڑے رنگنا، قلعی کرنا، جھاڑو، پنکھے اور پیٹیاں بنانا ایسے مشاغل ہیں، جن سے بچوں کے اوقاتِ فرصت بھی اچھی طرح گزر جائیں گے اور وہ اپنی مدد آپ کرنے کے قابل بنتے جائیں گے۔

مندرجہ بالا مشاغل یا اسی نوع کے دوسرے مشاغل میں حصّہ لینے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ انسان جو کچھ اپنے تجربے سے حاصل کرتا ہے، وہ اس کے کتابی علوم سے کہیں بہتر ہوتا ہے، جس کے متعلق مسٹر ایس، ایچ وڈ نے بھی کلب ہذا کے معائنے کے بعد لکھا تھا کہ "میں اس کلب کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے بچے بھی ولایت کے بچوں کی طرح ہاتھ سے کام کر کے سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہی تعلیم حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔"

ذیل میں، ہوبیز کلب مذکور کے کچھ اعداد و شمار دیے جاتے ہیں۔ شاید آپ کچھ استفادہ کر سکیں

سال	تعداد شعبہ جات	تعداد ممبران	آمدنی			آمدنی			منافع			کیفیت
			پائی	آنہ	روپے	پائی	آنہ	روپے	پائی	آنہ	روپے	
۱۹۳۵ء	۵	۱۳	۰	۴	۱	۰	۴	۱	۰	۰	۰	
۱۹۳۶ء	۱۰	۲۲	۳	۵	۵	۰	۲	۳	۳	۳	۲	نقد و سرمایہ
۱۹۳۷ء تا حال	۱۳	۳۵	۶	۸	۱۷	۶	۴	۶	۰	۴	۱۱	نقد و سرمایہ

مندرجہ بالا اعداد و شمار صرف اُن تمدنی مشاغل کے ہیں، جن پر کلب اس وقت کار بند ہے۔ دوسرے مشاغل کے لیے اعداد و شمار بہم پہنچانا ذرا مشکل ہے۔ اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے اگر اس قسم کی انجمنیں یا سوسائٹیاں جاری کر دی جائیں، تو ملک اور قوم کے سدھار کی کوشش ہو سکتی ہے۔

اشتہار

...ول کی ابتدائی جماعتوں میں موگا اردو ریڈرز کا استعمال کریں

اردو پڑھانے کے لیے یہ ٹریننگ اسکول فار ولیج ٹیچرز کا تیار کردہ کورس جس کی بنیاد جدید طریقۂ تعلیم پر رکھی گئی
بہت سے مدرسوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان ریڈرز کا پانچواں ایڈیشن ابھی چھپ کر تیار ہوا ہے۔
کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے اور انھیں پڑھائی کی طرف راغب کرنے کے لئے یہ ایک بے مثال کورس ہے۔
طریقۂ تعلیم سے وقت کی بچت ہوتی ہے اور یقیناً کامیابی ہوتی ہے۔ اس بات کا تجربہ ہو چکا ہے کہ اگر بچوں کو اس
ہنسے پڑھایا جائے، تو وہ خوشی و مسرت سے پڑھتے ہیں اور بہت جلد پڑھنا سیکھ لیتے ہیں +

ترمیم شدہ ایڈیشن

ائے مدرسین جماعت اول کی تصحیح ہو چکی ہے۔ اردو کے نئے ایڈیشن میں طریق الصوت میں کافی اضافہ کیا گیا ہے
اتذہ کے لئے مفصل ہدایات مندرج ہیں۔
پہلی جماعت میں اس کورس کا استعمال کرتے وقت مندرجۂ ذیل سامان کی ضرورت ہے :-
۔ استادوں کے لئے :-

(۱) رہنمائے مدرسین برائے جماعت اول { انگریزی ایڈیشن، حجم ۱۱۷ صفحے۔ گتے کی جلد۔ قیمت ۱۲ / اردو ایڈیشن، حجم ۱۸۴ صفحے۔ گتے کی جلد۔ قیمت ۱۲/ر
کتاب میں چارٹوں و دیگر کتب پڑھانے کی تیاری کے لئے سبق بہ سبق مفصل ہدایات دی گئی ہیں۔ انگریزی
یشن میں مہتممان (Supervisors) کی امداد کے لئے ایک باب شامل کیا گیا ہے +

(۲) پرائمر پڑھانے سے پیشتر استعمال کرنے کے لئے ۱۳ عدد چارٹ (اردو)۔ استاد ان چارٹوں کو رہنمائے
رسین میں دی ہوئی ہدایات کے مطابق خود تیار کر سکتا ہے یا چھپے ہوئے رنگدار ۱۳ عدد چارٹ بقیمت
روپے آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک منگوا سکتے ہیں۔

۔ بچوں کے لئے :-

(۱) (عملی کتاب) میری تصویروں کی کتاب (My Picture Book) حجم ۳۲ صفحے۔ قیمت ۱/ر
کتاب میں بہت سی تصاویر اور کئی ایک دلچسپ کھیل اور مشقیں دی گئی ہیں، جن کی مدد سے بچہ پرائمر کے لئے
الفاظ باسانی سیکھ لیتا ہے۔

(۲) (پرائمر) میری کہانیوں کی پہلی کتاب (My First Story Book) حجم ۴۲ صفحے۔ قیمت ۱/ر
اور کے ذریعے کہانیوں کی تشریح کی گئی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کو اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ بچے عام طور پر
وڑی سی مدد سے کہانیاں پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

(۳) (پہلی کتاب) جانوروں کی کہانیاں (Stories of Animals) حجم ۵۶ صفحے۔ قیمت ۲/ر
کتاب پہلے سال دوسری ششماہی میں پڑھائی جاتی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی ترتیب میں خاص احتیاط کی گئی ہے

(۴) جماعت اول کی لائبریریوں کے لئے امدادی کتب :-
لال مرغی (The Little Red Hens.) قیمت ایک آنہ
اس کے علاوہ بہت سی امدادی کتب ہیں جو پبلشرز سے مل سکتی ہیں۔

ملنے کا پتہ۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز مفید عام پریس۔ لاہور

جغرافیہ جدید ہندوستان

(اُردو)

از قاضی سعید الدین احمد صاحب ایم اے لکچرار جغرافیہ
مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

نمبر باب ۳۰۔ صفحات ۴۵۵۔ نقشے ۷۵۔ قیمت دو روپے

جغرافیہ کے جدید نظریہ کے مطابق ہندوستان پر نہایت جامع اور مفید کتاب ہے۔ نہایت وضاحت اور صاف زبان میں لکھی گئی ہے۔ ہندوستان کے جغرافیہ پر جدید۔ کارآمد اور مستند معلومات کا نہایت عمدہ ذخیرہ ہے۔ زود فہم بنانے کے لئے اعداد و شمار اور نقشے بہت کافی دئے گئے ہیں۔ ہائی اسکول کے طلبہ کے لئے نہایت ضروری اور بے بہا کتاب ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد امتحان میں کامیابی بالکل یقینی ہے ۔

ملنے کا پتہ:۔ **رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز۔ لاہور**

(نوٹ :۔ اس کتاب کا اُردو ایڈیشن تیار ہے۔ ہندی ایڈیشن پریس میں ہے)

یہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لئے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس کا مضمون حال ہی میں ورنیکلر فائنل
خان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لئے مخصوص ہوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر
امع کتاب نہ تھی۔ طلبہ کی اس دقت کا احساس کرتے ہوئے زر کثیر صرف کر کے مجوزہ سکیم
ن مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ بہ سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب
ہ جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے، جس کی عبارت نہایت سادہ اور
ں ہے اور ہر امر کو روزمرہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ
رسے واضح کیا گیا ہے اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے۔ سلسلہ ہذا طلبہ کے لیے ہر لحاظ سے
ہوگا۔ اس کے مطالعے سے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر
بان و دیگر سائنس کے مدرسین اصحاب اپنے مدارس میں جاری کرا کے جہاں ہمیں ممنون و
ر فرمائیں گے، وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبودی میں بھی خوشی محسوس کریں گے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت ۵ آنے ۴ پائی
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	″ ۵ ″ ۲ ″
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	″ ۷ ″ ۱۰ ″
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	″ ۱۴ ″ ۲ ″

مشتہران

ے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

اشتہار

آئینِ ادب

(رہبرِ اُردو)

برائے امیدواران امتحان ورنیکلر فائنل

۱- تقریباً ایک ہزار محاورات کا مطلب اور استعمال (فقرات و اشعار میں) واضح کیا گیا ہے +

۲ تصحیح اغلاط کے متعلق بیس مثالیں دے کر تقریباً سو (۱۰۰) غلط فقرات کو صحیح کرکے لکھا گیا ہے سلسلہ میں تذکیر و تانیث، ہجوں، خطوط، وحدت و جمع، ترکیب اور دیگر عام اغلاط کو علٰحدہ علٰحدہ بیان کرکے درست کر دیا گیا ہے +

۳- سو (۱۰۰) سے زیادہ نامکمل فقرات کو مکمل کرکے دکھایا گیا ہے اور یہ تمام فقرات اخلاقی نصائح پر مبنی ہیں +

۴- تذکیر و تانیث اور وحدت و جمع کے متعلق علٰحدہ باب قائم کرکے مکمل واقفیت دلائی گئی ہے +

۵- افعال لازم و متعدی اور معروف۔ مجہول کے متعلق ۱۰ مشقیں دے کر وضاحت کی گئی ہے +

۶- خاکہ سے کہانی لکھنے کا طریق سمجھایا گیا ہے اور ۱۰ کہانیوں کو خاکوں سے مکمل کر دیا گیا ہے +

۷- خط و کتابت کے متعلق ضروری ہدایات دے کر ۳۵ نمونے کے خطوط اور عرضیاں درج کی گئی ہیں +

۸- پرچہ ادب ورنیکلر فائنل کے ۴۰ موڈل پیپرز اخیر پر لگائے گئے ہیں +

۹- مشکل عبارت، اشعار اور نظم کا مطلب لکھنے کے متعلق مثالیں دے کر ہدایات دی گئی ہیں +

۱۰- ہندوستان کے بہترین شعرا اور ادیب حضرات کی نظم و نثر کے اقتباسات دئے گئے ہیں جنھیں پڑھ کر طالب علم اُردو کی مختلف طرزوں کو سمجھ سکتا ہے +

گویا یہ کتاب ۱۰ کتابوں کا مجموعہ ہے۔ اسے ایک ایسے ہیڈ ماسٹر نے لکھا ہے، جو اپنے امتحان میں پنجاب سے اوّل درجے پر رہ چکا ہے اور بیس سال سے اس کا کوئی شاگرد فیل نہیں ہوا۔ اس کتاب کے ہوتے ہوئے اُمیدواران ورنیکلر فائنل کو اُردو کی کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں +

حجم ۳۴۰ صفحے - کاغذ عمدہ - قیمت ۱۲ر۹ پائی

ناشر ــــ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب ملتان لاہور

اشتہار

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۶ر	۱۹	کام کی باتیں حصہ اوّل	۳ر۹ پائی
		۲۰	″ ″ ″ دوم	۲ر۳ ″
″ ″ دوسری	۷ر۴ پائی	۲۱	قصص ہند حصہ اوّل	۳ر۲ ″
″ ″ تیسری	۹ر۹ ″	۲۲	″ ″ دوم	۲ر۸ ″
پیاری کہانیاں اوّل	۶ر	۲۳	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
″ دوم	۵ر	۲۴	حسینہ اور وحشی	۱ر۵ پائی
″ سوم	۷ر	۲۵	شہزادہ مہربان	۲ر۶ ″
میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر	۲۶	راما سیتا	۱ر۱۰ ″
″ دوم	۳ر۷ پائی	۲۷	جادو کا مٹکا سسٹر لیلا رام	۳ر
″ سوم	۳ر۱۱ ″	۲۸	دروپدی	۱ر۸ ″
امرت کہانیاں نمبر۱	۲ر۹ ″	۲۹	مہاراجہ رنجیت سنگھ	۴ر۶ ″
″ نمبر۲	۳ر۱۰ ″	۳۰	خلیفہ ہارون الرشید	۴ر
″ نمبر۳	۵ر۲ ″	۳۱	راجہ اشوک	۵ر
انوار سہیلی کے انمول موتی حصہ ۱	۲ر۸ ″	۳۲	مہارانا پرتاپ	۲ر۱ پائی
		۳۳	شہاب الدین شاہجہان	۲ر۱۰ ″
″ ″ حصہ ۲	۴ر۱۰ ″	۳۴	شیر شاہ سوری	۲ر۱۱ ″
″ ″ حصہ ۳	۵ر۲ ″	۳۵	نصیر الدین ہمایوں	۲ر۱۰ ″
دلچسپ تاریخی کہانیاں		۳۶	اورنگ زیب عالمگیر	۲ر۹ ″
″ حصہ اوّل	۷ر۷ ″	۳۷	شہاب الدین غوری	۲ر۸ ″
″ ″ دوم	۸ر۱۱ ″	۳۸	سلطان علاؤالدین خلجی	۲ر۱۱ ″
″ ″ سوم	۷ر	۳۹	فیروز الدین تغلق	۲ر

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۰	نور الدین جہانگیر ...	۲ر۳ پائی
۴۱	امیر تیمور ...	۲ر۷ ″
۴۲	پرتھوی راج ...	۲ر۸ ″
۴۳	محمود غزنوی ...	۲ر۶ ″
۴۴	مصر کی داستان ...	۳ر
۴۵	جاپان کی کہانی ...	۴ر
۴۶	چین کی کہانی ...	۳ر۶ ″
۴۷	مستورات چین و جاپان ...	۴ر
۴۸	ایران کی کہانی ...	۲ر
۴۹	ایشیائی روم ...	۲ر۷ پائی
۵۰	ٹرکی (یورپی روم) ...	۲ر۷ ″
۵۱	لنکا ...	۱ر۱۱ ″
۵۲	بصرہ و بغداد ...	۵ر
۵۳	یونان ...	۲ر
۵۴	تین سوال ...	۲ر۷ پائی
۵۵	امرت ورشا ...	۳ر۱۰ ″
۵۶	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبر ۱ داؤد بادشاہ	۳ر۹ ″
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں حصۂ اول	۳ر۹ ″
۵۸	″ ″ دوم	۴ر۵ ″
۵۹	خوفناک خواب ...	۲ر
۶۰	ہیرا لال ...	۲ر۶ ″
۶۱	دولت کی پٹاری ...	۲ر۱ ″
۶۲	سادھو کی چلی ...	۲ر
۶۳	نیلا باز ...	۳ر۱۱ ″
۶۴	بہادر شہزادہ ...	[illegible] ″

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۶۵	جوتی موتی ...	۲ر۱۰ پائی
۶۶	جواہرات کا خزانہ ...	۳ر۷ ″
۶۷	چھوا اور سونا ہوا (باتصویر)	۲ر
۶۸	علی بابا چالیس چور ...	۴ر
۶۹	علاؤالدین و عجیب و غریب لیمپ	۴ر۶ پائی
۷۰	ملا دوپیازے کا سفر ...	۳ر
۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۷۲	نیشا پور کا سوداگر ...	۲ر۱۱ پائی
۷۳	پرستان کا موچی ...	۳ر
۷۴	سندر پیاری ...	۳ر
۷۵	چاندی کی کنجی ...	۳ر
۷۶	سلک جواہر نمبر ۱ (حکمرانی کا گر)	۲ر۶ ″
۷۷	″ ″ نمبر ۲ (اوج و پستی)	۱ر۶ ″
۷۸	″ ″ نمبر ۳ (شہید الفت)	۱ر۶ ″
۷۹	سلک جواہر ـ مرد میدان	۱ر۶ ″
۸۰	″ ″ نیک و بد	۱ر۹ ″
۸۱	″ ″ عیب و ہنر	۱ر۴ ″
۸۲	″ ″ جہاں گرد	۱ر۶ ″
۸۳	″ ″ جواب باصواب	۱ر۱۰ ″
۸۴	″ ″ سخاوت کی انتہا	۱ر۲ ″
۸۵	″ ″ حسن تدبیر	۱ر۶ ″
۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہریت ...	۱ر۳ ″
۸۷	ڈرامہ غم خوار عالم ...	۱ر[illegible] ″
۸۸	مہاراجہ بکرماجیت اور اس کا تخت ...	[illegible] ″

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

جلد (۵) دسمبر ۱۹۳۸ء نمبر (۹)

فہرستِ مضامین

ایڈیٹوریل		۱
موزونی طریقِ تعلیم	شیخ خادم محی الدین	۶
کھیل کھیل میں تعلیم	سردار موہن سنگھ	۱۶
کھیل اور تصوّر	میرزا مقبول بیگ	۲۴
بچوں کی تعلیم (سقراط کی نظریں)	چوہدری نذیر احمد	۳۷
تعلیم کی تحریک جدید کی تاریخی شخصیتیں	بشیر احمد ڈار	۵۲

اور اگر اخلاقِ حسنہ کی رغبت میں رشک پیدا کیا جا سکے، تو بہت ہی اچھا ہے، لیکن طلبہ بالکل نہ سمجھ سکیں کہ اُستاد ایسا کر رہا ہے۔ اُن پر یہ حقیقت عیاں نہ ہو، ورنہ تمام کوشش رائیگاں سمجھیے۔ اس کے علاوہ اگر ایسے شوخ بچوں کو کچھ ذمّے داری کا کام سپرد کر دیا جائے، مثلاً مانیٹری وغیرہ تو اُن پر بہت ہی اچھا اثر پیدا ہوتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ لڑکے ایسے ہی ہوں، تو اُن کو مختلف کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کلاس لائبریری کا انچارج، جماعت کو کمرے سے باہر لیجانے اور لانے کا انچارج وغیرہ وغیرہ۔

مسٹر شکلا نے یہ باتیں بڑے اطمینان سے سُنیں، لیکن اُن کی پوری تسلی نہ ہوئی اور کہنے لگے۔ صاحب آپ بالکل بجا فرماتے ہیں، لیکن میرا مقصد ابھی تک حل نہیں ہُوا۔ سوال تو یہ ہے کہ اگر طالب علم گستاخی کر ہی دے، تو پھر اس کا علاج کیا ہے۔ کیا سزا اس کا علاج نہیں؟

ہیڈ ماسٹر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے کہ سزا کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ سزا آخری حربہ ہے۔ اگر اس کا کوئی اور حل نکل سکے، تو سزا ضروری نہیں۔ سزا سے پہلے جرم کی نوعیّت کا مطالعہ ضروری ہے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ اُستاد اپنی غلطی سے طالب علم کو گستاخی پر آمادہ کر دے۔ مثلاً اس طرح کہ ایسی مذہبی گفتگو شروع کر دے، جس سے طالب علم کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہو یا ایسے فحش مذاق طلبہ سے شروع کر دے، جو جواب میں طلبہ کو اُستاد سے مذاق کرنے پر آمادہ کرلیں۔ یا اُستاد طلبہ سے بالکل بے تکلّف ہو کر بچّوں کی سی باتوں میں لگ جائے یا طلبہ سے زیادہ کُھل جائے، یا اُن سے معاملات میں خواہ مخواہ استدلال شروع کر دے یا بعید از عقل باتوں کو اپنی سینہ زوری سے منوانے کی کوشش کرے یا اُن کو اپنے کام میں اپنی نالائقی کا ثبوت دیدے۔ غرض کہ ایسی بہت سی باتیں ہیں، جن سے اُستاد طلبہ کو مدِمقابل بنا لیتا ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ اُستاد اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش کرے۔ طالب علم کو خواہ مخواہ سزا نہ دی جائے، بلکہ طالب علم

وتلاش کا انحصار دلیل کے ساتھ ساتھ مشاہدے اور تجربے پر رکھ دیا۔ یہ تحقیق وتلاش موجودہ علم انسانی اور سائنس کا بنیادی پتھر ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج کسی قسم کا استبداد آنے والی نسلوں کو منظور نہیں۔ وہ ہر چیز میں "کیوں" اور "کس طرح" کو ضروری سمجھتی ہیں۔ البتہ یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں کہ اکثر اوقات یہ جذبہ تحقیق غیر ذمے دار ہو جاتا ہے۔ اس غیر ذمہ دارا کو گستاخی اور بغاوت سمجھنا درست نہیں۔ پرانے لوگوں کو یہ چاہیے کہ اس جذبے کو غیر ذمے دا نہ ہونے دیں۔ گستاخی اور بغاوت خود بخود کم ہو جائیگی اور ہمارے نوجوانوں کی عام زندگی، اُن کے رسم ورواج، اُن کے اطوار حتیٰ کہ اُن کا ہر سماجی فعل مفید سے مفید تر بن جائیگا۔

اس تحقیق وتلاش، اس چون وچرا کے علاوہ ایک دوسرا عنصر نوع انسانی کے دماغ اور غور وفکر کی تشکیل میں کارفرما ہے۔ مشین کی ایجاد نے انسانی محنت کی تکلیفوں کو بہت کم کر دیا ہے۔ موجودہ دور مشینوں اور کارخانوں کا دور ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان پر اپنے گردو پیش کا بہت اثر پڑتا ہے۔ پہلے انسان مجبور تھا۔ اُس کی نگاہوں میں ہر وہ قوت جو جبر کر سکتی تھی دیوتا بن جاتی تھی۔ توہمات کا انبار لگتا جا رہا تھا۔ مثلاً بجلی کو لیجیے، یہ صرف ہمارے خرمنوں کو جلا دیتی تھی۔ ہم پر اور ہمارے جانوروں پر گر کر خاک سیاہ کر دیتی تھی۔ اب یہ بجلی ہماری غلام ہے۔ ہمارے گھروں کو منور کرتی ہے۔ ہماری کلیں چلاتی ہے۔ ہم حاکم ہیں یہ محکوم ہے۔ ہم اس سے ڈرتے نہیں، بلکہ اس سے خدمت لیتے ہیں۔ اسی طرح زندگی کے ہر شعبے میں وہ چیزیں، جن سے ہم ڈرتے تھے اب ہماری مطیع ہیں، یعنی قیاسی اور وہمی طور پر نہیں، بلکہ تجربے اور مشاہدے سے ہم ہر چیز کی پرکھ کرتے ہیں۔ اس کا ایک ظاہر نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہر چیز پر چون وچرا کرتے ہیں اور جب چون چرا دماغ کی سرشت اور عادت میں داخل ہو جائے، تو ظاہر ہے کہ سماج کے افعال اور سماج کے طور طریقوں پر بھی نکتہ چینی ہو۔ اس نکتہ چینی کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہر ایماندار آدمی اپنے عمل کو اپنے

طابق بنا ڈالے۔ خود فکر اور پرکھ کا نتیجہ اگر سچائی پر مبنی ہے، تو ظاہر ہے کہ اس سلسلے
ند ہونے والے افعال مذموم اور برے نہیں ہو سکتے۔ اور کوئی چیز صرف اس لیے تنقید اور
سے نہیں بچ سکتی کہ ایک صدی پہلے وہ قابل اعتبار تھی۔

اس زمانے میں مشین کے استعمال سے سماج پر اور بہت سے اثرات بھی پڑے ہیں۔
مثال لیجیے۔ پہلے ہر گاؤں اور قصبہ بذات خود ایک مکمل آبادی ہوتی تھی، جو اپنی ضروریات کی
س خود کفیل ہو جاتی تھی۔ جولاہا کپڑا بنتا تھا۔ موچی جوتا بناتا تھا۔ کسان جنس پیدا کرتا تھا۔
ہر ضرورت گاؤں کی گاؤں ہی میں پوری ہو جاتی تھی۔ دولتمندوں اور رئیسوں کی رہائش
ں میں ہوتی تھی، تو شہر ان کی ضروریاتِ زندگی، حتیٰ کہ اسباب عیش کی فراہمی کے لیے بھی
ے۔ اب ہندوستان کی روئی گاؤں گاؤں سے کھنچ کر سیکڑوں میل دور شہروں میں جاتی
وہاں کاتی جاتی ہے۔ ہزاروں میل دور جہازوں کے ذریعہ غیر ممالک میں جاتی ہے، وہاں
تا ہے۔ پھر ہزاروں میل دور جہازوں اور ریل کے ذریعہ وہ کپڑا آجاتا اور بکتا ہے۔ گاؤں والا
پر اور شہری گاؤں والے پر منحصر ہے۔ ریل، جہاز اور ہوائی جہاز نے فاصلے کم کر دیے ہیں۔
فر گھٹا دی ہے۔ مہینوں کی راہ گھنٹوں کی رہ گئی ہے۔ تار برقی سے پلوں میں ادھر کی بات
چ جاتی ہے۔ اس سب کا نتیجہ ظاہر ہے۔ گاؤں اور خاندان کے بندھن پہلے کی طرح
ط نہیں رہے۔ انسان کا تعلق انسان سے ہو گیا ہے۔ فرد اور اس کی شخصیت کی اہمیت کم
ا رہی ہے۔ جماعت اور سماج کا اقتدار بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں فرد کا تعلق
ج سے وہ ہے، جو پہلے خاندان سے تھا۔ یگانگی کم اور یگانگت زیادہ ہوتی چلی جا رہی
کون کہہ سکتا ہے کہ تمام دنیا ایک خاندان نہ ہو جائیگی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ سماج کا انتظام مکمل نہیں۔ مذہبی عناد، قومی رنجشیں، نسل و رنگ

کا امتیاز ابھی باقی ہے۔ یہ فساد کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اس سے بے انتہا تباہ کار جنگ کا بھی خوف لگا رہتا ہے۔ لیکن یہ بات تو پانچ آدمیوں کے کنبے میں بھی موجود تھی۔ خاندانوں کی کشمکشیں قبیلوں کی رقابتیں پہلے بھی موجود تھیں اور اب بھی ہیں۔ پھر اگر قوموں میں یہ کشمکشیں اور بدگمانیاں موجود ہیں، تو کچھ عجیب نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ اس قدر کم ہیں اور زیادہ نہیں۔

اس تحقیق و تلاش اور چون و چرا کا ایک اور مظاہرہ بھی دیکھ لیجیے۔ مختصراً میں اُسے جمہوریت کہوں گا۔ ایک زمانہ تھا کہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ ہوتا تھا۔ اس کا اقتدار اس کی شخصیت میں خواہ وہ کتنی ہی ناکارہ کیوں نہ ہو، مضمر ہوتا تھا۔ اب سماج خود بادشاہ ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق کبھی اور کہیں کہیں کسی بادشاہ کی اولاد کو نمائش کے لیے بادشاہ مان لیتی ہے اور اکثر جگہ اسے تخت سے ہٹا دیتی ہے۔ اس کا تاج چھین لیتی ہے اور بادشاہت کی نمائشی ضرورت کو بھی نہیں مانتی۔ جنگِ عظیم کے بعد جمہور میں ایک زلزلہ آیا۔ بڑے بڑے تخت اور تاج اس زلزلے میں گر گئے۔ ان تختوں پر بیٹھنے والے اور ان تاجوں کے پہننے والے اپنے تاج و تخت کے ساتھ نیست و نابود ہو گئے۔ سماج کا یہ اعلانِ بادشاہی افراد کی متفقہ رائے کا نتیجہ تھا۔ اب یہی افراد کی متفقہ رائے استبداد کی بیخ کنی پر آمادہ ہے۔ خود اپنے پرانے رسم و رواج اور اُس کے نظام کو حسب ضرورت بدل دینا چاہتی ہے۔

مختصراً یوں سمجھیے۔ اوّل آج ہم کسی چیز کو بغیر تجربہ اور مشاہدے کئے منظور کرنے کو تیار نہیں۔ غور و فکر اور چون و چرا سماج کا شیوہ ہو گیا ہے۔ رسم و رواج کی قدامت ان کی خوبی کی دلیل نہیں مانی جا سکتی۔ دوئم سائنس نے مشین ایجاد کی اور مشین نے ہمیں ان چیزوں پر اقتدار بخش دیا۔ جن سے ہم پہلے ڈرا کرتے تھے اور جن کی ہم پوجا کیا کرتے تھے۔ اس لیے ہم میں ایک احساس قوت پیدا ہو گیا ہے، جو مذہب کو توہمات سے پاک کرنے پر تلا ہوا ہے۔ سوئم

بنی نوع انسان میں تعلقات باہمی بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ نام نہاد بزرگی اور برتری کا استبداد ممکن نہیں۔ اب جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ اس لیے پرانے رسم و رواج بھی تنقید اور نکتہ چینی سے نہیں بچ سکتے۔

ان تین اثرات کا نتیجہ ہے کہ موجودہ نسل ہر چیز پر ایمانداری سے معترض ہو اور حسب ضرورت پرانے رسم و رواج میں تبدیلیاں پیدا کر دے۔ دوسری طرف پرانے دور کے اشخاص اپنے زمانے کی تعریف و توصیف کرنے سے باز نہیں رہ سکتے اور گئے گزرے زمانے کا نوحہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر اُٹھتے ہوئے قدم پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن اس لیے نہیں کہ تجربہ و مشاہدہ نئی چیزوں کے خلاف ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ نئی چیزیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں میں اختلاف ہے۔

البتہ یہ امر واقع ہے کہ زندگی ایک مسلسل جاری رہنے والا دریا ہے کہ جس کا مخرج اور منبع معلوم نہیں۔ چیزیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں اور شاید بقول علامہ اقبال ؎

مغاں ز دانۂ انگور آب مے سازند
ستارہ مے شکنند آفتاب مے سازند

موزونی طریقِ تعلیم

از

شیخ خادم محی الدین لیکچرر، سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

نئی تعلیم جن گوناگوں مظاہر میں جلوہ گر ہو رہی ہے، وہ تعلیم یافتہ حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ ڈالٹن اور مانٹیسوری طرزِ تعلیم، منصوبی طریق، یعنی پراجکٹ میتھڈ، کھیل کے ذریعے تعلیم، بازیچۂ اطفال یا کنڈرگارٹن۔ ان سب کے علاوہ جسمانی اور ذہنی تربیت کا ایک نیا طریق گزشتہ پندرہ سال سے یورپ میں رائج ہے، جسے اصطلاح میں یُورِتھمکس (Eurhythmics) یا موزونی طریق کہتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم موزونیات پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

اس طریق تعلیم کا موجد ایک فرانسیسی معلمِ موسیقی موسیو ژاک والکروز (M. Jacques-Dalcroze) ہے۔ موزونی طریق کی مختصر اور معین تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے کہ یہ موسیقی کے ذریعے جسمانی اور ذہنی تربیت کا ایک آلہ ہے۔ لیکن یہ طریق اُس ڈرل سے، جو بینڈ باجے کے ذریعے ہمارے مدارس میں کرائی جاتی ہے کہیں مختلف ہے۔ تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر بیان کی جائیگی۔ یہاں مختصراً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ طریق، قدیم یونانی طریقِ تعلیم کا بازیافتہ اسرار ہے۔ یونانیوں کی تعلیم کا مقولہ یہ تھا کہ جسم کے لئے کسرت یعنی جمناسٹک اور روح کے لیے موسیقی کو آلۂ کار بناؤ۔" موسیقی کے لفظ سے وہ محض گانا بجانا ہی مراد نہ لیتے تھے بلکہ وسیع معنوں میں اس لفظ کا اطلاق جملہ علوم و فنونِ لطیفہ مثلاً شاعری، نقاشی، بت تراشی، تواریخ، علم ادب اور فلسفہ وغیرہ پر بھی ہوتا تھا۔ موزونی طریق میں جسمانی تربیت کا درجہ سب سے آخر میں آتا ہے۔

کیونکہ اگرچہ جسمانی مشقوں کے ذریعے جو اس طریق میں شامل کی گئی ہیں بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ تاہم یہ مشقیں اُس اعلیٰ جسمانی تربیت کے رتبے تک نہیں پہنچ سکتی ہیں، جو سویڈن کی رائج کردہ ڈرل کو حاصل ہے۔ البتہ اس ڈرل اور موزونیت کے ملاپ سے بچے کی جسمانی نشوونما بہترین طور پر کی جا سکتی ہے۔

موزونی طرزِ تعلیم میں لَے کو بہت زیادہ دخل دیا گیا ہے۔ لے ایک قدرتی طاقت ہے جو ہمارے تمام ارادی افعال میں جاری وساری ہے۔ یہ افعال کو دہراتی، باہم ملاتی اور انہیں زندگی بخشتی ہے۔ موسیقی کے فن میں لے، ایک قدرتی حرکت ہے، جو کسی الحانی یا سازی گیت میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پائی جاتی ہے۔ لَے کے تصور میں وقتی پابندی اور لت، دو لازمی اجزا ہیں۔ یہی اجزا آپ کو کسی دلکش تصویر یا نظم میں محسوس ہونگے، جو مل کر کسی ل منتہیٰ تک پہنچتے ہیں۔ لے کو وقتی حرکت کہنا بجا ہے۔ یہ حرکت مسلسل اور پیہم ہوتی ہے، جسے وقت کی پابندی کے ساتھ دہرایا بھی جا سکتا ہے۔ لَے کی تعلیم سے یہ مراد ہے کہ آپ بچوں کے فطری میلانات یا ان کے فطری قوا کو ایک منضبط قوتِ ارادی کے ماتحت رکھ کر کام میں لانا چاہتے ہیں۔ اس طریق سے نظامِ عصبی کی تربیت سلیقے کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی بچے کی قوتِ تخیل ترقی کر سکتی ہے۔

اگر موزونی طریق کو موسیقی سکھاتے وقت کام میں لایا جائے، تو یہ طریق بے مثل ہے کیونکہ اس کی مدد سے بچوں کو اس فن کی مبادیات، مثلاً مختلف اقسام کے سُروں اور ان کے مقررہ عرصوں کا بخوبی علم ہونے لگتا ہے ساتھ ہی وہ ان سُروں کو حرکاتِ جسمانی کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں لیکن اس طریق سے موسیقی کا جو علم ان کو حاصل ہوتا ہے، اس میں ایک اور چیز کا اضافہ ہوتا ہے یعنی بچے موسیقی کی تحلیل کر سکتے ہیں۔ کسی سادہ گیت کو ساز پر سُن کر اُس کی

ئے خود بخود دریافت کرنے لگتے ہیں اور اس کے سُروں کی اقسام کو بھی شناخت کر لیتے ہیں چھوٹے
بچوں کا خود بخود اُس لَے یا پابندئ ضربات کو کسی گانے میں محسوس کر لینا، جس کے اندر اُس
گیت کو ڈھالا گیا ہو اور ساتھ ہی سُر کی اقسام اور خاص خاص مقامات کو دریافت کر لینا، جہاں
وہ سُر واقع ہوتے ہوں، کوئی معمولی درجے کی کامیابی نہ سمجھنا چاہیئے۔ ایسی حالت میں موسیقی
محض آوازوں کے ایک سلسلے کے بجائے زیادہ پُرمعنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کی ہیئت
اور لَے کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ان دروازوں میں داخل ہو کر انھیں پہلی مرتبہ موسیقیانہ
اظہار کی لطافت کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ موزونی طریق بچّے سے بڑی حد تک ذہنی عمل کی توقع
رکھتا ہے۔ اگر وہ بے توجہ ہو جائے یا لاپروائی اختیار کرے، تو موزونی مشقوں کا کرنا اس کے
لیے ناممکن ہو جائیگا۔ تاوقتیکہ ہر بچّہ اس بات میں انفرادی طور پر ذہنی کوشش نہ کرے، یہ
مشقیں ناکام ثابت ہونگی۔ اس لیے کہ جماعت کے لڑکے اس قسم کی ڈرل کرتے وقت، ایک
دوسرے کی نقل نہیں اتار سکتے۔ کیونکہ ہر ایک کی حرکت انفرادی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دماغ
کے عصبی مراکز کے ساتھ اعضا کی حرکت کا ایسا سریع اور سلسلے وار جوڑ ملا کر ان کی تربیت اور مشق
کرائی جاتی ہے کہ خیال اور عمل بیک وقت ایک دوسرے کی پیروی کرتے ہیں۔ اس طریق کا موجد
خود بتاتا ہے کہ اس کا پہلا مدّعا یہ ہے کہ لَے کی مدد سے دماغ اور جسم کے مابین ربط اور لگاؤ کی
ایک چست اور باقاعدہ رَو قائم کر دی جائے۔" اس طریق کا نفسیاتی فائدہ اس امر میں پایا جاتا ہے
کہ یہ ادراک بالواسطہ اور قوتِ اظہار کی تربیت کر کے قدرتی جذبات کو بیرونی شکل میں لے آتا ہے۔
اس ضمن میں حضرتِ موجد کی تصنیف "یورِتھمکس" کے صفحہ ۴۸ پر مندرجہ ذیل الفاظ ثبت ہیں، جن کا
ترجمہ حسبِ ذیل ہے:۔

"موزونی ورزش کے اسباق بچوں کے دوسرے مضامین کے اسباق یاد کرنے میں

مد ہوتے ہیں۔ کیونکہ میرے طریق کی مشقیں مشاہدہ، تحلیل، حافظہ اور تخیل کی قوتوں کی نشوونما کرتی ہیں اور اس طریق سے وہ اپنے طرزِ عمل میں زیادہ چوکس اور باترتیب ہونے لگتے ہیں۔

موزونی تربیت کا اثر، مدرسے کے انضباطِ اوقات اور اُس کی عام زندگی پر ایسا ہی پڑتا ہے، جیسے کسی عمارت کو سردی کے موسم میں گرم پانی کی نلکیوں کے ذریعے گرمایا جائے۔ عمارت کا ہر کمرہ اور گوشہ گوشہ یکساں طور پر اس حرارت کو اخذ کرنے لگیگا۔ چنانچہ دوسرے مضامین کے اساتذہ کو معلوم ہو جائیگا کہ موزونی طریق سے تربیت یافتہ طلبہ ان کے اسباق کو زیادہ ذوق و شوق، چستی اور توجہ سے حاصل کر رہے ہیں۔ بمقابلہ اُن طلبہ کے جنھیں موزونی طریق کی تربیت نہیں دیگئی ہے۔"

اس سلسلے میں سر مائیکل سیڈلر (Sir Michael Sadler) یوں رقمطراز ہیں:-

"تربیت کا یہ طریق، صناعی اور ذہنی اثرات کا مجموعہ ہے اور غایت درجے کے تعلیمی اثرات سے لبریز ہے۔ چھوٹے بچوں کے حق میں اس کی تعلیمی قدر و قیمت اور ان کی ضروریات میں اس طریق کا استعمال، مشقوں سے اُن کا لطف اندوز ہونا، یہ ایسی چیزیں ہیں، جو قطعی طور پر درست ثابت ہو چکی ہیں۔"

مدرسے کے کام میں موزونی طریق کا استعمال

اس طریق کے ذریعے نظم خوانی کو بہت سی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ کوئی نظم پڑھتے وقت سب اس کے وزن یا بحر کو کسی جسمانی حرکت (جیسے تالی بجانا) کے ذریعے ظاہر کر سکتے ہیں۔ جب نظم کا بحر سمجھ میں آجائے، تو اُس کا زبانی حفظ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

جن مدارس میں موزونی طریق کو دخل دیا جاتا ہے، وہاں طلبہ کا حاضری، ڈرل وغیرہ کے موقع پر مارچنگ کرنا ذرا بھی ابتری کا باعث نہیں ہوتا، بلکہ وہ زیادہ منظم صورت اختیار کر لیتا ہے، خواہ اس کا ساتھ بینڈ باجے کے ذریعے دیا جائے یا نہیں اور نہ لیفٹ رائٹ

(Left, right) کا حکم دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔
اکثر انگریزی مدارس میں موسیقی بطور درسی مضمون پڑھائی جاتی ہے۔اس کی تحصیل کے دوران میں گیتوں کو زبانی حفظ کرنا پڑتا ہے۔موزونی طریق کی مدد سے یہ گیت بآسانی ازبر ہو جاتے ہیں۔

مارچنگ

موزونی طریق کی بنیاد مارچنگ پر رکھی گئی ہے۔اس لیے مارچنگ سکھاتے وقت بہت سی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔اوّل تو یہ کہ بچوں کی حرکات میں کسی قسم کا بے ڈھنگا پن یا کاہلی نہ ہو۔ دوسرے بائیں پاؤں کے ذریعے بینڈ کے سُروں کے کسی خاص مقام کو ضربِ خاص یعنی (Accent) کے ذریعے واضح کرنا چاہیے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس ضرب کو مبالغہ کے ساتھ ظاہر کیا جائے، بلکہ پاؤں کا قدرے دباؤ دے کر آہٹ پیدا کی جائے۔حرکات کے اس سلسلے کے دوران میں نہ تو بچے ایک دوسرے کی ضربات کی نقل اتاریں اور نہ زور زور سے پاؤں کو زمین پر ماریں، بلکہ بینڈ کی راگنی سے متاثر ہو کر اس کا انفرادی اظہار پاؤں کی حرکات سے مارچنگ کے دوران میں کریں۔بچوں کو بار بار یہ تاکید مت کرو کہ "اپنے قدم ملاؤ" کیونکہ جب وہ ضربِ خاص کی تمیز عام ضربات سے کرنے لگیں گے، تو ان کے پاؤں خود بخود مل جائیں گے۔
بچوں کو بلا کسی قسم کی تکلیف یا تصنع کے قدرتی حالت میں کھڑے رہنا چاہیے۔ان کے جسم دائیں بائیں حرکت کیے بغیر مارچنگ کو خوبصورتی کے ساتھ قائم رکھیں، تو مناسب ہے۔
جب مارچ کرنے کی لَے یعنی رفتار کم ہو، تو پاؤں کو اچھی طرح اوپر اٹھا کر اور انگوٹھے نیچے جھکا کر زمین پر مارنا چاہییں اور جوں جوں رفتار تیز ہوتی جائے۔پاؤں اُوپر کی طرف زیادہ نہیں اُٹھنے چاہییں۔

بعد کی مشقوں میں، ضربِ خاص کو دائیں اور بائیں دونوں پاؤں کے ذریعے واضح کرنا
ہیے۔ اس قدر بیان کرنے کے بعد یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ اب تک جو صورت مارچنگ نے
ختیار کی، وہ لے کے ایک ایسے انداز کے ذریعے فرض کی گئی ہے، جس کو اصطلاح میں ۴/۴ کا عرصہ
ما جاتا ہے۔ اس کسر کا مطلب یہ ہے کہ شمار کنندہ چار سُروں اور ان کی مقررہ چار ضربات کو ظاہر
لتا ہے۔ ان سُروں کو "وَن، ٹُو، تھری، فور" (ایک، دو، تین، چار) یا لیفٹ، رائٹ، لیفٹ،
رائٹ" کہہ کر یا کسی گیت کے چار سُر یکے بعد دیگرے، یکساں عرصے کے تفاوت سے گا کر واضح
کیا جائے۔ اسی کسر کا نسب نما بھی چار کا ہندسہ ہے اور یہ سُر کی قسم بتاتا ہے، جس پر وقت کے
لحاظ سے قیام کرنا چاہیے۔ اس کسر میں سُر کی قسم کو حساب کی رُو سے چوتھائی سُر کہا جائے گا،
جسے مغربی موسیقی کی اصطلاح میں کروچیٹ (Crotchet) یا ہندی تال کی اصطلاح
میں ماترا کہتے ہیں۔ اسے تال یا لے کی اکائی تصور کیا جاتا ہے۔ چونکہ سب قسم کی تالیں ماترے سے
بنائی گئی ہیں۔ اس لیے ماترا موسیقی یا موزونی طریق کا نہایت ضروری جزو سمجھا گیا ہے۔ ماترا
ہندی حرفِ متحرک معہ ایک ساکن کے (مثلاً تا) اتنی دیر میں ادا کیا جاتا ہے کہ تندرست آدمی
کی نبض ایک حرکت اور ایک سکون کرے۔ ماترے ہی سے نصف، مکمل، تہائی وغیرہ مختلف
سُر مع ان کے قیام کے بنا لیے جاتے ہیں۔[1]

اب مارچنگ کی دوسری منزل ۳/۴ کے انداز سے شروع کی جائے۔ اس کا یہ مطلب ہے
کہ یعنی تین سُروں اور ماتروں کے جداگانہ مگر مسلسل ٹکڑوں کو جن سے کوئی گیت مرتب کیا گیا ہو، بنا
پڑھا کر مارچ کرایا جائے۔ مارچنگ کو یکساں رنگ میں قائم رکھنے اور ساتھ ہی اس مشق کو خوبصورت

---

[1] مزید تفصیل درکار ہو، تو کتاب "راگ سکھشا" حصہ اول مصنفہ خاکسار کا صفحہ ۲۸، متعلقہ سبق نمبر
ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کتاب قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، لاہور سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

کے ساتھ ادا کرنے کی غرض سے، تمام جماعت پہلے ماترے پر بائیں پاؤں ہی سے ضربِ خاص کو واضح کرے۔ لیکن اس مشق کا مدعا یہ نہیں کہ طلبہ کو فقط قدم ملانا ہی سکھایا جائے، بلکہ اصل مقصد اس کا یہ ہے کہ بچوں کو لَے کا تصور دلایا جائے۔

اس سے اگلی مشق کا مدعا یہ ہوگا کہ بچوں کو توجہ قائم کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ معمولی مارچ کی رفتار سے لے کر، بتدریج لَے کو بڑھایا اور پھر بتدریج گھٹایا جائے اور اسی کے ساتھ پاؤں کے دباؤ سے ضربِ خاص کو واضح کرایا جائے۔ یہ ضرب عموماً پہلے ماترے پر لگائی جاتی ہے۔

اس مشق کے بعد چند مشقیں مارچنگ کرانے کی ایسی ہیں، جن میں تال کی علامت ۲/۴ ، ۳/۴ ، ۴/۴ ، ۵/۴ ، ۶/۴ سلسلے وار رکھی گئی ہیں۔ ہر مشق میں ضربِ خاص پر پوری توجہ کرنی چاہیے۔ رفتار کو بتدریج یہاں تک بڑھاتے جانا چاہیے کہ مارچنگ دوڑ کی شکل اختیار کرلے۔ لیکن یہ دوڑ بے قاعدہ نہ ہو، بلکہ ہمیشہ منظّم صورت میں رہے، یعنی قابو میں رکھی جائے اور اس کی ترکیب ایک ہی ہے کہ بچے ضربِ خاص کا خیال رکھیں اور تیز رفتار میں بھی اسے واضح کرتے جائیں۔

گیت کا کوئی ٹکڑا، جس میں ماتروں کے شمار کی قید ہو، موسیقی کی اصطلاح میں بار (Bar) کہلاتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان کی ہوئی کسروں سے واضح ہے۔ جس طرح مارچنگ کے دوران میں پاؤں کی ایک ضرب کو ضربِ خاص کہا گیا ہے، اسی طرح کسی بار کا ایک خاص سُر ضربِ خاص کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مشقوں کے بعد اب بچے اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ خاص سُر کو دوسرے سُروں سے شناخت کرسکیں۔ اس لیے اب باقی ماندہ مشقوں کے دوران میں جماعت کو مارچنگ کی لَے کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا

چاہیے بلکہ بینڈ پر دو چار باریں بجا لینے سے معلوم ہو جائیگا کہ بچے ان کی لَے کو اخذ کر گئے ہیں یا نہیں۔ ان کی جسمانی حرکات سے پتہ چل جائیگا کہ وہ مارچنگ کے لیے تیار ہیں۔

اب ایک زیادہ مشکل مشق کرائی جائے۔ یعنی جب بچے خاص سُر کو شناخت کرنے لگیں تو چند مخلوط تانوں کے سُروں کو بجایا جائے۔ مثلاً مارچنگ شروع ہونے سے پہلے حکم دیا جائے کہ وہ ۲/۴ کی لَے سے شروع کریں۔ پھر حکم ملنے پر اپنی حرکات کو ۳/۴ کی لَے میں تبدیل کریں اور آخر میں پھر ۲/۴ کی لَے میں لوٹ آئیں۔ موزونی ورزش کے دوران میں حکم دینے کے لیے "ہاپ" (Hopp) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ اس لیے چنا گیا ہے کہ یہ مختصر ہے اور صاف سنائی دیتا ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ بچے اس لفظ کو سُن کر بہت جلد تعمیل کرتے ہیں۔ چنانچہ اُوپر بیان کی ہوئی مشق کے دوران میں، بچے پہلے ۲/۴ کی لَے سے مارچنگ شروع کرتے ہیں اور پھر ہاپ کا حکم ملتے ہی ۳/۴ کی لَے میں اپنے قدموں کی رفتار کو منتقل کر دیتے ہیں۔ دوبارہ ہاپ سُن کر ۲/۴ کی رفتار سے چلنے لگتے ہیں۔ ہر تبدیلی کے درمیان کوئی وقفہ نہ ہونا چاہیے۔ تبدیلی اچانک اور بلا تامل ہو جانی چاہیے۔ حکم دینے کا سب سے اچھا موقع ہر بار کی آخری ضرب ہے۔ تالوں کو حسب دلخواہ مخلوط کیا جا سکتا ہے۔ جن کے بموجب مارچنگ جاری رہتا ہے اور ان تالوں کی ترکیب جتنی زیادہ مختلف ہوگی، اتنی ہی موزونی مشقوں کی تعلیمی خوبی بڑھ جائیگی۔

تال بجا کر لَے کا تصوّر دلانا

اس عمل کو "تال دینا" بھی کہتے ہیں اور یہ بہ طریق معروف ظاہر کیا جاتا ہے یعنی جس طرح بینڈ باجے کا کنڈکٹر یا رہنما چھڑی کے ذریعے سُروں کی حرکت کو واضح کرتا ہے، وہی طریق بجانے کا ہوتا ہے لیکن موزونی طریق میں اس کی اصلاح یوں کی گئی ہے کہ اوّل تو بازوؤں کی حرکت کو ہاتھ کی حرکت کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے۔ دوسرے اس حرکت میں خوبصورتی کو مد

دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً ۲/۴ لے میں، بازو اُوپر نیچے حرکت کرینگے۔ پہلے دونوں ہاتھوں کو سر کے اُوپر لے جاؤ۔ پھر اُنھیں آہستہ آہستہ نیچے لاؤ۔ ساتھ ہی کہنیوں کو جھکاتے جاؤ، تاکہ دونوں ہاتھ نیچے آتے وقت، جسم کے اطراف کے ساتھ اُترتے آئیں۔ جب ہاتھوں کے پنچے کی حرکت اختتام پر پہنچے، تو دونوں کو مکّے کی صورت میں منتقل کرو اور دونوں مکّوں کو نیچے کی جانب جھکا دو۔ یہ جھٹکا ضربِ خاص کا اظہار ہے۔ اب بازو اُوپر اٹھاتے وقت مکّے کھول دِیے جائیں گے۔ کہنیاں پھر جھکائی جائینگی اور ہاتھ جسم کے ساتھ اُوپر کو حرکت کرینگے تاآنکہ بازو پھر سر کے اُوپر سیدھی حالت میں آجائیں۔ دونوں ہتھیلیاں ایک دوسرے کے بالمقابل ہوں اور ہاتھوں کی پشت قدرے اندر کی طرف جھک جائے۔ سر کو بھی قدرے پیچھے کی طرف جھکایا جاتا ہے تاکہ بچّے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے رہیں۔ ابتدا میں یہ مشق باجے کی مدد کے بغیر کرانی چاہیے۔ بعدازاں جب بچّے صحیح طریقِ حرکات کو اخذ کرلیں، تو بینڈ کی مدد ضروری ہے۔

اب ۳/۴ کی لے سکھاؤ۔ ہاتھوں کی حرکت کو سر کے اُوپر سے شروع کرکے پہلی ضرب اسی طریق سے شروع کی جائیگی، جیسے ۲/۴ لے میں کی گئی تھی۔ البتّہ تال کی دوسری ضرب پر ہاتھوں کو اُوپر سے جسم کے سامنے کی طرف لاؤ اور اسی ضرب کے دوران میں دونوں ہاتھ چھاتی پر آڑے رُخ پر پہنچ جائیں۔ اُنگلیوں کو پورے زور سے اندر کی طرف جھکا کر ہتھیلیوں کو اُوپر کی جانب رکھو۔ سر کو پہلو کے رُخ جنبش دو، تاکہ دایاں ہاتھ نظر آتا رہے۔ تیسری ضرب پر سیدھے بازو اُوپر کی طرف اٹھا دو۔ اس ضرب پر سر کو پیچھے کی طرف جھکا دو تاکہ اندر کو جھکے ہوئے ہاتھ دکھائی دیتے رہیں۔

۴/۴ کی لے کا سکھانا۔ اس لے میں پہلی ضرب بدستور سابق ہے۔ دوسری ضرب پر کھلے ہاتھوں کو جسم کے سامنے لاؤ، حتیٰ کہ وہ چھاتی پر آڑی حالت میں آجائیں۔ ہتھیلیوں کو نیچے

کے رُخ رہنا چاہیے۔ تیسری ضرب پر وہی طریق اختیار کرو، جو $\frac{3}{4}$ کی لے میں بیان کیا گیا ہے۔ چوتھی ضرب مثل سابق اُوپر کی حالت میں۔

$\frac{5}{4}$ کی لے میں پہلی اور دوسری ضربیں $\frac{4}{4}$ کی ضربوں سے مشابہ ہیں۔ تیسری ضرب پر ہاتھوں کو آگے کی طرف دھکیل دو اور ہتھیلیوں کو زمین کی جانب رکھو۔ چوتھی اور پانچویں ضربیں اسی طرح ہیں، جیسے $\frac{4}{4}$ کی لے کی تیسری اور چوتھی ضربیں۔

$\frac{6}{4}$ کی لے۔ اس لے میں نئی ضرب، $\frac{5}{4}$ لے کی تیسری ضرب کے بعد واقع ہوتی ہے، یعنی کلائیوں کو قدرے نیچے کے رُخ گرا دیا جاتا ہے۔ ہاتھ پچھلی طرف جھکا دیے جاتے ہیں اور ہتھیلیوں کو سامنے کی طرف رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد پانچویں اور چھٹی ضرب، $\frac{5}{4}$ لے کی چوتھی اور پانچویں ضرب سے مشابہ ہے۔

مارچنگ کے ساتھ تال دینے کا عمل، جس قدر جلد ہو سکے، شروع کر دینا چاہیے۔ بعض بچوں کو ان دونوں افعال کو بیک وقت باہم ملانے میں دقت محسوس ہوتی ہے لیکن جب وُہ اس مشکل پر غالب آجاتے ہیں، تو جماعت بہت سرعت کے ساتھ ترقی کرنے لگتی ہے اور اس کے بعد آنے والی زیادہ پیچیدہ مشقوں کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

تال دینے کی مشقیں

۱۔ مذکورہ بالا تانوں میں سے کسی ایک کو دہراؤ۔ (اُستاد پہلے تال، مثلاً $\frac{2}{4}$ یا $\frac{3}{4}$ کا نام لیکر بتائے)۔

۲۔ ہاپ کے حکم پر ایک تال سے دوسری تال میں اپنی حرکات کو تبدیل کرو۔

۳۔ حکم دو کہ بچے آنکھیں بند کر کے بنسری پر بجائی ہوئی ایک سادہ دُھن کو سُنیں۔ اس کے بعد اس دُھن کی لے کو محسوس کرتے ہی تال دیں۔ ساز کی آواز کے سوا اور کسی قسم کی ہدایات بچوں کو نہ دی جائیں۔

(باقی آئندہ)

کھیل کھیل میں تعلیم

از

سردار موہن سنگھ ایم اے، ہیڈ ماسٹر خالصہ ہائی اسکول پٹیالہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

آؤ، اب ہم غور کریں کہ کھیل کی خصوصیات کیا ہیں۔ حکما نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں :-

"کھیل طبعی تحریک سے ہوتا ہے اور کام عادت کے تقاضے سے کیا جاتا ہے۔"

"کھیل ایسا عمل ہے، جو صرف شوق سے کیا جائے اور جس میں کوئی دنیاوی فائدہ مقصود نہ ہو اور کام وہ جو ضرورت خارجی سے کیا جائے اور جس کی غایت کوئی فائدہ ہو۔"

"کام کا عموماً کوئی معیار ہوتا ہے اور کھیل کا اول تو کوئی معیار ہوتا ہی نہیں۔ اگر ہو بھی تو اختیاری۔"

آخری تمیز کسی حد تک درست ہے۔ چنانچہ چھوٹے بچے بھی اس فرق کو سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے کام کا کوئی معیار قائم کر لیتے ہیں۔ مگر کیا کھیل کا کوئی معیار ہوتا ہی نہیں؟ ہوتا ہے، مگر ایک حد کے بعد۔ مثلاً اچھے کھلاڑی ہی ٹیم میں شامل کیے جاتے ہیں۔ کھیل کی قدر و قیمت بھی ہوتی ہے۔ اچھے کھلاڑی اور ایکٹر بھاری تنخواہیں پاتے ہیں۔ کیا وہ اپنے کھیل کو نکما سمجھتے ہوں گے۔ انگلستان کے بعض اسکولوں اور کالجوں میں جو منزلت کھلاڑیوں کی ہوتی ہے، وہ شاید ہی عالموں کی ہوتی ہو۔ تمثیلات مذکورہ سے یہ ظاہر ہے کہ دراصل کام اور کھیل میں تمیز مشکل ہے۔ بلکہ

کا نظریہ یہ ہے کہ ہر کام کے دو جز ہوتے ہیں۔ ایک خارجی ضرورت، دوسرے اندرونی تحریک۔
جس میں اوّل الذکر زیادہ ہوگی، وہ کام کہلاتا ہے اور جس میں طبعی ضرورت حاوی ہو، وہ کھیل۔
ان کا خیال ہے کہ جن آدمیوں کو اپنے کام میں طبعی رغبت ہوتی ہے، اُن کو اپنے کام اور کھیل
میں نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال ایڈیسن کی زندگی سے ملتی ہے کہ جب
وُہ کسی نئے تجربے میں مستغرق ہوتا تھا، تو گھنٹوں، دنوں، ہفتوں تک لگاتار کام کرتا رہتا۔
اور کھانے پینے اور سونے تک کی پروا نہ کرتا تھا۔

جرمن شاعر اور فلاسفر شلر فنونِ لطیفہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ
کی روح کھیل کی مانند ذہنی "آمد" (Spontaniety) ہے۔ جو شاعر اپنا دکھ روتا ہے،
وہ اس راگ میں اپنے دکھ کی دوا پاتا ہے۔ یقیناً کھیل و فنونِ احسنہ ایک دوسرے سے لگاؤ
رکھتے ہیں۔ جس طرح کرکٹ کا کھلاڑی صرف زور لگانا ہی نہیں چاہتا، بلکہ ایک خاص انداز
کے ساتھ کھیلنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اسی طرح مصور یا گویا اپنے کمال سے محظوظ ہوتا ہے۔
کھیل اور فنونِ لطیفہ کی یکجہتی اس بات سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ فن سنگتراشی کا کمال ان
لوگوں میں پیدا ہوا، جو اولمپک کھیلوں کو عزیز رکھتے تھے، نہ کہ اُن لوگوں میں جو آدمیوں کو خونخوار
درندوں کے ساتھ لڑا کر دل بہلاتے تھے۔

ولیم مورس صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کسی کام کو خوبصورتی سے
کرنا کھیل کے تحت میں آتا ہے کیونکہ یہ کاریگر کی لطیف ذہنیت کا اظہار ہے۔

پروفیسر شیڈ کا خیال ہے کہ کھیل اور لطف لازم و ملزوم ہیں اور خوشی کے وقت
انھیں حرکات کو دہرایا جاتا ہے جو کہ ہماری زندگی سے تعلق رکھتی ہوں اور ہر کام اس شخص کے
لئے کھیل بن جاتا ہے جو اس میں مشاقی سے درجہ کمال حاصل کرتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر پرانے زمانے میں جب انسان چقماق کے ہتھیار بنانے لگا، تو پہلے پہل تو اس کی ساری توجہ اُن گھڑ اسلحہ جات بنانے میں صرف ہو جایا کرتی تھی لیکن جب بناتے بناتے مہارت ہو گئی، وہی اوزار اب غیر شعوری طور پر یا بہت کم دھیان سے تیار ہونے لگے۔ اب باقی توجہ اور طرف لگائی جا سکتی تھی۔ اب چونکہ کاریگر کو اپنے کام میں لطف بھی آنے لگا اس لیے بقایا طاقت خوبصورتی پیدا کرنے کے لیے صرف کی جانے لگی۔ چنانچہ پہلا ہتھیار صرف اسی قابل تھا کہ جانوروں کو گھائل کر سکے، بعد ازاں وہ خوبصورت بھی بن گیا۔

یہ مسئلہ نہایت ضروری ہے اور تعلیم میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خوبصورتی پیدا کرنے کی طاقت خدا معدودے چند افراد کو ہی نہیں دیتا، بلکہ یہ ایسا وصف ہے، جسے وہ ہر شخص کو اُس کی قابلیت کے لحاظ سے عطا فرماتا ہے۔ اگر ہم لڑکوں اور لڑکیوں کو کافی اور دلچسپ مشق لکھنے میں ماہر کر دیں، تو وہ خود بخود لکھنے لگیں گے اور اگر ان کے کلام میں ایسی مہارت پیدا کر دیں، تو ان کی طبیعت کی روانی ان کو شعر کہنے پر مجبور کرے گی۔

جھوٹ موٹ کی دنیا

کھیل کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ ہے، بچوں کا قیاسی کھیل۔ مثلاً بچہ سونٹا لیتا ہے اور اس کو گھوڑا بنا کر دوڑائے پھرتا ہے۔ حال ہی میں اس موضوع پر بہت چھان بین ہوئی ہے۔ میڈم میلانی کلائن، میڈم لون فیلڈ اور سوسن اسحاق کا کام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اس موضوع پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ یہاں صرف اشارتاً تھوڑا سا ذکر کیا جاتا ہے۔

بالغ آدمیوں کے نزدیک کام اور شیخ چلی کے ہوائی قلعوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر بچہ یہ امتیاز نہیں کرتا۔ یہ ممکن بھی ہے کہ بچوں کا قیاسی کھیل، ان کی نادانی اور بے سمجھ

منحصر ہو یا نہیں ممکن ہے کہ بچہ اپنے خیالات میں محو ہو کر اپنے ماحول کو بھول جاتا ہو اور اصلیت کے اس پہلو پر غور نہ کرتا ہو، جو اُس کی خیالی دنیا کو غلط ثابت کرتے ہوں۔ یہ بات پاگل آدمیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ایک شخص سیاہ فام تھا، مگر کہتا تھا، میں گورا ہوں اور اصلیت کو بالکل نظر انداز کرتا تھا۔ بچے بھی اصلیت کو نظر انداز کر سکتے ہیں، مگر وہ اس کو عیب نہیں سمجھتے۔ اگر آپ کسی آدمی کو چھڑی کے گھوڑے پر سوار دیکھ پائیں، تو وہ کھسیانہ ہو جائیگا۔ لیکن اگر کوئی بچہ کرسی کو قلعہ سمجھ کر محاصرہ کر رہا ہو اور کرسی آپ کسی اور ضرورت کے لیے لے جائیں، تو بچہ اپنے فعل پر شرمسار نہیں ہوتا، بلکہ فوراً کسی دوسری چیز پر یورش شروع کر دیتا ہے۔ وہ پاگل نہیں، بلکہ وہ اصلیت سے بھی بہرہ ور ہوتا ہے۔ مثلاً جب بچے مٹی کی روٹی پکائیں اور ان سے کہا جائے "کھاؤ"۔ تو جواب ملتا ہے۔ "واہ! یہ تو جھوٹ موٹ کی روٹی ہے" یا کہتا ہے۔ "یہ جھوٹ موٹ کا قلعہ ہے"۔ ساتھ ہی سچ مچ کی دنیا سے، جو اس کے ارد گرد ہے، متاثر نہیں ہوتا۔ یہ آخری بات پاگلوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ لاہور کے پاگل خانے میں ایک شخص اپنے آپ کو ایڈورڈ ہفتم سمجھتا تھا اور اپنے افلاس اور ناداری کی وجہ یہ بتلاتا تھا کہ لوگ میرے خلاف سازش کیے ہوئے ہیں اور مجھے تاج و تخت سے محروم کر رکھا ہے۔ بعینہٖ بچے بھی متضاد خیالات کو نباہ لیتے ہیں اور بناوٹ کو اصلیت مان لیتے ہیں۔ اکثر یہی وجہ ان کے جھوٹ کی ہوا کرتی ہے۔ یعنی وہ اپنے دماغ میں اصلیت و بناوٹ کو الگ نہیں رکھ سکتے۔ مشاہدات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ کھیل میں بچے اپنے مصنوعی تصورات میں اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ اصلیت کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک مشہور قصہ نویس سٹیونسن اپنے مکتوب "بچوں کے کھیل" میں یوں لکھتے ہیں کہ جس سوز کھانے میں مچھلی ہوتی تھی، تو میں یہ خیال کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ اس کو کھاتے کھاتے کہیں نہ کہیں چالیس چوروں کی غار مل جائیگی، جس میں قاسم سرنگ رہا ہوگا اور گو مجھے جیلی بالائی کے ساتھ مرغوب تھی،

مگر چونکہ بالائی ملانے سے شفاف نہ رہتی تھی۔اس لیے میں اکثر بغیر بالائی کے ہی آہستہ آہستہ پیچھے سے کھرچتا ہُوا آگے بڑھتا چلا جاتا تھا۔

بیان مذکورہ بالا سے بچوں کے جھوٹ موٹ اور پاگل پن میں کچھ یکجہتی نظر آتی ہے، مگر اس کو طول نہ دینا چاہیے۔بچوں کا دل و دماغ اس بناوٹ میں پاگلوں کی طرح مستغرق نہیں ہوتا، بلکہ بہت معمولی کوشش سے اصلیت کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔دوم پاگل آدمی اس لیے اصلیت سے بھاگتا ہے کہ دنیا کے جنجال میں پورا نہیں اتر سکتا۔مگر بچوں کا مصنوعی تصور اُس کی کمزوری پر دال نہیں، بلکہ زائد از ضرورت قوت متخیلہ کی دلیل ہے۔ بچے کی فطری ودیعت اُس کی ضروریات سے زیادہ ہوتی ہے، اس لیے اپنے قوٰی کو فاضل پاکر چلبلا پن اور خیالی پلاؤ پکانے میں صرف کرتا ہے۔ساتھ ہی اپنے تجربے کو وسعت دیتا ہے اور زندگی کو تونگر بناتا ہے۔گویا قدرت نے اس میں یہ بھید رکھا ہے کہ پرورش کے زمانے میں بچوں میں صرف اس وجہ سے آزادی کم نہ ہونے پائے کہ اُن کو اپنے ماحول پر اختیار نہیں ہوتا۔ مثلاً بچوں کو اگر کھیر پکانے کے لیے دودھ، چاول، برتن یا آگ میسر نہ آسکے، تو اُن کا کھیل بند نہ ہونے پائے۔لیکن بچہ جوں جوں اپنے علم اور طاقت میں اضافہ کرتا ہے، تو اس بناوٹ کی ضرورت کم ہوتی چلی جاتی ہے اور جوں جوں اس دنیا کی ذمّے داریوں کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے، وُہ قیدی کی طرح جکڑا چلا جاتا ہے۔مگر خیالی پلاؤ پکانے کی طاقت دیر تک رہتی ہے اور اس میں بے تکلفی پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔بوائے سکاؤٹ تحریک کی کامیابی کی بنیاد اسی ذہنی بناوٹ پر ہے۔سکاؤٹ کی سپاہیانہ وردی، اُس کی پیٹرول کا کسی جانور شیر یا بھیڑیا سے منسوب ہونا، اس کی پوشیدہ کنایات، ہیڈکمونج، یہ سب باتیں ایسی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں، جو صرف وہم میں پائی جاتی ہیں۔ان کے ذریعے سے سکاؤٹ مسلمات اور تجربے سے

جاتا ہے۔ مطالعۂ قدرت میں شغف پیدا ہو جاتا ہے۔ اخلاق اس کا سنور جاتا ہے۔ اس تعلیم میں
تصوروں کی دنیا سے اُس کو طاقت اور ذہن کو رسائی ملتی ہیں۔ یہیں وجہ ہے یہ تعلیم اُس کے لیے اسکول کی معمولی
تعلیم کی نسبت بہت دلچسپ اور کارآمد ہوتی ہے۔ اس کو دیکھ کر چند ایک اسکولوں میں اُستادوں
نے اپنی جماعتوں کو سکاؤٹ ٹرپ میں تبدیل کر دیا ہے۔ جب یہ تجربے پایۂ تکمیل کو پہنچیں گے،
تو وثوق سے کہا جا سکیگا کہ آیا تمام مضامین کی تعلیم و تدریس اس طرح کھیل کھیل میں ہو سکتی
ہے یا نہیں۔

حکما کے ایک طبقے کا یہ بھی خیال ہے کہ کھیل بچوں کے لیے بعض اور وجوہ کی بنا پر
بھی ضروری ہے۔ میلانی کلائن صاحبہ کا قول ہے کہ بچوں میں بچپن سے افکار اور خطرات کا ڈر
ہوتا ہے۔ کھیل کے ذریعے بچہ ان خطرات و افکار کو کھلونوں کے ساتھ منسوب کرتا ہے اور
اس طرح اپنے ڈر اور فکر کو دُور کر سکتا ہے۔ دوم کھیل بھی زبان کی طرح اظہارِ جذبات کا ذریعہ
ہے۔ مثلاً جب لڑکی گڑیا کے ساتھ کھیلتی ہے، تو ماں کا غصہ گڑیا پر نکال لیتی ہے اور
اس طرح ہلکی ہو جاتی ہے۔ اُس کو نہلاتی اور کپڑے پہناتی ہے۔ گویا اس امر کا اعادہ کرتی ہے
کہ ماں میری دیکھ بھال کرتی ہے۔ لڑکے گھر بناتے ہیں، تو گویا نئے گھر بنانے کی حرص کو پورا
کرتے ہیں۔ گاڑی، چھکڑوں، گھوڑوں سے کھیلتے ہیں، تو اس یقین کو مستحکم کرتے ہیں کہ ہم اس
قدر مرد، بہادر اور چالاک ہیں کہ حریف کا مقابلہ کر سکیں۔ کلوں کے کھلونوں سے کھیل کر یہ
یقین کرتے ہیں کہ اگر ہم ان کو روک سکتے ہیں، تو چلا بھی سکتے ہیں۔ کھلونوں کو توڑ کر ثابت
کرتے ہیں کہ اگر توڑ سکتے ہیں، تو جوڑ بھی سکتے ہیں اور اسی طرح اندرونی فکر کو دُور
کرتے ہیں۔ یہ باتیں گو نئی نہیں ہیں۔ مگر حال کے تجربوں سے پایۂ ثبوت کو پہنچ
چکی ہیں۔

کھیل اور تعلیم

بہ نظرِ غائر دیکھا جائے، تو یہ بات روشن ہے کہ اگر استاد ان مخفی قویٰ کو جو کھی
میں ظاہر ہوتے ہیں، استعمال کر سکے، تو تدریس نہ صرف آسان بلکہ بدرجہا دلچسپ بن جا
بہت سے مصنف اور محقق اور قابل آدمی لکھتے ہیں کہ اسکول نے ہماری بالیدگی میں کوئی مدد
کی، بلکہ اسکول کی تدریس ہماری ترقی میں سدِ راہ ثابت ہوئی۔ کیا یہ بات قابلِ افسوس نہیں
یہ چوٹی کے انسان جنھوں نے اپنے کھیل کے خوابوں کو پورا کر دکھلایا ہے اور جنھوں نے
مشکلات پر فتح پائی ہے، یوں کہیں کہ اسکول کے بے ڈھنگے پن نے ہزاروں نازک دلوں کا
کیا ہوگا۔ اسکولوں کی تعلیم کا تنگ دائرہ، اس کی تخیل اور تصور سے بے بہرہ تدریس،
پُر تکلف ضبط، بہتوں کو علم سے محروم رکھتا ہے۔ اگر یہ مقصود ہے کہ ہماری نسلیں ان نقص
سے بچیں، تو ظاہر ہے کہ طریقۂ تعلیم کھیل کی جبلی خواہش کو تقویت دے۔ اس کا یہ مطلب
کہ بچے کو اپنے قوائے ذہنی استعمال کرنے کا موقع دیا جائے اور اسکول میں زندگی کے
تجربے کرنے کی سہولیت ہو۔ استاد کی رہنما بچے کی جبلی کھیل کی رغبت ہو۔ جب بچہ شا
ایکٹر، نجومی، کیمیا گر، ڈاکٹر، ملاح بننے کی خواہش کرے، تو اس کو ان پیشوں کی چھان بین
کا موقع دیا جائے اور بقول جناب کارل گروس بچہ کی ان ننھی کوششوں کا مضحکہ نہ اڑ
اسکاؤٹنگ کا ایک فائدہ یہ ہے کہ لڑکوں کو زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفتیش کا موقع

ہمیں یقین ہے کہ اسکول کے تمام مضامین کو کھیل کھیل کے ذریعے پڑھایا جاسکتا ہے
اور موقع کے موافق کچھ ردّ و بدل کی ضرورت ہوگی اور جب عمر کے تقاضے سے بچے کا لط
شخصیت سے بلند تر ہو کر مجلسی پہلو اختیار کرے، اس وقت اس کو ایسی تعلیم دی
بچہ اپنے آپ کو ان شاندار انسانی کارگزاریوں کا حصے دار و وارث سمجھنے لگے۔

ہمارے تمدن کو چار چاند لگائے ہیں۔ اس وقت تاریخ و جغرافیے کی تعلیم کا رُخ سیاسیات اور اقتصادیات کی طرف ہو۔ سائنس اس کو سر جگدیش بوس، پاسٹیور، ایڈیسن اور ہکسلے کا جوڑی دار بنا دے۔ ریاضی اس کو کاروباری زندگی کے ذہنی پہلو پر غور کرنے کے قابل بنا دے جس سے وہ اصول اس کی سمجھ میں آجائیں، جو لین دین، صنعت و حرفت، تجارت اور حکومت کی تہ میں کام کرتے ہوں۔ اگر ایسا کیا جائے، تو گویا کھیل کھیل میں زندگی کے ساتھ انسان کا تعارف ہو جا سکتا ہے۔

تعلیم کا انتہائی مقصد یہ ہے کہ انسان زندگی کے کھیل میں ایک خاص عمل کے لیے تیار کر دیا جائے۔ اس تیاری کے لیے کسی کسب کا اختیار کرنا ضروری امر ہے اور کسبی تعلیم کا یہ کام ہے کہ بچّے کی قوتِ متخیلہ جس کا تختۂ مشق بہت وسیع تھا، اب ایک نقطہ پر مرکوز ہو جائے اور جبلی شوق اب ایک چیدہ طبقے کے معموں کو حل کرنے کی فکر میں ہو۔ طائرِ خیال کی پرواز اس روز کی منتظر ہو، جب وہ اپنے چیدہ پیشے کو اختیار کر سکے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کی مشکلات کے سامنے تصور کی بلند پروازیاں ختم ہو جایا کرتی ہیں، مگر قدرت اس قدر بخیل واقع نہیں ہوئی۔ قوتِ متصوّرہ کے عنصر دیر تک قائم رہتے ہیں اور انسانی کمزوریوں اور دنیا کی تکالیف کے باوجود وضع داری کی لکیر مٹنے نہیں پاتی[1]

---

[1] Sir T. Percy Nunn: "Education, Its Data and First Principle." Ch. VII Play Pages 88—90.

کھیل اور تصوّر

از

میرزا مقبول بیگ بدخشانی، بی اے سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

کھیل کی محبت ہر چھوٹے بچے کے دل میں ہوتی ہے۔ چاہے حیوان کا بچہ ہو، یا آدمی کا۔ یہ محبت اتنی واضح ہوتی ہے کہ پہلی نظر میں معلوم ہو جاتی ہے۔ اس محبت کے ساتھ ساتھ بناوٹ اور تصنع بھی ہوتا ہے، جو ان کے لیے بڑی ہی خوشی کا موجب ہے۔ بچے جب پھک پھک کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں، تو وہ گویا کھیل بھی کھیلتے ہیں اور ریل گاڑی کی نقل بھی اتارتے ہیں۔ یہ کھیل اور بناوٹ بچپن کی نہایت ہی اہم ضرورتیں ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ آپ کے بچے تندرست ہوں اور ان کی طبیعتیں شگفتہ ہوں، تو آپ کو چاہیے کہ ان دو باتوں کے لیے انھیں خود موقعے مہیا کریں۔ آپ یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ ان کھیلوں سے یا کھیلوں کی بناوٹ سے فائدہ کیا ہوگا؟ اس تربیت کے سلسلے میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسے موقعے پیدا کرنے کے لیے والدین کو کیا کچھ کرنا چاہیے اور اسکولوں کو کیا کچھ۔ دوسرے یہ کہ کھیلوں کا تعلیمی فائدہ بڑھانے کے لیے والدین اور استادوں کو کچھ اور بھی فرض انجام دینا چاہییں یا نہیں۔

اس سے پہلے کہ اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ کچھ کہا جائے، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھیلوں کے نفسیات پر سرسری سی نظر ڈالی جائے۔ کارل گروس نے اس موضوع کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں دو چیزیں مطالعے کے قابل ہیں۔ پہلا یہ دو چیزوں

جو کھیل پر اکساتا ہے اور کھیل کھلاتا ہے۔ دوسرا ہے کھیلوں کا جسمانی فائدہ۔ یہ آخری بات تو بالکل صاف اور واضح ہے۔ بچے اپنے بچپن میں وہ کھیل کھیلنا چاہتے ہیں اور ان مشاغل کی مشق کرنا پسند کرتے ہیں، جن سے انھیں سچ مچ زندگی میں واسطہ پڑتا ہے۔ یہ ایک عام نظریہ ہے، جسے سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ بچے خود تو اتنی دور کی بات نہیں سوچ سکتے، لیکن یہ سب کچھ ان سے قدرت کراتی ہے۔ کتے کے پلوں کو آپ نے آپس میں گتھم گتھا ہوتے دیکھا ہوگا۔ کسی کا گردن پر داؤ چلے، تو گردن کو دبوچ لیتا ہے۔ کسی کا کانوں پر بس چلے، تو وہ کانوں کو دانتوں میں دبا لینے سے نہیں چوکتا۔ لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو کاٹتے نہیں؛ یہ تو ان کا کھیل ہے اور یہ گویا مشق ہے، اس مشغلے کی، جو انھیں ساری عمر کرنا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا، کتا، کتے کا دشمن ہوتا ہے۔ جب کبھی دو کتوں کی مڈبھیڑ ہوتی ہے، تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر غرانے لگتے ہیں۔ اس سے تسکین نہیں ہوتی، تو ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ بلی کے بچوں کا کھیل بھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ کھیل بھی اس خونیں کھیل کی نقل ہوتی ہے، جو بلی چوہوں کے ساتھ کھیلا کرتی ہے۔ انسان کے ننھے بچوں کا بھی یہی حال ہے وہ بھی روزمرہ میں جو واقع دیکھتے ہیں، اس کی نقل بنا کر کھیلنے لگتے ہیں۔ کسی چور کو ہتھکڑی میں دیکھ لیں، تو ایک منچلا چور بن جاتا ہے اور دوسرا سپاہی۔ رسی کی ہتھکڑی بھی بنالی جاتی ہے۔ یہیں پر بس نہیں۔ اس چور کو ادھر اُدھر گھما کر عدالت کے سامنے لایا جاتا ہے، وہاں منصف صاحب اس کی قسمت کا فیصلہ سناتے ہیں۔ اسی قسم کی اور بہت سی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ غرض کہ جو باتیں انھیں زیادہ ضروری معلوم ہوں یا جن میں انھیں زیادہ دلچسپی ہو، اس کی نقل اتارنے لگتے ہیں۔ بچے ایسے کھیل کو بھی بہت پسند کرتے ہیں، جن سے اعضا حرکت کریں اور جسم میں چستی آئے، جیسے اچھلنا، کودنا، درخت پر چڑھنا، کسی تنگ اور باریک سطح پر

سے گزرنا وغیرہ۔

نفسیات کے بعض ماہر بچوں کے کھیل میں جنسی ترغیب کا عکس دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات حقیقت سے بہت دور معلوم ہوتی ہے۔ بچوں کے جذبات میں جو اکساہٹ سی پیدا ہوتی ہے، اُس کا موجب کوئی جنسی ترغیب نہیں۔ اس کا موجب تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہم بڑے بن جائیں۔ اس خواہش کو ہم قوت حاصل کرنے کی خواہش بھی کہہ سکتے ہیں۔ بچہ نوجوانوں کو دیکھتا ہے۔ ان کے کام کاج پر نظر دوڑاتا ہے، تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بہت کمزور پاتا ہے۔ چنانچہ پھر وہ اپنے اردگرد ایسے حالات پیدا کرتا ہے، جس میں وہ خود ایک نوجوان آدمی بن جائے اور اپنے بچے ہونے کی تمام کمزوریوں کو بھلا دے۔ آپ کے بچے کو جب یہ احساس ہو جائے کہ وہ بھی آپ جیسا مرد بن گیا ہے یا بن جائیگا، تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ یہ بات آپ نے اکثر دیکھی ہوگی کہ اگر کوئی خاص کام کرتے ہوئے یقین ہو جائے کہ اس میں کامیابی ہو جائیگی، تو آپ کی دوڑ دھوپ میں اور زیادہ گرمی آجاتی ہے۔ یہی حال بچوں کا ہے۔ وہ شروع ہی میں وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں، جو ان سے بڑے آدمی کرتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، چھوٹے بچوں کے لیے ان کے بڑے بھائی اور بہنیں بہت کارآمد ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ بچے ان کی باتیں اچھی طرح سے جان لیتے ہیں اور ان کے مقصد ٹھیک سمجھ لیتے ہیں۔ ان کی لیاقت اور مہارت بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوتی کہ یہ ان تک نہ پہنچ سکیں۔ بچوں میں یہ احساس کہ ہم دوسروں سے کمزور ہیں، بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اگر بچے اوسط درجے کے ہوں اور انھیں اچھی طرح سے تعلیم دی جائے، تو کمزوری کے اس احساس کو خاص شکلوں میں اُبھار کر بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی پرورش و بالیدگی حالت میں [illegible] ہو، تو یہی احساس انھیں ہمیشہ کے لیے ناکارہ بھی کر دیتا ہے۔

کھیل میں قوت حاصل کرنے کی خواہش دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جس سے کام کرنا سیکھتے ہیں۔ دوسری وہ جس سے خاص خاص چیزوں یا کاموں کا تصور کرتے ہیں، جس طرح کہ بڑے مرد کبھی کبھی ہوائی قلعے بنانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح یہ چھوٹے بچے بھی کھیل کی بناوٹ اور تصنع میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ بچہ ایک دیو بننا بھی پسند کرتا ہے اور شیر بننا بھی۔ وہ اپنے خیالات کے مطابق ایسی حرکتیں بھی کرتا ہے، جس سے لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا ہو۔ ایک مرتبہ ہم نے اپنے بچے کو سفید دیو کی کہانی سنائی، جو ایک منے کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ پھر اس سے کہا تم اپنے آپ کو وہ منا فرض کر لو۔ اس بات کے لیے ہم نے طرح طرح سے کوشش بھی کی، لیکن اس نے منا بننا پسند نہ کیا۔ وہ تو خود سفید دیو بننا چاہتا تھا۔ اس کی امی نے ایک مرتبہ اسے بالشتیے کی کہانی سنائی، جس نے اپنی بیوی کا سر کاٹ دیا تھا۔ دوسرے ہی دن وہ خود بالشتیے صاحب بن کر اینٹھتے پھرتے تھے۔ پڑوسن کی ایک چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی، اس کا سر کاٹنے کو دوڑتے تھے۔

وہ ان کہانیوں کو بہت پسند کرتا تھا، جن میں عورتوں کے سر کاٹے جاتے ہیں، وہ جن اور بھوت بننا بھی بہت پسند کرتا تھا، جو چھوٹے بچوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ وہ انجن بھی بننا چاہتا تھا، جو کئی سو من بوجھ کو ساتھ لے کر پھک پھک کرتا ہوا اڑنے لگتا ہے۔ ایسی بناوٹوں میں تصور کی قوت کام کرتی ہے، کوئی جنسی ترغیب کام نہیں کرتی۔ ایک مرتبہ ہم سیر سے واپس آ رہے تھے۔ ہم نے مذاق کے طور پر اپنے چھوٹے بچے سے کہا۔ دیکھو بیٹے اگر اس وقت ہمارے گھر میں کوئی بھوت براجمان ہو اور ہمیں مکان کے اندر داخل نہ ہونے دے، تو ہم کیا کریں گے۔ اس کے بعد اکثر ایسا ہوا کہ صاحبزادے صاحب بھوت بن کر دروازے میں کھڑے ہیں اور [illegible] بھوت ہیں بھوت کا ورد فرما رہے ہیں اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ آپ

کہیں اور ٹھکانا کریں۔ یہاں اب ہمارا قبضہ ہے۔" اس کھیل میں اسے اتنی لذت آتی تھی کہ اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب طاقتور بننے کی ایک بناوٹ تھی اور یہی بناوٹ اس کے لیے بڑی ہی خوشی کا موجب تھی۔

لیکن یہی سمجھ لینا بھی ٹھیک نہیں کہ بچّے کے کھیل سراسر طاقتور بننے کی خواہش پر منحصر ہیں۔ بچّوں کو اگر ڈرایا جائے، لیکن اس ڈرانے میں بناوٹ ہو، تو وہ اسے بھی بہت پسند کرتے ہیں۔ غالباً اس لیے کہ اس سے انھیں یہ علم ہوتا ہے کہ یہ بناوٹی خوف ان میں حفاظت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ کبھی کبھی میں مگرمچھ بن بیٹھتا ہوں اور اپنے لڑکے کو کھا جانے کے لیے منہ کھولے ہوئے اس کی طرف دوڑتا ہوں۔ وہ سچ مچ چلّا اٹھتا ہے۔ میں رک جاتا ہوں اور یہ خیال کرتا ہوں کہ غریب سچ مچ ڈر گیا ہے۔ لیکن جس وقت میں رکتا ہوں، وہ کہتا ہے "ابا پھر مگرمچھ بنو۔" ڈرامے کو دیکھ کر بچّوں کو جو خوشی ہوتی ہے، وہ اصل میں بناوٹ ہی کی خوشی ہوتی ہے۔ اس قسم کی خوشی حاصل کرنے کے لیے بڑے ناول پڑھتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں، تھیٹر جاتے ہیں۔ عجیب چیزوں کو دیکھنے کی خواہش جو بچّوں کے دلوں میں ہوتی ہے، اس کا بھی اس میں بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ بچّے جب آپس میں ریچھ ریچھ کھیلتے ہیں، تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ واقعی ریچھ کے متعلق نئی باتیں جان رہے ہیں۔

جہاں تک کھیل کی تعلیمی قدر و قیمت کا تعلق ہے، غالباً سب اس بات پر متفق ہوں گے کہ کھیل وہی اچھا ہے، جس میں نئے نئے رجحان حاصل ہوں۔ لیکن ترقی یافتہ زمانے کے بہت سے لوگ اس کھیل کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں، جس کا انحصار بناوٹ پر ہو۔ لڑکوں کے لیے ہوائی قلعے بنانا بُرا خیال کیا جاتا تھا اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو دنیا کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ہوائی قلعے بنانے کو حقیقی جدوجہد کا بدل سمجھتے

سے ہیں۔ ہوائی قلعے بنانا اچھا بھی ہے اور بُرا بھی ہے۔ لیکن جس قسم کی زد اس پر پڑتی ہے اس قسم کی زد بچوں کی بناوٹ اور تصنع پر بھی پڑتی ہے۔ مانٹیسوری طریق تعلیم کی پیروی کرنے والے عملاً اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بچے گاڑی گاڑی کھیلیں یا ٹوٹے ہوئے گھڑوں کے گلوں سے بیل بنا کر ہل جوتیں۔ ایسے کھیلوں کو وہ 'تصور کی پریشانی' سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ وہ درست سمجھتے ہیں۔ تصور کی پریشانی تو یہ ہے، چونکہ بچے اصل میں کھیل نہیں کھیلتے، بلکہ وہ اپنے تصور میں گاڑی چلاتے ہیں اور ہل جوتتے ہیں۔ کھیل کے سازو سامان ان کی خوشی کا موجب تو ہیں، لیکن اس کا مقصد اصل میں تعلیم ہی ہوتا ہے۔ یہ خوشی تو تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ خالص کھیل میں، جو محض شغل کے طور سے کھیلے جاتے ہیں، صرف خوشی ہی خوشی ہوتی ہے۔ 'تصور کی پریشانی' کا اعتراض اگر اس قسم کے خالص کھیل پر کیا جائے، تو یہ کچھ زیادتی ہے۔ اسی صورت میں اگر 'بھوت پریت' یا 'عمرو عیار کی گلیم' ایسی کہانیاں سنانے پر بھی یہ اعتراض کیا جائے، تو بجا نہیں۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ بچے اصل میں اور بناوٹ میں فرق نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بات کچھ درست معلوم نہیں ہوتی۔ ہماری نگاہیں جب تصویر کے پردے پر "ہیملٹ" دیکھنے میں لگی ہوتی ہیں، جب ہمارے دل اور دماغ ہیملٹ کی دیوانہ وار حرکتوں میں محو ہوتے ہیں، تو ایسی بے خبری کے لمحوں میں بھی ہمیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس قسم کا ہیملٹ کبھی ہماری دنیا میں موجود تھا۔ ہم اس وقت بھی اُسے شکسپیئر ہی کے دماغ کی مخلوق خیال کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر کھیل دیکھتے وقت ہمیں کوئی یہی بات جتلانے کی بار بار کوشش کرے تو ہمیں اس پر بہت غصہ آتا ہے۔ یہی حال بچوں کا ہے۔ اگر ہم بڑی ہوشیاری کے ساتھ بچوں کو یقین دلانے کی کوشش کریں کہ یہ جو تم جوت رہے ہو، اصل ہل نہیں، تو ان کو بھی غصہ آئے گا۔ لیکن یہ یاد

رہے کہ ان ٹھیکریوں کو اصلی پل وہ بھی نہیں سمجھتے ہیں۔

سچائی بڑی ضروری بات ہے۔ تصور بھی بڑی ضروری چیز ہے۔ لیکن تصور، قوم کی نسبت فرد میں زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھتا اور ترقی پاتا ہے۔ بچے کی جسمانی ضرورتیں اگر ساتھ ساتھ پوری ہوتی جائیں، تو کھیل کی دنیا اُنہیں اصلی دنیا سے کہیں زیادہ دلچسپ معلوم دیتی ہے۔ کھیل میں وُہ بادشاہ بنا ہوتا ہے۔ ایسا بادشاہ، جس کے اختیارات اصلی بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ ان سچ مچ کے بادشاہوں سے زیادہ اچھی طرح اپنی رعایا پر حکومت کرتا ہے۔ لیکن اصلیت کی دنیا میں پہنچ کر اُسے عین وقت پر سونا ہوتا ہے اور بہت سے پریشان کر دینے والے حقائق کو ماننا ہوتا ہے۔ بڑے جب بے سوچے سمجھے ان کے کھیل میں دخل دیتے ہیں، تو ان کی ناراضی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ بچے جب کھیل ہی کھیل میں دیوار بنالیں، تو اُنہیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگ بھی اسے عبور نہیں کر سکتے۔ لیکن جب آپ ایک ہی قدم اُٹھا کر اس سے پار ہو جائیں، تو اُنہیں غصہ اور رنج ہوتا ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جب بچہ بڑوں کا اپنے سے مقابلہ کرتا ہے، تو وہ اپنے کو بہت کمزور پاتا ہے۔ اس کمزوری کو وہ کھیل میں دور کرتا ہے۔ کمزوری کو دور کرنے کی کوشش بھی اتنی ہی ہوتی ہے، جتنی وہ اپنے آپ میں کمزوری محسوس کرتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ بچوں کے کھیل کا وقت اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ اس کے متعلق ہم یہ کہنے لگیں کہ اسے زیادہ بہتر کام میں لگایا جا سکتا تھا۔ اگر بچے کو تمام وقت سنجیدہ باتوں میں مصروف رکھا جائے، تو وہ جسمانی طور پر عضو معطل ہو کر رہ جائیگا۔ کوئی بالغ جب ہوائی قلعے بنانے میں مصروف ہو، تو اُسے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو عملی صورت میں لانے کی بھی کوشش کرو۔ لیکن کوئی بچہ جب اس قسم کے قلعے بنانے میں مصروف ہو، تو اُسے ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں اتنی سمجھ نہیں کہ اپنے تصور کی باتوں کو عمل میں لے آئے۔ وہ اس قسم کی باتوں

حقیقی باتوں کا بدل نہیں سمجھتا، بلکہ برعکس اس کے اسے یہ اُمید ہوتی ہے کہ جب وہ بڑا ہوگا
تو یہ سب کام خود کریگا۔

سچائی کو فرضی یقین سے خلط ملط کر دینا بڑی ہی خطرناک غلطی ہے۔ ہماری زندگی کا انحصا
سراسر عملی باتوں پر ہی نہیں، بلکہ اُمیدوں پر بھی ہوتا ہے۔ سچائی کی وہ قسم جو ہمیں ان عملی باتوں
سے آگے نہیں بڑھنے دیتی، ہماری روحوں کے لیے جیل خانہ ہو جاتی ہے۔ "دن کے خواب" اسی
وقت نفرت کے قابل ہوتے ہیں کہ ہم انھیں اصلیت کا عکس سمجھنے لگیں یا ہم بے حس و حرکت
گھٹنوں میں سر دیے ہوئے یہ فرض کرلیں کہ یہی خواب دنیا میں ہماری نجات کرا دینگے، لیکن
جب یہی خواب ہمیں کام کرنے کی تحریک دلائیں اور ہمیں دنیاوی مقصد حاصل کرنے میں مدد
دیں، تو ہمارے لیے نعمت ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم بچے کے تصوّر کو مٹا دینے کی کوشش کریں گے،
تو ہم اس کو اس قسم کی نعمت سے محروم کر دینگے اور اُسے دنیا کی تمام موجود چیزوں کا غلام بنا دیں گے۔
اسے ہم ایک ایسا جانور بنا دینگے، جو زمین پر رینگتا رہے اور اپنی پرواز کے لیے کبھی کوئی آسمان نہ
بنا سکے۔ اب آپ یہ سوال کر سکتے ہیں:-

کیا یہ آسمان، جو ہم بنانا چاہتے ہیں، ایسے جنوں سے آباد ہوگا، جو بچوں کو کھانے کے
لیے دانت تیز کیے ہوئے ہیں یا وہاں ایسے باشتیے ہونگے، جن کے ہاتھ اپنی بیگمات کے خون میں
رنگے ہوئے ہیں؟

اس سے پہلے کہ ہم تصوّر سے کوئی کام لیں، کیا یہ بات ضروری نہیں کہ ہم اس تصوّر کو
پاک اور صاف کرلیں؟

آپ اپنے بچے کو کیسے اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی کو برباد کرنے کے خیال
میں لذت حاصل کرے۔ کیا آپ اس لطف اور راحت کو جائز سمجھ سکتے ہیں، جو وحشیانہ جذبوں

سے حاصل ہوتی ہے؟

یہ سوال حقیقت میں بڑے ہی اہم ہیں، ہم کوشش کریں گے کہ ان پر تفصیل سے کچھ کہہ سکیں۔ ہماری تعلیم کا یہ مقصد ہے کہ ہم بچوں کے قدرتی جذبوں کی تربیت کریں اور انھیں خاص خاص مطلب پر چلائیں، انھیں دبائیں نہیں۔ انسان کے یہ قدرتی جذبے بہت مبہم ہوتے ہیں اور اس کی تسکین ایک ہی طریقے سے نہیں، بلکہ مختلف طریقوں سے ہو جا سکتی ہے۔ کرکٹ اور بیس بال یہ مختلف کھیل ہیں۔ یہ دونوں ایک خاص قسم کے کھیل کے جذبے کی تسکین کر سکتے ہیں لیکن اس جذبے کی تسکین کے لیے جو لڑکا کرکٹ جانتا ہے، وہ کرکٹ کھیلے گا اور جو بیس بال جانتا ہے، وہ بیس بال کھیلنے لگیگا۔ اس لیے ہماری تعلیم کا بھید، جہاں تک اس کا سیرت کی تربیت تعلق ہے، یہ ہے کہ وہ بچوں کو ایسی مہارتیں بہم پہنچائے کہ وہ ان کے ذریعے اپنے قدرتی جذبو سے ٹھیک ٹھیک کام لے سکیں۔ بچے کے اندر قوت کا ایک قدرتی جذبہ ہے۔ اس جذبہ کی تسکین اس وقت ہو جاتی ہے، جب کہ وہ بادشاہ بن بیٹھتا ہے۔ لیکن یہ خیال کر لینا غلط کہ جوان ہو کر بھی اس بچے کو قوت کے جذبے کی تسکین کے لیے ظالم اور خودمختار بادشاہ بننا جوانی کی حالت میں ایسے جذبے کی تسکین کسی سائنس کی ایجاد یا فنِ لطیف کی تخلیق سے ہوتی یا اس ذریعے سے کہ وہ خود اپنے ایک بچے کی معقول طریق سے تربیت کر کے اسے کامیاب انسان بنا دے۔ اس قسم کے اور بھی بہت سے مشغلے ہیں، جو اس جذبے کی تسکین کر سکتے اگر ایک بچہ صرف لڑنا ہی جانتا ہے، تو اس کے اس جذبے کی تسکین جنگ کے میدان میں سے ہولی کھیلنے میں ہوگی۔ ایک بچہ جو اس بات کا شوقین ہے کہ اپنی کتابوں کو پھاڑے تو یہ چیر پھاڑ کا جذبہ اسے کامیاب جراح بنا دیگا۔ اگر بچے کی قوت حاصل کرنے کی خواہش میں روک دی جائے تو وہ بڑا ہو کر سست اور کاہل ہوگا۔ اس سے نہ کسی کو فائدہ ہوگا نہ

سماج کا ایک معطل عضو ہوگا۔ دنیا کو اس قسم کے انسانوں کی ضرورت نہیں۔ بچہ جب تک
ٹا ہے، وہ قدرتی طور پر بچوں والی باتیں کریگا۔ اچھی بھی باتیں کریگا اور ایسی بھی جو اچھی نہیں
ں۔ اکثر ایسی باتیں کریگا، جس سے آپ کو نقصان بھی ہو۔ اسے اپنے تصور سے کام لے کر
ت پرانے وقتوں کے غیر مہذب لوگوں کی سی حرکتیں کرنا چاہییں۔ یہ آپ ہرگز خیال نہ کریں کہ
اسی طرح ہمیشہ کے لیے قائم رہیں گے۔ اگر آپ رفتہ رفتہ ان کے قدرتی جذبوں کی تسکین کے
لیے زیادہ اچھے اسباب مہیا کرتے رہیں گے اور انھیں مہارت حاصل کرنے کے لیے زیادہ بہتر
موقعے بہم پہنچائیں گے، تو ان کے ذوق اور شوق کی سطح بہت بلند ہوتی جائیگی۔ میں جب بچہ
تھا، تو قلابازیاں کھانا بہت پسند کرتا تھا۔ اب میں ایسا نہیں کرتا ہوں، لیکن اس کو بہت برا
بھی خیال نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ بچہ جو بالشتیہ بن کر ظلم کرنا پسند کرتا ہے، اس کا مذاق بھی
بدل جائیگا اور وہ قوت کے جذبے کی تسکین کے لیے اچھے اچھے ذریعے تلاش کریگا۔ اگر بچپنے میں
مناسب تحریکوں کے ذریعے تصور کو زندہ اور قائم رکھا گیا ہو، تو بڑے ہو کر بھی یہ تصوّر قائم رہتا
ہے اور ترقی بھی کرتا ہے۔ اس وقت یہ تصور اپنے منشا اور رجحان کے موافق استعمال کیا جاسکتا ہے۔
یہ ایک بے فائدہ سی بات ہے کہ آپ اخلاق کا سبق اس وقت سے دینا شروع کردیں، جب کہ
آپ کے اس سبق کی بازگشت بھی نہ ہو سکے اور نہ ہی بچے کے روزمرہ میں اس کی چنداں ضرورت
ہی ہو۔ یہ سبق آئندہ زندگی میں رکاوٹ پیدا کرنے کے موجب ہونگے، جب کہ واقعی ان کی
ضرورت ہوتی ہے۔

بچہ جب کچھ بڑا ہوتا ہے، تو اس کے کھیل، بچپنے کے کھیل سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ اب
ان کھیلوں میں ایک دوسرے پر برتری پانے کا خیال بھی شامل ہو جاتا ہے۔ بچہ شروع میں جو کھیل
کھیلتا ہے تنہا کھیلتا ہے، اس میں کوئی دوسرا شامل نہیں ہوتا۔ بالکل ننھے بچے کے لیے بڑے

بہن بھائیوں کے کھیل میں شریک ہونا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں
وہ اپنے خاص کھیل کو چھوڑ دیتا ہے۔ اب وہ ایسا کھیل کھیلنے لگتا ہے، جس میں دوسروں
بھی حصہ ہو۔ اس مشترکہ کھیل سے اُسے اتنی زیادہ دلچسپی ہوتی ہے کہ اپنے پہلے کھیل کی ساری دلچسپی
بھول جاتا ہے۔ آج کل ہمارے اسکولوں میں کھیلوں کو بڑی اہمیت دی جارہی ہے۔ اس میں کو
شبہ نہیں کہ ان کھیلوں کے فائدے بھی ہیں، لیکن ان کی اہمیت کو ضرورت سے زیادہ بڑھا دیا گ
اسکول کے کھیل بچوں کی صحت کے لیے بہت مفید ہیں، بشرطیکہ ان کھیلوں میں زیادہ مہارت
ضروری نہ سمجھا جائے۔ اگر زیادہ مہارت کا خیال رکھا جائے، تو صرف اچھے کھلاڑی ہی اس
حصہ لے سکتے ہیں۔ دوسرے اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہاکی، فٹ بال، والی بال، باسک
بال، کرکٹ وغیرہ سبھی طالب علم نہیں کھیلتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ان کھیلوں میں مہارت
زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ زیادہ تعداد اُن طالب علموں کی ہوتی ہے، جو غریب دور ہی
کھڑے ہو کر دیکھنے میں لطف لیتے ہیں۔ ان کھیلوں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ بچوں کے اگر
معمولی سی چوٹ آجائے، تو وہ ہائے وائے کیے بغیر اس کو سہہ گزرتے ہیں۔ تکان کی پریش
اُنھیں ہوتی تو ہے، لیکن وہ خوشی خوشی اسے برداشت کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ ان کھیلوں
بعض اور فائدے بھی بیان کیے جاتے ہیں یعنی یہ کہ ان سے ایک دوسرے کی مدد کے
احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ باہمی مدد کا احساس تو پیدا ہوتا ہے
رنگ اس میں مقابلے کا ہوتا ہے۔ اس باہمی مدد کی صورت تو جنگ کی سی ہوتی ہے جہاں
دوسرے پر برتری پانے کے لیے کھینچ تان ہوتی ہے۔ ایسی باہمی مدد نہیں، جو صنعت
کاروبار یا سماجی تعلقات میں ایک دوسرے کو دی جاتی ہے۔ ہماری سائنس کی موجودہ
ہمارے اقتصادی معاملوں اور بین الاقوامی سیاستوں میں یہ بات بڑی حد تک آسان کر

اپنے کی کھینچ تان جاتی رہے اور اس کی جگہ باہمی مدد حاصل کرے لیکن اس میں بھی شک نہیں جہاں مقابلے کا احساس (جنگ اور نزاع کی صورت میں) موجود ہے۔ وہ اس سائنس کے طفیل پہلے سے بھی زیادہ خوفناک ہو گیا ہے۔ اس نتیجے کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے اب یہ بات اور زیادہ ضروری ہو گئی ہے کہ ہم ایسے کاموں کو رواج دیں، جو مشترکہ ہوں۔ ایسے مشترکہ کاموں میں ہمارا واسطہ دوسرے لوگوں سے نہیں ہوتا، جن میں جیتنے والے بھی ہوتے ہیں اور ہارنے والے بھی، بلکہ ہمارا واسطہ براہ راست قدرتی چیزوں سے ہوگا۔ اس بات پر زیادہ زور دینا بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ یہ مقابلے کا خیال بھی قدرتی ہوتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ذریعہ تو ضرور ہونا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ اچھا ذریعہ یہی کھیل وغیرہ ہو سکتے ہیں، تو گویا ہمارے بیان کے مطابق بھی اسکولوں میں یہ کھیل ہونا تو ضرور چاہییں۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ انھیں ہمارے نصاب میں بہت اونچا درجہ دے دیا جائے۔ آپ بچوں کو کھیلنے دیں۔ اس لیے کہ وہ خود کھیلنا چاہتے ہیں، اس لیے نہیں کہ آپ انھیں کھلانا چاہتے ہیں۔

کسی پچھلی قسط میں خوف پر غلبہ پانے اور جرأت دلانے کی اہمیت کھول کر بیان کی گئی تھی۔ لیکن جرأت ایسی نہ ہونا چاہیے کہ بربریت کی حد تک جا پہنچے۔ بربریت تو نام ہے ایک لذت کا، جو اپنے منشا کو دوسروں کے ارادوں پر ٹھونسنے میں حاصل ہوا کرتی ہے۔ جرأت وہ ہے، جو ذاتی تکلیف یا مصیبت کی پروا نہ کرے۔ اگر موقع ملے تو میں بچوں کو تعلیم دوں گا کہ اپنی چھوٹی کشتیوں کو دریا کے عین وسط میں لے جاؤ، تاکہ وہاں اس کی گہرائیوں میں کود سکو۔ موٹر اور بگھی خود چلاؤ۔ اگر ہو سکے، تو ہوائی جہاز بھی خود چلاؤ۔ مشین اگر بنا سکو، تو خود بناؤ اور سائنس کے نئے نئے تجربے کرو، اس میں تمھیں زندگی خطرے میں ڈالنا پڑے، تو ڈرو نہیں۔ کھیل میں بچوں کا آمنا سامنا قدرت کی بے شعور اشیا سے کرانا چاہیے اور انھیں یہ بھی بتانا چاہیے، تمھارے مدمقابل یہ چیزیں ہیں،

انسان نہیں۔ قوت حاصل کرنے کی خواہش اپنی تسکین جیسے کہ دوسرے انسانوں سے مقا
کرنے میں پاتی ہے، قدرتی اسباب سے مقابلہ کرنے میں بھی حاصل کر سکتی ہے۔ اس قسم
مقابلوں میں حاصل کی ہوئی مہارت، کرکٹ یا فٹ بال کی مہارت سے زیادہ فائدہ مند۔
اس طرح سیرت کی جو تربیت ہوگی، وہ ہمارے سماجی اخلاق کے عین مناسب ہوگی اگر ا
کے کھیلوں پر زیادہ زور دیا جائے، تو اس کا ذہانت پر اچھا اثر نہیں پڑیگا۔

اسکول کے کھیلوں کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ طالب علموں کو چھوٹے چھوٹے گروہ
تقسیم کر دیا جاتا ہے اور گروہ داران میں قابلیت اور مہارت پیدا کرنے کی کوشش کی جا
اسے عام لوگ اچھا سمجھتے ہیں، لیکن میری نگاہ میں مجموعی حیثیت سے برا ہے۔ معلم اسے
پسند کرتے ہیں۔ چونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کے ذریعے برے ارادوں کو اچھے عملوں میں تب
کر لیا جا سکتا ہے۔ اگر کوشش کی جائے، تو انھیں یہ کہہ کر "دیکھو، تمھیں اپنے ساتھ
گروہ سے آگے بڑھنا ہے" بہت کچھ ابھارا جاتا ہے۔ مشکل اس میں یہ ہے کہ بچوں کو
کے لیے ایسا تحرک میسر نہیں آتا، جس میں مقابلے کا خیال نہ آئے۔ حیرانی کی بات یہ
مقابلہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں بے طرح رچا ہوا ہے۔ ہمارا کوئی شغل، ہمارا کوئی کام
کی کھینچ تان سے بچا ہوا نہیں ہے۔ کوئی کام اس کے خالص تعمیری پہلو سے نہیں کیا
اس غرض سے نہیں کیا جاتا کہ لوگ اپنے اپنے فرض قابلیت کے ساتھ انجام دے
ہمارے کھیلوں کی موجودہ صورت میں مقابلے کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ اگر ہم چاہیں
دنیا کے کام کاج میں مقابلے کی جگہ باہمی مدد حاصل کرلے، تو پھر ہمیں اپنے اسکو
میں بھی تبدیلی کرنا ہوگی۔

بچوں کی تعلیم

(افلاطون کی نظر میں)

از

چوہدری نذیر احمد، ایم اے

بالعموم ہر کام کے سرانجام دینے میں اُس کام کی ابتدا نہایت ہی اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ انگریزی کا مقولہ ہے کہ "ایک کام کی اچھی ابتدا ہو جائے، تو سمجھ لو کہ آدھا کام ختم ہو گیا"۔ اس لیے ہمیں بچوں کی تعلیم کی ابتدا کو بہت ہی اہم سمجھنا چاہیے۔ بچوں کی تعلیم ایک عمارت کی مانند ہے۔ جس کی اگر پہلی اینٹ غلط رکھی جائے، تو ساری عمارت کا نقشہ غلط ہو جائیگا، جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج

افلاطون کے خیال کے مطابق بچوں کی تعلیم کی ابتدا بہت ہی چھوٹی عمر سے ہو جاتی ہے اور ہم وہ تعلیم کہانیوں کے ذریعہ سے شروع کرتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ گھر میں بالکل چھوٹے چھوٹے بچے کہانیوں کے کس قدر شائق ہوتے ہیں اور وہ چڑیا اور کوّے کی کہانی سن کر یا لہٰذا کر پھولے نہیں سماتے۔ تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ کہانیوں کے متعلق پوری پوری احتیاط کریں۔ یہ مضمون افلاطون کی کتاب "جمہوریت" کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ اس میں اُس نے کہانیوں کے متعلق ہی بحث کی ہے کہ اُن کا آئندہ عمر میں بچوں پر کیا اثر پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

[ایک صحبت میں سقراط اور اُس کے شاگرد بیٹھے تھے۔ ان میں یہ باتیں ہو رہی تھی کہ بہترین حکومت کون سی ہو سکتی ہے اور حکومتِ جمہور کسے کہتے ہیں حکومت کی طرف سے افراد پر کیا کیا فرائض عاید ہوتے ہیں اور افراد کی طرف سے حکومت کن کن باتوں کی جواب دہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ باتوں باتوں میں یہ بات چل نکلی کہ افراد کی تعلیم کیسی ہونا چاہیے۔]

ایک شاگرد۔ "اس سے پہلے کہ ہم معلوم کریں کہ کسی ریاست میں "بے انصافی" کہاں سے آجاتی ہے، ہمیں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کسی حکومت کے افراد کی تعلیم کیسی ہونا چاہیے"۔

سقراط نے کہا۔ "بہت خوب۔ آؤ، کچھ دیر کہانیاں سُننے اور سنانے میں بسر کریں اور ہماری کہانیاں افراد اور اُن کے نمائندوں کی تعلیم کے متعلق ہونگی"۔

سارے شاگرد۔ "بہت خوب، جناب۔ بہت خوب"۔

پہلا شاگرد۔ "اور اُن کی تعلیم کیا ہوگی؟ کیا ہم موجودہ تعلیم (جس میں صرف دو چیزیں، روح کے لیے موسیقی اور بدن کے لیے جمناسٹک شامل ہیں) سے بہتر کوئی اور نظام تعلیم کر سکتے ہیں؟"

سقراط۔ "ہاں"

دوسرا شاگرد۔ کیا ہمیں موسیقی سے تعلیم کی ابتدا کرنا چاہیے اور پھر جمناسٹک کی طرف جانا چاہیے

سقراط۔ "ہاں"

تیسرا شاگرد۔ "اور کیا آپ موسیقی میں علم ادب کو بھی شامل سمجھتے ہیں؟"

سقراط۔ "کیوں نہیں"۔

چوتھا شاگرد۔ "اور علم ادب میں تو جھوٹ اور سچ دونوں شامل ہیں؟

س۔ "ہاں! اور بچوں کو دونوں قسم کا علم اور ب سکھانا چاہیے اور ہم عموماً جھوٹ سے شروع کرتے ہیں"۔

ش۔ "وہ کیسے؟"

س۔ "تم جانتے ہو کہ ہم بچوں کو بہت چھوٹی عمر سے ہی کہانیاں سُنانا شروع کرتے ہیں اور اگرچہ وہ تمامتر جھوٹ نہیں ہوتیں۔ مگر اُن کا زیادہ حصہ جھوٹ ہی ہوتا ہے اور ہم یہ کہانیاں اُس عمر سے اُن کو سُنانا شروع کرتے ہیں، جبکہ وہ ابھی جمناسٹک سیکھنے کے قابل ہی نہیں ہوتے"۔

ش۔ "جی ہاں"۔

س۔ "تمھیں اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ ہر کام کی ابتدا بہت ہی اہم چیز ہوتی ہے۔ خصوصاً ایک نوعمر اور نازک بچے کی تعلیم کی ابتدا۔ کیونکہ چال چلن کے بننے اور ہر قسم کا اثر فوراً قبول کرنے کے یہی دن ہوتے ہیں"۔

ش۔ "بے شک"

س۔ "تو کیا ہم یہ گوارا کریں گے کہ بچے ہر قسم کی جھوٹی سچی کہانیاں غیر ذمہ دار شخص سے سُن سُن کر وہ تاثرات قبول کرلیں۔ جو ہم نہیں چاہتے کہ اُن کی بڑی عمر میں اُن کے دلوں پر مسلط ہوں"۔

ش۔ "واقعی یہ گوارا نہیں کرسکتے"۔

س۔ "تب بچوں کی تعلیم کے متعلق ہمیں سب سے پہلے اس بات کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ کہانیوں کے موزوں یا ناموزوں قرار دینے کے لیے ایک کمیٹی قائم کریں، جو اچھی کہانیوں کو منظور کرے اور بُری اور ناموزوں کہانیوں کا استعمال کرنے سے بچوں کی مائیں اور دایہ

اس امر کا خاص خیال رکھیں کہ اُن کے بچّے صرف موزوں کہانیاں ہی سُننے پائیں اور اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ بچّوں کے دل اور دماغ کی تربیت کرنے کے لیے اُن کے جسم کی تربیت کرنے کی بہ نسبت زیادہ احتیاط کرنی چاہیے اور مروّجہ کہانیوں میں سے بہت سی خارج کر دینی چاہییں"۔

ش ۔"جناب آپ کون سی کہانیوں کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں"۔

س ۔"میرا مطلب یہ ہے کہ وہ خواہ معمولی شاعروں نے وضع کی ہوں یا ہومر اور ہیسیئڈ جیسے مشہور شاعروں نے"۔

ش ۔"جناب، میرا مقصد اس سوال سے یہ تھا کہ آپ مروّجہ کہانیوں میں کیا نقص دیکھتے ہیں"۔

س ۔"ان میں ایک ہی مضرت رساں نقص ہے، یعنی جھوٹ"۔

ش ۔"اور وُہ نقص کب پیدا ہوتا ہے؟"

س ۔"جب کہ دیوتاؤں یا بزرگوں کی فطرت کو غلط طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مصوّر ایسی تصویر بناتا ہے، جسے اصل سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا"۔

ش ۔"جی ہاں۔ واقعی اس قسم کی چیز قابلِ الزام ہے۔ مگر ایسی کون کون سی کہانیاں ہیں، جن میں یہ نقص پایا جاتا ہے؟"

س ۔"سب سے پہلے وہ کہانیاں لو۔ جن میں شاعروں نے دیوتاؤں کی نسبت جھوٹ موٹ فسانے گھڑے ہیں۔ مثلاً ہیسیئڈ نے یورے نس اور کرانس کی نسبت جو فسانہ وضع کیا ہے، وہ بہتر ہے کہ بچّے نہ سُنیں"۔

ش ۔"واقعی۔ ایسی کہانیاں قابلِ اعتراض ہیں"۔

س ۔"یقیناً ایسی کہانیاں ہماری حکومت میں نہیں ہونی چاہییں۔ جن سے بچّے کے دل پہ

یہ خیال بیٹھ جائے کہ اگر وہ بڑے سے بڑا جرم کریں یعنی وہ اپنے باپ کو اُس کی غلطی پر سزا دیں، تو وہ کوئی بُرا کام نہیں کر رہے، کیونکہ اُن کے سب سے بڑے دیوتا نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔"

ش۔ "جناب۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ واقعی ایسی کہانیوں کا دہرانا مضر ہے۔"

س۔ "اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے آئندہ حاکم اور محافظ لڑائی کو ایک نہایت بُرا فعل خیال کریں، تو ہمیں آج بچّوں کو اُن کہانیوں کا ایک لفظ بھی نہیں سُنانا چاہیے، جن میں آسمانی لڑائیوں کا ذکر ہے اور جن میں دیوتاؤں کی ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کا ذکر ہے اور جو تمام سراسر غلط ہیں۔ نہ ہی ہمیں جنّوں کی لڑائیوں کا حال سُنانا چاہیے۔ نہ ہی ایسے واقعات کی تصویریں کپڑے پر کاڑھ کے دکھانا چاہیے اور ہمیں دیوتاؤں اور بزرگوں کی اُن تمام لڑائیوں کے متعلق، جو اُنھوں نے اپنے رشتے داروں یا دوستوں کے ساتھ کیں، بھی خاموش رہنا چاہیے۔ اگر ہم بچّوں کو یقین دلا سکیں، تو اُنھیں یہ ہی بتانا چاہیے کہ مہذب آدمیوں کے درمیان کبھی کوئی لڑائی ہوئی ہے نہ ہوگی۔ جب وہ ذرا سمجھ دار ہو جائیں، تو ایسے رزمیہ افسانے جن میں لڑائیوں کے واقعات، خواہ ان کے کچھ ہی معنے لیے جاتے ہوں، ہرگز اُن کو نہ سُنائے جائیں۔ یہ نہایت ہی اہم بات ہے کہ نوعمری میں وہ ایسے قصّے کہانیاں سُنیں، جو اُن کے دلوں میں نیکی اور نیک چلنی کے خیالات پیدا کر سکیں اور پاک طینتی کا نمونہ ہوں۔"

ش۔ "آپ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص یہ پوچھے کہ ایسے نمونے کہاں سے ملتے ہیں، تو ہم اس کو کیا جواب دیں؟"

س۔ "میں تو اُسے یہی جواب دُونگا کہ کہانیاں وضع کرنا شاعروں کا کام ہے، نہ کہ حکومت

کے قوانین وضع کرنے والوں کا۔ تاہم ہر ایک کو یہ ضرور علم ہونا چاہیے کہ وہ کون سے سانچے ہیں۔ جن میں شعراء اپنی کہانیوں کو ڈھال سکتے ہیں۔"

ش۔ "جی ہاں۔ فرمائیے۔ وہ کون سے سانچے ہیں؟"

س۔ "مثلاً خدا کو لوگوں کے سامنے بالکل ایسا ہی پیش کیا جائے۔ جیسا کہ وہ ہے۔"

ش۔ "بالکل بجا ہے، جناب۔"

س۔ اور کیا خدا سراسر نیکی نہیں ہے اور کیا اُسے ایسا ہی پیش نہیں کرنا چاہیے؟"

ش۔ "یقیناً۔"

س۔ "اور نیکی تو کبھی نقصان نہیں پہنچاتی۔"

ش۔ "بے شک۔"

س۔ "جو نقصان نہ پہنچائے، وہ گویا بدی نہیں کرتا۔"

ش۔ "بے شک۔ نہیں۔"

س۔ "اور وہ شخص جو بدی نہیں کرتا۔ کیا کسی بدی کا موجب ہو سکتا ہے؟"

ش۔ "ناممکن ہے۔"

س۔ "اور نیکی سراسر فیض ہے۔"

ش۔ "جی ہاں۔"

س۔ "اور اسی وجہ سے اچھے کاموں کا سرچشمہ ہے۔"

ش۔ "جی ہاں۔"

س۔ پس اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ نیکی تمام قسم کے کاموں کا باعث نہیں ہو سکتی، بلکہ صرف نیک کاموں کا۔

ش ۔ "یقیناً"

س ۔ "تب خدا (بشرطیکہ وہ سراسر نیکی ہے) تمام اچھے بُرے کاموں کا کرانے والا نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ وہ صرف نیک اعمال کا ذمے دار ہے اور اس وجہ کو کہ ہم میں بُرائی یا بد افعال کہاں سے آ گئے۔ کہیں اور تلاش کرنا چاہیے۔"

ش ۔ "بات تو معقول نظر آتی ہے۔"

س ۔ "تب ہمیں شعرا کا اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ جب وہ یہ کہیں کہ خدا اور دیوتا ہمارے ہر قسم کے اچھے یا بُرے افعال کے ذمے دار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خدا ہمارے بُرے کاموں کی سزا ضرور دیتا ہے۔ مگر وہ ہمیں مجبور نہیں کرتا کہ ہم بُرے کام کریں۔ پس بچوں کی کہانیوں کے متعلق ہمارا پہلا اصول یہ ہُوا کہ خدا مجسم نیکی ہے۔ نیک کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔ بُرے کاموں کی سزا دیتا ہے اور انسان کو بُرے کام کرنے پر کبھی مجبور نہیں کرتا، اس لیے اُسے کہانیوں میں بھی بطور مجسمۂ نیکی پیش کیا جائے۔"

ش ۔ "جناب ۔ یہ تو آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔"

س ۔ "اب کیا تمھیں معلوم ہے کہ کہانیوں کے متعلق ہمارا دوسرا اصول کیا ہے؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ آیا خدا ایک جادوگر ہے۔ کبھی کوئی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کبھی کوئی رُوپ بدل لیتا ہے اور اس طرح شکل اور لباس کی تبدیلی سے ہمیں دھوکا دیتا ہے یا یہ کہ وہ ایک مستقل اور ناقابلِ تبدیل ہستی ہے؟"

ش ۔ "جناب میں آپ کے سوال کا جواب پورے طور پر نہیں دے سکتا۔"

س ۔ "اچھا، تو میرا یہ مطلب ہے کہ ہم کسی چیز کو تبدیل ہونے والی سمجھتے ہیں، تو ہم اُس کی تبدیلی کے متعلق دو خیالات دل میں لاتے ہیں، یا تو وہ چیز اس قسم کی صفات رکھتی ہے"

جو خود بخود اُسے تبدیل کر دیتی ہیں یا کوئی بیرونی طاقت اُسے تبدیل کر دیتی ہے۔"

ش - "یقیناً۔"

س - "اور وہ چیزیں جو بہمہ وجوہ مکمل ہیں، ناقابلِ تبدیل ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک بالکل تندرست آدمی خاص خوراک کھانے پینے سے کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہو جاتا یا ایک مضبوط اور بے روگ درخت پر گرمی اور ہوا کچھ زیادہ اثر نہیں کرتی۔"

ش - "بے شک۔"

س - تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک اعلیٰ دل و دماغ پر بیرونی حالات اثر انداز ہو سکیں۔"

ش - "بہت ہی کم۔"

س - "پس ہر وہ چیز جو مجسّم نیکی ہے، خواہ وہ قدرتی ہو یا مصنوعی، بیرونی اثرات سے بالکل محفوظ ہے۔"

ش - "جی ہاں - بے شک۔"

س - "اور اس بات کو ہر شخص جانتا ہے کہ خدا اور دیوتا ہر لحاظ سے مکمل ہیں۔"

ش - "بے شک، وہ مکمل ہیں اور مجسّم نیکی ہیں۔"

س - "تب وہ بیرونی اثرات سے بالکل محفوظ ہیں اور موقع اور محل دیکھ کر اپنے آپ کو تبدیل نہیں کر لیتے۔"

ش - "واقعی - سچ ہے۔"

س - پس کہانیوں کے متعلق دوسرا اصول یہ ہُوا کہ اُن میں یہ نہ بتایا جائے کہ خدا اور دیوتا بھیس بدل بدل کر ملکوں کی سیر کرتے پھرتے ہیں یا فقیرانہ شکل اختیار کر کے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ کیونکہ ایسی کہانیاں بچّوں کو بزدل بنا دینگی اور ہر مکر و ریا کے پتلے کو بھیس بدلا ہُوا دیوتا خیال کریں گے اور اس طرح سے اپنے علاقے کو گداگروں اور دوسرے مکاروں سے

پاک وصاف نہیں کر سکیں گے۔"

ش ۔"خدا نہ کرے کہ ہماری آئندہ نسلیں بدعمل ہوں اور ایک شہری کے فرائض سرانجام دینے سے قاصر ہوں۔"

س ۔"اور کیا تم یہ خیال کر سکتے ہو کہ خدا جھوٹ بولتا ہے یا جھوٹ موٹ کوئی کام کرتا ہے یا دیوتا ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہیں؟"

ش ۔"جناب دیوتا اور خدا تو ایک طرف، جھوٹ کو تو انسان بھی ناپسند کرتا ہے۔"

س ۔"بے شک، مگر کیا انسان کے لیے جھوٹ بعض موقعوں پر مفید ثابت نہیں ہوتا، مثلاً اپنے دشمنوں کے ساتھ معاملات میں جھوٹ کئی بُرے واقعات سے آدمی کو بچا لیتا ہے۔ یا چونکہ ہم ابتدائی زمانوں کے تمام حالات صحیح طور پر نہیں جانتے، اس لیے ہم مذہبی روایتوں میں جھوٹ کو داخل کر لیتے ہیں اور وہ جھوٹ آہستہ آہستہ سچ کا مرتبہ اختیار کر لیتا ہے۔"

ش ۔"بے شک۔"

س ۔"مگر کیا یہ امور ہم خدا پر عاید کر سکتے ہیں۔ کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ خدا ابتدائی زمانوں کے حالات سے ناواقف ہے اور اس وجہ سے اُن کے متعلق جھوٹ گھڑ لیتا ہے۔"

ش ۔"نہیں جناب۔ اس بات پر تو ہم یقین نہیں رکھتے۔"

س ۔"تب خدا کے متعلق جو ہمارے خیالات ہیں۔ ان میں ایک جھوٹے شاعر کو (کہ جن کے متعلق احسنہ اکذبہ مشہور ہے) مطلقاً کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔"

ش ۔"درست ہے جناب۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔"

س ۔"تب یہ کہانیوں کی ایک دوسری طرز ہے یا ایک دوسرا سانچہ ہے، جس میں کہانیوں کو ڈھالنا چاہیے۔ یعنی ہمیں وہ تمام کہانیاں اپنے بچوں کے نصاب سے خارج کر دینی

چاہییں۔ جن میں شاعروں نے خدا اور دیوتاؤں کی طرف جھوٹ کو منسوب کیا ہے اور ہمارے بچوں کے اُستادوں کو چاہیے کہ ایسی کہانیاں کسی وجہ سے بھی بچوں کو نہ سنائیں۔ جن سے بچوں کے دل میں یہ خیال بیٹھ جائے کہ اُن کے بزرگ یا دیوتا آڑے وقتوں میں جھوٹ کی پناہ لیتے رہے ہیں۔ تاکہ ہمارے بچے خدا اور دیوتاؤں کی پوری پوری عزت کریں اور اُن کے سچے پرستار بنیں۔"

ش۔ "میں بالکل ان اصولوں سے متفق ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر ان پر کاربند رہونگا اور دوسروں کو کاربند رہنے کی ترغیب دونگا۔"

س۔ "پس دینیات کے لحاظ سے تو کہانیوں کے متعلق ہمارے ایسے ہی اصول ہونے چاہییں۔ بعض کہانیاں (جو سنانے کے قابل ہیں) ہم اپنے بچوں کو سنائیں اور بعض کہانیاں (جن کے متعلق اوپر بحث ہو چکی ہے) ہم اپنے بچوں کو کبھی نہ سنائیں۔ کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ بڑے ہو کر اپنے دیوتاؤں اور بزرگوں کی پوری پوری عزت کریں۔

ش۔ "جی ہاں، اور میرا خیال ہے کہ ہمارے یہ اصول بالکل درست ہیں۔"

س۔ "لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے بلند ہمت اور عالی حوصلہ ہوں، تو کیا اُنھیں کوئی اور سبق بھی کہانیوں سے نہیں سیکھنا چاہیے؟ یعنی، ایک بلند ہمت کے دل میں موت کا خوف جاگزیں ہونا چاہیے؟"

ش۔ "بالکل نہیں۔"

س۔ "کیا وہ آدمی (جس کے دل میں یہ خیال جم گیا ہو کہ موت کے وقت اور موت کے بعد دوسرے جہان میں بہت ہی تکلیفیں ہیں) لڑائی کے وقت موت کو شکست اور غلامی پر ترجیح دے گا؟"

ش ۔ "ناممکن ہے۔"

س ۔ "تب ہمیں اس قسم کی کہانیوں سے بھی پرہیز کرنا چاہیے، جن سے آدمی کے دل میں موت کا ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ بلکہ ہمیں یہ بات اپنے آئندہ سپاہیوں کے دل نشین کرنی چاہیے کہ اپنے ملک پر قربان ہونا نہایت اچھا کام ہے اور اس قسم کی موت کے بعد آدمی اس دنیا کی بہ نسبت زیادہ سکھ پاتا ہے۔"

ش ۔ "بے شک، یہ ذہن نشین کرنا ہمارا عین فرض ہے۔"

س ۔ "پس ہمیں ایسے تمام اشعار اپنی کہانیوں سے خارج کر دینے چاہییں، جو ہمیں بتاتے ہیں کہ

"دوزخ میں صرف عذاب ہی عذاب ہے اور اس عذاب سے چھٹکارا محال ہے۔" یا

"کاش کہ میں دنیا میں ایک ایسے بیکس غلام کی سی زندگی بسر کر لیتا، جس کے پاس کوئی دنیاوی سامان نہیں اور جس کا کوئی ٹھکانا نہیں، مگر موت کے عذاب سے بچ سکتا۔" یا

"اُس نے ایک نہایت ڈراؤنی چیخ ماری اور اُس کی روح ایک خوفناک دھواں بن کر زمین میں سما گئی۔" وغیرہ وغیرہ۔

ش ۔ "بے شک، ہمارے نوجوانوں پر موت کا اتنا خوف طاری نہیں ہونا چاہیے۔"

س ۔ "موت کے خوف کے علاوہ ہمیں کہانیوں سے وہ خوفناک نام بھی خارج کر دینے چاہییں، جو سکراتِ موت کو زیادہ ہولناک بنا دیتے ہیں۔"

ش ۔ "واقعی، یہ نام موت کو اور بھی بھیانک بنا دیتے ہیں۔"

س ۔ اور کیا ہمیں اپنے مشہور آدمیوں کے متعلق یہ سننا چاہیے کہ وہ مصیبت کے وقت بے شمار گریہ وزاری کرتے رہے ہیں؟"

ش ۔ "بے شک، نہیں"۔

س ۔ "ذرا سوچو، تو ہمارا اصول تو یہ ہے کہ اچھے آدمی موت سے بھی نہیں ڈرتے۔ نہ ہی کسی اپنے دوست کی موت کو اتنا المناک قرار دیتے ہیں"۔

ش ۔ "جی ہاں۔ ہمارا اصول تو یہی ہے"۔

س ۔ "پس ایک دانا آدمی کو اپنے کسی عزیز یا دوست کی وفات پر اس قدر گریہ وزاری نہیں کرنا چاہیے، جس سے لوگوں کو معلوم ہو کہ اسے بہت ہی صدمہ پہنچا ہے اور یہ اس بوجھ کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے"۔

ش ۔ "جی، واقعی ایک دانا کو اتنا بیقرار اور بے صبر نہیں ہونا چاہیے"۔

س ۔ "ایسا آدمی اپنے لیے خود کشی کا سامان کر لیتا ہے اور دوسروں کا محتاج نہیں ہوتا کہ وہ آکر اس کا غم غلط کریں"۔

ش ۔ "حقیقت تو یہی ہے، جناب"۔

س ۔ "ایسے آدمی اپنے بھائی، بیٹے یا کسی اور عزیز کی موت کو صبر اور حوصلے سے برداشت کرتے ہیں اور مال و زر کا نقصان بھی اُن کے دل کے قرار اور اطمینان کو تباہ نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے ایسے آدمی صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے اور رونے دھونے اور ماتم وغیرہ سے اپنی کمزوری کا اظہار نہیں کرتے"۔

ش ۔ "جی ہاں، واقعی"۔

س ۔ "تب ہمیں ہومر اور دوسرے شاعروں کی اُن کہانیوں کی طرف مطلق توجہ نہیں دینا چاہیے

جن میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ بڑے بڑے مشہور آدمی مصیبت کے وقت زار زار روتے رہے ہیں، حتیٰ کہ اچی لس (جو کہ ایک دیوی کا لڑکا ہے) کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ "ایک موقعہ پر وہ کس قدر بیقرار اور مضطرب ہُوا۔ کبھی اس پہلو لیٹتا تھا، کبھی اُس پہلو۔ آخر جب کروٹیں بدلنے سے بھی قرار نہ آیا، تو اُوندھے مُنہ گر پڑا اور زار زار رویا اور پھر غم و غصّے سے پاگل ہو کر ایک بحرِ ناپیدا کنار میں اپنی کشتی کو ڈال دیا اور ایک ویران اور سنسان ساحل پر پہنچ کر راکھ اور ریت کی مٹھیاں بھر بھر کر اپنے سر میں ڈالتا تھا اور زار زار روتا تھا" وغیرہ وغیرہ

ش ۔ "جی ہاں، سچ ہے۔ ایسی کہانیاں سُن سُن کر ہم بھی صبر و قرار اختیار نہیں کر سکتے"

س ۔ ہمیں خوشی اور غم دونوں حالتوں میں باوقار رہنا چاہیے۔ نہ تو یہ ہو کہ غم کی وجہ سے چیخیں مار مار کر رو رہے ہیں اور نہ ہی یہ کہ خوشی کے موقع پر اتنا کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں"۔

ش ۔ جی ہاں، واقعی۔ ہمارے دل و دماغ کا توازن قائم رہنا چاہیے۔

س ۔ "اور ہمارے نوجوانوں کو راستباز ہونے کے علاوہ پرہیزگار بھی ہونا چاہیے اور پرہیزگاری میں دونوں باتیں شامل ہیں۔ بزرگوں اور بڑوں کی اطاعت اور اپنے نفس پر قابو، اس لیے ہمیں ایسے اشعار اور ایسی کہانیاں، جن میں شراب اور دیگر منشیات کی تعریفوں کے پُل باندھے گئے ہوں، نہیں سُننا چاہییں"۔

ش ۔ "جی ہاں، مَیں اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں"

س ۔ اور تمھارا زیئس کی اُس کہانی کے متعلق کیا خیال ہے" کہ جب ایک رات وہ اکیلا جاگ رہا تھا اور باقی دیوتا سوئے ہُوئے تھے۔ اُس نے ہیری (ایک دیوتا کی بیٹی) کو دیکھا

اُس کی محبت میں بیقرار ہو گیا۔ اُس کے قدموں میں جا گرا، اور اُس سے التجا کی
کہ ایک مجبور الفت کو جدائی کا صدمہ نہ دکھائے اور پھر اس کے فراق میں روتا
تھا اور شعر پڑھتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ"۔

ش ۔" جناب، میرا تو یہ خیال ہے کہ محبت کے افسانے دنیائے ادب سے یکسر مٹا
دینے چاہییں، کیونکہ یہ زیادہ تر بیکاری اور کاہلی کے جذبات کو اُبھارتے ہیں"۔

س ۔" اس قسم کی کہانیاں (خواہ وہ نظم ہوں یا نثر) جن میں شاعروں نے بیان کیا ہو
کہ اُس کے فراق میں خوب سینہ کوبی کی اور اپنے دل کو خوب کوسا اور کہا، اے
دل۔ لاکھوں تکلیفیں تو نے دیکھیں اور اُنھیں برداشت کیا۔ مگر فراقِ یار میں
اتنا بے قرار کیوں ہے۔ وغیرہ وغیرہ"۔

ش ۔" جی ہاں۔ بیشک، ایسے افسانے نہیں ہونے چاہییں"۔

س ۔" اور نہ ہی کہانیوں کو رواج دینا چاہیے۔ جن میں دیوتاؤں کی طرف لالچ جیسا
مذموم جذبہ منسوب کیا گیا ہو۔ مثلاً "فونکس نے اچی لس کو کہا کہ جب تک یونانی
تمھیں کافی روپیہ نہ دیں، اپنے غصّے کو فرو نہ کرنا اور نہ ہی ان کی مدد کی حامی
بھرنا"۔ یا مثلاً اُچی لس خود اس قدر لالچی تھا کہ اُس نے اگا ممنن سے جب تک
رشوت نہ لے لی۔ ہیکٹر کی لاش اُس کے سپرد نہ کی"۔

ش ۔ جی ہاں، واقعی۔ ایسی کہانیاں لالچ کو جائز قرار دیتی ہیں"۔

س ۔" اب کہانیوں کے متعلق ایک ضروری بات باقی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے شاعروں
نے نہ صرف دیوتاؤں سے ہی جھوٹ موٹ واقعات وابستہ کیے ہیں، بلکہ انھوں
نے آدمیوں کے متعلق بھی کافی غلط بیانیاں کیں۔ مثلاً اُنھوں نے بیان کیا ہے"

ظالم اور بدمعاش لوگ ہمیشہ خوش اور فارغ البال رہتے ہیں اور اچھے لوگ ہمیشہ ناشاد اور سقیم الحال یا مثلاً انھوں نے کہا ہے کہ بددیانتی سے دنیا کے لاکھوں کام نکلتے ہیں اور دیانتداری اور ایمانداری سے آدمی عموماً نقصان اُٹھاتے ہیں اور ان اقوال کی تائید میں کئی قصّے کہانیاں وضع کی ہیں۔ ایسی کہانیاں بھی ہمارے تعلیمی نصاب سے خارج ہونی چاہییں۔"

ش۔ "بے شک، جناب۔"

س۔ "تو آج ہم نے کہانیوں کے متعلق بہت سی باتیں طے کرلی ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ کافی ہیں۔ آئندہ کسی اجلاس میں ہم شاعری پر (جو موسیقی یا نغمہ کا جزوِ اعظم ہے) مکمل بحث کریں گے۔"

تعلیم کی تحریکِ جدید کی تاریخی شخصیتیں

از

بشیر احمد ڈار، ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

روسو کی پیدائش روسو (۱۷۱۲ء - ۱۷۷۸ء) جنیوا (GENEVA) کی شہری ریاست میں پیدا ہوا۔ والدہ کی وفات سے عمر کا ابتدائی حصہ والد کی نگرانی میں بسر کیا۔ والد کی آوارہ مزاجی کے باعث اس کی تعلیم کا کوئی عمدہ انتظام نہ ہو سکا۔ اس زمانے میں اس نے پلوٹارچ کی تاریخ "یونان و روما" کا مطالعہ کیا، جس نے اُس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے عمدہ اثرات چھوڑے۔ دس برس کی عمر میں اُس نے کسی معلم سے لاطینی زبان کی تحصیل کی اور دو سال بعد وہ کسی انگریور کے ہاں شاگرد ہو گیا۔ لیکن یہ شغلہ اُس کی آزاد طبیعت کے لیے ناساز گار ثابت ہوا۔ اس لیے اُس نے فوراً ہی اس کام کو ترک کر دیا اور شہر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد کئی اور مشغلے اختیار کیے، لیکن وہ کسی میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ان تمام ناکامیوں نے اسے بہت پریشان کر دیا اور آخر پچیس برس کی عمر میں اُس نے تنگ آ کر علم ادب اور سائنس کے مطالعے کی طرف رجوع کیا۔ اُس نے سولھویں اور سترھویں صدی کے فرانسیسی مصنفین کو بہ نظرِ غائر پڑھا اور دوسری طرف بعض انگریز مفکرین کے خیالات سے بھی تھوڑی سی روشناسی حاصل کی۔ جان لاک کے خیالات نے اس کے دل میں تعلیمی معاملات کے متعلق ایک خاص ذوق اور رجحان پیدا کیا اور اسی ذوق کے ماتحت اُس نے ایک معزز آدمی کے دو

لڑکوں کو تعلیم دینے کی ذمے داری لی لیکن ایک سال کے تجربے نے اسے ثابت کر دیا کہ وہ اس کام کا اہل نہیں، لیکن اس ناکامی کے باوجود اس کے دل میں تعلیمی معاملات کے متعلق اور زیادہ شغف ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیس سال بعد اس نے "امیل" جیسی نادر کتاب مکمل کی۔ اس کی زندگی میں سب سے پہلی شعاع امید ۱۷۵۰ء میں نمودار ہوئی، جب وہ ایک انعامی مضمون لکھنے میں کامیاب ہوا، جس کا بحث "علوم و فنون" تھا۔ کیا علوم و فنون کے احیا نے اخلاق کو سدھارنے میں مدد دی ہے؟ روسو کا جواب نفی میں تھا اور اس نے اس مسئلے کی بحث کے سلسلے میں ایک فطری نظامِ معاشرت (Natural State) کا نقشہ پیش کیا۔ اگرچہ یہ خیال ان دنوں میں عام تھا، لیکن روسو نے اس کی حمایت کچھ ایسے پُرجوش اور فصیحانہ انداز میں کی کہ اس کا مطالعہ ہی اس کے نظریے کی قبولیت اور شہرت کے لیے کافی تھا۔ روسو نے اپنی زندگی کے کئی سال "مہذب" سوسائٹی میں بسر کیے تھے۔ اسے اُن تمام حکما سے شرفِ ملاقات حاصل ہو چکا تھا، جو والیٹر (Voltaire) کے گرد جمع تھے اور جو اپنے زمانے میں یورپ کے معاشرتی اور سیاسی خیالات کے ناخدا تھے۔ لیکن اسے کہیں بھی سکونِ قلب نصیب نہ ہو سکا۔ وہ ہمیشہ سے جمہوریت پسند تھا اور اسی ایک اصول کو اس نے دیانتداری سے ساری عمر نبھایا۔ اسے عوام کی سادگی اور خلوص پر یقین تھا اور جب اُس نے یہ مضمون لکھا، تو اُس کے سامنے اپنے وقت کی یہی "مہذب" سوسائٹی تھی۔ چار سال بعد اُس نے ایک اور مضمون "عمرانی امتیازات" (Ineqnalities) پر لکھا۔ ان ابتدائی کوششوں کے بعد اس کے تین شاہکار شائع ہوئے (۱) New Heliose (۱۷۶۱ء) جس میں خانگی زندگی کے فرائض پر بہت عمدہ بحث کی ہے (۲) "معاہدہ عمرانی" (Social contract ۱۷۶۲ء) جس میں سوسائٹی کی حقیقی ماہیت اور اس کے آغاز اور ارتقا کے متعلق بحث کی ہے۔ انقلاب فرانس کے

راہنماؤں کے سیاسی خیالات کا سرچشمہ یہی کتاب ہے۔ (۲) امیل جس کا موضوع تعلیم ہے اور شاید اس کی دیگر تصانیف سے زیادہ اس کے صحیح خیالات کا آئینہ۔ امیل کے خلاف کلیسا نے فتویٰ صادر کر دیا اور روسو مدت تک جلاوطن پھرتا رہا۔ وہ انقلاب سے گیارہ برس قبل غربت، بے کسی اور تنہائی میں فوت ہوا۔ شاید روسو ہی ایک ایسا شخص ہے جس کے قلم نے انقلاب فرانس کی بنیاد استوار کی۔ نپولین کا قول ہے کہ روسو کے بغیر انقلاب ناممکن تھا۔ جس طرح عوام کی آزادی کا کام روسو نے خوش اسلوبی سے سرانجام دیا، اسی طرح بچوں کی آزادی کا تعلیمی مسئلہ بھی اس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ جس طرح "معاہدہ عمرانی" میں امریکہ کے دستورِ حکومت کے بنیادی خیالات پائے جاتے ہیں، اسی طرح کنڈرگارٹن، جدید ابتدائی مدارس اور تقریباً تمام تعلیم جدید کے تصورات کی جھلک امیل کے آئینے میں واضح نظر آتی ہے۔

ابتدائی دور میں روسو نے تعلیمی مسائل میں بہت حد تک جان لاک اور اس کے ہمعصر فرانسیسی ماہرین تعلیم کے خیالات کا تتبع کیا۔ لیکن بعد میں جب اُسے انسائیکلوپیڈیا کے مصنفین سے ملنے کا اتفاق ہوا، تو اُس نے ان کے انقلابی خیالات کو قبول کر لیا۔ "عمرانی امتیازات" اور "سیاسی اقتصادیات" کے مضمون میں (آخرالذکر اُس نے انسائیکلوپیڈیا کے لیے لکھا تھا) اس کے عقائد تقریباً وہی ہیں، جو ہیلوسیٹس (Helvetius) نے چار سال بعد (۱۷۵۹ء) اپنی کتاب De l'Espirit میں پیش کیے۔ روسو نے امتیازی غیر فطری امتیازات کا باعث ماحول اور تعلیم کو ٹھہرایا ہے اور دوسرے مضمون میں جہاں اس نے حکومت کے قوانین پر بحث کی تھی، اس نے بہتر اور عمدہ شہریوں کی تربیت کے لیے قومی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت واضح کی ہے۔ لیکن ان مصنفین کے ساتھ اس کی زیادہ دیر تک نبھ نہ سکی۔ انقلابی خیالات میں روسو ان سے کسی حیثیت میں کم نہ تھا، لیکن ان کا مطمحِ نظر تخریبی تھا، جو روسو کو پسند نہ آیا۔ اس کے برعکس روسو نے

ہر جگہ اپنے زمانے کے مروّجہ اداروں کے خلاف بغاوت کا علم اُٹھائے ہُوئے بھی تعمیری پہلو کو کبھی فراموش نہیں کیا اور نہ مادیت کا فلسفہ ہی اسے تسکین دے سکتا تھا، کیونکہ اس نظریے کی رُو سے تو انسان کی تمام بلند ترین روحانی زندگی محض تجربات حواس کے ایک مجموعے کا نام رہ جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یقیناً یہ ہے کہ انسان حوادث خارجی کے ہاتھ محض ایک کھلونا ہے اور اُس آزاد فعالی قوت سے انکار واجب آتا ہے، جو انسان کے اندر موجود ہے اور جس کے باعث ہر فرد دوسرے سے متمیز ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں روسو نے مجبوراً اپنا تعلق مصنفین انسائیکلوپیڈیا سے قطع کر لیا۔ یہ واقعہ اس کی ذاتی زندگی کے لیے کتنا ہی ناخوشگوار اور تلخ کیوں نہ ہو، کم از کم اس کی روحانی زندگی کے لیے ضرور فائدہ مند ثابت ہُوا۔ کیونکہ اس قطع تعلقی کے بعد سے اُس نے اپنی تخیلاتی زندگی کے ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی۔ اُس کے بعد اُس نے بالکل اپنے ذاتی خیالات اور عقائد کو عوام کے سامنے پیش کیا۔

اس علیحدگی کا پہلا اثر یہ ہوا کہ اُس کے خیالات نے ایک پلٹا کھایا اور یہ بڑی حد تک اس کی زندگی کے ابتدائی دور کے خیالات کی بازگشت تھی، جو اُس نے اپنے انعامی مضمون میں ظاہر کیے تھے۔ اُس نے ایک کتاب " Madam d'Epivay کی یادگار لکھی ہے جس میں اس خاتون اور روسو کے درمیان تعلیم کے موضوع پر ایک سبق آموز مکالمہ درج ہے۔ یہ مکالمہ اس وقت ہوا تھا، جب وُہ امیل کی تصنیف کے لیے قلم اُٹھانے والا تھا۔ دوران گفتگو میں خاتون نے اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق ذکر کرتے ہُوئے کہیں کہہ دیا کہ بچے کو تعلیم دینا ایک بڑا مشکل کام ہے۔ روسو جواب دیتا ہے: "میں آپ سے متفق ہوں۔ کیونکہ فطرت نے نہ ماں باپ کو تعلیم دینے کے لیے پیدا کیا ہے اور نہ بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے"۔ اس کے بعد وہ تشریح کرتا ہے کہ وحشی اقوام میں جو فطری حالت میں رہتی ہیں، تعلیم انسانی مداخلت کے بغیر ہی حاصل ہو جاتی ہے،

ایسی اقوام کے لیے زندہ رہنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ وہ اپنے تجربے سے کام لیں اور اپنے آپ کو حالات کے موافق بنائیں۔ اس کے جواب میں خاتون نے کہا۔ یہ تمام بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے کیونکہ اب ہم وحشی نہیں۔ بچوں کی تعلیم ایک لازمی امر ہے، خواہ اس کا انجام خوشگوار ہو یا ناخوشگوار۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ یہ کام کیسے سرانجام ہو۔ روسو اس کا جواب یہی دے سکتا تھا کہ اگر اس سے پہلے سماج کی صحیح تشکیل کر لی جائے، تو بچوں کی تعلیم کا مشکل سوال بہت آسان ہو سکتا ہے۔

اس مکالمے کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے اس تضاد کا ایک ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے، جو روسو کی ساری تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ اس کا پہلا خیال یہ ہے کہ دوسرے عمرانی اداروں کی طرح تعلیم بھی فطرت کے خلاف ہے اور اس کے بعد فوراً ہی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم کا عمدہ انتظام ممکن ہے بشرطیکہ سماج میں تبدیلی کی جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ اپنے پہلے خیال پر مطمئن ہو کر آگے قدم نہ بڑھاتا، تو اس کے لیے تعلیم کا معاملہ خارج از بحث ہوتا۔ لیکن ان شکوک کو تسلیم کرتے ہوئے اُس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ سماج کو فطرت کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے اور پھر ایسے تبدیل شدہ حالات میں تعلیم کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایمیل کے شائع ہونے کے دس سال بعد روسو نے اس معاملے کی بالتفصیل تشریح کی کہ ایک حکومت کی تجدید اور اصلاح کے لیے تعلیم کا معاملہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۷۷۲ء میں پولینڈ کی تقسیم سے کچھ عرصہ پہلے ایک پولش رئیس نے روسو کو ایک خط لکھا جس میں اس سے حکومت کی اصلاح کے متعلق کچھ مشورہ طلب کیا۔ اس کے جواب میں اس نے ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں اُس نے اس بات پر زور دیا کہ اپنی قوم کی محافظت اور مدافعت کے لیے صرف ملک کے باشندے ہی مناسب ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد اُس نے قومی تعلیم کی اہمیت کے متعلق بہت تاکید

کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صرف قومی ادارے ہی ایسے ہیں، جن سے کسی قوم کی سیرت، اخلاق اور مذاق کی تشکیل ہو سکتی ہے اور انھیں وجوہ کے باعث وہ دوسری قوم سے متمیز ہو سکتے ہیں۔ اس چیز کو ناممکن بنا دو کہ پولینڈ کا کوئی باشندہ روسی سیرت اختیار کرے اور اس کے بعد میں اس چیز کی ذمے داری لیتا ہوں کہ روس کبھی تمھارے ملک پر قابض نہیں ہو سکتا؟ اس کام کی تکمیل صرف اس طریقے سے ممکن ہے کہ قوم کے بچوں کو صحیح قسم کی قومی تعلیم دی جائے۔ اس ادارے کی اہمیت روسو کے نزدیک بالکل واضح تھی۔ چنانچہ اُس نے تعلیم کے صحیح انتظام کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ اس کو اعلیٰ درجے کے مجسٹریٹوں کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ ان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ اس چیز کا اہتمام کریں کہ چھوٹے اپنے ملک کے متعلق ہر وہ واقفیت حاصل کر سکیں، جو ان کو صحیح معنوں میں محبِ وطن بنا دے اور جسمانی ورزشوں اور کھیلوں کے ذریعے اس قابل ہو جائیں کہ قومی مقاصد کے لیے متفقہ طور پر جد و جہد کر سکیں۔ "میں چاہتا ہوں کہ جب پولینڈ کے بچّے پڑھنا سیکھیں، تو وہ اپنے ہی ملک کے متعلق پڑھیں، تاکہ جب وہ دس برس کی عمر کے ہوں، تو انھیں اپنے ملک کی پیداوار کا علم ہو۔ جب بارہ برس کے ہوں، تو اپنے ملک کے سب صوبوں، سڑکوں اور شہروں سے واقف ہوں۔ پندرہ برس کی عمر میں تمام تاریخ سے آگاہ ہوں اور سولہ برس میں اپنے ملکی قانون سے پوری طرح باخبر ہوں۔ اس طرح ہر وہ کام جو پولینڈ میں کیا گیا ہے اور ہر عظیم الشان آدمی جو اس ملک میں رہ چکا ہے، اس کے دل میں جگہ حاصل کر لیں۔"

لیکن یہ اسکیم ایک عمدہ وسیع تر اسکیم کا ایک حصّہ تھی۔ روسو کا یہ مدعا نہ تھا کہ تعلیمی طریقے کی اصلاح ہی قومی اصلاح کے لیے کافی ہے یا یہ کہ تعلیم جو عمدہ شہری پیدا کرے، ضرور ہی فطرت کے مطابق ہوگی۔ اس کے برعکس اُس نے اس چیز پر بہت ہی زور دیا کہ بہترین تعلیم صرف ایک

آئیڈل حکومت میں ممکن ہوسکتی ہے، جہاں افراد اپنی ذاتی خواہشات اور قومی فرائض میں کوئی کشمکش محسوس نہیں کرتے اور جہاں صرف شہری ہونا ہی اپنے رجحانات کی تکمیل ہے۔ مگر جب اس نے امیل (E'mile) تصنیف کی، تو اُسے اس چیز کا یقین ہوچکا تھا کہ ایسی آئیڈل حکومت کا قیام ناممکن ہے۔ کتاب کے پہلے حصہ میں وہ یہی کہتا ہے کہ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں، اور نہ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت کوئی ایسی حکومت نہیں، جو رعایا کے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرتی ہو اور ایسے سلوک کے بغیر تعلیم عوام کا تصور بے معنی ہے۔ قومی تعلیم جبھی فطرت کے مطابق ہوسکتی ہے کہ حکومت کے ماتحت کسی فرد کو اپنے رجحانات اور مقاصد کی تکمیل کے لیے کوئی امر مانع نہ ہو اور وہ آزادی کے ساتھ اپنے کام سے عہدہ برآ ہوسکے۔ فرد اور جماعت میں ایسی موافقت کہ دونوں کے فرائض اور حقوق میں کوئی مخاصمت نہ ہو، قدیم یونان کی شہری ریاستوں میں ممکن تھی، لیکن موجودہ جمہوری حکومتوں میں اس کا امکان نہیں۔ جہاں ہر فرد کو اپنی خودی کے برعکس ایک ہی سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ ان حالات میں کیا پھر فطری تعلیم کا کوئی امکان نہیں؟ امیل میں روسو کا پہلا نتیجہ یہی ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ غیر منطقی طریقے سے سوال کرتا ہے کہ کیا خاص حالات میں ممکن ہے کہ بچوں کو سماج کے لیے ایسی تعلیم دی جاسکے جس سے ان کی فطری چمک محفوظ رہ سکے اور اس طرح صحیح انسان اور شہری کی تربیت ہوسکے۔ ایسی تعلیم کا امکان اس تضاد کے صحیح مفہوم پر مبنی ہے جو روسو انسانی فطرت اور معاشری اطلاعات میں تسلیم کرتا ہے۔ اگر سماج مطلق غیر فطری ہے۔ اگر عمرانی اداروں کی زندگی کا دار و مدار صرف افراد کی جبلتوں کو کچل دینے پر موقوف ہے، تو پھر امیل کی فطری تعلیم کا واحد طریقہ یہ ہوگا کہ اس کو سماج سے بالکل الگ تھلگ رکھا جائے اور اگر اس چیز کا امکان نہیں، تو پھر جیسا کہ روسو خود تسلیم کرتا ہے یہی بہتر ہوگا کہ اس کو تہذیب و تمدن سے صرف اتنا روشناس کیا جائے کہ وہ اپنے ہم عصروں میں اس طرح زندگی بسر کرسکے کہ ان کے طرز معاشرت سے متاثر نہ ہو۔ اگرچہ سماج کا ایسا مفہوم، جو انسانی فطرت کے

مطابق نہیں، روسو کی تصانیف میں موجود ہے۔ لیکن یہ اس کا آخری اور قطعی نظریہ نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور تصور بھی ہے، جو امیل کے تعلیمی نظریے سے زیادہ مطابق ہے۔ اس نظریے کے مطابق عمرانی ادارے بذاتہٖ غیر فطری نہیں، لیکن انسان کی مذموم کوششوں سے ان کے غیر فطری ہونے کا امکان ہے۔ ہر ادارے کی بنیاد درحقیقت کسی نہ کسی فطری جبلّت پر مبنی ہوتی ہے۔ مثلاً شادی کی رسم کی بنیاد آدمی اور عورت کے درمیان ایک قدرتی تعلق پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ ادارہ غیر فطری ہو جاتا ہے، جب شادی کی روح غائب ہو جاتی ہے اور کسی قسم کے فطری تعلق کے بغیر مرد اور عورت کو زناشوی کے تعلق میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حکومت (STATE) بنیادی طور پر ایک خاندان ہے۔ رعایا اور راعی کا تعلق بالکل والدین اور اولاد کا سا ہے۔ ریاست غیر فطری ہو جاتی ہے، جب راعی رعایا سے خدمت لیتا ہے، لیکن ان کے حقوق ادا نہیں کرتا۔

اس نقطۂ نگاہ سے جہاں تک بچوں کا تعلق ہے، عمرانی اداروں کی برائی کا باعث یہ نہیں کہ ان کی بنیاد فطری نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے اداروں کو بچوں کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ تعلیمی معاملات میں ایسے اصول کا عمل بالکل سادہ ہے۔ بچہ سماج کا رکن ہو سکتا ہے اور اس کے باوجود بھی اپنی فطرت کو برقرار رکھ سکتا ہے، بشرطیکہ اس زندگی سے جو معاشری خیالات اس کو حاصل ہوں، وہ اس کے ذاتی تجربے کا نتیجہ ہوں تاکہ وہ ان خیالات کو کسی خارجی اثر کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اپنی فطرت کا اظہار تصوّر کرے۔ روسو کہتا ہے: ”اگر ہم کسی بچے کی تربیت فطرت کے مطابق کرنی چاہیں، تو اُس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم اسے وحشی بنائیں یا اُسے جنگلوں میں رہنے کے لیے بھیج دیں۔ اگر وہ سماج کے ہجوم میں زندگی بسر کر رہا ہے، تو اس کی فطرت کی محافظت کے لیے یہ بھی کافی ہوگا کہ وہ اپنے جذبات و خواہشات اور لوگوں کی رائے سے متاثر ہو کر اس زندگی میں حصہ نہ لے اور یہ کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے دل سے محسوس

کرے اور ہر عمل میں اپنی عقل و دانائی کی راہبری اختیار کرے۔" ایسے حالات میں معاشری زندگی بچے کی دماغی ترقی کا باعث ہوتی ہے۔" صحیح تعلیم بچے کی اصلی فطرت کی نشوونما ہی کا نام ہے۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچے کی وہ اصلی فطرت جو تعلیم سے بدل جاتی ہے، کیا ہے؟ روسو نے اس سوال کا جواب امیل اور New Heliose میں دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کا جواب نامکمل اور مختلف تصانیف میں بکھرا پڑا ہے۔ لیکن جتنا جواب وہ دے سکا، وہ درست اور اچھوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معلّم کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ بچے کا مطالعہ کرے اور انسانی فطرت کی عام خصوصیات کو بہ نظرِ غائر دیکھے، یعنی وہ خصوصیات جو مختلف طریقوں سے انسانی جبلتوں اور رجحانات میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کے بعد تذکیر و تانیث کا امتیاز ہے۔ امیل میں وہ کہتا ہے کہ "جب ایک دفعہ یہ چیز واضح ہوگئی کہ آدمی اور عورت اپنی اپنی سیرت اور طبیعت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تو اس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی تعلیم ایک جیسی نہیں ہونی چاہیے۔" اس کے بعد عمروں کے اختلافات کا سوال آتا ہے، جو پہلے دو تصورات کی طرح تعلیمی معاملات میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ عمر کا ہر حصہ روسو کے نزدیک مکمل ہے اور ہر حصے کے علحدہ قوانین اور اصول ہیں۔ اس کے بعد نفسیاتی اختلافات کا مطالعہ بھی معلّم کے لیے ضروری ہے۔ "ہر نفس کی ایک علحدہ خصوصیت ہے، جس کے مطابق اس کی رہنمائی ہونی چاہیے اور معلّم کی کامیابی اس پر موقوف ہے کہ ہر بچے کی تربیت اس کی نفسی خصوصیات کے مطابق ہو۔"

(باقی آئندہ)

اشتہار

اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں "موگا اُردو ریڈرز" کا استعمال کریں

اُردو پڑھانے کے لئے یہ ٹریننگ اسکول فار ٹیچرز کا تیار کردہ کورس جس کی بنیاد جدید طریقہ تعلیم پر رکھی گئی ہے۔ بہت سے مدرسوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان ریڈروں کا پانچواں ایڈیشن ابھی چھپ کر تیار ہوا ہے۔ بچوں کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے اور انھیں پڑھائی کی طرف راغب کرنے کے لئے یہ ایک بے مثال کورس ہے۔ اس طریقہ تعلیم سے وقت کی بچت ہوتی ہے اور یقیناً کامیابی ہوتی ہے۔ اس بات کا تجربہ ہو چکا ہے کہ اگر بچوں کو اس طریقے سے پڑھایا جائے، تو وہ خوشی و مسرت سے پڑھتے ہیں اور بہت جلد پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔

ترمیم شدہ ایڈیشن

رہنمائے مدرسین جماعت اوّل کی تصحیح ہو چکی ہے۔ اُردو کے نئے ایڈیشن میں طریق الصوت میں کافی اضافہ کیا گیا ہے۔ اساتذہ کے لئے مفصل ہدایات مندرج ہیں۔

پہلی جماعت میں اُردو کورس کا استعمال کرتے وقت مندرجۂ ذیل سامان کی ضرورت ہے:-

ا۔ اُستادوں کے لئے:-

(۱) رہنمائے مدرسین برائے جماعت اوّل } انگریزی ایڈیشن، حجم ۱۱۷ صفحے۔ گتے کی جلد۔ قیمت ۱۲/
اُردو ایڈیشن، حجم ۱۸۴ صفحے۔ گتے کی جلد۔ قیمت ۱۲/

اس کتاب میں چارٹوں و دیگر کتب پڑھانے کی تیاری کے لئے سبق بہ سبق مفصل ہدایات دی گئی ہیں۔ انگریزی ایڈیشن میں مہتممان (Supervisors) کے لئے ایک باب شامل کیا گیا ہے۔

(۲) پرائمر پڑھانے سے پیشتر استعمال کرنے کے لئے ۱۳ عدد چارٹ (اُردو)۔ اُستاد ان چارٹوں کو رہنمائے مدرسین میں دی ہوئی ہدایات کے مطابق خود تیار کر سکتا ہے یا چھپے ہوئے رنگدار ۱۳ عدد چارٹ بقیمت دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک منگوا سکتے ہیں۔

ب۔ بچوں کے لئے:-

(۱) (عملی کتاب) میری تصویروں کی کتاب (My picture book) حجم ۳۲ صفحے۔ قیمت ۱/۔
اس کتاب میں بہت سی تصاویر اور کئی ایک دلچسپ کھیل اور مشقیں دی گئی ہیں۔ جن کی مدد سے بچہ پرائمر کے لئے نئے الفاظ بآسانی سیکھ لیتا ہے۔

(۲) (پرائمر) میری کہانیوں کی کتاب (My first story book) حجم ۴۲ صفحے۔ قیمت ۱/
تصاویر کے ذریعے کہانیوں کی تشریح کی گئی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کو اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ بچے عام طور پر تھوڑی سی مدد سے کہانیاں پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

(۳) (پہلی کتاب) جانوروں کی کہانیاں (Stories of animals) حجم ۵۶ صفحے۔ قیمت ۲/
یہ کتاب پہلے سال دوسری ششماہی میں پڑھائی جاتی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی ترتیب میں خاص احتیاط کی گئی ہے۔

(۴) جماعت اوّل کی لائبریریوں کے لئے امدادی کتب:-
لال مرغی (The little red hens) قیمت ایک آنہ

اس کے علاوہ اور بہت سی امدادی کتب ہیں، جو پبلشرز سے مل سکتی ہیں۔

ملنے کا پتہ:- رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز مفید عام پریس۔ لاہور

اشتہار

دیہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لیئے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس کا مضمون حال ہی میں ورنیکلر فائنل کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لئے مخصوص ہُوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر کوئی جامع کتاب نہ تھی۔ طلبہ کی اس دقّت کا احساس کرتے ہُوئے زرِ کثیر صرف کرکے مجوزہ سکیم کے عین مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب برائے جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے، جس کی عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے اور ہر امر کو روزمرّہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ تصاویر سے واضح کیا گیا ہے اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے۔ سلسلہ ہذا طلبہ کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔ اس کے مطالعے سے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان و دیہاتی سائنس کے مدرسین اصحاب اپنے مدارس میں جاری کرکے جہاں ہمیں ممنون و مشکور فرمائیں گے، وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبودی میں بھی خوشی محسوس کریں گے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت ۵ آنے ۴ پائی
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	〃 ۵ 〃 ۲ 〃
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	〃 ۷ 〃 ۱۰ 〃
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	〃 ۱۴ 〃 ۲ 〃

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۶ر
۲	// // دوسری // //	۷ر۲ پائی
۳	// // تیسری // //	۹/۹ //
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر
۵	// // دوم	۵ر
۶	// // سوم	۷ر
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر
۸	// // دوم	۳ر۷ پائی
۹	// // سوم	۷ر
۱۰	امرت کہانیاں نمبر۱	۹/۲ //
۱۱	// // نمبر۲	۱۰/۳ //
۱۲	// // نمبر۳	۲/۵ //
۱۳	انوار سہیلی کے انمول موتی // // حصہ۱ // //	۸/۲ //
۱۴	// // حصہ۲ // //	۱۰/۴ //
۱۵	// // حصہ۳ // //	۲/۵ //
۱۶	دلچسپ تاریخی کہانیاں // حصہ اوّل //	۷/۷ //
۱۷	// حصہ دوم // //	۱۱/۸ //
۱۸	// حصہ سوم // //	۷ر

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۹	کام کی باتیں حصہ اوّل	۳ر۹ پائی
۲۰	// // // دوم	۲/۳ //
۲۱	قصص ہند حصہ اوّل	۳/۲ //
۲۲	// // حصہ دوم	۲/۸ //
۲۳	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۲۴	حسینہ اور وحشی	۱/۵ //
۲۵	شہزادہ مہربان	۶/۲ //
۲۶	راما سیتا	۱/۱۰ //
۲۷	جادو کا مٹکا مسٹر رلیارام	۳ر
۲۸	دروپدی	۸/۱ //
۲۹	مہاراجہ رنجیت سنگھ . .	۶/۴ //
۳۰	خلیفہ ہارون الرشید . .	۴ر
۳۱	راجہ اشوک	۵ر
۳۲	مہارانا پرتاپ	۲ر۱ پائی
۳۳	شہاب الدین شاہجہان	۱۰/۲ //
۳۴	شیر شاہ سوری	۱۱/۲ //
۳۵	نصیر الدین ہمایوں . . .	۱۰/۲ //
۳۶	اورنگ زیب عالمگیر .	۹/۲ //
۳۷	شہاب الدین غوری . . .	۸/۲ //
۳۸	سلطان علاؤالدین خلجی . .	۱۱/۲ //
۳۹	فیروز الدین تغلق . . .	۳ر

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۰	نورالدین جہانگیر	۲ر۳ پائی	۶۵	جوتی موتی	۲ر۱۰ پائی
۴۱	امیر تیمور	۲ر۷ //	۶۶	جواہرات کا خزانہ	۳ر۷ //
۴۲	پرتھوی راج	۲ر۷ //	۶۷	چھوا اور سونا ہوا (باتصویر)	۲ر
۴۳	محمود غزنوی . . .	۲ر۶ //	۶۸	علی بابا چالیس چور . . .	۴ر
۴۴	مصر کی داستان . .	۳ر	۶۹	علاؤالدین وعجیب وغریب لیمپ	۳ر۶ پائی
۴۵	جاپان کی کہانی . . .	۴ر	۷۰	ملاد و پیانے کا سفر . . .	۳ر
۴۶	چین کی کہانی	۳ر۶ پائی	۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۴۷	مستورات چین وجاپان . . .	۴ر			
۴۸	ایران کی کہانی . . .	۳ر۶ پائی	۷۲	نیشاپور کا سوداگر	۲ر۱۱ پائی
۴۹	ایشیائی روم	۲ر۷ //	۷۳	پرستان کا موچی	۳ر
۵۰	ٹرکی (یورپی روم) . . .	۲ر۷ //	۷۴	سندر پیاری	۳ر
۵۱	لنکا	۱ر۱۱ //	۷۵	چاندی کی کنجی	۳ر
۵۲	بصرہ و بغداد	۵ر	۷۶	سلکِ جواہر نمبرا (حکمرانی کاگر)	۲ر۶ پائی
۵۳	یونان	۲ر	۷۷	// // نمبر۲ (بلندی و پستی)	۱ر۶ //
۵۴	تین سوال	۲ر۷ پائی	۷۸	// // نمبر۳ (شہید الفت)	۱ر۶ //
۵۵	امرت ورشا	۳ر۱۰ //	۷۹	سلکِ جواہر - مرد میدان	۱ر۶ //
۵۶	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبرا داؤد بادشاہ	۳ر۹ //	۸۰	// // نیک و بد	۱ر۹ //
			۸۱	// // عیب و ہنر	۱ر۴ //
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں // حصہ اول //	۳ر۹ //	۸۲	// // جہاں گرد	۱ر۶ //
			۸۳	// // جواب باصواب	۱ر۱۰ //
۵۸	// // دوم //	۴ر۵ //	۸۴	// // سخاوت کی انتہا	۱ر۲ //
۵۹	خوفناک خواب	۲ر	۸۵	// // حسن تدبیر	۱ر۶ //
۶۰	ہیرالال	۲ر۶ //	۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہرت . . .	۳ر //
۶۱	دولت کی پٹاری	۲ر۱ //			
۶۲	سادھو کی چکی	۲ر	۸۷	ڈرامہ غم خوار عالم . . .	[illegible]
۶۳	نیلا باز	[illegible]	۸۸	[illegible]	[illegible]
۶۴	بہادر شہزادہ	۲ر۱ //			

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
NATIONAL ... DELHI

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اردو ایڈیشن)

جلد (۵) | مارچ ۱۹۳۹ء | نمبر (۱۲)

فہرست مضامین

۱	ایڈیٹوریل		۱
۲	ہماری گزشتہ تعلیم کی بعض خصوصیات	سید محمد عبداللہ	۵
۳	موزونی طریق تعلیم	شیخ خادم محی الدین	۱۳
۴	بچے کی زندگی کا پہلا سال	میرزا مقبول بیگ	۲۴
۵	ریڈیو اور نصابی مضامین کی تدریس	عبدالغفور ایم اے	۳۸
۶	تعلیم کی تحریک جدید کے ارکان ثلاثہ	بشیر احمد ڈار	۴۸

ایڈیٹوریل

ہندوؤں اور مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوستان میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم عام تعلیم کا ایک ضروری جزو سمجھی جاتی تھی۔ ہر پاٹ شالے اور مکتب میں نوشت وخواند اور ابتدائی حساب کے ساتھ ساتھ مذہب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ فرنگی اقوام کے ہندوستان میں آنے تک یہ رواج عام تھا۔ سترھویں صدی میں جب فرنگی اقوام نے ہندوستان میں اپنی تجارتی کوٹھیاں کھولیں اور رفتہ رفتہ چند ساحلی علاقوں پر اقتدار حاصل کیا، تو انھوں نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ عیسائی مذہب کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے جگہ جگہ مدارس قائم کیے جائیں۔ چنانچہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں انگلستان، فرانس، ڈنمارک، پرتگال اور دوسرے یورپین ممالک سے عیسائی پادری یہاں آئے اور جنوبی ہندوستان کے مختلف مقامات پر تبلیغ کی غرض سے مدرسے قائم کیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی شروع میں عیسائی مذہب کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیتی رہی، لیکن جوں جوں کمپنی کے مقبوضات وسیع ہوتے گئے، اسی قدر مذہبی بدگمانیاں ترقی کرتی گئیں اور یہ خوف لاحق ہو گیا کہ کہیں عیسائی مذہب کی اشاعت سے سلطنت کی روزافزوں ترقی کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی مذہبی اشاعت کی پالیسی کو ترک کر دیا اور یہ اعلان بھی کر دیا کہ حکومت کو کسی مذہب کی سرپرستی اور حمایت سے سروکار نہیں۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے کسی مذہب کی تدریس و تعلیم کو مدارس میں جاری رکھنے یا رائج کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ سرکار کی غیر جانب داری کی پالیسی کا اثر یہ ہوا کہ ہندو اور مسلمان بچے اپنے اپنے مذاہب

کے ان اسباق سے بے بہرہ رہنے لگے، جو پہلے اُن کی اخلاقی زندگی کا منبع تھے۔

۱۸۱۱ء میں جب اس پالیسی کا اعلان اور نفاذ ہُوا ہی تھا۔ لارڈ مینٹو نے کمپنی کے ڈائرکٹروں کو ایک مراسلے میں لکھا کہ ہندوستانی نظامِ تعلیم میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا یہ فقدان بُرے نتائج کا باعث ہوگا اور اگرچہ کمپنی کی پالیسی مذہب کے متعلق غیر جانبداری کی ہے، تاہم کمپنی کو اپنی "رعایا" کی اخلاقی تعلیم کا کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کرنا چاہیے۔ ملک کے مختلف حصوں میں سربرآوردہ ہندوستانیوں نے بھی اس مراسلے کی تائید کی اور تائید وطلب کا یہ سلسلہ تقریباً تیس سال تک متواتر جاری رہا، حتیٰ کہ ۱۸۴۲ء میں حکومت نے اخلاقی تعلیم کو رائج کرنے کا اعلان کر دیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ ملک کے مختلف مذاہب کو مدِّنظر رکھتے ہوئے، اخلاقی تعلیم مذہبی تعلیم کا جز نہیں قرار دی جا سکتی، اس لیے محکمہ ہائے تعلیم اخلاقی تعلیم کو ایک علٰحدہ مضمون، یعنی، فلسفۂ اخلاق کے زیرِ عنوان رائج کریں۔ یہ زبانی جمع خرچ ہوتے رہے، لیکن حکومت نے اس نیک ارادے کو عملی جامہ نہ پہنایا۔

سر چارلس وڈ کے مشہور تعلیمی مراسلہ مورخہ ۱۸۵۴ء کی اس باب میں تشنگی مزید محرومی کا باعث ہوئی، یعنی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لیے سرکاری اور امدادی مدارس کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے۔

البتہ ۱۸۸۲ء میں یونیورسٹی کمیشن نے اس بات کی سفارش کی کہ مدارس میں اخلاقی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور اس غرض کے لیے کتابیں لکھی جائیں۔ ایسی کتابیں جن میں عام طور پر انسان کے حقوق اور فرائض پر بحث ہو، لیکن حکومت نے اس سفارش کو منظور نہ کیا اور ہندوستان کے مدارس میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لیے کوئی گنجائش نہ پیدا ہو سکی۔

ہمارے نظامِ تعلیم سے اخلاق کی تعلیم کے اس طرح جلاوطن کیے جانے کے نتائج

اور اثرات آج ہماری سماجی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہیں۔ میرا یہ ارادہ نہیں کہ ان اثرات کا تفصیل کے ساتھ محاسبہ کروں، لیکن میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مذہب و اخلاق سے بے تعلق ہونے کے باعث ہماری تعلیم "بے دین" سی ہو کر رہ گئی ہے، جس میں افراد شخصی مطالبات تو کرنا چاہتے ہیں، لیکن سماجی ذمّے داریوں کی زحمت گوارا نہیں کرنا چاہتے۔ ملک کی موجودہ حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوے اور خارجی اثرات کی بے پناہ دست بُرد کو دیکھتے ہُوے، یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم شریک کی جائیگی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس محرومی کو دُور کرنے کی ذمّے داری مدرسے پر ہی عاید ہوتی ہے۔

مدرسہ اس معاملے میں کیا کر سکتا ہے؟

ہر اچھے مدرسے کی شخصیت ہوتی ہے، یعنی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ جن کے باعث ایک مدرسہ دوسرے مدرسے سے ممتاز یا کم از کم مختلف ضرور ہوتا ہے۔ مدرسہ صرف عمارت ہی کا نام نہیں، بلکہ ایک ماحول ہے، جو ہیڈ ماسٹر، مدرسین، طلبہ، مدرسے کی عمارت اور کھیل کے میدان وغیرہم پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسا ماحول ہے، جہاں طلبہ کو زندگی کے تجربات سے دوچار ہونے کے مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ جہاں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں تاکہ علم انسانی کا ذخیرہ نئی نسلوں کے لیے مفید ہو سکے۔ جہاں سائنس کے تجربات کیے جاتے ہیں تاکہ علم انسانی میں ترقی ہو اور جہاں جسمانی صحت و بالیدگی کے لیے مشاغل بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ یہاں لازمی طور پر جسمانی اور دماغی قوتوں کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی ہونی چاہیے کہ طلبہ اپنے جذباتی تجربات کے ذریعے اپنے گرد و پیش، یعنی سماج سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت پیدا کر سکیں، یعنی جہاں طلبہ کی اخلاقی تعلیم بھی مدِ نظر ہو اور طلبہ کو ایسی زندگی بسر کرنے کا موقع بھی ملے کہ وہ بآسانی دوسروں کے نقطۂ نظر، دوسروں کے جذبات،

خواہشات اور مشکلات کو سمجھ سکیں اور ان کے عقائد کا احترام کر سکیں۔

اس کے حصول کے لیے مقررہ نصاب کی تدریس ضروری نہیں۔ ہر مدرس کی شخصیت کی تعلیم، اس کے اقوال اور افعال کرتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک مدرس سبق کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہوتا، یا سبق پڑھاتے ہوئے، گھاس سی کاٹتا ہے۔ ہر چیز کو سہل انگارانہ دیکھتا ہے۔ حرکات و سکنات میں سستی اور کاہلی کو روا رکھتا ہے۔ لباس کی صفائی یا باقاعدگی کو مدِ نظر نہیں رکھتا یا مختصراً یوں کہیے کہ "نشاطِ کار" سے نا آشنا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کے طلبہ میں بھی ایسی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔

میرا خیال ہے کہ مدرسین بآسانی مندرجہ ذیل نکات کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں مدِ نظر رکھ کر طلبہ کی ایک کامیاب اخلاقی تعلیم کر سکتے ہیں:۔

ا۔ طلبہ سے تعلقات میں سچائی اور راست بازی۔

ب۔ اپنے فرائض کی ذمے دارانہ تکمیل اور آزادانہ اظہار رائے۔

ج۔ قوتِ عمل پر اعتماد

د۔ جسمانی تکالیف اور مصائب کی طرف سے بے پرواہی۔

ہ۔ شخصی ترقی اور بہبود کی خواہش۔ خود ساختہ افراد کی قدر و منزلت۔

ہماری گزشتہ تعلیم کی بعض خصوصیات

از

سید محمد عبد اللہ ایم اے، ڈی لٹ، اورینٹل کالج لاہور

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر زمانہ اور ہر عہد کی ایک خاص رُوح ہوتی ہے۔ یہی تمام مظاہر حیات پر چھا جاتی ہے اور تمام اوضاع و اطوار زندگی کے اندر ہم ایک متحد الحال اور یکساں کیفیت کا اثر پاتے ہیں۔ ہر دور میں یہ کیفیات مختلف ہوتی ہیں اور نظرِ غائر سے مطالعہ کرنے والا، ہر زمانے کے مخصوص رجحانات میں ایک بیّن فرق پاتا ہے۔ علوم، شاعری، فنون، طرزِ فکر، اندازِ خیال، نظریۂ زندگی، غرض انسانی تصوّر کا ہر شعبہ اس سپرٹ سے متکیّف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہم جس دور میں سے گزر رہے ہیں، یہ سائنٹفک دور کہلاتا ہے۔ اس میں ہر معاملے اور ہر مسئلے پر تنقیدی اور تجرباتی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جاتی ہے۔ اس میں ہر علم، ہر خیال اور ہر تصوّر کے لیے اصول و قوانین مقرر ہو گئے ہیں اور حد یہ ہے کہ بعض عقلا کے قول کے مطابق اس دَور میں جہالت، جُرم، اور لاعلمی کے حصول کے لیے بھی سائنٹفک طریق موجود ہے۔

مسئلۂ تعلیم کے متعلق موجودہ زمانے میں جس قدر دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے، گزشتہ زمانے میں شاید اس سے کم شوق اور ذوق نہ پایا جاتا ہوگا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج کل علمائے یورپ نے جس حکیمانہ طریق سے فنِ تعلیم کے اصول مدوّن کیے ہیں، ان کا پتہ عہدِ ماضی میں نہیں مل سکتا۔ علم نفسیات، بچّے کا نفسیاتی مطالعہ، ترغیب اور تشویق کے طریقے، تعلیم کے

مختلف شعبوں کے قوانین، غرض ہر موضوع کا مطالعہ اس تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے کہ عہدِ جدید کی ہمہ گیری، جامعیت اور برتری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

تاہم، جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے، ہر دور کی ایک خاص مختص النوع نفسیت اور سپرٹ ہوتی ہے۔ پُرانے اور نئے زمانے کی غرض و غایت تعلیم اور نصب العین تعلیم میں بہت نمایاں فرق پایا جاتا ہے علی الخصوص جہاں تک ایشیائی ممالک اور اسلامی ملکوں کا تعلق ہے، ہمیں ایک نہایت ہی قابلِ ذکر امتیاز نظر آتا ہے۔ ہربرٹ سپنسر کے نزدیک تکمیلِ حیات (Perfect life) تعلیم کی اصلی غرض و غایت ہے اور بعض دیگر محققینِ تعلیم مثلاً ایمرسن وغیرہ کے خیال میں ہماری منزلِ آخری "کلچر" یا شائستگی ہے، لیکن اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ تمام مشرق علی الخصوص مسلمانوں کا تعلیمی نصب العین جسم و روح کی تمام ممکن خوبیوں کا بروئے کار لانا اور ان کی تکمیل کرنا ہے اور تہذیبِ اخلاق اور تصفیہ نفس وہ غایت ہے جس پر ہمارا اُستاد ہمیں پہنچانا چاہتا ہے۔ پس ہماری گزشتہ تعلیم کی تمام بنیاد اور ماحول 'رُوحانی' ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عہدِ گزشتہ میں تعلیم کے تمام مراحل کے متعلق بہت اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہمارے اسلاف کا خیال اس بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی بے حد اور اہم فرائض داریوں میں ایک نہایت ہی دشوار ذمّے داری تعلیم بھی ہے۔ آج جس سرسری اور بے رنگ طریق پر بچے کو مکتب میں بٹھایا جاتا ہے اور آج اُستاد اور شاگرد کے تعلقات میں جو تصنّع، خشکی، اور دنیاداری پیدا ہو گئی ہے اور آج جس طرح تعلیم سے روحانی عنصر کا فقدان ہے، اس سے یہ اندازہ نہ کرنا چاہیے کہ عہدِ ماضی میں بھی یہ پاکیزہ مشغلۂ زندگی آج ہی کی طرح رنگ، خلوص اور اہتمام سے خالی تھا، یا اس زمانے میں بھی اُستاد ایک بڑی عمر کا ملازم یا اتالیق ہوتا

قرار دیا جاتا تھا یا پھر یہ کہ اس دور میں بھی اس کی تمام بنیاد مادی منفعت پر مبنی تھی حقیقت یہ ہے کہ ایسا خیال بالکل خلاف واقعہ ہے اور جو کچھ ہم آجکل دیکھ رہے ہیں وہ پُرانی طرز تعلیم سے کسی طرح مشابہ نہیں ہوسکتا۔

ہمارے خیال کی تصدیق کے لیے صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ پُرانے زمانے میں تعلیم کی ابتدا اور مکتب نشینی کی رسم جس اہتمام سے منائی جاتی تھی، اسی سے اس رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پُرانے لوگ تعلیم کو کیا خیال کرتے تھے۔ یہ رسم ہمارے لٹریچر میں "مکتب نشینی" یا "بسم اللہ" کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔ جس کے کچھ کچھ آثار آج ہندوستان کے بعض حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ عمر کے ایک خاص سال میں بچے کو مکتب میں بھیجا جاتا تھا۔ تعلیم کی اس ابتدا کی ایک تقریب منائی جاتی تھی۔ زعفران اور بعض خوشبودار ادویہ کی ترکیب سے ایک مرکب تیار کیا جاتا تھا، جس سے بچے کی تختی پر حروف لکھے جاتے تھے۔ اسی آمیزہ سے کچھ نقوش بچے کے چہرے اور پیشانی پر بھی بنائے جاتے تھے۔ پڑھائی کے سلسلے میں سب سے پہلے قرآن مجید کی آیت اقرأ باسم ربك الذی خلق، بچے کو حفظ یاد کرائی جاتی تھی۔ اس موقع پر اپنی اپنی حیثیت اور مرتبے کے مطابق جشن منایا جاتا تھا اور اس دن والدین کی طرف سے بہت خوشیاں منائی جاتی، مٹھائی بانٹی جاتی اور بہت صدقہ وخیرات کی جاتی۔ اس ہدیہ اور شیرینی کو پُرانی اصطلاح میں "نشرہ" کہا جاتا تھا۔ مولانا حالی، سرسید احمد خان مرحوم ومغفور کی رسم مکتب نشینی کے متعلق لکھتے ہیں: "سرسید کہتے تھے مجھکو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے، خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھ کو لاکر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا۔

پڑھو، بسم اللہ! . . . پھر اقرأ کی اوّل آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔ مَیں بھی ان کے ساتھ پڑھتا گیا۔ (حیاتِ جاوید۔ ص ۸)

یہ رسم عہدِ اسلامی میں بے حد اہمیت رکھتی تھی، جس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تعلیم کی آئندہ عظمت اور اس کی ضرورت کا لوگوں کو کتنا احساس تھا اور یہ تصوّر صرف عوا تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ بادشاہ اور اُمرا بھی اس بلند نصب العین کا اسی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ احترام کیا کرتے تھے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ تیموری خاندان شہزادگان نہایت بامذاق، شائستہ اور صاحب علم و فضل تھے۔ چنانچہ جب شہزاد سے تخت سلطنت کے لیے باعثِ رونق ہوتے تھے، تو عموماً ان کا وجود اس پُرجلال مس کے لیے موزوں ثابت ہوا کرتا تھا۔ بالیستغر مرزا اعلیٰ درجے کا شاعر تھا۔ سلطان حسین م مصنف تھا۔ الغ بیگ مرزا علم نجوم میں مہارت رکھتا تھا۔ بابر، ہمایوں، کامران، جہا شاہجہان، اورنگ زیب، بلکہ اس خاندان کی لڑکیاں اور بیگمات بھی زیور علم سے آرا ہوا کرتی تھیں۔

یہ صورتِ حالات تمام تر ابتدائی تعلیم کی مرہونِ منت تھی۔ مغلوں میں ایک ر کہ وہ بسم اللہ یا مکتب نشینی کی رسم کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے ابتدائ کے لیے چار سال، چار ماہ اور چار دن کی عمر مقرر کر رکھی تھی اور اس پر سختی کے ساتھ عا ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں تعلیم اور اس کے مسائل کے متعلق بہت سی تفاصیل د جن کو دہرانا یہاں شاید پسندیدہ نہ ہو، لیکن محض بطور اشارہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ نے قدیم طریق سے کامل علٰحدگی اختیار نہیں کی، تاہم اگر وہ فاضل دہر اس مضمون کی اور توجہ کرتا، تو شاید نفسیاتِ تعلیم کی ایجاد کا سہرا اسی کے سر ہوتا۔

عہدِ ماضی میں نصابِ تعلیم کے سلسلے میں کسی قدر تقلید اور قدامت پرستی کا بہت رواج تھا۔ ہمارے ملک کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس میں اجتہاد اور جدتِ حسنہ کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ کلاسیکل کی تعلیم کا رواج تو اس میں شک نہیں ہر جگہ پایا جاتا رہا ہے، لیکن ہماری تعلیم میں انتخاب اور تبدیلی کی برکات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے، چنانچہ بعض بعض کتابوں کے متعلق یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان کا رواج پانچ پانچ سو برس تک چلا آتا رہا ہے۔ تعلیم کا نظری پہلو اگرچہ مضبوط چلا آیا ہے، لیکن "ایجوکیشنل سائیکالوجی" کی رُو سے عملی اور تجرباتی پہلوؤں کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا۔ بااین ہمہ پرانے طرزِ تعلیم کے مطابق طلبہ میں ایک عمق، ایک گہرائی اور ایک عبور کامل ہو جاتا تھا۔ آج جو سطحیت پائی جاتی ہے، وہ ہمارے ناقص طریقِ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ پُرانے دور میں تبحر تھا، نقد و تبصرہ کی کمی تھی۔ آج تنقید میں رجحان کی تربیت تو ہو جاتی ہے، لیکن ذہنی پرورش اور تعلیمی سطح بہت پست ہو گئی ہے۔ حضرت اکبرؔ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے
اُسے کشتی نہیں ملتی، اسے ساحل نہیں ملتا

اگرچہ ہم ہر پرانی چیز کو خواہ مخواہ اچھا ثابت کرنے کے عادی نہیں ہیں اور بنا بریں ہم بلاوجہ معقول نئی تعلیم کی مذمت نہ کریں گے، لیکن ہمیں یہ از روئے انصاف ماننا پڑتا ہے کہ پُرانے زمانے میں جو "جہد للبقا" (Struggle for Existence) تعلیم کے زمانے سے ہی کرنا پڑتا تھا اور علم کے لیے سیاحت اور سفر کی جو مشقتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ نیز اس سلسلے میں اُستاد کے سامنے نیازمندی اور ہمہ تن خاکساری کی جو عادت طبیعت میں راسخ ہو جاتی تھی۔ وہ طالب علم کو اتنا ضرور پختہ کار بنا دیتی تھی کہ وہ زندگی کی آئندہ کش مکش کا کامیابی

کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ سعدی کے سفر، امام غزالی کی تکالیف اور راستے میں ڈاکوؤں کے ہاتھ سے لٹ جانا۔ ہر صدی اور ہر زمانے میں بے شمار طلبہ کا مراکزِ علمی کی طرف سفر کرنا اور ان کے دوران میں طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہونا ـــــ اس کی ایک نہیں، بیشمار مثالیں کتابوں میں ملتی ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پرانے زمانے میں "ترغیب" کے بجائے عموماً "ترہیب" اور "سزا" اور "خوف" ہی کو لڑکوں کی اصلاح کا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔ سعدی کہتے ہیں ؎

بخوردی بخورد از بزرگان قفا
خدا دادش اندر بزرگی صفا

اسی طرح حضرت سعدی یہ بھی فرماتے ہیں، ع جورِ اُستاد بہ زمہرِ پدر۔ جس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس طریقِ اصلاح کی طرف خاص توجہ تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ سزا کا طریقہ آج بھی اُستاد کی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہے اور اس زمانے میں بھی ایسا ہی تھا۔ سعدی نے جہاں یہ فرمایا، وہاں یہ بھی فرمایا کہ ؎

نو آموز را ذکر و تحسین و زہ
ز توبیخ و تادیبِ استاد بہ

دراصل سزا کا ہونا یا نہ ہونا، یا اس کا مفید یا غیر مفید ہونا بجائے خود اتنا اہم مبحث نہیں، کیونکہ اس کا حسن و قبح، نظریۂ تعلیم کے تفاوت سے مختلف ہوتا ہے۔ آج دنیا میں اُستاد اور شاگرد، والدین اور اولاد، راعی اور رعایا کے درمیان سے فرقِ مراتب جس سرعت سے اُٹھ رہا ہے، وہ اسی میلانِ طبع کا نتیجہ ہے کہ شاگرد پر اُستاد کو سختی کرنے کا حق حاصل نہیں، کیونکہ جدید خیال کے مطابق، اس سے ذہنی قوتوں کی بالیدگی رُک جاتی ہے۔ ہمارا عہدِ متوسط سزا کا قائل

ـکھوں اکابر اور ائمۂ علم و فن کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے، جن میں سے ہر ایک نے اسی "سزا" کے ماحول میں پرورش پائی۔ وہ جوہر جو فطرت نے ان کے نہاں خانۂ ضمیر میں دفن کر رکھا تھا، وہ ضرور پھوٹ کر نکل آتا تھا۔ پس اس حقیقت کے پیشِ نظر ہمیں کسی حد تک عہدِ جدید کے اس دعوے کو ماننے سے تامل ہوتا ہے، کیونکہ باعتبار نتائج "سزا" کے زمانے میں "قابلیت" کی کسی طرح کی نظر نہیں آتی اور آج آزادی کے گرد و پیش میں ہمیں وہ نتائج مترتب ہوتے نظر نہیں آتے، جن کی ہمیں توقع ہونی چاہیے تھی۔

آج مدرسہ اور مکتب کو ایک "تفریح گاہ" بنانے کی کوشش ہو رہی ہے، لیکن پرانے زمانے میں ایسا نہ تھا۔ ہمارے شعرا وغیرہ مکتب کی حاضری کو گرفتاری زندان سے تشبیہ دیتے نظر آتے ہیں اور طالب علموں کو گرفتارِ قفس۔ نظیری نیشاپوری کہتے ہیں ؎

درسِ ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پاے را

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُستاد کی تعلیم کے متعلق یہ تخیل ہی نہ تھا کہ اُسے زمزمۂ محبت بھی بنایا جاسکتا ہے۔ تاہم نظیری کے اس شعر میں موجودہ تصور کی ایک غیر اختیاری موجودگی تو پائی جاتی ہے۔ اگرچہ ہمارے شاعر نے ایک رنگ میں "مکتب" کے اُستاد کے سامنے درسِ محبت کا پروگرام رکھا، لیکن سچ یہ ہے کہ مشرقی تعلیم اپنے انداز اور اپنی ان خصوصیات کی بنا پر کسی ایسے زمزمۂ محبت کی قائل ہی نہ تھی، کیونکہ اس میں استاد کی سزا کو باعث ہزار خیر و برکت خیال کیا جاتا تھا اور ایسی صورت میں جبکہ انجام اور غایتِ اصلی "روحانی ترقی" تھی، تو عام طور پر شاگرد اس جسمانی سزا کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، بلکہ اسی کو اکسیرِ سعادت خیال کیا کرتے تھے۔ دنیا میں ہر چیز نقطۂ نگاہ کی تبدیلی سے مختلف نظر آنے لگتی ہے۔ قدیم تعلیم کی

بنیاد اور غرض وغایت کو جب نظروں کے سامنے رکھا جاتا ہے، تو ہمیں "سزا" کی سختی اور غیر موزونیت کا احساس نہیں رہتا اور سعدی کا ہمزبان ہوکر کہنا پڑتا ہے ؎

ہر کہ در خردیش ادب نہ کند
در بزرگی فلاح ازو برخاست
چوب تر را چنانکہ خواہی پیچ
نشود خشک جز بآتش راست

موزونی طریقِ تعلیم

از

شیخ خادم محی الدین، لیکچرر سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس طریق کے متعلق جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے، اُس کی روشنی میں مندرجۂ ذیل چند اسباق کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان اسباق کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ہر سبق میں ایک خاص ترتیب مدِ نظر ہے۔ لَے کو طویل نہیں کیا گیا اور اُسے حسبِ ضرورت دہرایا جا سکتا ہے۔ ابتائی جماعتوں میں اسی سادگی کی ضرورت ہے۔ اُوپر کی جماعتوں میں مختلف اقسام کی لَے مرکب اور مخلوط کی جا سکتی ہے۔

پہلا سبق:

(۱) دو، تین، چار، پانچ اور چھ کروچیٹ کے عرصے کے مطابق تالی بجانا۔ اسی کو مدھ یا دُرت لَے میں جاری رکھنا۔

(۲) مارچنگ اور تالی بجانے کو باہم ملانا۔ پہلے منم سُر پر قدم بڑھا کر گھٹنا جھکانا۔ پھر قدم بڑھا کر پاؤں کو ایڑیوں کے بل اٹھانا۔

(۳) پانچ کروچیٹ کے طولِ وقت اور سیمی بریو، سُر کا اندازہ کرنا اور بنسری کے طرز کے مطابق مارچنگ کرنا اور تالی بجانا۔

(۴) $\frac{3}{4}$ اور $\frac{6}{8}$ کی لَے میں مذکورۂ بالا حرکات کی مشق، جس کا نمونہ حسبِ ذیل ہے

(ا) 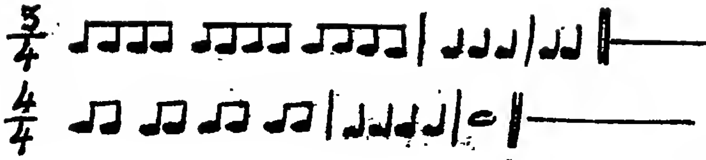

(ب)

دوسرا سبق:

(۱) مارچنگ اور تالی بجانے کی مزید مشق۔ مثلاً ضرب خاص کو واضح کرنا۔ خواہ پاؤں کی حرکت سے کی جائے اور خواہ سر کو پیچھے جھکا کر۔ یہ ضربِ خاص، لَے کے مندرجہ ذیل نمونوں کے ذریعے واضح کی جا سکتی ہے:۔

(ا)

(ب)

(ج)

(۲) مارچنگ کراتے وقت سُروں کو مختلف ضربات میں تقسیم کرو۔ مثلاً ۲، ۴، ۶، ۷، ۱۲، اور ۲۴۔ ہر ضرب کی آواز پر قدم اُٹھائے جائیں۔

(۳) $\frac{12}{4}$ کی لَے میں مارچنگ کی مشق۔ ہاپ کے حکم پر اس حرکت کو ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، اور $\frac{2}{4}$ کی لَے میں تبدیل کیا جائے۔ پھر ۲ سے ۱۲ تک الٹ پھیر کیا جائے۔

(۴) مشق نمبر ۳ کی طرح $\frac{6}{4}$ کی لَے میں مارچنگ کرنا۔ ہر لَے کی تبدیلی پر کلائی کو پھیرا جائے۔

(۵) لَے کو ضبط میں رکھنے کی مشق۔ یعنی پہلے بنسری کی دُھن کے ساتھ مارچنگ شروع کیا جائے اور ہاپ کا حکم ملنے پر (ا) ایک ضرب کے عرصے سے قدم پیچھے ہٹایا جائے۔ اس کے بعد (ب) ایک ضرب پر سکون اختیار کیا جائے۔

(۶) مارچنگ میں (ا) ایک ضرب پیچھے اور ۴ ضربوں کے عرصے سے آگے کی طرف

چلا جائے۔

(ب) دو ضربیں پیچھے اور تین ضربیں آگے
(ج) تین ضربیں پیچھے اور چار ضربیں آگے } کے حساب سے چلایا جائے۔
(د) چار ضربیں پیچھے اور ایک ضرب آگے

(۷) کودنا۔ (ا) جسم کو آگے جھکا کر اور گھٹنوں کو اوپر اُٹھا کر آگے کی طرف جست لگائی جائے۔ اس اثنا میں ہاتھوں کو آگے بڑھا کر اُوپر کی طرف لے جائیں۔

باپ کے حکم پر (ب) تمام جسم کو پیچھے جھکا کر، سر اور بازوؤں کو بھی پچھلی طرف لے جائیں اور جست لگائیں۔

(ج) انھیں دو اقسام کی جست میں بینڈ کے "طرز" کے بموجب ردّ و بدل کیا جائے۔

تیسرا سبق:

(۱) تالی بجانا

(ا) ۷، ۸، اور ۹ ضربوں کے عرصے سے تالی بجانا۔

(ب) ۵/۴ کی لے میں یہی مشق کرائی جائے۔

(ج) ۴/۴ کی لے میں یہی مشق اور اسی کے ساتھ سر کو آگے پیچھے جنبش دینا۔

(د) آڑی ضرب کی مشق۔ مثلاً ۳/۴ کی ایک "بار" میں تین کروچیٹ سُر ہیں۔

⅃ ⅃ ⅃ || اگر ایسی "باروں" کا سلسلہ لگاتار ضربوں کے ذریعے جاری رکھا جائے، تو وہ تسلسل سیدھی گنتی کہلائیگی اور ضربیں بھی سیدھی ہونگی۔ لیکن فرض کیا کہ "ایک، دو، تین" کہنے کے بجائے ہم یوں کہیں "تین، ایک، دو، تین" یعنی تیسری ضرب کو دوسری "بار" کی پہلی ضرب کے ساتھ یکجا کر کے دونوں کو اُتنے ہی عرصے میں ادا کریں، جتنے میں ایک کروچیٹ کا طول

وقت مقرر ہے، تو اس مرکب ضرب میں ایک کو آیوڈ سُر اور دو کروچیٹ پائے جاتے ہیں اور ایسی تمام "بار" کی چار ضربیں، تین ضربوں کے برابر ہونگی۔ گویا ہم نے معمولی سیدھی گنتی کو آڑے طریق سے ادا کر دیا۔ اس طریق سے، کسی "بار" میں سے ایک ضرب کے سُر کو اُٹھا کر اگلی "بار" کے ساتھ شامل کر لینے کو موسیقی کی اصطلاح میں سنکو پیشن (Syncopation) کہتے ہیں اور مذکورۂ بالا آڑی "بار" کو علامات کے ذریعے یُوں ظاہر کرینگے :۔

اسی طریق کے بموجب، ہر طرز کی مختلف "باروں" میں سے ایک ایک ضرب کے دو دو ٹکڑے کر کے ہر دوسرے ٹکڑے پر تالی بجانے کی مشق کرائی جائے۔

(س) گزشتہ دو اسباق کی مختلف مشقوں کو دہرایا جائے۔ اسی کے ساتھ ۱۲۰ سے لگاتار ۱۳۶ کی لَے کے مطابق طولِ وقت کا اندازہ تالی بجا کر کرایا جائے اور ساتھ ہی مارچنگ کو جاری رکھا جائے۔ ہالٹ کے حکم پر مناسب ردّ و بدل کیا جائے اور ہر عرصے کی ہر تبدیلی پر کلائی کو بھی گھمایا جائے۔

(۸) مارچنگ اور تالی بجانے کی مشق آڑی ضربوں کے حساب سے اس طرح کرائی جائے کہ جب ایک "بار" کا آخری سُر بجے، تو اُس کے فوراً ہی بعد قدم اُٹھائے جائیں۔

لَے کے نمونے حسبِ ذیل ہیں :۔

(ا) ٹرپلٹ سُروں کی ضربیں لگاتار سلسلے میں :۔

(ب) مخلوط ضربیں :۔

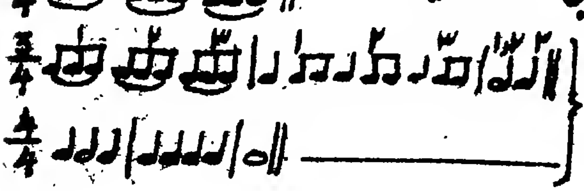

چوتھا سبق:

(۱) پیانو یا بنسری کے مطابق مارچنگ اور تالی بجانے کی مشق کرنا اور ہاپ کے حکم پر ایک سُر کی ضرب کو خالی چھوڑتے جانا۔

(۲) آڑی ضربوں کی مزید مشق۔

(۳) بنسری کی آواز کے ساتھ مارچنگ کرنا۔

(۴) آسان آسان تالوں کی لَے کے بموجب، ساز پر بجائی ہوئی ہر "بار" کے خاتمے پر، اسی قدر عرصے کو خاموشی کے ساتھ حرکاتِ جسمانی سے واضح کرنا۔

(۵) تین تین طلبہ کا ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر، لَے کے ساتھ آگے اور پیچھے اُچھلنا۔ یہ اچھل کود پہلے ایک تنگ دائرے کے اندر ہونی چاہیے۔ پھر یہ حرکت بتدریج ایک وسیع دائرے کی شکل اختیار کرے۔

(۶) ہر لڑکے کا انفرادی طور پر مشق ۵ کے بموجب اُچھلنا۔ پھر تمام جماعت کا گول دائرہ بنا کر اور ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر یہی مشق کرنا۔ اس مشق کے دوران میں، پہلے جسم اور سر کو آگے کی طرف جھکایا جائے۔ گھٹنا سیدھا رہے اور بازو بندھے رہیں۔ اس کے بعد سر اور ٹانگیں سیدھی ہو جائیں اور بازو سامنے کی طرف کھول دیے جائیں۔

اس تمام سبق کے دوران میں سُروں اور ضربوں کے استعمال کرنے میں ۲/۴ کی لَے سے کام لیا جائے۔

پانچواں سبق:

(۱) اس سبق میں مارچنگ کو ۶/۸ کی لے سے کروچیٹ سروں کے ذریعے کرایا جائے۔ ہاپ کہنے پر، ایک کروچیٹ کے بعد ایک کو اپور سُر ہر "بار" میں کھا جائے مثلاً

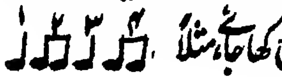

(۲) طلبہ کے دو دائرے بنائیں، ایک اندر کا، دوسرا باہر کا۔ اگر اندر والے لڑکے کروچیٹ سروں کے مطابق حرکات کریں، تو باہر والے لڑکے کواور سروں کے مطابق پاؤں اور بازو ہلائیں۔ لے کا اندازہ وہی رکھا جائے، جو نمبر ا کی شکل میں ہے۔

(۳) آڑی ضربوں کی مزید مشق۔ اس کے لیے نغمے خود اختراع کیے جائیں۔

(۴) لے کی قدرے پیچیدہ صورتوں، مثلاً $\frac{6}{8}$ یا $\frac{9}{8}$ سے کام لیا جائے۔

چھٹا سبق :

(۱) ان نغموں میں، جن سے طلبہ بخوبی واقف ہوں، قدرے پیچیدگی کو دخل دے کر مارچنگ کرائیں۔ ہر پیچیدگی کو جسمانی طور پر کسی نہ کسی نئی حرکت کے ذریعے واضح کیا جائے، مثلاً ہاتھ یا بازو کی حرکت یا پاؤں کو کسی خاص ضرب پر پٹخنا۔

(۲) جماعت کو چار گروہوں میں بانٹ دو۔ ساز پر ایک "طرز" ایسی بجائی جائے، جس میں چار "باریں" کسی مقررہ لے میں موجود ہوں۔ ہر گروہ باری باری ایک ایک "بار" کے ساتھ پاؤں کو زمین پر پٹخے۔ باقی اعضا کی حرکات کو مدرس اپنی پسند کے بموجب ساتھ شامل کرے، مثلاً ہاتھ، بازو اور سر کی حرکات جو آگے یا پیچھے کو جاری رہیں۔ جب ہر گروہ ایک ایک "بار" کے ساتھ یہ حرکات ختم کرلے، تو تمام جماعت چاروں "باروں" کے بموجب حرکت کرے۔

(۳) تین تین لڑکوں کے گروہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیں اور ٹرپلیٹ سُر وا $\frac{3}{4}$ کی لے میں ساز پر بجائیں۔ تین تین "باروں" کے ساتھ ہر گروہ باری باری ورزش کرے۔

(۴) مشق نمبر ۳ کے بموجب ہر تین لڑکوں کا گروہ ایک ایک ٹرپلیٹ سُر کے جواب باری باری حرکات کرے۔ اب ٹرپلیٹ سُروں کو کروچیٹ سُروں میں تبدیل کر کے مشق نمبر ۴ کو اسی طریق سے کراؤ، یا ان سُروں میں مذکورۂ بالا مزید اقسام کے سروں کو دخل دو اور بشہ

صدر حرکات کو جاری رکھو یا ان سُروں کو مخلوط کرکے جا۔ بجا ہاپ کہہ کر حرکات میں ردّ و بدل کرواؤ۔

(۵) ساز پر چار کروچیٹ کی ایک "بار" بجنے پر مارچنگ کراؤ۔ پھر اس رفتار کو چار کو اور سُروں کے مطابق دُگنا کردو۔ ہر پہلے کروچیٹ سُر کو ضربِ خاص تصور کیا جائے۔

(۶) کسی طرز کی آخری "بار" پر تالی بجائی جائے۔

ساتواں سبق :

(۱) ۵/۴ کی لے کے ساتھ مارچنگ کراؤ۔ اس میں کسی ایک ضرب پر ہاپ کہہ کر باقی ماندہ ضربات کا خیالی شمار کرایا جائے، یعنی، ذہنی طور پر طلبہ باقی ماندہ عرصے کو پورا کرکے پھر اُسی ایک ضربِ خاص کو پاؤں پٹخ کر ظاہر کریں، یا تالی بجا کر۔

(۲) طولِ وقت کو ایک "بار" کے عرصے سے مارچنگ کے ذریعے واضح کیا جائے۔ اس ایک "بار" میں تین اقسام کے سُر ہونے چاہییں، یعنی کوایور، کروچیٹ اور منم۔ (دیکھو شکل)

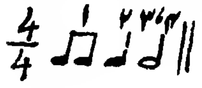

(۳) مشق ۲ کی رفتار دگنی کرکے مارچنگ کراؤ۔

(۴) مشق ۱ کی لے کے مطابق مارچنگ کراؤ، لیکن اس کی تال کو دگنے عرصے سے واضح کراؤ۔

(۵) بازوؤں کی حرکات ۴/۴ کی لے میں اور سر کی حرکت ۲/۴ کی لے میں کی جائے۔

(۶) دائیں بازو سے ۲/۴ اور بائیں بازو سے ۳/۴ کی لے ظاہر ہو۔

(۷) بازوؤں کی حرکت ۳/۴ اور پاؤں کی حرکت ۴/۴ کی لے سے واضح کی جائے۔

(۸) سر کی حرکت ۲/۴، پاؤں کی ۴/۴، دائیں بازو کی ۳/۴ اور بائیں بازو کی ۴/۴ لے کو ظاہر کرے۔

(۹) ایک ہی وقت میں پاؤں ۲/۴ اور بازو ۳/۴ لے کے مطابق حرکت کریں۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام مشقیں پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اُستاد اپنی سمجھ کے مطابق سُروں اور ضربات کو اور زیادہ پیچیدہ کر سکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ جب تک ایک مشق مکمل نہ ہو، دوسری مشق نہیں کرانی چاہیے۔

آٹھواں سبق:

(۱) کسی تال کے مطابق مارچنگ کراؤ اور جب ساز بجتے بجتے لے کو تبدیل کرے، تو ہاں کہے بغیر، طلبہ سے ان کی سمجھ کے مطابق، مارچنگ کی رفتار کا اندازہ کراؤ۔

(۲) ساز ۳/۴ کی لے سے بجایا جائے۔ جونہی طلبہ اس لے کی تفہیم کر لیں، خود بخود مارچنگ شروع کراؤ۔

(۳) ساز کی ایک "بار" ختم ہونے پر، اس کے طولِ وقت کے اندازے کی جانچ حرکات کے ذریعے کرانی چاہیے۔

(۴) ۳/۴ سے ۶/۸ کی لے میں جسمانی حرکات کو منتقل کرنا۔ اس کی صورت حسبِ ذیل ہو سکتی ہے:۔

اوّل، تین تین طلبہ کے گروہوں کو اس طرح کھڑا کیا جائے کہ ایک لڑکا آگے اور دو اس کے پیچھے کھڑے ہوں۔ اگلا لڑکا ۳/۴ اور پچھلے دو ۶/۸ کی لے سے مارچنگ کریں۔ ۳/۴ میں تین کوا ور ضربات ہوں۔ مثلاً (3/4 ♩ ♩ ♩) اور ۶/۸ کی لے میں ایک "بار" کے دو ٹرپلیٹ سُر موجود ہوں، جیسے (6/8 ♪♪♪ ♪♪♪)

دوم۔ اس یکسانیت میں مندرجۂ ذیل قسم کے اختلاف کو لے میں داخل کیا جائے

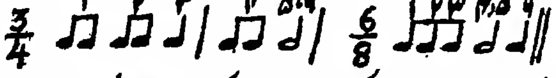

(۵) ۲/۴ کی لے سے پاؤں اور سر کی جنبش۔ ۳/۴ کے ساتھ بائیں بازو اور ۴/۴ ۔

مطابق دائیں بازو کی حرکت کرائی جائے۔

(۶) کروچیٹ سُروں کے ساتھ مارچنگ کرتے ہوئے، دائیں ہاتھ سے تال واضح کی جائے اور اسی تال کو شدہ شدہ بائیں ہاتھ سے دُگنی لے کے ساتھ ظاہر کیا جائے۔ پھر اسی کی دگنی (یعنی چوگنی) لے کے ساتھ دوڑ لگائی جائے۔

(۷) دو دو لڑکوں کے گروہوں کا، ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہاتھ پکڑ کر پہلے آگے اور پھر پیچھے کی طرف مارچنگ کرنا۔

(۸) ساز پر بجائے ہوئے سب سے طویل سُر یعنی سیمی بریو کو چھ اجزا میں تقسیم کر کے حرکات کے ذریعے واضح کریں۔ مثلاً (○) مساوی ہے ($\frac{4}{4}$ ♩¹ ♫² ♫³ ♩⁴)۔ اسی طرح تین منم سروں کو چھ ٹکڑوں میں بانٹ کر بتائیں۔

(۹) اب دائرہ بنانے کے بجائے لڑکوں کو سیدھی قطار میں کھڑا کرو۔ پہلا لڑکا چار سیمی بریو سروں کے طولِ وقت کے اندازے سے آگے کی طرف مارچنگ کرے۔ دوسرا چار منم کے اندازے سے۔ تیسرا چار کروچیٹ علیٰ ہٰذالقیاس پانچواں چار سیمی کوایور اور چھٹا پھر سیمی بریو کے مطابق بڑھے۔

(۱۰) جماعت کو دو گروہوں میں بانٹ دو۔ ایک لڑکا سامنے کھڑا ہو کر دونوں ہاتھوں سے کسی ایک کے مطابق تالی بجائے۔ جب وہ کسی ضربِ خاص کو بائیں ہاتھ کے اشارے سے واضح کرے، تو بائیں طرف کا گروہ اسی ضرب پر پاؤں پٹخے اور جب دائیں ہاتھ سے اسی ضرب کا اشارہ کرے، تو دایاں گروہ وہی عمل کرے، جو بائیں گروہ نے کیا تھا۔

(۱۱) جماعت سیدھی قطار میں کھڑی ہے۔ سب نے اپنا اپنا نمبر بول دیا۔ ایک

لڑکا سامنے آکر اس لَے کے مطابق تالی بجائے، جو اس شکل میں دکھائی گئی ہے،
ا ـ ـ ا ـ ـ ا ـ ـ ا ـ ـ ا ـ ـ ا ـ ـ ا ـ ـ ۔ اب اُستاد کسی نمبر والے لڑکے کو ہاتھ سے بُلانے کا اشارہ کرے۔ یہ لڑکا آگے کی طرف اسی لَے کے مطابق مارچنگ کرتا ہُوا جائے۔

(۱۲) جماعت کا پھر ایک دائرہ بناؤ۔ ایک لڑکا دائرے کے مرکز میں کھڑا ہو کر کسی لَے کے مطابق تالی بجائے۔ دوسرے تمام لڑکے اسی لَے کی رفتار کے بموجب قدم اُٹھاتے ہُوئے گھومیں۔

(۱۳) اسی دائرے کی شکل کے بموجب ایک لڑکا مرکز میں کھڑا ہو کر ۴/۴ کی تال دے۔ یہ تال بتدریج تیز ہوتی جائے۔ پھر بتدریج کم ہوتی جائے۔ دوسرے لڑکے گول دائرے میں لَے کی رفتار کے ساتھ مارچنگ کریں۔

(۱۴) ساز کی مدد سے مارچنگ کراؤ۔ کچھ دیر کے بعد ساز کی آواز بند ہو جائے او مارچنگ اسی رفتار سے جاری رہے۔ پھر ہاپ سُن کر لڑکے ٹھیر جائیں اور "طرز" کی ایک "باروں" کے عرصے کو تالی بجا کر واضح کریں۔

نواں سبق:

(۱) ہاتھوں اور بازوؤں کو دائرے میں گھمانا۔ پہلے ساز کے ایک سُر کے سا چھوٹا دائرہ بنایا جائے۔ اس کے بعد دو سُروں کی آواز پر اس سے بڑا دائرہ۔ تین سُرو کے بجنے پر اس سے بھی بڑا۔ حتیٰ کہ بارہ سُروں تک پہنچ کر بازو کی پوری اور کھلی حرکت دائرے کو مکمل کیا جائے۔

(۲) بازوؤں سے 8 کے ہندسے کی شکل بنانا۔ ایک سُر سے آٹھ سُروں تک بشرح صدر یہ شکل مکمل کی جائے۔

(۳) مقررہ احکام مثلاً دایاں بازو، بایاں بازو یا سر کے مطابق عضلات کو تنا جائے، یا ڈھیلا چھوڑا جائے۔

(۴) زمین پر لیٹ کر احکام کے مطابق (مثلاً دایاں بازو یا بائیں ٹانگ) بازوؤں اور ٹانگوں کو بلند کیا جائے۔

(۵) دو سیمی بریو سُروں کے عرصے سے آہستہ آہستہ مارچنگ کراؤ۔ اسی طرح دو دو منم یا کروچیٹ ضربات کی رُو سے یہی عمل جاری رکھو۔ یہ خیال رہے کہ قدم سُروں کی حیثیت کے مطابق بتدریج تیز ہوتے جائیں۔

(۶) جماعت کے تمام لڑکے ایک دائرے میں جھک کر کھڑے ہوں اور اپنا اپنا نمبر پکاریں۔ جب ساز پر ایک سُر بجے، تو پہلا لڑکا سیدھا کھڑا ہو جائے۔ دوسرے سُر پر دوسرا لڑکا کھڑا ہو۔ منم سُر بجنے پر دو لڑکے بیک وقت سیدھے کھڑے ہو جائیں۔ سیمی بریو سُر پر چار لڑکے کھڑے ہوں۔

مذکورۂ بالا اسباق نمونے کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ اگر یہ تمام اسباق پورے ہو جائیں، تو مدرس میں مزید اسباق اختراع کرنے کی استعداد پیدا ہو جانی چاہیے۔

بچّے کی زندگی کا پہلا سال

از

مرزا مقبول بیگ بدخشانی، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

بچے کی تعلیم کا ابتدائی حصّہ اسکول کی تعلیم سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے۔ بچّہ جب پیدا ہوتا ہے، تو اُس کی دیکھ بھال اس کی ماں کرتی ہے۔ بچہ نہ اس سے کچھ کہتا ہے، نہ اس کی کوئی سنتا ہے۔ دلی احساس سے ماں کو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ اب اُسے فلاں چیز کی ضرورت ہے۔ اب اُسے فلاں بات پسند ہے۔ ہمارے ہاں کے شہروں میں اکثر بچے تو پیدا ہوتے ہی اس دنیا کو خیرباد کہہ جاتے ہیں۔ جو بچتے ہیں، اُن میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں، جن کی پرورش اچھی طرح سے نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی صحت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ ان کی گویا یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں۔ چھوٹے بچے بالخصوص جب تک کہ وہ ہلنے اور حرکت کرنے میں محض بے بس ہوتے ہیں۔ ماؤں کو بہت پیارے لگتے ہیں۔ وہ انھیں جدا کرنا نہیں چاہتیں اور تقریباً بہت سے طبی اصول اُن کی ممتا کو ناگوار گزرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ اُونچے طبقے کے لوگ بچوں کی پرورش کے سلسلے میں طبی اصول کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں، اس لیے بچوں کی موتیں بھی کم واقع ہوتی ہیں اور ان بچوں کی دماغی اور جسمانی حالت بھی نسبتہً اچھی ہوتی ہے۔

بچوں کی جسمانی صحت کے متعلق مجھے یہاں کچھ زیادہ نہیں عرض کرنا ہے۔ ہاں البتہ جہاں جہاں جسمانی صحت کو نفسیاتی اہمیت بھی حاصل ہے، اس کا ذکر ضرور کیا جائیگا، لیکن بچے کی زندگی کے پہلے سال میں جسمانی اور دماغی کیفیتیں کچھ اتنی ملی جلی ہوتی ہیں کہ ان میں تمیز کرنا مشکل

ہوتا ہے، اس لیے پہلے سال میں جسمانی صحت کے تذکرے کے بغیر چارہ ہی نہیں۔

نوزائیدہ بچہ جبلتیں (Instincts) اور معکوسات (Reflexes) تو رکھتا ہے، لیکن اُسے کسی بات کی عادت نہیں ہوتی۔ عادتیں بعد میں بنتی ہیں۔ ماں کے شکم میں ممکن ہے، کوئی خاص بات اس کی عادت میں داخل ہو جائے، لیکن یہ عادت دیرپا نہیں ہوتی اور اس دنیا میں اس کے لیے کارآمد بھی نہیں ہوتی۔ شروع شروع میں بعض صورتوں میں تو سانس لینا بھی ماں یا دایہ ہی کو سکھانا پڑتا ہے۔ کئی بچے یہیں مر جاتے ہیں۔ چونکہ سکھانے کے باوجود ٹھیک طور سے سانس نہیں لے سکتے۔ بچے کی چوسنے کی جبلّت بہت ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ جب وہ ماں کا دودھ پیتا ہے یا اپنا انگوٹھا چوستا ہے، تو وہ کسی قسم کا تکلّف محسوس نہیں کرتا، بے تکان اپنے فعل کو جاری رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اس میں خاص مہارت حاصل ہے۔ مانوس وہ صرف اسی بات سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دُنیا کی ہر چیز اُس کے لیے نئی ہوتی ہے اور ہر نئی چیز کو وہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ وہ ان حیران کر دینے والی چیزوں کو نہیں دیکھنا چاہتا، اس لیے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سو جاتا ہے۔ دن اور رات کا زیادہ تر وقت وہ سو کر گزار دیتا ہے، اس لیے بھی کہ اُسے نیند بہت آتی ہے اور اس لیے بھی کہ وہ ان چیزوں سے مانوس نہیں۔ دو اڑھائی ہفتے کا عرصہ گزر جانے کے بعد حالات کی صورت کچھ بدل جاتی ہے۔ جن چیزوں کو وہ نیا سمجھتا تھا، وہ اب اس کے لیے نئی نہیں رہتیں۔ ان سے مانوس ہوتا جاتا ہے۔ جس چیز کو وہ زیادہ دیکھتا ہے، اس سے وہ اپنے آپ کو زیادہ قریب محسوس کرتا ہے۔ جس چیز کو وہ اب بھی پہلی مرتبہ دیکھتا ہے، اس سے دور رہنا چاہتا ہے۔ تو گویا پہلے پہل بچہ بہت قدامت پسند ہوتا ہے۔ اس زمانے میں عادتیں بہت تیزی کے ساتھ بنتی ہیں اور اتنی تیزی کے ساتھ کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اچھی عادتیں اچھا بنا دیتی ہیں

اور بُری عادتیں بُرا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے، اُس کی بُری عادتیں اچھی عادتوں میں رکاوٹ ڈالنے کا موجب بنتی ہیں۔ اس لیے اس بات پر زیادہ زور دینا چاہیے کہ بچپن میں بچے کی عادتیں اچھی ہوں، بُری نہ ہوں۔ حکما کا قول ہے کہ انسان کو جو کچھ بننا ہوتا ہے، اپنی پانچ برس کی عمر میں بن چکتا ہے۔ حقیقت میں یہ بات صحیح بھی ہے۔ اگر بچّے کی عادتیں اچھی ہوں، تو ماں باپ کی بہت سی پریشانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نیز جو عادتیں بچپنے میں بن جاتی ہیں، وہ گویا ان کی جبلتیں ہو جاتی ہیں۔ ان عادتوں کی گرفت بھی جبلتوں کی گرفت کی طرح بہت مضبوط ہوتی ہے۔ جو عادتیں بچپن میں بن چکتی ہیں، ان سے متضاد عادتیں اگر لڑکپن میں پڑیں، تو یہ ان کے مقابلے میں کمزور ہونگی۔ اس لیے ہمیں بچپن کی عادتوں کو بہت اہمیت کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔

بچپن کی عادتوں پر جب ہم غور کرتے ہیں، تو ہمارے سامنے دو باتیں آتی ہیں۔ پہلی اہم بات "صحت" ہے اور دوسری "سیرت"۔ قدرتی طور سے ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے بچے جب لوگ دیکھیں، تو اس سے محبت کریں، نفرت نہ کریں۔ دُبلا پتلا منحنی سا بچہ ہوگا، تو کوئی اُس سے محبت نہ کرے گا۔ سُرخ و سپید، مضبوط اور ہوشیار بچہ ہوگا، تو سب کی نظریں اس پر پڑینگی، وہ سب کو پیارا لگیگا۔ ہمیں یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ بچہ بڑا ہو کر دوسروں سے کامیابی کے ساتھ گھل مل سکے۔ اس بات کا انحصار سیرت پر ہے، تو گویا صحت اور سیرت ایک ہی منزل کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

تعلیم یافتہ گھروں کے لوگ اس بات کی اہمیت اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ بچّوں کو وقت پر دودھ دینا چاہیے۔ یہ نہیں کہ جب بچہ رو دیا، اُسے دودھ مل گیا، لیکن ابھی تک بہت سے گھروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ادھر بچہ رویا، اُدھر ماں نے اُسے دودھ دے کر چُپ کرایا۔ یہ طریقہ بہت بُرا ہے، صحت کے خیال سے بھی اور اخلاقی لحاظ سے بھی۔ بچّے جوں جوں

ہوتے ہیں، ہوشیار ہوتے جاتے ہیں اور وہ اس سے کہیں زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں، جتنا ہم انھیں خیال کرتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کی جذباتی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں، انھیں یقین ہوتا ہے کہ رونے سے دودھ مل جائیگا۔ چنانچہ جب انھیں وقت بے وقت بھوک لگتی ہے، وہ رو دیتے ہیں۔ ہم بچوں کو بُری عادت تو خود ڈالتے ہیں، لیکن ہمارے اس جرم کی سزا ان غریبوں کو آئندہ سالوں میں بھگتنا پڑتی ہے۔ اس وقت بچہ اپنی عادت کے بموجب بار بار ایک شکایت کرتا ہے، لیکن یہ شکایت بجائے اس کے کہ بزرگوں کے دل میں ہمدردی کا احساس پیدا کرے، اُلٹا ان سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ بچے جب دیکھتے ہیں کہ ان کی بات پر کسی نے کان نہیں دھرا، تو انھیں بہت حیرت ہوتی ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے۔ دنیا انھیں سرد مہر اور بے دردسی نظر آنے لگتی ہے۔ بچیوں کا حال کچھ ان سے مختلف ہوتا ہے۔ ان کی بچپن کی یہ عادت لڑکپن تک بُری نہیں معلوم ہوتی۔ وہ لڑتی جھگڑتی ہیں، تو انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا، اُلٹا ان سے پیار کیا جاتا ہے اور بچپن کی اس عادت کو اور زیادہ پختہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے بہت خوفناک ہوتے ہیں۔ سرمایہ داروں میں تو یہ باتیں عام ہیں۔ بہر حال یہ باتیں بُری ہیں۔ اگر بچپن میں تربیت کے اچھے طریقے نہ اختیار کیے جائیں، تو بچے جوان ہو کر یا تو غیر مطمئن رہتے ہیں یا حد سے زیادہ طماع۔ تو گویا اخلاقی تربیت کا پہلا اور بہترین موقع پیدائش ہی کا ہوتا ہے اگر ہم اس موقع کو ہاتھ سے دے دیں اور اس کی تربیت اس وقت پر اُٹھا رکھیں کہ وہ سیانا ہو جائے، تو ہمیں بہت مایوسی ہوگی۔ اس وقت اس کی عادتیں بن چکی ہونگی۔ اگر اس کی یہ عادتیں ہمارے منشا کے خلاف ہوں، تو ہمیں ان کے خلاف جہاد کرنا پڑیگا۔ یہ بات بچے کی آزردگی اور برہمی کا موجب ہوگی۔

بچے کی طرف ہمیں توجہ بھی دینا پڑتی ہے اور اس کو بعض اوقات نظر انداز بھی کرنا

پڑتا ہے۔ جو بات بچے کی صحت کے لیے ضروری ہے، اس پر آپ پوری پوری توجہ دیں۔ بچہ سردی سے ٹھٹھرتا ہے، تو آپ اُسے اٹھالیں۔ اُسے نرم و گرم کپڑوں میں لپیٹ دیں۔ اُسے پیار بھی کریں اور گرمادیں۔ لیکن اگر بلاوجہ چلا رہا ہے، تو اُسے چُپ کرانے کے لیے پیار کر ٹھیک نہیں۔ اُسے جوں کا توں رہنے دیں کہ وہ اچھی طرح سے رو لے اور آپ ہی آپ چپ ہو جائے۔ اگر آپ ہر بار اس کے رونے سے متاثر ہو گئے اور ہر بار اُسے چپ کرا کے لیے آغوش میں اُٹھاتے رہے اور یوں اس کے دل کی بات پوری ہوتی رہی، تو وہ بڑا ہو ضدی ہوگا، ظالم ہوگا اور جفاکار ہوگا۔ اپنے مفاد کے لیے کسی دوسرے کے مفاد کی ہر پروا نہ کرے گا۔ جب آپ اُسے چپ کرانا ہی ضروری سمجھیں، تو بہت زیادہ گھبراہٹ او ہنگامہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ جو بات موقع کے لحاظ سے مناسب اور ضروری ہو، وہ آ کر دیں۔ ہمدردی کریں، لیکن ہمدردی کا اظہار نہ کریں۔ ہمدردی بس اسی قدر کافی ہے ک بات ضروری تھی، ہولی۔ لفظی جمع خرچ سے بچے کی طبیعت بگڑے گی۔ بچے کو شروع بہت زیادہ منظورِ نظر نہ بنالینا چاہیے ہمیں اس کو شروع ہی سے ایک توانا اور جوان مرد کرنا چاہیے، جسے ہماری فریفتگی کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ اُسے بچہ ہی سمجھتے رہیں گے، رکھیں، بچے کی بہت سی عادتیں ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہی عادتیں اگر بلوغت کے وقت قائم رہیں، تو ہم انھیں برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے انھیں بالغ ہی سمجھنا چاہیے اور اُس کے سا ہی کا سلوک کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بچے میں بالغ کی سی عادتیں نہیں پیدا ہو لیکن جو جو باتیں ایسی عادتوں میں روک ڈالنے کا موجب ہوں، ان کو دور کرنے کی ضرور کوشش کر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں بچے کے لیے کوئی ایسی بات نہ کرنا چاہیے، جس سے اس میں پندار کا ہوا اور وہ اپنے آپکو بہت کچھ سمجھنے لگے۔ سیئیات حقیقت سے دور ہوگی اور اس کے لیے آئندہ زندگی

اور ذلت کا باعث ہوگی۔

بچے کی صحت و حفاظت کے لیے پوری پوری دیکھ بھال اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ماں باپ جو والہانہ طور پر بچوں سے محبت کرتے ہیں، ان باتوں پر کاربند نہیں رہ سکتے۔ ایسے پرستار والدین کی نظروں میں بچے کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے اور اگر بہت زیادہ احتیاط نہ کی جائے، تو بچہ بھی اپنے متعلق یہی محسوس کرنے لگتا ہے، لیکن جب اُسے حقیقی زندگی میں قدم رکھنا پڑتا ہے، تو یہاں بھی اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ سماج والدین کی طرح اس کی ناز برداری کرے اور اُسے اپنی امیدوں کا مرکز بنائے۔ لیکن یہ بات ممکن نہیں۔ سماج کو اس بات کی ہرگز پروا نہیں کہ وہ ماں باپ کی امیدوں کا مرکز تھا یا نہیں۔ اس کی محبوبیت کے معیار ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت سے بہت مختلف ہیں۔ وہ نقاد ہے اور صرف اسی کو اپنا عزیز جانتی ہے، جو اس کے معیار پر پورا اُترے۔ ایسے محبت آشنا بچوں کو عملی زندگی میں سخت مایوسی ہوتی ہے، تو اس لیے ضروری ہے کہ زندگی کے پہلے سال میں اور آئندہ سالوں میں بچے کی تکلیفوں کو شگفتہ روئی سے دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس کی تکلیف کے ساتھ اپنی تکلیف کا اظہار نہ کریں۔ پچھلے دور کے لوگ اور غیر تعلیم یافتہ لوگ بچوں کو اب بھی پنگھوڑوں میں ڈال دیتے ہیں اور یوں ان کے جسم قید کر دیے جاتے ہیں۔ ان کے اعضا کو بہت زیادہ گرمایا جاتا ہے۔ وہ غریب دن اور رات کا اکثر حصہ اسی صورت میں پڑے رہتے ہیں، آزادی کے ساتھ اپنے ہاتھ پاؤں کو نہیں ہلا سکتے۔ ایک طرف تو یہ حال ہے اور دوسری طرف انھیں لوریاں دی جاتی ہیں، تھپکا جاتا ہے، پیار کیا جاتا ہے، جھولنے میں جھلایا جاتا ہے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ لوریاں دینا، پیار کرنا، جھولا جھلانا وغیرہ بچے کی قطعاً کوئی خدمت نہیں۔ اس کی خدمت تو یہ ہے کہ ہم اُسے آزادی کے ساتھ حرکت کرنے کا موقع دیں اور

اسی چیز سے وہ غریب محروم رکھا جاتا ہے۔ اس طرح بچے بالکل بے بس اور طفیلی قسم کے ہو جاتے ہیں۔ بچے کی ناز برداری یا اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آپ کو کوئی تکلیف اٹھانا پڑے، تو یہ تکلیف آپ بچے پر ہرگز ظاہر نہ ہونے دیں۔ ہماری جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جس قدر ممکن ہو، بچے کی زندگی کو بیرونی ضبط و نظم سے آزاد کر دیا جائے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ بچے میں اندرونی ضبط پیدا کیا جائے اور یہ ضبط ایسا ہو کہ خود اس کی اپنی ذات سے متعلق ہو۔ اس ضبط کی ترتیب کے لیے موزوں ترین وقت بچے کی زندگی کا پہلا سال ہے، مثلاً اگر آپ بچے کو سُلانا چاہتے ہیں، تو جیسا کہ اکثر ہمارے ہاں کے گھروں میں ہوتا ہے، اُس کو گود میں لیکر لوریاں دینا نہ شروع کر دیں۔ کندھے سے لگا کر تھپکائیں نہیں۔ اُٹھا کر ادھر اُدھر پھرنے نہ لگ جائیں۔ بچے کو یہ باتیں یقیناً پسند ہیں، لیکن یہ باتیں اسے آپ کی نیازمندیوں کا عادی بنا دینگی۔ ایک مرتبہ آپ یوں کرینگے، تو وہ چاہیں گے، دوسری مرتبہ بھی ایسا ہو، غرضکہ ایسا ہوتا ہی رہے تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی خوشامد ناکافی ثابت ہوگی اور اُسے سُلانا مشکل ہو جائیگا۔ ایک خشک بستر میں اُسے اس طرح لٹا دیں کہ وہ آرام محسوس کرے۔ اسے ایک مرتبہ تھپک بھی دیں اور کہہ دیں، لو بیٹا اب تم سو جاؤ۔ لیکن اس انداز میں کہیں کہ وہ آپ کی بات سمجھ لے۔ پھر اُسے تنہا چھوڑ دیں۔ وہ آپ کی سرد مہری کو پسند نہیں کریگا اور چیخنا چلّانا شروع کر دیگا، لیکن اس کا چیخنا چلّانا زیادہ دیر تک نہیں رہیگا۔ پانچ چار منٹ کے بعد وہ آپ ہی آپ چپ ہو جائیگا۔ پیار دلاسا دے کر سلانے کی نسبت یہ طریقہ زیادہ اچھا اور زیادہ سہل ہے۔

اُوپر ذکر آ چکا ہے کہ بچہ جبلّتیں اور محسوسات تو رکھتا ہے، لیکن اسے کسی خاص بات کی عادت نہیں ہوتی۔ کسی خاص چیز کی پہچان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نگاہ کے سامنے سے کئی بار گزرے۔ جب وہ چیز ایک مرتبہ پہچان میں آ جائے، تو پھر اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے۔ بچہ

پنگھوڑے کے احساس سے، ماں کے دودھ کی خوشبو سے، دایہ کی آواز سے بہت جلد شناسا ہو جاتا ہے۔ ان سب کو وہ شروع شروع میں احساس کے ذریعے سے پہچانتا ہے، نظر کے ذریعے سے نہیں۔ وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ پنگھوڑے یا ماں کو نظر سے دیکھ کر پہچان لے۔ آنکھوں سے دیکھ کر پہچاننے کا عمل بعد میں ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ متواتر ربط و تعلق سے خاص خاص عادتیں بنتی ہیں اور وہ چھو کر، دیکھ کر، سونگھ کر اور سُن کر، گویا وہ ان سب قوتوں کو یک جا کر کے چیزوں کو پہچاننے لگتا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی بچہ ایک مدت تک جان دار اور بے جان چیزوں میں تمیز نہیں کر سکتا۔ ہمارے یہاں زیادہ تر بچے ماں کے دودھ پر پلتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں، جنھیں ماں یا دایہ بوتل کے ذریعے سے دودھ پلاتی ہے۔ یہ بچے بوتل کی طرف اسی طرح بڑھتے ہیں، جس طرح دوسرے بچے ماں کی طرف۔ بعض بچے ایسے بھی ہوتے ہیں، جنھیں مائیں بھی دودھ پلاتی ہیں اور جنھیں بوتل کے ذریعے بھی دودھ دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے بچے ماں اور بوتل میں تمیز نہیں کر سکتے۔ بوتل کو بھی وہ ماں سمجھتے ہیں اور ماں کو بھی ماں۔ بچے کا یہ زمانہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس میں اس کی تعلیم صرف جسمانی صورت میں ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی راحتیں جسمانی ہوتی ہیں اور اس کی تکلیفیں بھی جسمانی۔ آپ اس کے ہاتھ میں لذیذ سی مٹھائی دے دیں۔ یہ اس کی راحت ہے۔ اس سے کھلونا چھین کر کسی دوسرے کو دے دیں، یہ اس کی تکلیف ہے۔ بچہ اگر واقعی کسی تکلیف کی وجہ سے رو رہا ہے، تو آپ اس کی تکلیف کو دور کر دیں اور اگر وہ تکلیف کے بعد بھی رونا شروع رکھے، تو اس کا یہ رونا اس لیے ہوگا کہ وہ آپ سے اپنے منشا کے موافق کوئی کام لے۔ اگر آپ اس کے رونے سے متاثر ہو کر اس کے جھانسے میں آ گئے، تو بعد میں یہ بچہ کچھ اپنا شعار ہی بنا لیگا کہ جب کوئی بھی چیز حاصل کرنے کو دل چاہا رو دیا۔ یہ رونا ہرگز اس لیے نہیں کہ اُسے کوئی جسمانی تکلیف ہے۔ وہ روتا ہے اور رو کر من مانی بات پوری کرا لیتا ہے۔ یہ گویا بچگانہ ذہانت کی پہلی فتح ہے۔

لیکن اگر آپ ذرا غور کریں، تو آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ من مانی کرانے کا رونا کون سا ہے
اور تکلیف کا رونا کون سا۔ بچہ اس تفریق کو مٹانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کرے، کامیاب نہیں
ہو سکتا۔ ماں اپنے بچے سے اچھی طرح واقف ہوتی ہے، وہ اس کی بات بات کو جانتی ہے، وہ
اس کی ہر حرکت کو پہچانتی ہے۔ اس کا کان بچے کی آواز پر لگا رہتا ہے، اس لیے وہ اس فرق کو
فوراً معلوم کر لیتی ہے اور اگر وہ سمجھدار ہو، تو اس کے بناوٹی رونے اور آنسو بہانے کو نظر انداز
کر دیتی ہے۔ گیت گا کر یا جھولا جھلا کر بچے کا دل بہلا لینا بڑی ہی آسان بات ہے اور ایک
حد تک یہ بھلی بھی معلوم ہوتی ہے، لیکن بچے کا دل بہلاوے کا مطالبہ اور زیادہ بڑھتا جاتا ہے
جوں جوں اس کا دل بہلتا ہے، اس کو نیند کی حاجت محسوس نہیں ہوتی۔ اس سے اس کی نیند پر
بڑا بُرا اثر پڑتا ہے۔ ننھے بچے کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہت زیادہ وقت سو کر گزارے، بلکہ
اُسے تو کھانے کے وقتوں کے علاوہ سارا سارا دن سو کر گزارنا چاہیے۔ بعض باتیں جو بیان کی
چکی ہیں، ناگوار اور کرخت تو ضرور ہیں، لیکن تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان سے بچے کی صحت بنتی
ہے، سیرت بنتی ہے اور اس کی پائیدار خوشی کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔

بچے کی دل لگی کے لیے جو اسباب اس کے بزرگ مہیا کریں، وہ بہت محدود ہونا چاہئیں
لیکن ایسی باتوں میں بچوں کی ضرور حوصلہ افزائی کرنا چاہیے، جو وہ آپ اپنی دل لگی کے لیے پیدا
کریں۔ بچہ اگر لات چلا کر خوش ہوتا ہے، تو لات چلانے کے لیے خود موقعے پیدا کر دیں۔ اس سے
اس کے اعضا حرکت کرتے ہیں۔ اس کے پٹھوں میں قوت آتی ہے۔ بعض قدامت پسند لوگ بچے
کو اب بھی لپیٹ کر لٹا دیتے ہیں اور گویا اس صورت سے ان کی آزادی کو روک دیتے ہیں۔
اگر آزاد ہو، تو اس پر بزرگوں کو زیادہ توجہ دینا پڑتی ہے۔ اس سے ان کا کچھ وقت بھی ضائع ہوتا
اور کام کاج میں بھی خلل آتا ہے۔ وہ اس کوفت سے بچنا چاہتے ہیں، اس لیے یہی مناسب خیال

تے ہیں کہ وہ لیٹے رہنے کا عادی ہو جائے۔ بچہ جب اس قابل ہو جائے کہ اپنی نگہ کو ایک نقطے
جما سکے، تو اُسے حرکت کرتی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر لطف آتا ہے، خاص کر ان چیزوں کو دیکھ کر
ہوا میں ہلتی ہیں۔ اس کے بعد جب وہ ان چیزوں کو اپنی گرفت میں لے لے، تو اُسے اُنھیں
ڈکر خوشی ہوتی ہے۔ یہ خوشی پہلی خوشی کی نسبت زیادہ ہوتی ہے اور قائم بھی دیر تک رہتی ہے
ں زمانے میں وہ بڑبڑانا شروع کر دیتا ہے اور اُسے بڑبڑانے میں اور زیادہ لذت آتی ہے۔
ہر رفتہ رفتہ ہاتھوں کی اُنگلیوں کو اپنے منشا کے موافق حرکت دینے لگتا ہے۔ انگلیوں کی یہ حرکت
س کے لیے بہت بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے۔ اس سے اسے اتنی ہی مسرت ہوتی ہے،
جتنی ایک فاتح کو نیا ملک فتح کرنے سے ہوا کرتی ہے۔ پہلے وہ ان اُنگلیوں کو بیگانہ خیال
کرتا تھا، لیکن اب ان کو وہ اپنا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کی تفریح کے اسباب بڑھتے جاتے ہیں۔
ب خیال رکھنا چاہیے کہ تفریح کے اسباب کا زیادہ تر حصہ ایسا ہو، جو اس کی تعلیم و تربیت کے لیے
ددکار ہو۔

پہلے تین مہینے کے عرصے میں بچے کے لیے صرف وہی وقت پُر کیف ہوتا ہے جب
وہ اپنی خوراک حاصل کرتا ہے۔ باقی سارا وقت اس کے لیے بے کیف ہے۔ اُسے کچھ اطمینان
سا ہو، تو وہ سو جاتا ہے، لیکن جب وہ اُٹھ جاتا ہے، تو عام طور سے بے آرام ہوتا ہے۔
انسان کی خوشی کا انحصار اس کی ذہنی صلاحیتوں پر ہوتا ہے، لیکن ایک تین ماہ کے بچے
کو نہ اپنے پٹھوں پر قابو ہوتا ہے، نہ اُسے کسی چیز کا تجربہ ہی ہوتا ہے، اس لیے یہ صلاحیتیں
بروئے کار نہیں آسکتیں۔ جانوروں کے بچے انسانوں کے بچوں کی نسبت بہت جلد زندگی
سے لطف اُٹھانے لگ جاتے ہیں۔ چونکہ ان کی ہر حرکت اور ان کا ہر کام جبلّی ہوتا ہے،
تجربے کو اس میں بہت کم دخل ہے، لیکن انسان کا بچہ اپنی جبلّت سے بہت کم باتیں ایسی

کرتا ہے جن میں اُسے لطف اور دلچسپی حاصل ہو سکے۔ بہرحال یہ پہلے مہینے اس کے لیے بیزاری کے ہوتے ہیں، لیکن یہ بیزاری بھی اس کے لیے بڑی ضروری ہے۔ بچے کو دن اور رات کا زیادہ حصہ سو کر گزارنا چاہیے۔ اگر آپ اسے دلچسپی کی چیزوں میں ہی مصروف رکھیں گے، تو سونے کے لیے اسے زیادہ وقت نہیں مل سکیگا۔

تین مہینے کی عمر میں بچہ مسکرانا سیکھ جاتا ہے۔ بے جان اور جاندار چیزوں میں فرق بھی کرنے لگتا ہے۔ اس عرصے میں اُسے اپنی ماں کے ساتھ ایک خاص تعلق ہو جاتا ہے۔ جب وہ ماں کو دیکھتا ہے، تو مسکراتا ہے۔ اس میں جوابی احساس بھی پیدا ہو آتا ہے۔ رفتہ رفتہ بچے کے دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوتی ہے کہ اس کی تعریف و توصیف کی جائے۔ بچہ آپ کی میز سے بھاری گھنٹی اٹھانے کی بار بار کوشش کرتا ہے، لیکن ناکام رہتا ہے۔ جب وہ پہلی مرتبہ اُسے اٹھانے میں کامیاب ہو جائے، تو وہ بیحد خوش ہوتا ہے اور اگر بٹن دبا کر اُسے بجا بھی لے، تو اُس کی خوشی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ ہر ایک کے چہرے کو بڑی فاتحانہ نظروں سے دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے اور چاہتا ہے کہ سب مسکرائیں اور اس کی ہمت پر واہ واہ کہیں۔ یہاں گویا ہمارے معلم کو ایک حربہ ہاتھ لگتا ہے، تعریف و ملامت کا ——— بچپن میں تعلیم کا یہ حربہ نہایت ہی کارگر ثابت ہوتا ہے، لیکن اس کو استعمال کرنے کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ پہلے سال میں تو ملامت سے بالکل پرہیز کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ضرورت کے وقت ملامت کرنے میں بھی کوئی ہرج نہیں، لیکن کبھی کبھی تعریف ضرور ہونا چاہیے، لیکن اتنی وافر نہیں کہ بچے کی نگاہ میں اس تعریف کی کوئی عزت ہی نہ رہے اور ایسی بھی نہیں کہ وہ بچے کو ضرورت سے زیادہ اُبھار دے۔ اگر پہلے پہل کوئی بچہ آپ ہی آپ ٹانگوں پر کھڑا ہو جائے، تو سب دیکھنے والے تالیاں بجا کر اُسے داد دیتے ہیں۔ اگر وہ پہلے پہل اپنی توتلی زبان سے کوئی لفظ ادا کرے تو سب

گ واہ واہ کہہ اُٹھتے ہیں حقیقت میں جب کوئی بچہ اپنی محنت سے کسی مشکل پر قابو پالے، تو اُس وقت تعریف ہم پر فرض ہو جاتی ہے اور یہ تعریف اس کے لیے یقیناً بہترین صلہ ہے۔ اس کے علاوہ بچے کو یہ بھی تو علم ہونا چاہیے کہ جب وہ کوئی نئی بات سیکھتا ہے، تو آپ اس میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔

بچے کی سیکھنے کی خواہش بہت تیز ہوتی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آپ اس کے لیے موقع بہم پہنچائیں۔ اس کی نشوونما کے لیے آپ ایک صورت پیدا کر دیں۔ باقی سب باتیں وہ خود نپٹ لیگا۔ اس بات کی قطعاً ضرورت نہیں کہ آپ اُسے گھسٹنا، چلنا یا ہاتھ پاؤں کو حرکت دینا سکھائیں۔ باتیں کرنا ہم اسے ضرور سکھاتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ارادتاً اُسے باتیں سکھانا بھی زیادہ مفید نہیں ہوتا۔ بچے کو اگر کسی مشکل کے بعد کامیابی ہوتی رہے، تو اُسے آپ ہی آپ تحریک ہوتی رہتی ہے۔ یہی تحریک حقیقت میں زیادہ مفید اور زیادہ پُرزور ہے، لیکن یہ خیال رہے کہ بچے کی مشکلیں اتنی بڑی بھی نہ ہوں کہ وہ حوصلہ ہی ہار دے اور اتنی معمولی بھی نہیں کہ اُسے کوشش کرنے پر ابھار ہی نہ سکیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک یہی ایک اصول کارفرما ہے۔ ہم سب کچھ اسی اصول کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جو کچھ بچے سے کرانا چاہیں، وہ خود اس کے سامنے کریں۔ پھر وہ خود بخود اُسے کرنے لگیگا۔ بچے اگر کسی دوسرے کو ایک کام کرتے ہوئے دیکھیں، تو ان کے دل میں بھی اس کام کے لیے امنگ پیدا ہوتی ہے۔

بچے کی زندگی میں باقاعدگی اور روزمرّہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کھانے، سونے اور رفع حاجت کی شروع شروع ہی سے خاص خاص عادتیں ہو جانا چاہییں۔ گردوپیش کی چیزوں سے واقف ہونا بھی ذہنی طور سے بڑا ضروری ہے۔ اس سے پہچان آتی ہے اور پہچان سے

سوہن سنگھ صاحب ذیلدار، ٹھاکر بیلی رام صاحب صوبیدار، ٹھاکر سوہن سنگھ صاحب جمعدار، ٹھاکر بسنت سنگھ صاحب نمبردار، پنڈت لچھو رام صاحب دکاندار پر مشتمل ایک کمیٹی مرتب کی گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے سیکرٹری کے فرائض سر انجام دینے کی ذمہ داری لی۔ ٹھاکر بیلی رام صوبیدار نے اپنی سرائے واقع بڑھ میں بالغان کی عارضی رہائش کی اجازت ہیڈ ماسٹر صاحب کی درخواست پر دے دی۔

ایک سب کمیٹی "تعلیم بالغان" بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کی درخواست پر ٹھاکر سوہن سنگھ صاحب ذیلدار، ٹھاکر بسنت سنگھ صاحب نمبردار، پنڈت لچھو رام صاحب دکاندار، ٹھاکر کرم چند صاحب نمبردار و ہیڈ ماسٹر صاحب پر مشتمل مرتب کی گئی۔

آخر میں صاحب صدر کی مختصر اور مؤثر تقریر کے بعد جملہ حاضرین کا شکریہ ادا کیا گیا اور ممبران اسکول اسٹاف کی طرف سے چائے پیش کی گئی اور جلسہ برخاست ہوا۔

گوپی رام سیکرٹری

مدرسہ بالغان رائے کوٹ | اس اسکول کے ایک جلسے میں ۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو صاحب ڈپٹی کمشنر ضلع لدھیانہ نے بالغان کو خواندگی کی اسناد اور انعامات تقسیم کرتے ہوئے، مندرجہ ذیل ریمارک تحریر کیے :-

"میں اس مدرسے کے کام سے بہت خوش ہوا۔ کام اس سے بہت زیادہ تسلی بخش ہے، جو مجھے زبانی بتایا گیا تھا۔ یہ مدرسہ اپنی قسم کا ایک نمونے کا مدرسہ ہے۔ ہیڈ ماسٹر اور مدرسین نے سرگرمی کے ساتھ لاثانی کام کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ رائےکوٹ کی میونسپل کمیٹی اس کام کے لیے مستقل مالی امداد دے گی۔ تاکہ یہ کام جاری رہے۔ میں ہیڈ ماسٹر اور مدرسین کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں"۔

دیں کہ اس کا کھانا آپ کی خوشی کا باعث ہے۔ اگر آپ ایسا کریں گے، تو وہ آپ کی جذباتی کمزوری سے واقف ہو جائیگا اور وہ چاہیگا کہ آپ ایسے کاموں کے لیے بھی اس کے ناز اٹھائیں، جو اُسے خود بخود کرنا چاہییں۔ بچے کی قوتیں مختصر سی ہوتی ہیں۔ اس کا علم محدود ہوتا ہے، لیکن ذہانت اس کی بھی ویسی ہی ہوتی ہے، جیسی ایک بالغ کی ہوتی ہے۔ پہلے بارہ ماہ میں وہ بہت کچھ سیکھ لیتا ہے اور یہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، جو اُسے دوسرے سال میں سیکھنا ہے۔

ریڈیو اور نصابی مضامین کی تدریس

از
عبدالغفور ایم اے، ٹریننگ کالج، علی گڈھ

(گزشتہ سے پیوستہ)

ہندوستان میں زبانوں کی تدریس کا مسئلہ سیاسئین اور ماہرین تعلیم کی توجہ کا مرکز بنا ہُوا ہے۔ انگریزی زبان کے مقابلے میں اب مادری زبان اور ہندوستانی کو بھی خاص اہمیت دی جارہی ہے۔ وار دھا اسکیم کی رُو سے ہر صوبے میں ابتدائی اور ثانوی درجے کی تعلیم مادری زبان میں ہوگی اور ہر بچے کو ہندوستانی زبان بھی اس کے ساتھ ساتھ سیکھنا ہوگی۔

زبانوں کی تعلیم کے سلسلے میں ریڈیو پروگرام خاص خدمت انجام دے سکتا ہے۔ صوبے کے اسٹیشن پر اسکول کے پروگرام کی زبان تو مادری زبان ہی ہوگی، البتہ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان پر بھی اسباق دیے جا سکتے ہیں۔ آج ہندوستان کو ایک متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیے ایک عام زبان کی کس قدر ضرورت ہے اور بچوں کو بھی آئندہ زندگی میں سیاسی، معاشی، تجارتی اور کلچرل لحاظ سے ایک عام اور متفقہ ذریعۂ اظہار خیالات' کاروباری یا سماجی زندگی کا ایک ضروری جز ہوگا۔ ہندوستان نے آج نہیں، صدیوں پیشتر سے اس کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا۔ ہندوستان کی زندگی کا اساس مذہب اور روحانیت پر تھا اور اگرچہ ایک صاحب دل کو دوسرے اہلِ دل سے مکالمہ کے لیے زبان کی ضرورت نہیں۔ تاہم ہندوستان کے صوفیائے کرام، سادھوؤں اور اہلِ ویدانت نے ہندی اور فارسی کے میل جول سے ایک خاص زبان ایجاد کرلی

تھی، جو گرونانک یا کبیر، حضرت گنج شکرؒ یا نظام الدین اولیاؒ برابر سمجھتے تھے۔ ان بزرگوں کی ذات ایک روحانی ریڈیو مرکز تھی جس سے روحانی، لسانی اور ادبی یگانگت کی لہریں اُٹھ کر ہندوستان کے سماجی اور مذہبی بندھنوں کو توڑ کر ملک میں انسانی اخوت اور برادری کا پیام پہنچاتی تھیں۔ مجھے ہندوستان کے لسانی مسئلہ کے سلسلے میں وہ واقعہ یاد ہے، جب پہلی مرتبہ میرے دل پر اس کی ضرورت کا عجیب دلچسپ طریق پر احساس ہوا۔ مَیں جنوبی ہند کے ایسے علاقے میں سفر کر رہا تھا، جہاں کان کسی آشنا زبان کی آواز کو ترس گئے تھے۔ گاڑی سینکڑوں میل چلتے ہوئے میدانوں اور تپتی ہوئی سنگلاخ زمینوں میں سے گزرتی گئی اور میرے دل پر ایک اجنبی ملک، اجنبی زبان اور اجنبی لوگوں کی موجودگی کا نامعلوم، مگر تکلیف دہ احساس بڑھتا گیا۔ اتنے میں گاڑی رُکی اور کسی نے میرے پاس سے پکارا "ہمیں گنگ باشی۔ چلیے رامیشورن"۔ میں نے دیکھا، تو دو ہندوستانی سادھو، ہندوستان کی اس زبان میں، جو صدیوں سے ان کی روحانیت کی ترجمان رہی ہے، آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔

ہمارے ریڈیو اسٹیشن بھی ہندوستانی زبان کی ترویج کے لیے بڑا مفید کام انجام دے سکتے ہیں۔ مغربی ممالک میں زبانوں کی تدریس کے سلسلے میں جو تجربے کیے گئے ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مسلسل اسباق، قواعد صرف و نحو وغیرہ کے موضوع پر زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئے، بلکہ ان سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز چیزیں مکالمات، گفتگوئیں، مناظرے اور تمثیلات ثابت ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر مادسن سیکرٹری کمیٹی اسکول براڈ کاسٹنگ ڈنمارک نے اوکسفورڈ کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۵ء میں ایک تقریر کے سلسلے میں بتایا کہ غیر زبانوں کی تعلیم کے لیے اوّل تو ہم نے اس ملک کے اصلی باشندوں سے تقریریں کرائیں، مگر اب ہم دو اشخاص کا مکالمہ کراتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو غیر ملکی باشندہ ہوتا ہے اور ایک اصلی ڈنمارک کا رہنے والا، جو غیر زبان کا علم

ہوتا ہے۔ یہ معلم دوسرے سے سوالات کرتا ہے اور وہ اپنی زبان میں اس کا جواب دیتا ہے اس ترکیب سے ان کی گفتگو کا لسانی معیار ڈین بچوں کی زباندانی اور لیاقت کے مطابق رکھا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ ڈنمارک کے ریڈیو اسٹیشن والوں نے سویڈن والوں کے ریڈیو کے ساتھ سمجھوتہ کر کے سویڈن اور ڈین مکالموں کا انتظام کیا ہے۔ اس میں سویڈ اپنی زبان میں کچھ پوچھتا ہے اور ڈین اپنی مادری زبان میں اس کا جواب دیتا ہے اور چونکہ یہ دونوں بانیں لغت اور صرف ونحو میں ملتی جلتی ہیں، اس لیے اس گنگا جمنی گفتگو سے طبیعت کو الجھن نہیں ہو سکتی۔

ہندوستان میں یہی تجربہ بڑے مفید نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ شمالی ہندوستان کی زبانیں سندھی، پنجابی، بنگالی، مرہٹی، گجراتی وغیرہ کا ہندوستانی زبان سے گہرا رشتہ ہے ان زبانوں کا ماخذ ایک، ان کی لغت میں بہت سے الفاظ مشترک، پھر زبان کا کلچرل، جذباتی جغرافی پس منظر بھی ایک۔ پس اس قسم کے مکالمات ہندوستانی پروگرام میں بھی اچھی دلچسپی پیدا کر سکیں گے۔

انگریزی زبان کی تدریس کے لیے صحیح لہجے اور تلفظ کی بے حد ضرورت ہے۔ ہر ایک اسکول مادر زاد انگریز کو اسٹاف میں نہیں رکھ سکتا اور بعض اوقات انگریزی کے ہندوستانی اساتذہ کا لہجہ بے حد غیر تسلی بخش ہوتا ہے اور مختلف صوبوں کے لوگ جو کچھ اصلی انگریزی طرز کلام میں تصرفات کرتے ہیں، وہ بجائے خود مجلس علم کا ایک مزاحیہ باب ہو کر رہ جاتا ہے۔ انگریزی تلفظ اور لہجے کی اصلاح کے لیے بعض مدارس میں گراموفون ریکارڈ رکھے جاتے ہیں۔ تاہم ریڈیو ہمیں اک بولتے چالتے سچ مچ کے انگریزی زبان سننے کا موقع دیتا ہے۔ علم الصوت

سبقوں کا سلسلہ ہندوستانی اسٹیشن کے پروگرام کی ضروری شاخ ہونا چاہیے۔ وہ اسباق جن میں نہ صرف بچوں کو انگریزی زبان کی مخصوص آوازوں سے روشناس کرایا جائے، بلکہ اُن کے ہم آواز مادری زبان کے جزؤوں کے تمیزی نقاط ان پر واضح کیے جائیں اور نہ صرف انفرادی حروف اور الفاظ کا صحیح تلفظ بتایا جائے، بلکہ جملے ادا کرنے کے وقت ان میں جو صوتی تصرفات ہوتے ہیں، اُن کی طرف بھی خاص توجہ کی جائے۔

اس سلسلے میں یہ امر واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زبان کیا، کسی مضمون کی تدریس میں بھی ریڈیو اُستاد کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اُستاد اور شاگرد میں جو روحانی تعلق ہوتا ہے، بچوں کے چہروں پر جب کسی مسئلہ کے سمجھنے سے ایک چمک ، ایک تازگی آجاتی ہے۔ بچوں کی طرف سے عسیر الفہم چیزوں پر سوالات اور اُستاد کے جوابات۔ یہ سب چیزیں ریڈیو کے اسباق میں مفقود ہوتی ہیں۔ اسی لیے انگلستان کے بعض قدامت پسند ماہرینِ تعلیم ریڈیو اسباق کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ بہرحال اس امر پر سب کو اتفاق ہے کہ ایک اچھے اُستاد کی موجودگی میں زبانوں کی تعلیم کے لیے ریڈیو کی ضرورت نہیں۔ مگر ہندوستانی مدارس میں تربیت یافتہ اُستاد ہیں کتنے۔ انگلستان میں محققین اور ماہرینِ تعلیم ریڈیو کے اسباق پر تجربات کر کے اور بچوں کے معیارِ تعلیم کو جانچ کر ایک خاص نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ان ملکوں میں یہ ذریعۂ تعلیم تجربی حالت سے گزر چکا ہے اور اُس نے وسائلِ تعلیم میں ایک ممتاز اور معنی خیز جگہ حاصل کر لی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک تجربہ بھی نہیں کیا گیا۔ تاہم اگر ہندوستانی اسٹیشن باقاعدہ سلسلۂ اسباق کے بجائے چیدہ چیدہ مضامین یعنی علم الصوت، مکالمات، تمثیلات کے ذریعے انگریزی زبان کے اساتذہ کی امداد کریں، تو اس میں کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے مضامین ہیں، جن کے لیے ریڈیو بہت کارآمد ثابت ہو

سکتا ہے۔ Civics یا شہریت کی تربیت کو ہی لیجیے۔ ہماری تعلیم کے علمبردار آہستہ آہستہ اس مضمون کی اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں اور جو مضمون پہلے تاریخ کی نصابی کتب کے پچھلے چند ورق میں ایک معذرت آمیز انداز میں ٹھسا ہوتا تھا، اب تعلیمی نصاب کا ضروری عنصر ہو گیا ہے۔ جہاں پہلے عمالِ حکومت کے حقوق گنائے جاتے تھے، اب انھیں کو خدامِ خلق کے نام سے تعبیر کر کے اُن کے فرائض بتائے جاتے ہیں۔ دیہات سدھار کے سلسلے میں شہریت کے اصول بھی اکثر ہندوستانی پروگرام میں شامل ہوتے ہیں، مگر اُن کی اپیل بالغ سامعین کے لیے ہوتی ہے اور ان کا انداز ناصحانہ اور منطقیانہ ہوتا ہے۔ بچوں کی دنیا کے لیے فلسفیانہ طرزِ کلام صدا بہ صحرا ثابت ہوگا۔ استدلالی تقریر اور خشک دلائل، فکرِ فردا کے افسانے، ان پھوٹتی ہوئی کونپلوں کے لیے بادِ سموم کا جھونکا ہیں۔ ان کے لیے بادِ نسیم ہو، فضا میں ایک رنگینی ہو، ان کے حیرت انگیز قوتِ متخیلہ کے لیے ایک نئی دنیا کی تشکیل ہو۔ ان کے دل میں اس کی تخلیق کی امنگ پیدا ہو جائے۔ ان کے ننھے ننھے سینوں میں ہمک اُٹھے کہ وہ اک نئے جہان کی آبیاری کریں اور یہ چیز الہامی اور القائی تدریس سے متعلق ہے۔ اس کی بنیاد احساسات اور جذبات کی تعلیم پر ہے اور اس کا مقصد بچے کے دل میں آدابِ احترام پیدا کرنا ہے۔ اب اگر اُستاد نے بچے کے دل میں اپنے گاؤں، شہر، اپنے ملک کی یہ روحانی محبت پیدا کر سکتا ہے، تو اُس نے شہریت کی تربیت کی طرف ایک مستقل قدم اُٹھا لیا ہے۔ اگر بچے کے لیے اس کا وطن ایک نیا شوالہ ہے۔ اگر اُس کا ذرہ ذرہ اُس کو عزیز ہے۔ اگر اُس کے ہرے بھرے کھیت، اس کے قدرتی مناظر، اس کی روح کا ضروری عنصر ہیں، تو وہ کبھی اس منظر کو آلودہ نہ ہونے دیگا۔ وہ کبھی اپنے گاؤں کی گلیوں کو متعفن دیکھنا پسند نہ کرے گا۔ دیہاتیوں کے باہمی فساد و نزاع اُس کے لیے کوفت کا باعث ہونگے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں اُس کی جمالیاتی، اخلاقی اور ذہنی ہم آہنگی اور توازن کے

خلاف ہیں، جو اُس نے وطن عزیز کے متعلق اپنے دل میں پیدا کر لیا ہے۔ اگر کوئی ناعاقبت اندیش کسی خوبصورت درخت کی جڑوں پر کلہاڑا چلاتا ہے، تو اُس کا وار اس کے دل پر ہوگا۔ اس کی ہر ضرب ایک ہتھوڑے کا کام دے گی۔ وہ محسوس کرے گا کہ آج میرے گاؤں کی خوبصورت فضا کا پہرہ دار ہم سے جدا ہو رہا ہے۔

یہ ولولہ اور جوش ایک تو طرزِ بیان اور اسلوبِ مضمون سے پیدا ہو سکتا ہے اور دوسرے تقریر کرنے والی مقناطیسی شخصیت سے اور ریڈیو اس مقصد کے لیے بہترین وسیلہ ہے۔ شہرت کے موضوع پر ریڈیو ملک کی ممتاز ترین شخصیتوں کو دعوت دے سکتا ہے۔ اگر گاندھی جی مائیکروفون پر آ کر بچوں کو بتائیں کہ وہ اپنا فضلہ اپنے ہاتھ سے خود اُٹھاتے ہیں۔ اگر وہ آ کر یہ بھی بتائیں کہ اپنا نہیں، اُنھوں نے اکثر دوسروں کا فضلہ خود اُٹھایا ہے، تو ان پر کیا کچھ اثر نہ ہوگا۔ اگر مسٹر برائین انھیں گڑگاؤں کے ایک گاؤں کا قصہ سنائیں۔ جہاں اسکولوں کی بلند ہمت نے پورے گاؤں کی حفظانِ صحت کی کایا پلٹ دی۔ جہاں اسکول کے بچوں کو گندگی کی ٹوکریاں اپنے سر پر اُٹھانے سے عار نہیں، تو یقیناً جب وہ دوسری مرتبہ ایک ڈھیر کے قریب سے گزرینگے تو اُن کے ہاتھ اس کو اُٹھانے کے لیے بیتاب ہو جائیں گے۔ اُن کی انگلیاں ایک بیلچہ کے لیے مضطرب ہونگی۔ ایسی تقریروں کے لیے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ملک کی وہ ممتاز ہستی خود تقریر کرے۔ بچے محسوس کریں کہ ان کا دل اس عظیم شخصیت سے ہمکلام ہے۔ جس کے کارناموں نے اُن کی ماحولی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ وہ اس گوشت پوست کا بنا ہوا ہے، جس کے ہم بنے ہیں۔ اس کی مٹی کا خمیر اس سرزمین سے اُٹھا ہے اور بتدریج یہ ملکی برادری اور اخوت کا جذبہ پانی کی لہروں کی مانند بڑھتے ہوئے دائرے کی حرکت اختیار کر لیتا ہے حتیٰ کہ اُسے تمام انسان ایک عظیم الشان برادری میں منسلک نظر آتے ہیں اور جیسے کہ ایتھر کی متحرک اور زندگی بخش

لہریں فضائے بسیط کو ترنم اور آرٹ کی دلفریبیوں سے بھرپور کر دیتی ہیں۔ اُس کی تقریریں انسانی ماحول اور اُس کی ذہنی جذباتی دنیا کو بھی اک عالمگیر اصول محبت سے سرشار کر دیتی ہیں۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ اُسے انسانی برادری کا احساس پہلے پہل S.O.S کال سے ہوا، یہ ایک ڈوبتے ہوئے جہاز کی دردانگیز چیخ تھی، جو سمندر کی ناپید اکنار وسعتوں میں گم ہو کر رہ جاتی، مگر ایتھر کے پرندوں نے اُسے دوسرے جہازوں تک پہنچایا اور دیکھتے دیکھتے اس امریکی جہاز کے بچانے کے لیے انگریزی، فرانسیسی، جاپانی جہاز آگئے۔ ضرورت ہے کہ دنیا کے بچوں کے دل بھی ایک "آواز گیر" بن جائیں۔ جن کے اندر ہر مصیبت کی آواز اور ہر دکھی کی آواز کے جواب میں دھڑکنے کا جذبہ پیدا ہو۔

جغرافیے میں فلموں کے ذریعہ تدریس کے کام کا معیار بے حد دلچسپ، صحیح اور وسیع ہو گیا ہے۔ ریڈیو بھی اس سلسلے میں کئی لحاظ سے بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ مشہور و معروف سیّاح اپنے کارنامے بچوں کو اپنی زبان میں سُنا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ایورسٹ اور نانگا پربت بھی اپنی وحشت انگیز بلندیوں میں ایک رومان، ایک ہیجان انگیز دلچسپی رکھتے ہیں، جو بچے کے جبلّی رجحانوں اور نفسیاتی زندگی کے عین مطابق ہیں اور اگر وہ صمیم العزم ہستیاں، جنھوں نے قدرت کے ان شاہکاروں پر عبور کرنے کی کوشش کی ہے، خود اپنی ناکامیابی کی داستان، جس پر ہزار کامیابیاں صدقے ہوں، سُنائیں، تو بچوں کے لیے یہ جغرافی معلومات کا ذخیرہ بھی ثابت ہوگی اور اس سے جمالیاتی ذوق کی بھی تربیت ہوگی۔

مطالعہ قدرت یا نیچر سٹڈی کے لیے بھی ریڈیو بہت کام دے سکتا ہے اور ان تقریروں کا تعلق موسم، اُس کی نباتات، پھول پتیوں، اور چرند و پرند سے ہونا چاہیے۔ ریڈیو پروگرام اس آہستہ حرکت کرنے والی رنگین فلم کی مانند ہو، جو جنگل کی زندگی کا دلچسپ آئینہ ہو اور

اپنا دور سال بھر میں پیدا کرے۔ ان اسباق میں جماعتی استادوں کی امداد اور اتحاد کی ضرورت ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ مطالعہ قدرت کے متعلقہ مضامین، زراعت، باغبانی، جغرافیہ وغیرہ بھی آسکتے ہیں۔

سائنس کی تدریس ریڈیو کے ذریعے ایک حد تک انسانی لحاظ سے دلچسپ بنائی جاسکتی ہے۔ طلبہ کے سامنے اس مضمون کا محض میکانکی پہلو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان کے پیشِ نظر محض نتائج اور اصول ہوتے ہیں اور وہ ان بلند ہمت ہستیوں کی پیہم جدوجہد، ایک گلیلیو کی محبوسی، ایک فیریڈے کی فاقہ کشی سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ سائنس نے جو خدمات انجام دی ہیں ان سے آگاہ نہیں ہوتے۔ کس طرح کلوروفارم نے گزشتہ زمانہ کو عہد نپولین کے خوفناک علم سے نجات دلائی۔ ہوائی جہازوں اور زیپلن نے دنیا کو کس طرح سے لپیٹ دیا۔ یہ سب چیزیں بچوں کو بتانے کی ہیں۔ بقول سر رچرڈ گریگوری "سائنس کا حقیقی پیغام بم یا زلزلوں میں مضمر نہیں ہے، بلکہ اس کا بھید ممل کی دھیمی آواز میں چھپا ہوا ہے۔" سائنس ہی نہیں، بلکہ کل کائنات میں ہر تیز یا خموش ہے۔ دنیا کے خاموش انقلاب کی صدائے بازگشت صدیوں تک وقت کے ایوانوں کو گونجا دیتی ہے۔ جنگل کا عظیم الشان دیودار کا درخت جب گرتا ہے، تو قیامت خیز تہلکہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہی ہوا ہزاروں دیودار کے بیجوں کو زمین کی آنچل پر بکھیر دیتی ہے، جن میں جنگل کی زندگی کا بھید چھپا ہوا ہے۔ آسٹریا اور دوسرے مغربی ممالک میں مشہور سائنسدان ریڈیو پر اپنی نئی ایجادات کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنی علمی تحقیقات کو دلچسپ اور زندہ طریق سے بچوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے ریڈیو ان پروفیسروں اور محققین کو بھی انسانی زندگی سے قریب تر لانے کا ذریعہ بن سکے۔ جن کا اوڑھنا بچھونا ان کا کتب خانہ یا معمل ہے۔

اس کے علاوہ بعض مدارس نے تو درسی مضامین پڑھانے کے لیے عجب جدتیں کی ہیں۔ مثلاً اٹلی میں ڈرائنگ کا مضمون ریڈیو کے ذریعے پڑھانے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ بچوں کو پہلے سے مربع دار کاغذ دے دیے جاتے ہیں، جن کے مربعوں پر نمبر لگے ہوتے ہیں۔ بچہ ریڈیو پر سبق دینے والے کی ہدایت کے مطابق پنسل چلاتے جاتا ہے اور بعد میں رنگ یا سرمئی پنسل سے سایہ بناتا ہے۔

بہت سے ممالک میں تعلیم بالغاں بھی ریڈیو پروگرام کا ضروری جز بن گیا ہے مثلاً انگلستان میں تو ایک انجمن خاص اس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے، جس کا نام نیشنل کونسل فور ایڈلٹ ایجوکیشن بائی براڈ کاسٹنگ[1] ہے۔ یہ کونسل پروگرام کا انتظام کرتی ہے۔ تقریروں اور مکالمات کے سلسلوں کو مرتب کرتی ہے۔ بالغ سامعین کو گروہوں، کلبوں، کتب خانوں یا اداروں میں ریڈیو سے فائدہ اٹھانے کے لیے منظم کرتی ہے۔ روس میں تو بالغوں کی تعلیم ایک باقاعدہ سائنس کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ مزدوروں اور شہری عوام کے لیے Narodny Dom قائم کیے گئے ہیں، جس کے معنی لوگوں کے گھر ہیں۔ چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں Isbas ہیں، یعنی دیہاتی مطالعہ گھر، ان کے علاوہ Red Corners ہیں جو اشتمالیت پسند طبقے کے تفریحی اور سماجی مرکز ہیں۔ ان سب میں ریڈیو پروگرام تعلیم کا پرچار اس وسیع اور زندگی بخش معنوں میں کرتا ہے، جس کی وہ حامل ہے۔

آسٹریلین براڈ کاسٹنگ کمپنی کی طرف سے تعلیم بالغان کے سلسلے میں مفصلۂ ذیل متنوع مضامین پر مکالمات اور تقریریں نشر ہو چکی ہیں۔ سائنسداں، سیاح اور ادیب مقالات پڑھتے ہیں۔ بعض وقت مسئے حل کرنے کے مقابلے ہو جاتے ہیں۔ بے کاروں کے لیے

---

[1] National Council for Adult Education by Broad-casting

زبان اور پیشوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر ہفتے ۲ ڈھائی گھنٹے نسوانی دنیا اور گھریلو سائنس اور امورِ خانہ داری وغیرہ کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ ایک گھنٹہ بچوں کی تعلیم پر صرف ہوتا ہے۔ ہفتے میں ایک دن مزدوروں کے لیے بھی وقت ہوتا ہے جس میں یونین کے مسائل، مزدوروں کی شاعری، گیت اور موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے۔ دیہاتیوں کے لیے دیہاتی شاعری، دیہاتی گیت، ٹپے، ان کے رسم و رواج پر تقریریں ہوتی ہیں۔ آسٹریا میں مختلف پیشوں، مثلاً کاشتکاری، تجارت، صنعت، کاروبار وغیرہ کی منظم انجمنیں ہیں۔ ریڈیو پروگرام کے ذریعے ان میں سوشل جذبہ پیدا کیا جاتا ہے اور ان میں اپنے گروہ اور برادری سے وفاداری کی روح پیدا کی جاتی ہے۔

اتوار کی صبح کو عوام کے بعض طبقوں مثلاً عورتوں اور کسانوں کے لیے طبی ہدایتیں دی جاتی ہیں۔ حفظانِ صحت، صحت عامہ اور گھریلو علاج پر تقریریں کی جاتی ہیں۔ فلم اور آرٹ کے متعلق تنقیدی رجحان پیدا کیا جاتا ہے۔ عوام کے گیتوں پر خاص توجہ کی گئی ہے اور مقابلوں وغیرہ کے ذریعہ اُن کا معیار کافی بلند ہو گیا ہے۔ ملک کے سیاسی اور سماجی مسائل پر بحث و تنقید کے لیے بھی خاص اوقات مخصوص ہیں اور سویڈن میں تو اکثر مسائل متنازعہ فیہ کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ یہ بحث آزادانہ طریق پر کی جاتی ہے اور اس میں ملک کی سربرآوردہ ہستیاں حصہ لیتی ہیں۔ آسٹریلیا کے اسٹیشن کی تعلیم بالغان کے شعبے کا پروگرام اس لیے ذرا تفصیلاً بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ترقی پذیر ممالک میں ریڈیو زندگی کی کس قدر متنوع اور مختلف دلچسپیوں اور پہلوؤں پر حاوی ہے؛ جو بوقلمیاں ہم زندگی میں پاتے ہیں، وہ اس پروگرام کے ہر لمحہ میں موجود ہیں۔ درحقیقت جیسے بچے کی نفسیاتی زندگی ایک وحدانی حقیقت ہے۔ ایسی ہستی کے لیے علم بھی ایک وحدانی اصول پر مبنی ہونا چاہیے۔ اسکولی نصاب مضامین کو مختلف ڈربوں میں بند کر دیتا ہے۔ ریڈیو ایک مرتبہ اُن کو زندگی کی رنگین ثبت میں اس طرح ٹانک دیتا ہے کہ باوجود مختلف رنگین لہروں کے وہ تمام ایک مستقل آہنگ کا شاہکار معلوم ہوتا ہے۔

تعلیم کی تحریکِ جدید کے ارکانِ ثلاثہ

از

بشیر احمد ڈار، ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

پسٹالوٹسی کے تعلیمی نظریات کا خلاصہ

(۱) پسٹالوٹسی کی زندگی میں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے زمانے کی سماج کے تمام نقائص کو دور کرنے کے لیے ایک ہی علاج تجویز کیا اور وہ تعلیم تھا۔ اس زمانے میں لوگوں کی حالت بہت ابتر ہو چکی تھی اور حکومت کی طرف سے غریبوں کے لیے کوئی انتظام نہ تھا۔ سماج کی بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کے لیے بیشمار تجاویز پیش کی جا رہی تھیں۔ اشتراکیت، دہریت، اشتمالیت، انفرادیت وغیرہ وغیرہ کئی اصولوں کی تائید میں مضمون لکھے جا رہے تھے اور ہر شخص سماج کی اصلاح کا انحصار ان میں سے کسی ایک اصول کی پیروی میں سمجھتا تھا، لیکن پسٹالوٹسی نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی سے ان تمام اصولوں کو ترک کر کے تعلیم کی اصلاح پر زور دیا اور کہا کہ صرف اسی تعلیم ہی کے ذریعے ملک اور اُس کے باشندوں کی نجات ہو سکتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پسٹالوٹسی سے پہلے بھی چند اشخاص ایسے تھے، جنھوں نے تعلیم کو سوسائٹی کی اصلاح کا ذریعہ تصور کیا، لیکن ان کے نزدیک تعلیم کا مفہوم صرف سماج کے بلند رتبے کے اشخاص تک محدود تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی تعلیم کو عوام میں پھیلانے کا خیال ظاہر

یا۔ البتہ تحریک تجدید مذہب کے بعض رہنماؤں اور کومینیس (Comenius) نے تعلیم
م کی طرف توجہ کی، مگر پسٹالوٹسی کا نقطۂ نگاہ ان سب سے مختلف تھا۔ اس کے نزدیک تعلیم کا
صد بچوں کے دماغی، اخلاقی اور جسمانی قویٰ کی نشوونما تھا اور یہ تعلیم صرف امرا کے طبقے تک
دود نہ تھی، بلکہ پسٹالوٹسی اس تعلیم کو ہر طبقے کے بچوں کے لیے عام کر دینا چاہتا تھا۔ اُس کا خیال
ا کہ پرانی تعلیم جس میں مختلف علوم و فنون کی بھتات ہوتی ہے، غریبوں کے لیے بالکل بےفائدہ
ہے اور امرا اسے حاصل کرنے کے بعد مغرور اور غریبوں کی حالت زار سے بےخبر ہو جاتے ہیں۔ اپنی
تاب "لیونارڈ اور گرٹ روڈ" میں وہ اس نقطۂ نگاہ کی تشریح کرتا ہے۔ "اگر انسان کی دماغی اور
سمانی حالت درست نہ ہو، تو لازمی طور پر اس میں بےشمار عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح
ماج نہ صرف ان تمام فوائد سے محروم رہ جاتی ہے، جو اُسے ایسے انسانوں سے (بشرطیکہ انھیں
قاعدہ تربیت دی جاتی) حاصل ہو سکتی تھی، بلکہ اُن کو بدی سے روکنے کے لیے بہت سی تکلیف
ھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ سماج ان فوائد کو حاصل کرنے
کے لیے جو ہر انسان انفرادی طور پر اس کو پہنچا سکتا ہے اور بےفائدہ اخراجات سے بچنے کے لیے
بچوں کی تعلیم میں ہر قسم کی آسائش مہیا کرے۔ صحیح تعلیم بچوں کے قویٰ کی نشوونما کر سکتی ہے،
جو ہر حالت میں بدی سے پاک ہوتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم ہر حالت میں عملی ہونی چاہیے، جس سے ہر فرد زندگی کے مختلف شعبوں
میں صحیح لذت پا سکے اور سماج کے لیے فائدہ مند بن سکے۔ یہ تعلیم بالکل عام ہونی چاہیے۔ پہلے
درجوں میں کسی خاص قسم کی فنی تعلیم بالکل ناموزوں ہے۔ کیونکہ اس کے لیے ترقی یافتہ دماغ کی
ضرورت ہے، جس کا تیار کرنا ابتدائی تعلیم کا مقصد ہے۔ ابتدائی تعلیم کا مقصد بہتر کاریگر یا بہتر
آدمی بنانا نہیں، بلکہ بہتر انسان بنانا ہے، جو نتیجتاً بعد میں بہتر کاریگر اور بہتر کاروباری آدمی بن

سکتے ہیں۔

ایسی ابتدائی تعلیم کا معیار مدرسہ یا کتب خانہ درسی نہیں، اس کا ماحول بالکل گھر جیسا ہونا چاہیے اور معلم کی حیثیت بالکل ماں جیسی ہونی چاہیے۔ ماں اور بچے کا تعلق بچوں میں خود بخود عمدہ اخلاق پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے عملی مشاغل سے بھی اخلاق کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کام بذاتہ اخلاق سے عاری ہے، لیکن ان مشاغل کو سرانجام دینے کے چند طریقے ایسے ہیں، جو اخلاق کہلا سکتے ہیں۔ اس طرح جسمانی ورزش بھی اخلاق کی پرورش میں بڑی ممد ثابت ہو سکتی ہے۔

(۲) تعلیم کا مفہوم۔ تعلیم کا صحیح مقصد یہ نہیں کہ مدارس کے عام معیار کے مطابق کمال حاصل کیا جا سکے، بلکہ زندگی کی جدوجہد کے لیے تیاری کرنا اس کا مقصد ہے۔ اس سے مراد اندھا دھند فرمانبرداری اور مفروضہ حدود میں رہ کر محنت کرنا نہیں، بلکہ بچوں میں آزادانہ طور پر عمل کرنے کا ملکہ پیدا کرنے کا نام تعلیم ہے۔ ہر بچہ خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو، یا کوئی پیشہ اختیار کرنے والا ہو، کچھ ایسے قویٰ رکھتا ہے، جو فطرت نے سب کو یکساں طور پر ودیعت کیے ہوئے ہیں۔ ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہم بچوں کے اس سرمائے کو مناسب نشوونما سے روکیں یا ان قویٰ میں سے کسی ایک کو ترقی دیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں ہم کسی خاص قوت کی طرف زیادہ توجہ دیں اور دوسرے قویٰ کی تکمیل میں زیادہ محنت سے کام نہ لیں، لیکن اس کے باوجود ہمارا فرض ہے کہ ہم بچے کی مکمل نشوونما کا خیال رکھیں۔ ممکن ہے کہ بعض قوےٰ ایسے بھی ہوں، جن کی اہمیت ہمیں اس کے مستقبل کے لیے بالکل بیکار معلوم ہوتی ہو۔

صحیح تعلیم کے لیے جہاں یہ بھی ضروری ہے کہ بچوں کو جو کچھ سکھایا جاتا ہے، اس پر غور کیا جائے، وہاں اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ ان کی استعداد کی حالت کیا ہے جو

اس بات کی سوچ بچار ضروری ہے کہ بچے کو بعد میں کیا بننا ہے، وہاں اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ معلوم کیا جائے بچہ کس کام کا اہل ہے۔ تعلیم درحقیقت فطرت کے دکھائے ہوئے راستے کی پیروی کا نام ہے اور اس کی استعداد اور اُس کے قوٰے کی نشوونما لازمی ہے۔ تعلیم اس طریقہ سے ہونی چاہیے کہ ہر استعداد اپنی فطرت کے مطابق ترقی حاصل کر سکے اور یہ فطرت دل و دماغ اور جسم کے لیے مختلف ہے، مثلاً یقین پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یقین کرایا جائے یقین محض یقین پیدا کرنے والی چیزوں کے علم حاصل کرنے سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ محبت محبت کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ محض محبت کے مفہوم یا محبت پیدا کرنے والی چیزوں کے علم سے محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہی ایک ایسا فطری طریقہ ہے، جس سے ہم صحیح معنوں میں بچوں کی ہر قوت کی انفرادی اور مجموعی طور پر تکمیل کر سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم تعلیمی معاملات کو علم نفس کے کے ماتحت سمجھیں۔ اس بحث سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پسٹالوٹسی ان قوانین فطری اور نفسیاتی سے پورے طور پر واقف تھا۔ اس کا شاندار کام یہی تھا کہ اُس نے سب سے پہلی بار اس حقیقت کا اعلان کیا، جس کو آج ہر مفکر تعلیم تسلیم کیے ہوئے ہے اور جس کو تسلیم کرنے کے بعد لوگوں نے علم نفس کی طرف پوری توجہ دینی شروع کی۔

ابتدائی تعلیم درحقیقت انسانی نسل کی کوشش کا نتیجہ ہے تاکہ فطرت صحیحہ کو انفرادی استعداد کی ترقی میں مدد دے۔ اس مدد کے بغیر ممکن ہے کہ انسانی جبلت راہبری کا کام دیتی رہے لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم انسانی اور روحانی اثر ڈال کر ان قوٰے کی تکمیل میں کوشش کریں۔ صرف وہی تاثرات جو انسان پر مجموعی حیثیت میں (دل و دماغ اور جسم) اثر انداز ہوں، صحیح معنوں میں فائدہ مند اور فطرت کے مطابق کہلائے جا سکتے ہیں۔ انسان کی کسی ایک استعداد کی یک طرفہ ترقی یقیناً صحیح تعلیم کے منافی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ پسٹالوتسی کے نزدیک تعلیم وہی صحیح ہے، جو انسان کو مختلف قویٰ اور استعدادات کا مجموعہ سمجھے اور یہ مجموعہ محض بکھری ہوئی چیزوں کے بے ڈھنگے اجتماع کا نام نہیں، بلکہ ایک وحدت ہے، جس میں کثرت بھی ہے۔ ابتدائی تعلیم اسی وحدت وکثرت سے تعلق رکھتی ہے۔ عملی طور پر اگرچہ ہمیں تعلیم کو دماغی، اخلاقی اور جسمانی حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے، لیکن ان کی علیحدگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ کیونکہ حقیقی دنیا میں یہ سب حصے ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت ایک وحدت ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے، تو اُس میں ہر وہ استعداد بالقوہ موجود ہوتی ہے، جو جسمانی نشو ونما کے مختلف درجوں میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ اس کی مثال ایک کلی کی سمجھ لو۔ جب کلی کھلتی ہے، تو ہر ایک پتا کھل جاتا ہے اور ان میں سے کوئی بھی بند نہیں رہتا۔ ایسے ہی عمل کا نام تعلیم ہے۔

پسٹالوتسی نے خود ایک جگہ مثال دے کر تعلیم کے عمل کو سمجھایا ہے۔ "فطرت کا نظام ہر جگہ شاندار مگر سادہ ہوتا ہے۔ اے انسان! تجھے لازم ہے کہ اس کی نقل کرے۔ غور سے دیکھو کہ قدرت کس طرح ایک بڑے درخت کے بیج سے چھوٹا سا پودا پیدا کرتی ہے، جو تھوڑا تھوڑا ہر لحظہ اور ہر روز ترقی کرتے کرتے تنا، شاخ اور پتوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ غور سے دیکھو کہ قدرت اس درخت کے ہر حصّے کو جونہی وہ نمودار ہوتا ہے، کس طرح حفاظت کرتی ہے اور اس کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتی ہے تاکہ دوسری چیزوں کی نشو ونما کا منبع بن سکے۔

دیکھو پھول کس طرح کلی کے اندر سے پیدا ہوتا اور کھلتا ہے۔ کس طرح اس پھول کی خوشبو اور خوبصورتی ختم ہو کر پھل کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جو اگرچہ بالکل کمزور ہوتا ہے، لیکن ان تمام خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، جو بعد میں اس میں نمودار ہوتی ہیں اور کس طرح مہینوں تک وہ پھل ٹہنی سے لٹکتا ہوا اپنی خوراک حاصل کرتا ہے اور آخر پک کر گر پڑتا ہے۔

دیکھو جونہی پودے کا ننھا سا حصہ سطح زمین سے اُوپر اُبھرتا ہے، تو اُسی وقت قدرت زمین میں ایک جڑ پیدا کر دیتی ہے۔ کس طرح جڑ میں سے تنا پھوٹتا ہے اور پھر تنے سے بے شمار شاخیں نکلتی ہیں۔ کس طرح قدرت اُس کے ہر حصے کو خواہ وہ کتنا کمزور اور معمولی کیوں نہ ہو، مناسب خوراک پہنچاتی ہے۔ کوئی چیز بے فائدہ، بے کار اور فضول نہیں"۔

معلم کا کام بالکل وہی ہے، جو مندرجۂ بالا بیان میں پسٹالوٹسی نے ایک باغبان کے سپرد کیا۔ قدرت کی طرف سے باغبان کو ایک بیج عطا ہوتا ہے۔ جس میں درخت بننے کی ہر خاصیت موجود ہوتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ ایسے ماحول پیدا کرے، جس سے اس بیج کی مکمل نشوونما ہو سکے اور جب وہ درخت کی شکل اختیار کر رہا ہو، تو اُس کے ہر حصے کا، خواہ وہ ظاہراً کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو، مناسب خیال رکھے۔ اس کے ہر پہلو کی نشوونما ہونے دے۔ بچے میں پیدائش کے وقت ہر وہ قوت و استعداد موجود ہے، جس کی بنا پر اُس نے بڑے ہو کر زندگی کی جنگ میں حصہ لینا ہے۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ اُس کی ہر استعداد کی نشوونما کے لیے مناسب ماحول پیدا کرے۔ تمام علوم و فنون اسی مقصد کے تحت ہیں۔

(۳) پسٹالوٹسی کے طریقہ ہائے تعلیم۔ پسٹالوٹسی کے طریقۂ تعلیم کا بنیادی خیال بالکل سادہ ہے، جو اُس کے نظریۂ تعلیم پر موقوف ہے، یعنی دماغ کی مسلسل نشوونما مناسب مشقوں کے ذریعے ہو جو اس طرح منتخب کی جائیں کہ ان سے دماغ کی ہر قوت و استعداد عمل کو آہستہ آہستہ اور بتدریج بروئے کار آنے کا موقع ملتا رہے۔ تعلیم کے ہر درجے میں یہ ترقی مکمل اور محیط ہونی چاہیے۔ سب سے اول فرض یہ ہے کہ ہر قسم کے علم کو اس کے مختلف ابتدائی اجزا میں تقسیم کیا جائے۔ جونہی بچہ قدرتی طور پر واقف ہو، اس کو ان اجزا کی تعلیم محض سطحی طور پر نہیں، بلکہ مشاہدے یا تجربے کے ذریعے دینی چاہیے۔ وجدان کے ذریعے ان کے صحیح معانی سے واقف اور خبردار کرنا بھی ضروری ہے۔

اس کے بعد مناسب مشغلوں سے بتدریج اس کے علم میں اضافہ کرنا چاہیے علم کو صرف الفاظ کے مطالعہ پر منحصر کرنا صریح غلطی ہے۔ ان سے بچے کے علم میں کسی قسم کا حقیقی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ان کی بنیاد اشیا کے مطالعہ پر ہونی چاہیے، یعنی پسٹالوٹسی کے طریقے کی حقیقی بنیاد مطالعہ اشیا ہے، لیکن اس سے محض اشیا کا علم حاصل کرنا مراد نہیں بلکہ قوت مشاہدہ کی ترقی بھی اسی عمل میں مضمر ہوتی ہے۔ خود پسٹالوٹسی اس کے متعلق یوں رقمطراز ہے: "آہستہ آہستہ یہ خیال میرے دل پر راسخ ہوتا گیا کہ مدارس کے مروجہ نقائص کو کلیتہً دُور کرنے کے لیے لازمی ہے کہ معلم کے مردہ اور جامد طریقہ تعلیم کے بدلے ایسے قوانین فطریہ رائج کیے جائیں، جن کے مطابق نفس انسانی حسی تاثرات (Sense impressions) سے صاف تصورات (ideas) حاصل کر سکے بچہ اپنے آزاد مشاغل ہی کے ذریعہ سے سیکھتا ہے (یعنی اس کی ذہنی نشوونما اسی ذریعے سے ہو سکتی ہے) الفاظ کے بجائے حسی تاثرات اور تجربات ہی اس کی رہنمائی کر سکتے ہیں، لیکن اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ان سب تاثرات کو لفظوں کا جامہ پہنایا جائے۔

پسٹالوٹسی کے طریقہ تعلیم کے متعلق اس عام خلاصہ کے بعد ضروری ہے کہ مختلف مضامین کے متعلق جو طریقہ اس نے اختیار کیا یا جس کی پیروی کرنے کے لیے اُس نے بار بار زور دیا اُس کو مجمل طور پر یہاں بیان کیا جائے۔

(الف) تعلیم السنہ۔ زبان کی تعلیم کے لیے (ڈائرکٹ میتھڈ) فطری طریقہ پر زور دیا گیا۔ پیشتر اس کے کہ بچوں کو پڑھایا جائے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے بولنا سیکھ چکے ہوں اور بولنے سے پہلے لازمی ہے کہ انھیں محسوس کرنا اور سوچنا سکھایا جائے۔ پیشتر اس کے کہ ہم بچوں کو پڑھنا یا حرف شناسی سکھائیں، اس چیز کی ضرورت ہے کہ تصور کے ذریعے اس کی عام واقفیت اور بولنے کے ذریعے اُس کے تکلم زبان میں کافی مہارت پیدا ہو جائے۔ زبان

ملیم کو مندرجۂ ذیل تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) آوازوں کا مطالعہ جس سے بولنے کے کئی اعضا نشوونما پاتے ہیں (۲) لفظوں کا مطالعہ، جو انفرادی اشیا کے علم دینے کا ذریعہ ہیں۔ (۳) بولنے کا مطالعہ، یعنی اشیا اور اُن کی صفات کے متعلق جو کچھ وہ جانتے ہیں، اُن کو صحیح طور پر معرض تحریر میں لانے کے طریقے سے واقف کرنا۔

قواعد کے اصولوں کی تعلیم کی اہمیت زبان کی تعلیم کے دوسرے درجے پر ہے۔ پسٹالوٹسی کا مندرجۂ ذیل فقرہ ان اشخاص کے لیے قابلِ غور ہے، جو اُردو کی تعلیم کو مکمل کیے بغیر انگریزی تعلیم کو شروع کر رہے ہیں۔ "جب تک کوئی شخص ایک زبان پر پوری طرح حاوی نہ ہو تو اس کے دماغ کا ایک اہم حصہ ناکارہ رہ جاتا ہے۔ اس کے علم میں خلل اندازی واقع ہو جاتی ہے اور اُس کے تصورات مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں۔"

پسٹالوٹسی کا خیال یہ تھا کہ سبق کا آغاز چند معروف اشیا کے نام اور اس کی عام صفات سے کیا جائے۔ اسی طریقے سے اس کا خیال تھا کہ مشاہدہ اور زبان دونوں میں دسترس ہو سکتی ہے مثلاً شام خنک خاموش اور پُر لطف ہے۔ کھیت سرسبز اناج سے بھرا ہوا اور وسیع ہے، وغیرہ یا ہم سبق کا آغاز "صفت" سے کریں اور ان الفاظ کو یاد کریں، جو اس سے تعلق رکھتے ہوں۔ مثلاً گول، گیند، چاند سورج، گولی، ہلکا، ہوا، پر، تنکا، بلند، پہاڑ، مینار اور درخت وغیرہ ایسے سبقوں میں پسٹالوٹسی کبھی اشیا کا استعمال کرتا اور کبھی تصویروں کا۔

خیالات کی وسعت اور طویل فقرے بنوانے کے لیے پسٹالوٹسی اکثر بچوں سے اشیا کی تعریف اور افعال کا بیان طلب کرتا۔ مثلاً چلنا قدم بہ قدم بلنے کو کہتے ہیں۔ کھڑا ہونا، جسم کو ٹانگوں کے سہارے عموداً رکھنا۔ گیند، لکڑی یا ربڑ کی ایک ایسی گول چیز، جس سے بچے اور بڑے کھیلتے ہیں، وغیرہ۔ بعض دفعہ بچوں کو ترغیب دی جاتی کہ وہ اپنے ذاتی علم اور ایک یا دو لفظوں کی مدد سے

فقرات کی توسیع کریں۔ مثلاً میں ہوں۔ میں بھوکا ہوں۔ بخار کی وجہ سے میں چار دن سے بھوکا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

(ب) ڈرائنگ۔ پسٹالوزی کے نزدیک زبان اور اس کے ملحقہ مضامین کی تعلیم ابتدائی درجے میں پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد پیمائش، ڈرائنگ اور لکھائی کا درجہ ہے۔ وہ کہتا ہے "لکھائی سکھانے کے وقت مجھے اس چیز کا احساس ہوا کہ مجھے اس سے پہلے بچوں کو ڈرائنگ سے روشناس کرانا چاہیے اور جب میں نے اس کام کو شروع کیا، تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک بچوں کو اشیا کی لمبائی، عرض اور حجم وغیرہ جاننے کا طریقہ نہ آتا ہو، ڈرائنگ سکھانے کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

بچوں میں تصویر کشی کی خواہش فطری طور پر موجود ہوتی ہے اور جونہی وہ مختلف مشاغل میں حصہ لینے کے قابل ہوتے ہیں، اُسی وقت سے وہ ڈرائنگ کی طرف رجوع کرتے ہیں جس طرح تقلید کی قوت کان کی مدد سے بچے کو زبان اور موسیقی سے بہرہ ور کرتی ہے، اسی طرح آنکھ اور ہاتھ کی مدد سے وہ ڈرائنگ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ تصویر کشی کی تعلیم اگر شروع ہی سے بچوں کو دی جائے، تو اس سے کئی ایک فائدے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ شخص جو تصویر کشی کی تعلیم اور مشق حاصل کر چکا ہے، اپنی روزمرہ کی زندگی میں اشیا کی وہ تفصیلات ملاحظہ کر سکیگا، جو دوسرے انسانوں کی آنکھوں سے پوشیدہ رہتی ہیں اور عام طور پر ایسی چیزوں کا تصور بھی اس کے دماغ میں بہت صاف ہوگا۔ جن کا وہ بغور مطالعہ نہیں کرتا۔ کسی چیز کی مجموعی شکل اور اس کے مختلف اجزا کی باہمی نسبت کی طرف، جو تصویر کشی کے لیے لازمی صفات ہیں، توجہ کرنا اس کی عادت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ نصابِ تعلیم میں ڈرائنگ کو شامل کرنے سے پسٹالوزی کا اصل مقصد یہ ہے کہ بچوں کے دھندلے اور خام تصورات صاف اور پختہ خیالات اور تاثرات میں

میں تبدیل ہوسکیں اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ڈرائنگ کو پیمائش اور اندازہ لگانے کے فن سے جدا نہ کیا جائے۔

تاثرات و تصورات (Perception) کو مناسب ترقی دینے کے لیے لازمی ہے کہ بچہ قدرتی مناظر کا خود مطالعہ کرے اور اُن کی نقل کھینچنے کی کوشش کرے۔ کسی قدرتی منظر کی تصویر کی نقل اُتارنا بچوں کے دلوں میں وہ شوق پیدا نہیں کرسکتا، جو قدرتی ماحول میں بیٹھ کر تصویر کشی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

پستالوزی نے اس نظری تعلیم پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ ڈرائنگ کا ایک مفصل نصاب تیار کرنے کی بے سود کوشش بھی کی۔ اس کا خیال ہے کہ ہم بچوں سے اس چیز کی توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ پیمائش اور شکلوں کے قوانین سے واقف ہوئے بغیر تصویر کشی کرسکیں۔ سب سے پہلے ضروری ہے کہ بچوں کے مختلف قسم کے خطوط اور زاویوں اور مربع دار دائرے کے مختلف حصوں سے بخوبی واقف کیا جائے۔ یہ سب کام ڈرائنگ کے ساتھ ہی ساتھ ہونا چاہیے۔ مثلاً جونہی بچہ عمودی horizontal اور ترچھے Slanting خطوط کو پہچان اور کھینچ سکے، تو اس وقت چاہیے کہ کسی ایسی شئے کی تصویر بنائے، جس میں اس قسم کے خطوط وغیرہ استعمال ہوتے ہوں۔ ان مشقوں سے یہ فائدہ ہوگا کہ مبتدی کسی چیز کے مختلف حصّوں کے طول و عرض اور بلندی کے تناسب کو سمجھ سکیگا۔

لکھنے کی مشق ڈرائنگ کی تحصیل کے بعد کرانی چاہیے۔ لکھائی کی مشق کو وہ دو درجوں میں تقسیم کرتا ہے۔ (۱) سلیٹ پر حروف بنانا اور ان کے مختلف اجتماع سے لفظوں کی مشق کرنا۔ (۲) قلم سے مشق کرنا۔ تحریر کے ابتدائی درجے میں حروف کو اس طریق سے ترتیب دینی چاہیے کہ اُن کا تناسب برقرار رہے۔ تحریر کی مشق کو ڈرائنگ کے بعد رکھنے کے لیے پستالوزی نے کئی ایک

دلائل پیش کیے ہیں: (۱) تحریر خطوط کشی کی ایک قسم ہے اور ایک خاص شکل پر منحصر ہے، جس سے کسی حالت میں تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ (۲) اگر تحریر کی مشق ڈرائنگ سے پہلے اور علٰحدہ کی جائے تو ہاتھ کی آزادی اور عمدگی سلب ہو جاتی ہے۔ (۳) ڈرائنگ کی مشق کے بعد خطوط کی بناوٹ میں کسی قسم کی دیر نہیں لگتی اور بری عادت کو چھوڑنے کے لیے جو بہت زیادہ مشق سے پیدا ہو جاتی کسی قسم کی دقت پیدا نہیں ہوتی۔ (۴) بچوں میں یہ مادہ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جو کام بھی وہ کرنا چاہیں، عمدہ اور مکمل ہوں۔ یہ مقصد تحریر کے معاملے میں بھی حاصل ہو سکتا ہے اگر اس سے پہلے ڈرائنگ کے ابتدائی اصول سے وہ واقف ہو۔

مشق تحریر اپنی ظاہری شکل کے لحاظ سے ڈرائنگ کے تابع ہے لیکن اپنے مضمون کے لحاظ سے کئی دوسرے مضمونوں سے متعلق ہے، اس لیے پسٹالوزی کا خیال ہے کہ اگر لڑکے اس قابل ہوں کہ حروف اور الفاظ کو لکھ کر سکیں، تو تحریر کی عمدگی حاصل کرنے کے لیے کسی خاص قسم کی مقررہ کاپیوں کی نقل اور مشق کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا علم مشاہدات اور تجربات کی سے کافی ہوتا ہے۔ اس لیے اب انھیں مضمون نویسی کی مشق کرانی چاہیے۔ تحریر کی مشق صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ ہم اپنے خیالات اور تاثرات کو بیان کر سکیں۔ محض حروف اور الفاظ لکھ لینا کسی قسم کی تعلیم نہیں کہلا سکتا۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ جب انھیں حروف اور الفاظ لکھنے کی کافی مشق ہو جائے، تو اس کے بعد بجائے اس کے کہ مقررشدہ کاپیوں کی مشق کریں، وہ چھوٹے چھوٹے مضمون لکھنے کی کوشش کریں۔ جس سے نہ صرف ان کی تحریری مشق ترقی کرے بلکہ ان کے خیالات میں نشوونما ہوتی رہے گی اور وہ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا سکیں گے

(باقی آئندہ)

اشتہار

آئین ادب

(رہبر اردو)

برائے امیدواران امتحان ورنیکلر فائنل

۱- تقریباً ایک ہزار محاورات کا مطلب اور استعمال (فقرات و اشعار میں) واضح کیا گیا ہے۔

۲- تصحیح اغلاط کے متعلق بیس مثالیں دے کر تقریباً سو (۱۰۰) غلط اشعار کو صحیح کر کے لکھا گیا ہے اور سلسلہ میں تذکیر و تانیث، ہجوں، خطوط، وحدت و جمع، ترکیب اور دیگر عام اغلاط کو علیحدہ علیحدہ بیان کر کے درست کر دیا گیا ہے۔

۳- سو (۱۰۰) سے زیادہ نامکمل فقرات کو مکمل کر کے دکھایا گیا ہے اور یہ تمام فقرات اخلاقی نصائح پر مبنی ہیں۔

۴- تذکیر و تانیث اور وحدت و جمع کے متعلق علیحدہ باب قائم کر کے مکمل واقفیت دلائی گئی ہے۔

۵- افعال لازم و متعدی اور معروف مجہول کے متعلق ۱۰ مشقیں دے کر وضاحت کی گئی ہے۔

۶- خاکہ سے کہانی لکھنے کا طریق سمجھایا گیا ہے اور ۱۰ کہانیوں کو خاکوں سے مکمل کر دیا گیا ہے۔

۷- خط و کتابت کے متعلق ضروری ہدایات دے کر ۳۵ نمونے کے خطوط اور عرضیاں درج کی گئی ہیں۔

۸- پرچہ اردو ورنیکلر فائنل کے ۴۰ ماڈل پیپرز اخیر پر لگائے گئے ہیں۔

۹- مشکل عبارت، اشعار اور نظم کا مطلب لکھنے کے متعلق مثالیں دے کر ہدایات دی گئی ہے۔

۱۰- ہندوستان کے بہترین شعرا اور ادیب حضرات کی نظم و نثر کے اقتباسات دے گئے ہیں، جنہیں پڑھ کر طالب علم اردو کی مختلف طرزوں کو سمجھ سکتا ہے۔

گویا یہ کتاب ۱۰ کتابوں کا مجموعہ ہے۔ اسے ایک ایسے ہیڈ ماسٹر نے لکھا ہے، جو اپنے امتحان میں پنجاب سے اول درجہ پر رہ چکا ہے اور بیس سال سے اس کا کوئی شاگرد فیل نہیں ہوا۔ اس کتاب کے ہوتے ہوئے امیدواران ورنیکلر فائنل کو اردو کی کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں۔

حجم ۳۴۰ صفحے - کاغذ عمدہ - قیمت ۱۲/ ۹ پائی

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب لاہور

اشتہار

اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں "موگا اُردو ریڈرز" کا استعمال کریں

اُردو پڑھانے کے لئے یہ ٹریننگ اسکول فار وومن ٹیچرز کا تیار کردہ کورس جس کی بنیاد جدید طریقہ تعلیم پر رکھی گئی ہے بہت سے مدرسوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان ریڈرز کا پانچواں ایڈیشن ابھی چھپ کر تیار ہوا ہے۔ بچوں کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے اور انھیں پڑھائی کی طرف راغب کرنے کے لئے یہ ایک بے مثال کورس ہے۔ اس طریقہ تعلیم سے وقت کی بچت ہوتی ہے اور یقیناً کامیابی ہوتی ہے۔ اس بات کا تجربہ ہو چکا ہے کہ اگر بچوں کو اس طریقہ سے پڑھایا جائے، تو وہ خوشی و مسرت سے پڑھتے ہیں اور بہت جلد پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔

ترمیم شدہ ایڈیشن

رہنمائے مدرسین جماعت اوّل کی تصحیح ہو چکی ہے۔ اُردو کے نئے ایڈیشن میں طریق الصوت میں کافی اضافہ کیا گیا ہے اساتذہ کے لئے مفصل ہدایات مندرج ہیں۔

پہلی جماعت میں اس کورس کا استعمال کرتے وقت مندرجۂ ذیل سامان کی ضرورت ہے:۔

ا۔ اُستادوں کے لئے:۔

(۱) رہنمائے مدرسین برائے جماعت اوّل کی { انگریزی ایڈیشن، حجم ۱۱۷ صفحے۔ گتے کی جلد قیمت ۱۲؍
اُردو ایڈیشن، حجم ۱۸۴ صفحے۔ گتے کی جلد قیمت ۱۲؍ }

اس کتاب میں چارٹوں و دیگر کتب پڑھانے کی تیاری کے لئے سبق بہ سبق مفصل ہدایات دی گئی ہیں۔ انگریزی ایڈیشن میں مہتممان (Supervisors) کی امداد کے لئے ایک باب شامل کیا گیا ہے۔

(۲) پرائمر پڑھانے سے پیشتر استعمال کرنے کے لئے ۱۳ عدد چارٹ (اُردو)۔ اُستاد ان چارٹوں کو رہنمائے مدرسین میں دی ہوئی ہدایات کے مطابق خود تیار کر سکتا ہے یا چھپے ہوئے رنگدار ۱۳ عدد چارٹ بقیمت دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک منگوا سکتے ہیں۔

ب۔ بچوں کے لئے:۔

(۱) (پہلی کتاب) میری تصویروں کی کتاب (My picture book) حجم ۳۲ صفحے۔ قیمت ۱؍
اس کتاب میں بہت سی تصاویر اور کئی ایک دلچسپ کھیل اور مشقیں دی گئی ہیں، جن کی مدد سے بچہ پرائمر کے لئے نئے الفاظ باسانی سیکھ لیتا ہے۔

(۲) (پرائمر) میری کہانیوں کی پہلی کتاب (My first Story book) حجم ۴۲ صفحے۔ قیمت ۱۰؍
تصاویر کے ذریعے کہانیوں کی تشریح کی گئی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کو اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ بچے عام طور پر تھوڑی سی مدد سے کہانیاں پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

(۳) (پہلی کتاب) جانوروں کی کہانیاں (Stories of animals) حجم ۵۶ صفحے۔ قیمت ۲؍
یہ کتاب پہلے سال دوسری ششماہی میں پڑھائی جاتی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی ترتیب میں خاص احتیاط کی گئی ہے۔

(۴) جماعت اوّل کی لائبریری کے لئے امدادی کتب:۔

لال مرغی (The little red hen) قیمت ایک آنہ

اس کے علاوہ اور بہت سی امدادی کتب ہیں، جو پبلشرز سے مل سکتی ہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، مفید عام پریس، لاہور

دیہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لئے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس کا مضمون حال ہی میں ورنیکلر فائنل کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لئے مخصوص ہوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر کوئی جامع کتاب نہ تھی۔ طلبہ کی اس دقت کا احساس کرتے ہوئے زر کثیر صرف کر کے مجوزہ سکیم کے عین مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ بہ سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب برائے جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے۔ جس کی عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے اور ہر امر کو روزمرہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ تصاویر سے واضح کیا گیا ہے اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے۔ سلسلہ ہذا طلبہ کے لئے ہر لحاظ سے مفید ہو گا۔ اس کے مطالعے سے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان و دیگر سائنس کے مدرسین اصحاب اپنے مدارس میں جاری کرا کے جہاں ہمیں ممنون و مشکور فرمائیں گے، وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبودی میں خوشی محسوس کرینگے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت ۵ آنے ۴ پائی
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	〃 ۵ 〃 ۲ 〃
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	〃 ۷ 〃 ۱۰ 〃
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	〃 ۱۴ 〃 ۲ 〃

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

جغرافیہ جدید ہندوستان

(اُردو)

از قاضی سعید الدین احمد صاحب ایم اے لکچرار جغرافیہ
مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

نمبر باب ۳۰۔ صفحات ۴۵۵۔ نقشے ۵۷۔ قیمت دو ۲ روپے

جغرافیہ کے جدید نظریہ کے مطابق ہندوستان پر نہایت جامع اور مفید کتاب ہے۔ نہایت وضاحت اور صاف زبان میں لکھی گئی ہے۔ ہندوستان کے جغرافیہ پر جدید۔ کارآمد اور مستند معلومات کا نہایت عمدہ ذخیرہ ہے۔ زود فہم بنانے کے لئے اعداد و شمار اور نقشے بہت کافی دئے گئے ہیں۔ ہائی اسکول کے طلبہ کے لئے نہایت ضروری اور بے بہا کتاب ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد امتحان میں کامیابی بالکل یقینی ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

(نوٹ:۔ اس کتاب کا اُردو ایڈیشن تیار ہے۔ ہندی ایڈیشن پریس میں ہے)

اشتہار

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۶ر
۲	ر ر دوسری ر ر	۷ر۴ پائی
۳	ر ر تیسری ر ر	۹ر۹ ر
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر
۵	ر ر دوم	۵ر
۶	ر ر سوم	۷ر
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر
۸	ر ر دوم	۳ر۷ پائی
۹	ر ر سوم	۳ر۱۱ ر
۱۰	امرت کہانیاں نمبر۱	۲ر۹ ر
۱۱	ر ر نمبر۲	۳ر۱۰ ر
۱۲	ر ر نمبر۳	۵ر۲ ر
۱۳	انوارِ سہیلی کے انمول موتی حصہ ۱	۲ر۸ ر
۱۴	ر ر حصہ ۲ ر ر	۴ر۱۰ ر
۱۵	ر ر حصہ ۳ ر ر	۵ر۲ ر
۱۶	دلچسپ تاریخی کہانیاں ر حصہ اول ر	۷ر۷ ر
۱۷	ر ر دوم ر	۸ر۱۱ ر
۱۸	ر ر سوم ر	۷ر
۱۹	کام کی باتیں حصہ اوّل	۳ر۹ پائی
۲۰	ر ر ر دوم	۳ر۲ ر
۲۱	قصصِ ہند حصۂ اوّل	۲ر۳ ر
۲۲	ر ر دوم	۸ر۲ ر
۲۳	قصصِ ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۲۴	حسینہ اور وحشی	۱ر۵ پائی
۲۵	شہزادہ مہربان	۲ر۶ ر
۲۶	راماسیتا	۱ر۱۰ ر
۲۷	جادو کا مٹکا مسٹر رلیا رام	۳ر
۲۸	دروپدی	۱ر۱۰ ر
۲۹	مہاراجہ رنجیت سنگھ .	۴ر۶ ر
۳۰	خلیفہ ہارون الرشید .	۴ر
۳۱	راجہ اشوک	۵ر
۳۲	مہارانا پرتاپ	۲ر۱ پائی
۳۳	شہاب الدین شاہجہان . .	۲ر۱۰ ر
۳۴	شیر شاہ سوری . . .	۲ر۱۱ ر
۳۵	نصیر الدین ہمایوں . .	۲ر۱۰ ر
۳۶	اورنگ زیب عالمگیر .	۲ر۹ ر
۳۷	شہاب الدین غوری . .	۲ر۸ ر
۳۸	سلطان علاؤ الدین خلجی	۲ر۱۱ ر
۳۹	فیروز الدین تغلق . . .	۳ر

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
NATIONAL MUSEUM

اشتہار

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۰	نورالدین جہانگیر . .	۲/۲ پائی	۶۵	جوتی موتی	۲/۱۰ پائی
۴۱	امیر تیمور	۲/۷ //	۶۶	جواہرات کا خزانہ . . .	۳/۷ //
۴۲	پرتھوی راج	۲/۸ //	۶۷	پھوا اور سونا ہوا (باتصویر)	۲/
۴۳	محمود غزنوی	۲/۶ //	۶۸	علی بابا چالیس چور . . .	۴/
۴۴	مصر کی داستان . . .	۳/	۶۹	علاؤالدین و عجیب غریب لیمپ	۴/۶ پائی
۴۵	جاپان کی کہانی . . .	۴/	۷۰	ملا دوپیازے کا سفر . . .	۳/
۴۶	چین کی کہانی	۳/۶ //	۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳/
۴۷	مستورات چین و جاپان .	۴/			
۴۸	ایران کی کہانی	۲/	۷۲	نیشا پور کا سوداگر	۲/۱۱ پائی
۴۹	ایشیائی روم	۲/۷ پائی	۷۳	پرستان کا موچی	۳/
۵۰	ترکی (یورپی روم)	۲/۷ //	۷۴	سندر پیلی	۳/
۵۱	لنکا	۱/۱۱ //	۷۵	چاندی کی کنجی .	۳/
۵۲	بصرہ و بغداد	۵/	۷۶	سلک جواہر نمبر۱ (حکمرانی کاگر)	۳/۶ پائی
۵۳	یونان	۲/	۷۷	// // نمبر۲ (ادعا پرستی)	۱/۶ //
۵۴	تین سوال	۲/۷ پائی	۷۸	// // نمبر۳ (شہید الفت)	۱/۶ //
۵۵	امرت ورشا	۳/۱۰ //	۷۹	سلک جواہر - مرد میدان	۱/۶ //
۵۶	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبر۱ داؤد بادشاہ	۴/۹ //	۸۰	// // نیک و بد	۱/۹ //
			۸۱	// // عیب و ہنر	۱/۴ //
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اول	۳/۹ //	۸۲	// // جہاں گرد	۱/۹ //
۵۸	// // // دوم	۴/۵ //	۸۳	// // جواب باصواب	۱/۱۰ //
۵۹	خوفناک خواب	۲/	۸۴	// // سخاوت کی انتہا	۱/۲ //
۶۰	ہیرا لال	۲/۶ //	۸۵	// // حسن تدبیر	۱/۶ //
۶۱	دولت کی پٹاری	۲/۱ //	۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہریت	۱/۳ //
۶۲	سادھو کی جھگی	۲/	۸۷	ڈرامہ غم خوار عالم . . .	۱/۷ //
۶۳	نیلا باز	۲/۱۱ پائی	۸۸	مہاراجہ بکرماجیت اور مس کا	

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

جلد (۶)	جون ۱۹۳۹ء	نمبر (۳)

فہرستِ مضامین

۱	ایڈیٹوریل		۱
۲	اسلامی تعلیم و تربیت کے متعلق چند اشارات	سیّد محمد عبداللہ، ایم اے	۵
۳	ذوقِ سلیم	نذیر احمد، ایم اے	۱۳
۴	ودّیا مندر اسکیم	نیاز الدین احمد، بی اے	۲۳
۵	ہربرٹ سپنسر کا نظریۂ تعلیم	غلام جیلانی، ایم اے	۳۸
۶	لڑکپن	میرزا مقبول بیگ	۴۳
۷	ڈالٹن پلین	محمد عبدالغفور خاں	۵۶

ایڈیٹوریل

مسئلۂ ضبط صدیوں سے زیر بحث چلا آتا ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی باوجودیکہ تعلیم جدید کا دَور دَورہ ہے، ہمیں ایسے اشخاص نظر آتے ہیں، جن کے نزدیک ضبط کے معنی یہ ہیں کہ طلبہ اپنے جذبات کو کسی ایسے شخص کے ماتحت کر دیں، جو اپنے وجود، علم اور تجربے کی رُو سے اُن پر فوقیت رکھتا ہو۔ اس نظریے کو اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ یہ حضرات ضبطِ مدرسہ کو فوجی نظام سے کسی طرح کم نہیں خیال کرتے۔ جس طرح فوج کے ایک سپاہی کی کوئی حرکت، اس کا کوئی فعل اس کے منشا کے موافق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح طالب علم کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام ذاتی رجحانات اور احساسات کو اپنے سے بالاتر شخصیت میں پیوست کر دیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر ایسا نہ ہو، تو سارے اسکول میں کھلبلی مچ جائے اور اس بے قاعدگی میں تعلیم و تدریس تو درکنار لڑکوں پر قابو پانا بھی مشکل ہو جائے۔

اس کے برعکس ایسے حضرات بھی ہیں، جو یہ چاہتے ہیں کہ پرانی روایات اور اعتقادات کو بالکل بدل دیا جائے۔ اُن کا خیال ہے کہ ضبط اور نظامِ مدرسہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور ان کی اہمیتیں بھی جداجدا ہیں۔ اسکول کے نظام سے یہ مراد ہے کہ ایسے حالات

پیدا کیے جائیں، جن سے اسکول کی زندگی کا مقصد حل ہو سکے۔ اس نظام کو برقرار رکھنے کے لیے جو قواعد بنائے جائیں، اُن کی پابندی پر زور دینا ہر ایک اُستاد کا فرضِ اوّلیں ہے۔ لیکن ضبط کا تعلق انسان کے بیرونی ماحول سے نہیں، بلکہ اندرونی زندگی سے ہے۔ نظم و نسق کے قواعد تو ایک بیرونی ہستی مرتب کرتی ہے، لیکن ضبط کے قواعد کا تعلق انسان کی باطنی ذمّے داری کے احساس سے ہے۔

اس باریکی کو عام طور پر سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اکثر لوگ فطرۃً عافیت پسند ہوتے ہیں۔ اپنے لیے وہی راستہ پسند کرتے ہیں، جو سیدھا و صاف ہو اور پہلے سے موجود ہو۔ زمانۂ قدیم کے اساتذہ اپنی جماعتوں میں ضبط و سکون مار پیٹ کے ذریعے رکھا کرتے تھے۔ ہمیں بھی انھیں کی پیروی میں آسانی نظر آئی۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی لکیر کو پیٹنا شروع کیا۔ لیکن ہم نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ جو تعلیم صرف خوف و ہراس کا نتیجہ ہو، وہ دیر پا نہیں ہو سکتی۔ اس کی حیثیت بالکل ہنگامی سی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق طلبہ کی کسی اندرونی تحریک سے نہیں ہوتا، بلکہ بیرونی مجبوریوں سے ہوتا ہے۔ اصل تعلیم وہ ہے، جو طبعی شوق سے حاصل کی جائے۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ شوق خوف کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ لڑکے کوئی معمولی مخلوق نہیں۔ شیطان کے چیلے اگر انھیں کہا جائے، تو بے جا نہیں۔ جب تک انھیں قابو میں نہ رکھا جائے، وہ لکھنا پڑھنا پسند نہیں کرتے اور قابو میں رکھنے کا بہترین طریقہ سزا یا سزا کا ڈر ہے۔

اگر ضبط کے معنی یہی خیال کیے جائیں، تو تعلیم کا اصلی منشا فوت ہو جاتا ہے۔ تعلیم کا اصلی مقصد یہ ہے کہ وہ انسان میں زندگی پیدا کرے۔ اس لیے ضبط کو ایک انتظامی قوانین کا مجموعہ سمجھ لینا غلط ہے۔ جن طلبہ پر چاروں طرف سے پابندیاں عاید ہوں

ے کا ہر ایک عمل خوف کے تابع ہوتا ہے۔ اگر تعلیم حاصل کرتے وقت ان پر جمود سا اری ہوتا ہے، تو وہ اس لیے نہیں کہ انھیں سبق میں دلچسپی نہیں ہوتی، بلکہ اس لیے ۔ اگر جماعت میں ذرا سا شور ہو، تو فوراً استاد صاحب کا عصا ان کی پیٹھ پر برسنا شروع ہو جاتا ہے۔

زمانہ بدل رہا ہے، ذہنیتوں میں انقلابِ عظیم برپا ہو چکا ہے۔ اگر معلم پنے تعلیمی مقصد میں کامیاب ہونا چاہتا ہے، تو ضروری ہے کہ وہ ضبط کے متعلق اپنے پرانے خیالات کو خیرباد کہہ دے۔ طلبہ اگر کسی تشدد آمیز ماحول میں چپ چاپ بیٹھے ہیں، تو اس سے یہ نتیجہ ہرگز اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنے کام میں ہمہ تن محو ہیں۔ سختی خاموشی ضرور کرا سکتی ہے، لیکن توجہ اور ارادے پر اس کا قطعاً زور نہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبہ ضبط کی ماہیت کو خود سمجھیں اور اس کے قاعد کو اپنی بہبود کا باعث جانتے ہوئے، خود بخود ان پر کاربند ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔

آپ ذرا غور فرمائیں کہ ہمارے اکثر و بیشتر طلبہ اسکول کے قوانین سے منحرف کیوں ہو جاتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ہمارے اسکولوں کی حالت عموماً ایک فوجی کیمپ کی سی ہوتی ہے۔ جہاں جبر و تشدد سے کام لیا جاتا ہے اور قواعد کی پابندی خوف پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر انھیں قواعد کا تعلق طلبہ کی زندگی سے ہو اور وہ محسوس کریں کہ ان کی ترقی کے لیے ان کی پابندی اشد ضروری ہے، تو ساری مشکلات آسانی سے حل ہو جائیں۔ جو شخص صرف سزا کے ڈر سے کام کرتا ہے، وہ دل سے کام نہیں کر سکتا۔

ضبط کا اصلی منشا یہ ہے کہ وہ انسان کی اندرونی طاقتوں کی نشوونما کرے۔ تاکہ وہ کسی لاٹھی کے ڈر سے متحرک نہ ہو، بلکہ اُس کا ہر عمل اس بات کی شہادت دے کہ وہ اپنے مقصد کا پورا علم رکھتا ہے اور اس کے حصول کے لیے توجہ۔ دلچسپی اور ذمّے داری سے کام لیتا ہے۔ اس امر کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے پُرانے اور فرسودہ خیالات کو بالائے طاق رکھیں اور نئے خیالات کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ اس سے عالمِ تعلیم میں ایک زبردست انقلاب کی ابتدا ہوگی اور یہ ابتدا یقیناً انسانی عروج کی ابتدا ہوگی۔

اسلامی تعلیم و تربیت کے متعلق چند اشارات

از

سید محمد اللہ ایم اے، ڈی لٹ، اورینٹل کالج لاہور

جب ہم مسلمانوں کی گزشتہ کلچرل تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر صدی اور ہر دور میں ایسی ایسی عظیم الشان ہستیاں پیدا ہوتی رہیں، جنھوں نے علم اور تہذیب کی مشعل کو روشن سے روشن تر کر دیا اور جن کا وجود نہ صرف ایک قوم کے لیے بلکہ تمام دنیا کے لیے باعثِ فخر کہا جا سکتا ہے۔

غالباً اس حقیقت کو بدلائل بیان کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ دنیا میں شخصیتوں کی تخلیق ایک خاص قسم کے ماحول اور ایک مختص النوع تربیت یافتہ سوسائٹی کی رہین منت ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ گاہے گاہے نادر الوجود ہستیاں "لالہ صحرا" کی طرح خود رَو اور محض نامعلوم قدرتی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہیں، جنھیں خالق کائنات اس عالم آب و گل میں غرسودگی اور کہنگی کو رفع کرنے کے لیے نامزد فرماتا ہے۔ تاہم جب تک تمام سوسائٹی شائستہ اور اعلیٰ ذہن و فکر کی مالک نہ ہو۔ اس وقت تک متواتر اور پیہم اور کافی تعداد میں علما و فضلا کا ہر ہر زمانہ اور ہر ہر دور میں موجود ہونا قرین قیاس نہیں۔

عالم وسطیٰ میں تمام عالم اسلام میں عموماً اور ایران میں خصوصاً اعلیٰ درجے کی شائستگی اور بلند درجے کی سطح ذہنی پائی جاتی تھی اور اگر تاریخ کے اوراق پر غائر نظر ڈالی جائے۔ تو یہ معلوم ہوگا کہ تمام قوم کی شائستگی، عام علمی مذاق اور بلند سیرت محض خود رَو نہ تھی۔ بلکہ اس

عمومی فضیلت کے پیدا کرنے کے لیے ایک بہت وسیع اور مؤثر نظام تربیت موجود تھا۔ جو تعلیم کے ساتھ ساتھ لیکن اس سے کہیں زیادہ پابندی، سختی اور ضبط کی فضا میں انفرادی اور اجتماعی طور پر نافذ تھا۔ جو نوجوانان ملک میں تعلیم کا صحیح تصور پیدا کرنے کے علاوہ ذاتی سیرت کی تنقیح و تہذیب، زندگی کی کشمکشوں سے باعزت طریق پر عہدہ برآ ہونے کے وسائل اور حیاتِ مستعار میں قومی خدمت اور ذات کی قربانی کے اصول کو دلوں میں راسخ کر دیا کرتا تھا۔ یہ نظام حکومتوں کے زیرِ اثر نہ تھا، بلکہ اس سے بالکل بے نیاز بلکہ ہر مادی طاقت سے مستغنی! سیاسی دائرۂ عمل میں جمود ہو یا حرکت، سلطنتوں اور حکومتوں کے انقلاب، جماعتوں اور قوموں کی کشاکش، حاکم اور محکوم کی نزاع، غرض کوئی ملکی ہنگامہ ان مراکزِ تربیت پر زیادہ دیر تک اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔

قومی تعلیم و تربیت کی یہ داستان مختصر نہیں، بلکہ اس قصے کی تشریح و تفصیل کے لیے کئی مفصل جلدوں کی ضرورت ہے۔ اس بحث کا مختصر سا تبصرہ مولانا شبلی کی کتاب "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" میں آچکا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا کو تربیت کے مسئلے کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی۔ ورنہ شاید اس موضوع کے متعلق ہماری تشنگی کب کی رفع ہو چکی ہوتی! بہر حال نہایت اختصار کے ساتھ ان اوراق میں تربیتِ قومی کے بعض اہم عناصر ذکر کیا جاتا ہے۔

گزشتہ تعلیم و تربیت کے متعلق مندرجۂ ذیل عنوانوں کے ماتحت بحث ہو سکتی ہے:

(۱) تعلیم کتابی (۲) تعلیم کتابی کے مختلف مدارج (۳) مدارس و مکاتب (۴) مدارس و مکاتب میں تعلیم و تربیت کا طریق اور اس کی جزئیات (۵) تربیت رسمی (۶) تصوف اور تربیت (۶) خانقاہیں اور تربیت (۷) تصوف اور عورتوں کی تربیت (۹) مجالس وعظ اور ...

اثر عوام پر، وغیرہ وغیرہ۔

مندرجۂ بالا عنوانات میں سے تعلیم اور مدارس کے موضوع پر اس سے قبل بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جن کے متعلق محض اشارۃً (ربط کو قائم کرنے کے لیے) اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ خلافتِ بغداد کے بعد تمام اسلامی مشرق میں باقاعدہ اور منظم تعلیم گاہوں کا نظام قائم ہو چکا تھا۔ جن میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے جملہ وسائل موجود تھے اور اگر آج ان میں سے ایک دَور کے نمایاں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا شمار کیا جائے۔ تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔

جہاں تک ابتدائی مکاتب کا تعلق ہے۔ وہ احاطۂ اعداد سے باہر ہیں۔ ہر مسجد اور خانقاہ کے ساتھ معمولی تعلیم کے لئے ایک مکتب موجود ہوتا تھا۔ ان مکاتب میں "مُعلّم" یا "معید" مقرر ہوتے تھے۔ جن کی تنخواہ بالعموم پبلک کے ذمّے ہوتی تھی لیکن گاہے گاہے سرکاری امداد بھی ملا کرتی تھی معلم کی مدد کے لیے ایک مُعید بھی ہوا کرتا تھا۔ جس کا کام یہ تھا کہ سبق کے یاد کرنے میں لڑکوں کے ساتھ تکرار و اعادہ کیا کرتا تھا۔

اُمرا اور صاحب ثروت افراد اپنے بچوں کے لیے تعلیم کا پرائیویٹ انتظام بھی کر لیا کرتے تھے لیکن اُن اُمرا کو عمومی سکولوں میں بچوں کو بھیجنے کے لئے کوئی عار نہ تھی۔ تدریس کے طریقے اور اُس کے متعلق دوسرے کوائف اگرچہ زیادہ اور الگ بحث کے محتاج ہیں تاہم یہاں برسبیل تذکرہ یہ بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ مُدرّسین (خصوصًا) کالجوں کے اساتذہ تدریس کے وقت کرسی یا کسی بلند جگہ پر متمکن ہُوا کرتے تھے اور طیلسان[1] کی طرح کا سیاہ لباس جسے "طرحہ" کہا جاتا تھا، زیب تن کیا کرتے تھے اور سر پر عمامہ کو وقار اور

---

[1] واعظوں کی چادر جسے "ہڈ" سے مشابہت ہے۔

تمکنت کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔ جہاں جماعتیں بڑی ہوتی تھیں۔ وہاں مُعید بھی مقرر ہوتے تھے۔ تاکہ لیکچر کو دُور کے طلبہ تک پہنچانے میں ممد ہوں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ باقاعدہ طلبہ کے علاوہ دوسرے شائقین بھی درس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ یہانتک کہ بڑے بڑے وزرا و اُمرا بھی استفادہ کے لیے ان لیکچروں میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ جب نورالدین زنگی ۶۳۴ھ میں بغداد آیا، تو مدرسہ مستنصریہ کی مجلس تعلیم میں حاضر ہُوا اور نہایت سکون اور غور کے ساتھ درس کو سُنتا رہا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس طرح کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ جن کے اعادے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

نصابِ تعلیم کی جزئیات سے قطع نظر کرتے ہُوئے، صرف ایک ضروری نکتے کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے کہ اس زمانے میں درسی کتابوں کے متعلق دو طریقے رائج تھے، جو ہمارے خیال میں افراط و تفریط کی بُرائی کی بنا پر طلبہ کی ذہنی تربیت کے لیے بہت مضر تھے۔ کتب نصاب یا تو بیحد طویل ہوا کرتی تھیں، جن پر عبور پانا مشکل ہوتا یا جن میں بے ضرورت تفصیل ہوتی۔ جن کی طالب علم کو چنداں ضرورت نہ ہوتی تھی یا اس کے برعکس نہایت مختصر کتابوں کا رواج تھا، جن کا اختصار پیچیدگی اور ابہام تک پہنچا ہوا تھا۔ مشہور مؤرخ اور فلسفی ابنِ خلدون نے اس نقص کی طرف ماہرینِ تعلیم کو متوجہ کیا اور اس کے متعلق اصلاحی مشورے بھی دیے۔ ابنِ خلدون نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ بعض تعلیم گاہوں میں نصاب کی کتابیں معیّن نہیں ہوتی تھیں اور یہ بھی ان بے شمار خرابیوں میں سے ایک ہے، جس کے ازالہ کی طرف علّامہ موصوف نے خاص توجہ فرمائی۔

میں اس مقالے کے شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ عالمِ اسلام میں تعلیم و تربیت کا جو طریقہ رائج تھا۔ اس کی گہرائیوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کتابی کوئی

مقصود بالذات چیز نہ تھی، بلکہ اس سے غرض قومی کیریکٹر کی تعمیر اور قوم میں ایک مختص النوع نظریۂ زندگی کی تخلیق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں تعلیم کی نسبت "تربیت" اور "ذاتی شخصی تعلق" کا اصول بہت رائج نظر آتا ہے۔

اس غرض کو پورا کرنے کے لیے کوئی سرکاری یا غیر سرکاری نظام موجود نہ تھا، بلکہ یہ خدمت ایک خدا پرست جماعت رضا کارانہ طور پر انجام دیتی تھی، جس کو عرفِ عام میں "صوفیہ" کا گروہ کہا جاتا ہے۔ صوفیوں کے متعلق جو غلط فہمیاں آج کل رائج ہیں، ان کے پیش نظر مجھے ڈر ہے کہ اکثر قارئین میری ان تصریحات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھیں گے، لیکن میں بہ ادب گزارش کروں گا کہ آج اگرچہ بقول مہدی الافادی "تصوّف" گداگری کے مرادف اور "توکل" بے کاری کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے، لیکن درحقیقت موجودہ تصوّف صدیوں کے انحطاط، غلامانہ ذہنیت اور تقلید بے روح کا نتیجہ ہے ——— یہ ہم تک جب پہنچی، صورت بگاڑ کر پہنچی۔ ہم یہ سمجھے۔ اس پر کبھی جوبن ہی نہیں آیا! ——— موجودہ تصوّف سے اُس نہایت ہی زبردست اور مؤثر وسیلۂ تربیت پر کوئی الزام نہیں عاید کیا جاسکتا، جو باوجود اپنی جملہ بے اعتدالیوں کے صدیوں تک تزکیۂ اخلاق، لطافتِ خیال اور حُسنِ احساس کے پیدا کرنے کی ذمّے دار رہی ہے۔ جہاں مذہب داروئے تلخ سمجھ لیا گیا یا ثابت ہوگیا، وہاں تصوّف نے "گل قند" بن کر اثر کیا۔

بہرحال عہدِ وسطیٰ میں تصوّف نے تربیت افراد کے لیے بہت بڑا کام کیا۔ جہاں تعلیم رسمی نے تکبّر، غرور، خود پسندی اور جدال کے مفاسد پیدا کیے۔ وہاں تصوّف نے قربانی، فنائے انانیت، ضبط اور عزتِ نفس کا سبق سکھایا۔ تعلیم جن دلوں کے لیے "سرکہ" ثابت ہوئی، تصوّف نے وہاں "شرابِ انگوری" کا کام کیا۔

یہ ایک بہت بڑا نظام تھا۔ جو محض محبت اور باہمی ایثار کے اصول پر قا
اس کا راستہ مذہب سے مماثل لیکن کہیں کہیں اس سے جُدا تھا۔ ہاں فلسفہ کے
برعکس تھا۔ فلسفی حقیقت تک پہنچنے کے لیے بحث و استدلال کی پگڈنڈی پر چا
ہوتا ہے۔ لیکن تصوّف دل کی شاہراہ سے مسافر کو لے جاتی ہے۔ اس میں مشقت
ریاضت کے ذریعے "شخصیت" کو پیدا کیا جاتا ہے اور انسانی سیرت کی تکمیل اس
سب سے بڑی غرض و غایت تھی۔

جس طرح مدرسے علوم رسمیہ کے لیے ہوتے ہیں۔ تصوف کی تربیت ک
"خانقاہوں" سے وہی کام لیا جاتا تھا۔ یہ مراکز قریب قریب ہر بڑے شہر میں موجود
بعض اوقات ایک نہیں متعدد خانقاہیں ایک جگہ ہوتی تھیں۔

"صفوۃ الصفا" وغیرہ کتابوں سے اس سلسلے میں بہت تفاصیل دستی
ہوتی ہیں۔ بعض جگہوں میں بہت بڑے بڑے کمرے تعمیر کر دیے جاتے تھے، جن
سازو سامان یا تجمّل بالکل نہ ہوتا تھا۔ یہ کمرے اجتماعات یا سماع کے لیے کام
تھے۔ "جماعت خانہ" بھی انھیں خانقاہوں کا دوسرا نام تھا۔ اس میں شیخ کے
زاویہ بنایا جاتا تھا، جہاں شیخ عبادت و ریاضت کیا کرتا تھا۔

صوفیوں کے تین طبقے ہوتے تھے۔ اوّل پیر یا قطب کہ ہر خانقاہ میں
ایک ہی ہوتا تھا۔ دوم مرید یا سالک جن کے بے شمار مختلف اور بے شمار مدار
سوم خدام اور امین کہ محض تبرکاً صوفیوں کی خدمت کا فرض اپنے ذمّے لے لیتے
لیکن یہ تقسیم عمومی ہے۔ اصطلاحی تقسیم کے مطابق صوفی دو حصّوں میں منقسم تھے۔
سالک۔ دوم واصل۔

سالکوں کے دو گروہ تھے :-

۱۔ طالبان وصول

۲۔ طالبان سعادت اُخروی

یہ تمام طبقات آگے چھوٹے چھوٹے طبقات پر مشتمل تھے۔ جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

جب پہلے پہل کوئی شخص حلقۂ تصوّف میں شامل ہوتا تھا۔ اس کے لیے بعض رسوم مقرر تھیں۔ سب سے پہلے کمر میں پٹکا باندھا جاتا تھا۔ پھر اس کو شیخ کی دائیں یا بائیں جانب بٹھایا جاتا تھا۔ شیخ اور مرید کے درمیان تین قدم کا فاصلہ ہوتا تھا، جس سے کچھ عارفانہ معنی مراد لیے جاتے تھے۔ کمر بندی کے بعد شیخ یوں گویا ہوتا تھا۔

"برخیز بخدمت، بنشین بحرمت، بگوی بحکمت"

اس کے بعد شیخ مرید کو بارہ نصیحتیں کیا کرتا، جن میں سے چند یہ ہیں۔ حسد سے بچنا، ہمدردی کرنا، سچ بولنا، بُرائی سے رکنا اور روکنا، جوانمردی کرنا، غالب کے سامنے عزّت نفس دکھانا اور مغلوب کے سامنے انکسار کا اظہار کرنا۔

صوفیہ اگرچہ جہالت کے دشمن تھے، لیکن محض علم کو شخصیت کی تکمیل کے لیے کافی نہ سمجھتے تھے، اس لیے سالکوں کو ایک خاص درجے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد عموماً مندرجہ بالا نصائح پر عمل کرانے کی کوشش کیا کرتے تھے، جس کو ان کی زبان میں حال کہا جاتا تھا اور یہ کیفیت عام خدمت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ تصوّف کی تمام تعلیمات میں قدر خدمت، پاکبازی اور ترک ریا کو ضروری قرار دیا گیا، کسی اور جزو پر اتنا زور نہیں دیا گیا۔ یہ وہ پابندی ہے، جو مرید کے لیے اور پیر کے لیے بیک وقت ضروری ہے۔

تصوف کی ریاضت میں علاوہ خدمتِ خلق اور ترکِ خودی کے بے شمار
بھی ہیں، جن کا نفسیات اور کیریکٹر پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً توبہ و بیعت، ذکر و فکا
نغمہ، سفر و زیارت، ریاضت و مجاہدت، حفظ اسرار، مالی اور جانی قربانی وغیرہ
لیکن یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

سطور بالا میں مَیں نے تربیت عوام و افراد کے جس مؤثر وسیلہ و ذریعہ
کی طرف مختصر اشارات کیے ہیں، وہ درحقیقت ایک نہایت ہی جامع بحث کی محتا
مجھے یقین ہے کہ اگر ہم موجودہ تعلیمی علم النفس کی روشنی میں اس اہم نصابِ تعلیم
کریں گے، تو ہمیں اس کے اندر نہایت گراں قدر رموز و نکات ملیں گے، جن کے
کو محض آج کل کی خصوصیت سمجھا جاتا ہے دنیا میں چند نفوس و افراد کا کسی ایک غلط
قائم ہو جانا تو ممکن ہے، لیکن کروڑوں عقلا کا ایک نظریۂ زندگی کو بغیر اس کے او
قبول کر لینا قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا ——— تصوّف اس میں شک نہیں، عقیدہ و عم
بے اعتدالیوں سے بدنام ہو گیا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کا اصولِ تربیت
بہت مؤثر ثابت ہُوا ——— !

ذوقِ سلیم

از

نذیر احمد ایم اے، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

ذوق (Taste) ایک فطری ملکہ ہے۔ جس کی وجہ سے ہر قسم کے علوم و فنون کی تحصیل نسبتاً زیادہ آسان ہو جاتی ہے۔ یہی وہ جوہر ہے، جس سے ایک شخص دوسرے کی نسبت زیادہ باوقار لائق اور فاضل خیال کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ذرہ ہے، جو اپنی درخشندگی سے آفتاب عالمتاب کو مات کر دیتا ہے۔ یہی وہ محرک ہے، جو ایک جاہلِ مطلق کو شاعر، مصوّر یا نقّاش بنا دیتا ہے اور ایک معمولی خوش گلو شخص کو تان سین اور بیجو باورے کا مثیل بنا دیتا ہے۔ تہذیب و تمدن کے مختلف ادوار میں سے وہی اشخاص زندۂ جاوید ہیں، جو صاحبِ ذوق تھے۔

کہتے ہیں کہ سکندر اعظم کو بچپن سے ہی ایک وسیع سلطنت زیرِ نگیں کرنے کا ذوق تھا۔ نپولین شروع سے ہی جنگی ذوق رکھتا تھا۔ محمود غزنوی کو بچپن سے ہی ہندوستان کی دولت مندی کی کہانیاں سننے کا شوق تھا۔ کارلائل صغر سنی سے ہی ادب کی طرف۔ ڈارون حساب، سائنس اور فلسفہ کی طرف۔ حافظ، فیضی اور اقبال شعر کی طرف مائل تھے۔ تاریخ کے صفحات اِس امر کے شاہد ہیں کہ متذکرہ بالا ہستیوں کو اُن کے مقاصد و عزائم کی تکمیل میں اُن کے ذوق نے کس قدر مدد دی۔ خواجہ حافظ ابتداءً کچھ ایسے نغز گو نہ تھے لیکن ذوق نے خضر بن کر رہنمائی کی اور وہ نغز گوئی کا آبِ حیات پی کر زندۂ جاوید ہوئے۔

ذوق ایک وہبی چیز ہے۔ اکتسابی نہیں۔ مگر اکتساب علوم میں بیحد ممدّ و معاون ہے اور اسی وجہ سے ہر معلّم کا فرض ہے کہ وہ اپنے شاگرد کا ذوق یا فطری میلان جانچے۔ اُس کے ذوق کی تربیت کرکے اُسے ذوقِ سلیم حاصل کرنے میں مدد دے۔ ڈالٹن پلین (جو ایک مشہور تعلیمی اسکیم ہے) کی بنیاد طلبہ کے ذوق اور فطری میلان ہی پر رکھی گئی۔ پس ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ ذوق کیا چیز ہے اور اُس کی تربیت کیسے کی جا سکتی ہے۔

ذوق کی تعریف کسی نے یوں کی ہے "یہ وُہ قوت ہے جس کے ذریعے سے ہم اپنے گردوپیش کی چیزوں میں حسن و قبح کی پرکھ کرتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں"۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ذوق کا کسی اندرونی حِس سے تعلق ہے یا عقل سے۔ اگر ہم عقل سے وہ دماغی طاقت مراد لیں، جو پیچیدہ معاملات کو سلجھا کر صحیح نتائج اخذ کرتی ہے اور عملی کاموں میں مقاصد کے لیئے ذرائع کی موزونی و غیر موزونی کو جانچتی ہے، تو اس سوال کا جواب کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھر یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ذوق کا عقل سے چنداں تعلق نہیں۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ہم کسی اچھے منظر یا عمدہ نظم سے محظوظ ہونے کے لیئے قوتِ استدلال یا تفہیم کے محتاج ہوں، بلکہ ایسی چیزیں عموماً ہمیں خود بخود متوجہ کر لیتی ہیں اور ہم یہ بتانے سے قاصر رہتے ہیں کہ ہم ان سے کیوں متاثر یا محظوظ ہوتے ہیں۔ ایسی چیزیں بسا اوقات ایک فلسفی اور دہقان یا ایک بچے اور مرد کے لیئے یکساں جاذب توجہ ہوتی ہیں۔ پس اُس قوت کا جس کے ذریعے سے ہم حسن سے محظوظ ہوتے ہیں عملِ تفہیم یا عقل سے اتنا تعلق نظر نہیں آتا، جتنا کہ کسی اندرونی قدرتی حِس سے۔

اگرچہ ذوق کا قوائے عقلی سے کوئی تعلق نہیں اور یہ اصطلاح قوتِ ذائقہ سے وضع کی گئی ہے اور اس کی بنیاد اس امر پر ہے کہ انسان خوبصورتی پر فطری طور سے مائل ہے۔ تاہم ہم

اس ملکہ کو قوائے عقلی سے بالکل خارج نہیں سمجھتے، کیونکہ قوائے عقلی سے ذوق تربیت پذیر ہوتا ہے اور ترقی کرتا ہُوا، اُس درجے تک پہنچتا ہے، جسے عموماً ذوقِ سلیم یا مذاقِ سلیم کہا جاتا ہے۔

متذکرہ بالا مفہوم کے مطابق ذوق ایک ایسا ملکہ ہے، جو کم و بیش ہر شخص کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ ہر شخص میں بلا امتیازِ مذہب و ملّت، رنگ و نسل، ملک و قوم، یہ اہلیت کم و بیش ضرور پائی جاتی ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو جو متناسب، متوافق، منظم، ذی شان، عجیب اور خوبصورت ہے، بنظرِ تحسین دیکھتا ہے۔ وُہ ہر چیز کو سراہتا ہے، جس میں رنگوں کا امتزاج نہایت دلکش ہو۔ حتیٰ کہ بچوں میں بھی یہ ملکہ پایا جاتا ہے۔ وہ خوب صورت، سڈول ڈیل ڈول والے اور متناسب الاعضا اشخاص سے والہانہ محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہ تصویروں اور مجسموں پر فدا ہوتے ہیں اور ان کو گھنٹوں، بلکہ پہروں دیکھ دیکھ کر بھی سیر نہیں ہوتے اور وہ ہر نئی، تعجب خیز اور حیران کُن چیز کی طرف خود بخود کھنچے چلے جاتے ہیں۔ بالکل اجڈ، اَن پڑھ کسان بھی فطرت کے اس عطیّے سے محروم نہیں ہیں۔ وہ بھی ارضی اور سماوی خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہیں اور دلکش ترانوں اور خواب آور افسانوں کے سحر سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ صحراؤں کے خانہ بدوش، افریقہ کے حبشی اور امریکہ کے وحشی بھی قدرت کی اس نعمت سے فیضیاب ہیں۔ ان کے لباس، ان کے گھروں کی آرائش اور زیورات وغیرہ سے بدن کی زیبائش، اُن کے ذوق کا اظہار کرتی ہے۔ پس اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ جس طرح خداوند تعالیٰ نے انسان کو عقل اور گویائی عطا کی ہے، اُسی طرح ہر انسان کو ذوق بھی عطا کیا ہے۔ جو واقعات و حالات کی مساعدت یا نامطابقت سے بنتا یا بگڑتا ہے، جو تعلیم اور تمدن کی همہ گیری کی وجہ سے عمدہ ہو کر ذوقِ سلیم کہلاتا ہے۔

اور وہ لوگ جو تعلیم اور تہذیب و تمدن سے کوسوں دُور ہیں۔ جن کے خیالات اور قلب و دماغ کی پہنائیاں محدود ہیں، کور ذوق کہلاتے ہیں۔

اگرچہ بظاہر ہر شخص کو ملکۂ ذوق قدرتی طور پر ضرور ملا ہوتا ہے۔ مگر اس ملکہ کمیّت اور کیفیت یا کمی بیشی کی وجہ سے ممکن ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے بُعد المشرق رکھتا ہو۔ عموماً اکثر اشخاص میں یہ ملکہ اس قدر کم ہوتا ہے کہ اُنھیں اس ملکہ کے مکمّل فقدا کا یقین ہونے لگتا ہے۔ بعض اشخاص میں ذوق کی معمولی سی جھلک نظر آتی ہے، یعنی خوبصورتی سے محظوظ تو ہو سکتے ہیں، مگر حُسن کی جُزئیات اور مختلف کیفیات سے لطف اٹھا ہونے کی استعداد نہیں رکھتے۔ ذوق وہ جوہر ہے، جس سے فطرت نے نہایت کفایت شعاری سے چیدہ چیدہ اشخاص کو بہرہ مند کیا ہے۔

ذوق کی مذکورہ بالا عدم مساوات دو وجہ سے۔ اوّل طبائع کا قدرتی طور پر مختلف ہونا۔ دوم بعض اشخاص میں ذہنی اور دماغی قوےٰ کا زیادہ لطیف ہونا، یعنی بعض اشخا طبعاً صاحبِ ذوق ہوتے ہیں اور بعض کو تعلیم اور تہذیب صاحبِ ذوق بنا دیتی۔ مؤخر الذکر قضیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق قابلِ تربیت ملکہ ہے اور تعلیم اور تہذیب سے ترقی پذیر ہو سکتا ہے۔ پس اب ہمیں اُن ذرائع پر غور کرنا چاہیے۔ جن سے یہ ملکہ نشو و پاتا ہے اور یہی ایک ایسا امر ہے۔ جس کی طرف ہر معلّم کو پوری پوری توجہ دینا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک ایسی ہستی جو معلّم کی معمولی توجہ سے رودکی، فردوسی، ہومر بن سکتی ہے اُس کی عدم توجہی سے تباہ و برباد ہو جائے۔

ذوق کی تربیت کے سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں اُن اصولوں کی طرف غور کرنا چاہیے، جو ہماری فطرت میں ودیعت ہیں اور ہماری طبیعت میں سرگرمِ عمل ہیں۔ تو ہمیں

آئیگا کہ مشق یا ورزش سب سے بڑا اصول ہے، جس سے جسم انسانی تربیت پاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے، جس سے قوائے دماغی کی بھی نشو و نما کی جاتی ہے اور اگرچہ حواس خمسہ پر مشق یا ورزش کا کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا، مگر حقیقت یہ ہے کہ مشق و ممارست سے حواس خمسہ بھی زیادہ ذکی الحس ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کاتب، گھڑی ساز، نقاش، نگینوں پر نام وغیرہ کندہ کرنے والے لوگوں کی بصارت زیادہ باریک بین ہو جاتی ہے۔ شکاری لوگوں کی قوتِ سامعہ اور باصرہ تیز ہو جاتی ہے۔ دوا فروشوں، عطاروں اور خانساموں وغیرہ کی قوتِ ذائقہ زیادہ ذکی الحس ہو جاتی ہے۔ موسیقی کے فدائیوں کی سماعت اس قسم کی ہو جاتی ہے کہ وہ راگ کی جزئیات کو سمجھنے لگ جاتے ہیں اور اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایک عام آدمی کے کان اس فرق کو جو ایک ہی راگ کی ایک تان اور دوسری تان ہوتا ہے، محسوس ہی نہیں کر سکتے۔ پس مشق و ممارست سے ذوق کی بھی تربیت اور نشو و نما کی جا سکتی ہے۔ بعض تعلیمی مضامین مثلاً ڈرائنگ اور خوشنویسی تو بالکل ایسے ہیں، جن سے ذوق کی بہت نشو و نما ہوتی ہے۔ مگر ایک لائق معلّم اور کئی ایسے ذرائع بھی اختیار کر سکتا ہے، جس سے ذوقِ سلیم پیدا ہو، مثلاً خطّاطی، نقاشی اور تصاویر کے بے شمار نمونے دکھا دکھا کر اور اُن کے حُسن و قبح کو بار بار واضح کر کے طلبہ میں ان فنونِ لطیفہ کا صحیح ذوق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح مضامین نثر و نظم کو پڑھ پڑھ کر سنانے اور اُن کے عیب و ثواب پر کافی بحث کرنے سے نظم و نثر کے محاسن طلبہ کے ذہن نشین کیے جا سکتے ہیں اور اسی طرح کافی مشق دلانے سے سخن فہمی کا صحیح مذاق پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس طرح سے وہ طالب علم جن کے جوہر قابل ہیں، رفتہ رفتہ علم ادب کے ایسے جیّد عالم اور زبردست نقاد بنائے جا سکتے ہیں کہ ایک دُنیا سے اپنا لوہا منوائیں۔

یہ بات عام مشاہدے میں آتی ہے کہ بعض معمولی پڑھے لکھے لوگوں میں شعرگوئی کا ملکہ ہوتا ہے۔ وُہ اپنے اِس ذوق کی تربیت کرتے رہتے ہیں اور اُس کی تکمیل میں شب و روز کوشاں رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دن اُن کا شمار بڑے بڑے شاعروں میں ہونے لگ جاتا ہے اور ہر کہ و مہ ان کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح بعض آدمیوں کو مضمون نویسی کا ذوق ہوتا ہے۔ مگر تعلیم کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوتی۔ وُہ لکھنے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔ اس مشق سے اور دوسروں کے مضامین پڑھ کر اُن سے مقابلہ اور موازنہ کرتے رہنے سے آہستہ آہستہ اُن میں مضمون نویسی کا صحیح مذاق پیدا ہو جاتا ہے اور اُن کے مضامین دنیا بھر سے خراجِ تحسین وصول کرتے ہیں۔ یہ لوگ پہلے ہی دن سے ایسے ماہر پیدا نہیں ہُوئے تھے، بلکہ انھوں نے آہستہ آہستہ اپنے ذوق کی تربیت سے یہ رتبہ حاصل کیا ہے۔ پس معلّم کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے ذوق کا صحیح صحیح اندازہ کرے اور جس قسم کے ذوق کی تربیت وہ کر سکتا ہے، اُسے فرض جان کر اُس میں کوتاہی نہ کرے۔ کیونکہ کسی چیز کا صحیح ذوق پیدا کرنا اور اُس کی تربیت کرنا معلّم کا عین فرض ہے۔

ذوق کی تربیت کا دوسرا طریقہ قوائے ذہنی کی تربیت کرنا ہے۔ جب قوائے ذہنی تربیت پذیر ہوتے ہیں۔ تو ذوق خود بخود ترقی کرتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کسی چیز میں دلکشی محسوس کرتا ہے، مگر وہ دلائل نہیں دے سکتا کہ وُہ چیز اُس کے لیے کیوں دلکش ہے۔ جب اُس کے قوائے ذہنی کافی تربیت پاتے ہیں، تو قوتِ ادراک اور قوتِ فیصلہ اُسے بتاتی ہے کہ یہ چیز کیوں دلکش ہے۔ اس میں کیا صفات ہیں، جنھوں نے اس چیز کو عام سطح سے اُوپر اُبھارا ہے۔ غرضیکہ قوائے ذہنی کی تربیت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر

چیز جو بظاہر حسین ہو، ہمارے لیے جاذبِ توجہ نہیں بن سکتی اور ہمارا ذوق صرف حقیقی حُسن کو ہی سراہتا ہے۔ سینما کی مثال لیجیے۔ آج کل سینما دیکھنے کا شوق بہت بڑھ رہا ہے۔ ہر امیر غریب حسبِ استطاعت سینما گھر میں دل کی لگی بجھانے جاتا ہے اور عوام الناس کا یہ حال ہے کہ جو فلم نئی بن کر آتی ہے، اسی کے متعلق کہنے لگ جاتے ہیں، بس ایسی تصویر نہ بنی تھی، نہ بنے گی۔ معدودے چند ایسے ہیں، جو مقابلہ کر کے اُسے اچھی یا بُری فلم کہتے ہیں۔ مگر اُن کا مقابلہ اور موازنہ بھی کسی اصول پر مبنی نہیں۔ ہاں وہ لوگ جو صاحبِ ذوق بھی ہیں اور تعلیم سے ان کے قوائے ذہنی بھی کافی تربیت پائے ہوئے ہیں۔ وہ صرف ایکٹروں کے نام، ڈائرکٹر کی شخصیت اور تصاویر کے رنگوں سے ہی مرعوب نہیں ہوتے، بلکہ اُس کا ہر لحاظ سے پورا پورا تجزیہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ قدرت کے کس قدر قریب ہے۔ کون کون سی چیزیں قدرت کے رخسارہ پر غازہ سمجھ کر مَلی گئی ہیں اور اُس غازہ سے رنگِ رُخ چمکا ہے یا اور پھیکا پڑ گیا ہے۔ کن کن جذبات و احساسات کا اظہار کیا گیا ہے اور کس قدر جوش سے۔ آیا جوش قدرتی معلوم ہوتا ہے یا مصنوعی وغیرہ وغیرہ۔ یعنی وہ اصلی حُسن کو دیکھ سکتے ہیں۔ اُس کی تعریف کر سکتے ہیں اور اُس کے عیوب پر بحث کر سکتے ہیں اور محاسن کا جواز ثابت کر سکتے ہیں۔ پس قوائے ذہنی کی تربیت کرنا ذوقِ سلیم حاصل کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔

ذوقِ سلیم میں دو خواص بہت نمایاں ہوتے ہیں، یعنی نفاست اور صحت۔ نفاست اُن لطیف قوتوں پر مشتمل ہے، جو انسان کو اس قابل بنا دیتی ہیں کہ وہ اس خوبصورتی کو بھی دریافت کر لیتا ہے، جسے عوام کی نظر دریافت نہیں کر سکتی۔ یہ خاصیت زیادہ تر حواس کی تندرستی اور صحت سے تعلق رکھتی ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایک آدمی کے حواس بالکل

صحیح ہوں، مگر اس میں نفاستِ ذوق نہ ہو۔ ممکن ہے کہ ایک آدمی بڑا حساس ہو، مگر اُس کے مذاق میں نفاست نہ ہو۔ نفیس مذاق شخص حساس بھی بہت ہوتا ہے اور اُس کے احساسات بالکل صحیح بھی ہوتے ہیں، یعنی اُسے سونے اور ملمّع کی اس قدر پہچان ہوتی ہے کہ اُسے کسوٹی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ حُسن خواہ لاکھ پردوں میں چھپا ہو، اُس کی تیز اور باریک بین نگاہ سے چھُپ نہیں سکتا۔ وہ نورِ ازل کو ہر اُس جگہ جلوہ فرما دیکھ سکتا ہے، جہاں عوام کو اُس کے وجود کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ جس طرح وہ شخص جس کی ذائقہ کی حس بہت تیز ہوتی ہے، ایک مرکب کو چکھ کر بتا دیتا ہے کہ اس میں فلاں فلاں چیز شامل ہے۔ بالکل اسی طرح ایک نفیس مذاق شخص صرف وہی حُسن دیکھیگا۔ جو ہر قسم کے لوث سے پاک اور صاف ہو۔

مذاقِ سلیم میں دوسری خاصیت صحّت ہے۔ صحت کا قوتِ ادراک سے تعلق ہے۔ یہ خاصیت اس بات کا جائزہ لیتی ہے کہ جو چیز دل کو مرغوب ہوتی ہے، اس میں دلکشی کیوں پائی جاتی ہے۔ آیا اس دلکشی میں کوئی خاص جذبہ تو کارفرما نہیں ہو رہا۔ آیا یہ دلکشی ہر قسم کے عیوبِ تعصب و جانبداری سے تو پاک ہے۔ آیا یہ دلکشی جائز حدود کے اندر ہے یا حدود کی قیود سے آزاد۔ مختصر یہ کہ صحّت مذاقِ سلیم کے لیے عنانِ رہوار ہے، جو اُسے بے لگام اور بے راہ چلنے سے روکتی ہے یا ایک بھُولے بھٹکے مسافر کے لیے خضرِ راہ ہے۔ مسافر بچارا ہر دوراہے اور چوراہے پر کھڑا ہو کر سوچتا ہے کہ منزلِ مقصود کا راستہ کدھر ہے اور یہ آ کر اُس کی رہنمائی کرتی ہے۔ صحّت مذاقِ سلیم کو سیدھے اور صحیح راستے پر لے جاتی ہے اور ہر غولِ بیابان سے اُس کی حفاظت کرتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کسی زمانے میں یونانی فنِ عمارت کی بہت قدر تھی اور سمجھا جاتا تھا

کہ فنِ تعمیر کا معراجِ کمال یہی ہے۔ پھر رومن تعمیرات (Gothic architecture) کا دَور دَورہ ہُوا اور پھر آہستہ آہستہ مغل فنِ تعمیر کو عروج حاصل ہوا جس نے ایک عالم کے دل پر اپنی جبروت و سطوت کا سکّہ جمایا اور تاج محل کو دُنیا کے عجائبات میں سے گنوایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی چیز کے متعلق مختلف زمانوں میں انسان کا مذاق بدلتا رہتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص مزاحیہ ڈراموں (Comedy) کا ذوق رکھتا ہے، تو کوئی دردناک ڈراموں (Tragedy) کا فدائی ہوتا ہے۔ کوئی نظم کو پسند کرتا ہے، تو کوئی نثر کو جانِ ادب سمجھتا ہے۔ کوئی تاریخ پڑھنے کا شیدائی ہے، تو کسی کو طبیعیات پسند آتی ہے۔ کوئی جسم کو دماغ پر اور کوئی دماغ کو جسم پر ترجیح دیتا ہے۔ ایک ورزشِ جسمانی کا دیوانہ ہے، تو دوسرا شمعِ علم کا پروانہ ہے۔ ایک گھر کی چار دیواری میں اسیر، تو دوسرا اسیرِ صحرا کی ہوس میں دلگیر ہے۔ غرضیکہ ع پسند اپنی اپنی مذاق اپنا اپنا ——— کا عالم نظر آتا ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذوقِ سلیم کا معیار کیا ہے۔ مندرجہ بالا مختلف مذاق رکھنے والے لوگوں میں سے کسے بُرا کہیں اور کسے اچھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مندرجۂ بالا ہر قسم کے ذوق اپنی اپنی جگہ پر سبھی اچھے ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے بھی ہمیں کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی اور نہ ہی ترجیح دینے کی ضرورت کو اتنا محسوس کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مندرجۂ بالا امور بھی تو سب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ہاں جب ایک ہی چیز کے متعلق دو مختلف قسم کے ذوق نظر آئیں، تو اُن میں سے ایک کو اچھا کہنے اور دوسرے کو بُرا کہنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک چیز ایک ہی وقت میں بہت اچھی بھی ہو اور بہت بُری بھی۔ مثال کے طور پر ایک شخص کہتا ہے کہ غالب کا کلام نہایت ہی اعلیٰ پایہ کا ہے۔ وہ اُسے الہامِ منظوم سمجھتا ہے،

تو دوسرا کہتا ہے، غالب ایک مہمل نویس شاعر تھا۔ بڑے بڑے لفظوں کے انمل بے جوڑ مرکبات کے سوا اس کی شاعری میں اور دھرا ہی کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ تو ہمیں لازمی طور پر کسی ایک نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص ایک تصویر کو تصویر کشی کا کمال ٹھہراتا ہے، آ دوسرا اُسے مبتذل اور پامال۔ تو ہمارے پاس وہ کون سا پیمانہ ہے، جس سے دونوں کے بیانات کا اندازہ لگائیں یا کونسی ایسی کسوٹی ہے، جس پر ہر دو کے تاثرات کو پرکھ کر کھرے کو کھوٹے سے علیحدہ کر سکیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو مذاقِ سلیم خود بخود کھرے کھو میں تمیز کر لیتا ہے۔ صحیح بات خود بخود دل میں گھر کر لیتی ہے۔ دوسرے متقدمین کا کسی بات اتفاق رائے بھی درست تسلیم کر لینا چاہیے اور تیسرا سب سے اہم اصول مذاقِ سلیم جانچنے کا یہ ہے کہ نقل کا اصل سے مقابلہ کیا جائے، یعنی صنعت کا قدرت سے مقابلہ کیا جائے۔ صنعت (Art) کے متعلق ایک فلسفی کا قول ہے کہ یہ ایک آئینہ کی مانند ہے جس میں قدرت (Nature) عکس پزیر ہے۔ اگر عکس صحیح اور پورا اُترے تو آئینہ کو ہر لحاظ سے درست جانو۔ بصورت دیگر سقیم۔

پس ذوقِ سلیم ہمیشہ یہ پرکھتا ہے کہ فلاں آرٹ قدرت کے کس قدر قریب ہے اور اسی قرب و بُعد سے کسی آرٹسٹ کے ذوقِ سلیم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ودّیامندر اسکیم

از

نیاز الدین احمد، بی اے

ذیل میں صوبجاتِ متوسط کی کانگرسی حکومت کی ودّیا مندر اسکیم پیش کی جاتی ہے۔ یہ اسکیم ابتدائی جبری تعلیم کو مقبول اور کامیاب بنانے کی مدعی ہے، لیکن یہ وہی اسکیم ہے، جس کی وجہ سے ملک میں بہت کچھ لے دے ہو رہی ہے۔

یہ اسکیم سی پی کے سرکاری مطبع میں چھپی ہے اور اس میں مناسب اور ضروری اصلاحات کی گنجائش ہے اور سی پی کی حکومت نے اسے پبلک کی رائے زنی اور نکتہ چینی کے لیے ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ ذیل میں اس اسکیم کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ (ایڈیٹر)

تاریخی پس منظر

قدیم ہندوستان میں سماجی بہبودی حکمران کا فرضِ اوّلیں خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اُسی زمانے میں ٹیکسلا اور نالندا تعلیم کے بہت بڑے مرکز تھے۔ متذکرہ تعلیمی مرکز ہمیں یہ حقیقت یاد دلاتے ہیں کہ زمانۂ قدیم کے ہندو تعلیم کے بہت بڑے بہی خواہ اور سرپرست ہوتے تھے اور عظیم الشان تعلیمی مرکزوں کے اخراجات کی کفالت کرتے تھے اور ان سرچشمہ ہائے علوم سے ہزارہا علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ یہ مرکز صدیوں تک لوگوں کی

خدمت کرتے رہے۔ یہاں ہمیں ان کے متعلق تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

ہمارے ملک میں جب انگریز لوگ آئے، تو یہاں تعلیم عام تھی۔ ملک میں دو قسم کے ادارے پائے جاتے تھے۔ ہنود کے پاریشاد، تول اور پاٹھ شالے تھے اور مسلمانوں کے مکتب اور مدرسے تھے۔ پاریشاد مسن اور عالم لوگوں کے ادارے تھے۔ تول میں برہمنوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی اور پاٹھ شالے حقیقی طور پر عوام کے لیے ابتدائی تعلیم کا ذریعہ تھے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور یہ تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے اور مکتب وہ اسکول تھے، جو مسجدوں کے ساتھ ملحق تھے۔ مسلمان بچوں کو ابتدائی تعلیم انھیں کے ذریعے دی جاتی اور مدرسے وہ اسکول یا کالج تھے، جہاں مسلمانوں کو ثانوی اور اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔

اہلِ یورپ کے آنے کے بعد ہندوستان میں حکومت کے لیے تلوار چلنا شروع ہوگئی۔ اس ہنگامہ پرور دَور میں تعلیم کو پوچھنے والا کوئی نہ رہا۔ حق تو یہ ہے کہ اس جنگ و جدل کی وجہ سے تعلیمی ترقی کا راستہ مسدود ہوگیا۔ تمام قومیں ملکی فتوحات کی ہوس میں جبر و استبداد میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتی رہیں اور آخر کار جب انگریزوں نے اہلِ پرتگال اور اہلِ فرانس اور اہلِ ہالینڈ کو شکست دے دی اور اس ملک کے مالک بن گئے، تو انھوں نے دیکھا کہ پاریشاد، تول، پاٹھ شالے، مکتب اور مدرسے ابھی تک قائم ہیں اور ان کے قائم رہنے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ اِن اداروں کے نام اپنی جائدادیں وقف کر گئے تھے اور ایسی درسگاہیں جن کی آمدنی اوقاف کی وجہ سے مستقل تھی۔ اس جنگ و جدل کے باوجود قائم رہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں ابتدائی مشرقی تعلیم کو ترقی دینے کی غرض سے کمپنی بہادر کے چند ایک ملازمین نے بھی اپنی توجہ اس طرف مبذول کی اور

جب عیسائی مبلغین اس ملک میں آئے اور انھوں نے یہاں اپنے ادارے قائم کیے، تو کمپنی کو اس بات کا خدشہ پیدا ہوا کہ اُن کی مذہبی تحریکات کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دل خوف زدہ نہ ہو جائیں۔ کمپنی کے ارکان لوگوں کے مذہبی تعصب سے ڈرتے تھے۔ اسی لیے وہ عیسائی مبلغین کے کارناموں کو بہ نظرِ تحسین نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن آخرکار مبلغین کامیاب ہوئے اور تعلیم و تبلیغ کا کام بدستور کرتے رہے۔ ۱۷۹۲ء میں یہ احساس عام ہو گیا کہ ہندوستان میں تعلیم کا کام محض خود ساختہ انجمنوں تک محدود نہیں رہنا چاہیے، چونکہ اشاعتِ تعلیم کی کچھ ذمّے داری حکومت پر بھی عائد ہوتی تھی، لیکن اس احساس کے باوجود ۱۸۱۳ء تک کوئی تعمیری کام نہ کیا گیا۔ بالآخر کمپنی بہادر کے چارٹر میں اس شق کا اضافہ کیا گیا کہ گورنر جنرل نشرِ تعلیم کے لیے ہر سال ایک لاکھ روپیہ خرچ کر سکتا ہے۔ ۱۸۱۴ء کے فرمان میں ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے بجائے اعلیٰ تعلیم پر زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرنے کی تاکید کی گئی اور اسی فرمان سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں کس قسم کا نظامِ تعلیم رائج تھا۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے :۔

"ہم اس موقع پر ایک گونہ تسلّی سے رائج الوقت اندرونی پالیسی کے ایک نمایاں پہلو کا ذکر کرتے ہیں، جس کی رُو سے لوگوں کی تعلیم کی کفالت زمینی پیداوار کے ایک مخصوص حصّے اور دیگر عطیات کے ذریعے کی جاتی تھی، جن کی وجہ سے اساتذہ ملک کے قومی خادم بن جاتے تھے۔"

۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۵ء تک روپیہ زیادہ تر اعلیٰ تعلیم پر خرچ کیا گیا، لیکن یہ کشمکش ۱۸۳۵ء تک جاری رہی۔ جب کہ لارڈ میکالے کا معرکہ خیز فرمان لکھا گیا اور (لارڈ میکالے کے الفاظ میں) حسبِ ذیل پالیسی منضبط کی گئی :۔

"ہمیں اس وقت انتہائی کوشش کرنی چاہیے کہ ملک میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے، جو ہمارے اور عامۃ الناس کے مابین مترجمین کا کام سرانجام دے۔ یہ جماعت رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو، لیکن ذوقی میلانات آرا، اخلاق اور ذہنی نشوونما کے لحاظ سے فرنگی ہو۔"

اس حقیقت کو اب سب لوگوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ لارڈ میکالے ایک خطرناک غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ مغربی تعلیم ہندوستانیوں کو سو فیصدی فرنگی نما بنا دے گی۔ اگر کوئی فرق رہ جائے گا، تو وہ صرف رنگ کا ہوگا۔ میکالے کے اس اعلان کے ستر سال بعد لارڈ کرزن نے بدیں الفاظ اقرار کیا کہ "جس وقت سے میکالے کے وبا انگریز سائنس نے ہندوستانی زبانوں اور ہندوستانی نصاب کی کشت زار کو مسموم کیا ہے، اُس وقت سے لوگوں کی ابتدائی تعلیم پژمردہ ہو کر رہ گئی ہے۔"

۱۸۳۵ء کے اعلان کے باوجود لارڈ میکالے کے مخالفین اس امر کے لیے کوشاں رہے کہ ملک کی تعلیمی حالت کا صحیح جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ بنگال اور مدراس میں اس عقیدے کو عملی جامہ بھی پہنایا گیا۔ یہ نکتہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ جب لارڈ میکالے نے اپنا فرمان تحریر کیا، اُس وقت مسٹر آدم (جو کہ بنگال میں تعلیمی جائزے کے لیے خاص طور پر مقرر ہوئے تھے) کے بیان کے مطابق صرف صوبۂ بنگال میں دس ہزار مدرسے موجود تھے۔ مسٹر آدم نے محض حالات کا جائزہ ہی نہیں لیا، بلکہ آئندہ پروگرام کو مرتب کرنے کے لیے کچھ نئے اُمور کی تلقین بھی کی، جن میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) ملکی مدارس کی ترقی کے لیے عملۂ اساتذہ کے معیار کو بلند تر کیا جائے۔

(۲) مخصوص اوقات پر انسپکٹر امتحان لے اور اُن کے نتائج کو مدِ نظر رکھ کر انعام

اکرام سے گروؤں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

(۳) ہر ضلع میں اُستادوں کی ٹریننگ کے لیے ایک نارمل اسکول ہو۔

(۴) ان فارغ التحصیل اساتذہ کی کفالت کے لیے ہر قوم کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جاگیریں ملحق ہوں۔

(۵) پہلے آزمائش کے طور پر چند ایک ضلعوں کو چن لیا جائے، جن میں یہ طریق تعلیم رائج کیا جائے۔

مسٹر آدم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اُس نے جو طریق تعلیم مرتب کیا ہے اُوہ صحیح قومی تعلیم کی بنیاد ہونا چاہیے۔ لیکن شومیٔ قسمت سے اُس کی تجاویز کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ اُنیسویں صدی میں اس عقیدے پر عمل کیا گیا کہ تعلیم سوسائٹی کے بالائی طبقوں سے زیریں طبقوں کی طرف نزول کرتی ہے۔ مسٹر آدم نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا ہے، وُہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:۔ ملکی آبادی کے زیریں طبقوں کے لیے اسکول کھولنے کے بجائے حکومت اس قسم کی درسگاہیں بھی کھول سکتی ہیں، جن میں صرف اعلیٰ طبقوں کے لیے تعلیم کا انتظام ہو اور یہ اس خیال سے کہ علم کا طبعی رجحان "ہبوط" ہے "صعود" نہیں اس نقطۂ نظر کے ماتحت ہمیں ہر ضلع کے مرکز میں ایک اسکول کھولنا چاہیے۔ پھر پرگنوں میں اور اُس کے بعد گاؤں میں اسکولوں کا انتظام کرنا چاہیے اور نشرِ تعلیم کے لیے بتدریج بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ وسائل اختیار کرنے چاہییں۔ لیکن اس تجویز کے خلاف پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کا مروّجہ نظام یک قلم موقوف ہو جاتا ہے، جو کہ ہماری آمد سے پہلے اس ملک میں موجود تھا اور اس وقت تک موجود ہے اور جو کہ ہماری تجاویز سے آزاد رہ کر وطنی کردار کو متشکّل و مترتّب کرنے میں مصروف ہے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود نئی تجویز کے ماتحت اسکولوں میں اُستادوں اور کتابوں کے انتظام کے لیے ملک ہمارا رہینِ منّت رہے گا اور ان خیالات کی تشکیل کے لیے ہمیں ملک کی قدیمی درسگاہوں کی معاونت اور لوگوں کی حقیقی نشوونما کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ ہمیں اس ملک میں زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں سے سابقہ پڑے گا۔ مقدم الذکر دُنیا کی قدیم ترین مہذب اقوام میں شامل ہیں اور موخرالذکر اپنی تاریخ کے روشن ترین ابواب میں گوناگوں علوم کے جاں دادہ اور حامی رہے ہیں۔ ابتذالِ ذہنی کی ان پست منازل میں بھی ان دونوں قوموں میں علم و ہنر کا حقیقی ذوق پایا جاتا ہے اور جس کی نشوونما کی ذمّے دار یہی درسگاہیں ہیں۔ جن کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے اور جن کو پسِ پشت ڈالنا انتہا درجے کی عاقبت نااندیشی ہوگی۔"

اس کے بعد مسٹر آدم نے لکھا ہے کہ "عمارت کو بلند اور مضبوط بنانے کے لیے بنیاد وسیع اور عمیق ہونی چاہیے۔ چنانچہ تعمیرات کا آغاز بنیاد ہی سے کرتے ہُوئے ہر قسم کی درسگاہوں اور ہر طریقِ تعلیم کو ملا کر ایک موزوں اور مناسب طریقہ پیدا کرنا چاہیے۔"

بدقسمتی سے کمیٹی نے لارڈ میکالے کی صدارت میں مسٹر آدم کی تجاویز کو پسِ پشت ڈال دیا۔ ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۴ء تک اس قسم کے ملکی اسکول جاری کرنے کی بارہا کوشش کی گئی لیکن سب بے اثر ثابت ہوئی۔ کیونکہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے دیہاتی اسکولوں میں بھی مطالبہ کیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۴ء میں کمپنی بہادر کو ایک نیا چارٹر دیا گیا اور بورڈ آف ڈائرکٹرز نے ایک تعلیمی فرمان جاری کیا جس کے ذریعے یونیورسٹیوں کے نظام کی بنیاد پریزیڈنسی شہروں میں رکھی گئی۔ ۱۸۵۷ء میں غدر شروع ہو گیا اور ۱۸۵۴ء تک جو ترقی ہوئی تھی اس کا جائزہ ۱۸۵۹ء میں لیا گیا اور اس کے بعد عطیات حاصل کرنے کی رسم کو بند

کردیا گیا اور امدادی رقم کی اسکیم کو ناقابلِ عمل سمجھا گیا اور حکومت کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ وہ زمین پر متعین ٹیکس لگا کر اُن اسکولوں کے اخراجات کو برداشت کرے، جو دیہاتی آبادی کے لیے جاری کیے جائیں۔ یہ طریق کار اُن اداروں کے لیے پیغامِ موت ثابت ہوا جو کہ لوگوں کی امداد اور عطیوں سے چل رہے تھے۔

صوبۂ مدراس میں بھی اسی قسم کی تحقیق کی گئی۔ مسٹر ٹامس منرو (Thomas Munro) نے اپنے ۱۸۲۶ء کے بیان کے دوران میں لکھا ہے کہ "اٹھارویں صدی میں جنگ و جدل اور دیگر اسباب کی وجہ سے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا پرانا نظامِ تعلیم درہم برہم ہو گیا۔"

اُس نے ان نقائص کے ازالے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت ملک کے طول و عرض میں نئے مدارس کا افتتاح کرے۔ ایک کمیٹی عوام کی تعلیم کے لیے مقرر کی گئی، جس نے لوگوں کی ہمدردی اور معاونت حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ چنانچہ اسٹاف کے تقرر کا معاملہ شہر کے مقتدر اصحاب کی رائے پر چھوڑ دیا۔ لیکن سر ٹامس منرو کی اس پالیسی کو بعد میں ترک کر دیا گیا اور کمیٹی بھی توڑ دی گئی اور ایک یونیورسٹی بورڈ مقرر کر دیا۔ جن کا یہ خیال تھا کہ "سورج کی شعاعیں پہلے پہاڑ کی چوٹیوں کو روشن کرتی ہیں اور پستی تک بعد میں پہنچتی ہیں۔"

دوسرے صوبوں میں بھی کئی بار اسی قسم کی کوشش کی گئی۔ جہاں صوبجات متوسط کا تعلق ہے، نربدا اور سوگر کے اضلاع میں چند اسکول موجود تھے۔ "ہندوستانی تعلیمی کمیشن" نے صوبجاتِ متوسط کے متعلق یہ لکھا ہے کہ ۱۸۶۱ء سے پہلے سوگر اور نربدا کے علاقوں میں حکومت کی طرف سے ایک ایسا نظامِ تعلیم موجود تھا، جو کہ صوبجات متحدہ کے نظامِ تعلیم

کا ایک نامکمل خاکہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت ناگپور کے اضلاع میں حکومت کی طرف سے کوئی نظام تعلیم رائج نہ تھا۔ سمبل پور اور اس کے مضافات میں عوام کی تعلیم کے لیے چند اسکول موجود تھے۔ سر رچرڈ ٹمپل (Sir Richard Temple) نے لکھا ہے۔ "لوگ بالکل ناخواندہ تھے۔ برطانوی ہند کے کسی علاقے میں بھی اس قدر جاہل آبادی دیکھنے میں نہ آتی تھی۔ پچاس گاؤں کے لیے ایک بھی مقامی اسکول موجود نہ تھا۔"

۱۸۱۷ء سے ۱۸۵۶ء تک حکومت نے سوائے دو عدد اسکول کھولنے کے اور کوئی کام نہ کیا۔ ان میں سے ایک اسکول ۱۸۴۱ء میں بند کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت کے آغاز سے پہلے ہمارے صوبے میں تعلیم کی یہ حالت تھی۔

۱۸۳۶ء میں ۸ء۵ فیصدی آبادی خواندہ پائی گئی۔ ۱۹۳۱ء میں ۸ فیصدی تک پہنچ گئی۔ گویا سو سالوں میں معمولی نوشت و خواند نے ۲ء۲ فیصدی ترقی کی۔ گزشتہ تیس سالوں میں ہمارے صوبے میں صرف ایک فیصدی ترقی ہوئی ہے۔

یہ افسوس ناک صورتِ حالات زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہنی چاہیے۔ ذہنی اور قومی انقلاب کو بروئے کار لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک معین وقت میں لوگوں کو سو فیصدی تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ناخواندہ آبادی ہر طرزِ حکومت کے لیے خطرناک ہے اور جمہوری نظام کے لیے اور بھی زیادہ۔ دنیا کے تمام ماہرینِ تعلیم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عوام کے لیے جبری اور مفت تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ جب کہ جنگِ یورپ جاری تھا، تو اُس وقت رائٹ آنریبل فشر (Right Hon'ble Fisher) نے انگلستان کے ایوانِ عام میں یہ قرار داد پیش کی کہ ابتدائی تعلیم کے لیے مزید رقم منظور کی جائے۔ اُس نے اپنے مطالبے کی تائید میں ایک

ہنگامہ خیز تقریر کی جس میں بیان کیا کہ تعلیم پر روپیہ خرچ کرنا ایک عظیم الشان قومی مفاد ہے، جس کو حکومتِ برطانیہ اس نازک وقت میں بھی فراموش نہیں کر سکتی۔

صوبجاتِ متوسط اور برار کے ڈائرکٹر نے عوام کی تعلیم کے مسئلے پر ۱۹۳۶ء میں ایک نوٹ لکھا جس میں درج ہے۔ "ہر ترقی یافتہ قوم کی تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ملک کے سیاسی اور سماجی ارتقا کی کنجی عوام کا تعلیم یافتہ ہونا ہے۔ ہندوستان کی ترقی کا دارومدار زیادہ تر عوام کی تعلیم پر ہے۔ اب اصلاح کو زیادہ دیر تک ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اسی پر آئندہ ہندوستان کی قسمت کا انحصار ہے۔"

آرتھر میہو (Arthur Mayhew) جو کہ متقدمین میں ایک ممتاز شہ نشین پر متمکن ہیں، اپنی مشہور کتاب "تعلیم ہند" میں رقم طراز ہیں۔ "اگر تعلیم کو اسی رفتار سے جاری رکھا جائے، تو کم از کم دو صدیوں میں ہندوستان کی تعلیمی حالت اس درجے تک پہنچے گی جو کہ اس وقت انگلستان اور ویلز میں ہے۔"

یہ بالکل سچ ہے کہ ہم اب اور زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ اس لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور سوچنا چاہیے۔

صوبائی حالت

موجودہ حالت حسب ذیل ہے:۔

(۱) صوبجاتِ متوسط و برار کی آبادی ۱۵۵۶۷۷۲۳ ہے۔

(۲) دیہات کی تعداد صوبے میں ۳۹۷۶۲ ہے۔

(۳) وہ دیہات جن میں اسکول موجود ہیں، ۴۷۴۶ ہیں۔

(۴) اُن دیہات کی تعداد جن سے طلبہ ان اسکولوں میں حاضر ہوتے ہیں ۲۵۲۵۴ ہیں۔

اب ہم اپنے صوبے کی مالیات کا اندازہ لگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا ہم صرف اسی ذریعے سے تعلیمی مصارف کے کفیل ہو سکتے ہیں ۱۹۳۶-۳۷ء کے بجٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم پر کل ۵۲۸۱۰۰۰ روپے خرچ ہوئے۔ اس خرچ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے وہ حصّہ جس کا تعین ہمارے نمائندے نہ کر سکیں۔ اس کی تعداد ۲۷۷۹۷ روپے ہے۔ دوسرے وہ حصّہ جس کا تعین نمائندوں کے ذریعے ہو سکے۔ اس کی تعداد ۵۰۰۲۵۲۱ روپے ہے۔ ابتدائی تعلیم پر ۱۹۳۶-۳۷ء میں کل ۳۶۹۶۲۱۷ روپے خرچ ہوئے۔ اس حساب سے دس روپے آٹھ آنے فی کس خرچ ہوئے۔ آبادی کے لحاظ سے اُن لڑکے اور لڑکیوں کا اوسط جو کہ ۶ اور ۱۱ سال کے درمیان ہیں ۱۰۹ ہے۔ لیکن اُن لڑکے اور لڑکیوں کا اوسط جن کو اس عمر میں تعلیم حاصل کرنی چاہیے، ۱۵ فیصدی ہے۔

اس لحاظ سے کل ۲۲۴۹۶۲۷ روپے خرچ ہونگے۔ صوبے کی مالیات سے ان عظیم اخراجات کی کفالت قطعاً ناقابلِ تصوّر ہے، بلکہ اس کا نصف حصّہ بھی مہیّا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر صوبائی مالیات سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، تو ہمارا یہ فرض ہے کہ اس کے لیے ہم کوئی اور چارۂ کار سوچیں محض عوام اور حکومت کے اشتراکِ عمل ہی سے بظاہر غیر ممکن کام ممکن ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ودیا مندر اسکیم ہے۔

کانگریس پارٹی منعقدہ ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء نے ایک سب کمیٹی مقرر کی، جس کے صدر آنریبل وزیرِ تعلیم ہیں۔ کمیٹی کا پہلا اجلاس ۳۱ اگست ۱۹۳۷ء کو ودیا مندر اسکیم کی پُر زور تائید کی گئی۔ آنریبل وزیرِ تعلیم نے عوام کی آراء اور خیالات معلوم کرنے کے لیے

اس کا ایک اجمالی خاکہ شائع کیا۔ ذیل میں ضمیمہ (ل) نقل کیا جاتا ہے۔

مفت جبری ابتدائی تعلیم کی اسکیم

صوبجاتِ متوسط و برار کی آبادی ۲۳۲۷۰۵۵۱۵ ہے۔ ان میں سے ۲ر ۶ فیصدی آبادی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ کل آبادی کا ۶ر۱۲ فیصدی حصہ جن کی عمر ۶ اور ۱۰ سال کے درمیان ہے، اسکول میں داخل نہیں۔ لیکن جسے ابتدائی تعلیم حاصل کرنا چاہیے تھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سو میں سے صرف اکیس بچے اسکول میں داخل ہیں۔ تعلیم پر جو خرچ کیا جاتا ہے، وہ ذیل میں درج ہے:۔

حکومت کی طرف سے -------	۱۳۳۱۸۰۳	روپے
لوکل باڈی کی طرف سے ------	۱۹۰۵۹۸۹	روپے
فیس سے آمدنی --------	۳۶۱۲۱۸	
میزان	۳۶۷۹۰۱۰	روپے

ایک طالب علم کا خرچ دس روپے پانچ آنے دو پائی ہے۔ اس میں حکومت کا حصہ تین روپے گیارہ آنے چھ پائی ہے۔ لوکل باڈی کا حصہ پانچ روپے نو آنے دو پائی ہے اور فیسوں سے ایک روپیہ چھ پائی آتا ہے۔ کل ۶ر۱۲ فیصدی آبادی کو خواندہ بنانے کا خرچ ۲۰۱۷۰۷۱ روپے ہوگا۔ اس کے علاوہ ابتدائی خرچ اس رقم سے دگنا ہوگا۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں خواندہ آبادی صرف ۸ر۵ فیصدی تھی۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ۸ فیصدی تھی، یعنی ایک صدی میں خواندگی محض ۲ر۲ فیصدی بڑھی اور آخری تیس سالوں میں محض ایک فیصدی کا اضافہ ہوا۔ یہ حالت اس طرح نہیں رہنی چاہیے۔ ذہنی اور قومی انقلاب

پیدا کرنے کے لیے سو فیصدی خواندگی کی ضرورت ہے، جس کی تکمیل معین عرصے میں ہونی چاہیے۔ صوبے کی موجودہ مالی حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، یہ ممکن نہیں کہ حکومت اس غرض کے لیے مزید روپیہ دے سکے۔ اس لیے مندرجہ ذیل اسکیم اختیار کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

(ا)

۱۔ ہر اُس گاؤں میں جہاں چالیس لڑکے اور لڑکیاں مل سکیں، ایک وِدّیا مندر جاری کیا جائے۔

۲۔ وِدّیا مندر کو ایک قطعہ زمین دیا جائے۔ جس کی آمدنی اتنی کافی ہو کہ اس سے اُستاد کو کم از کم تنخواہ مل سکے جس سے اُس کی گزر اوقات ممکن ہو۔ شروع میں چاہے اسے جبری نہ کیا جائے۔ لیکن اگر یہ کامیاب ثابت ہو جائے، تو اسے قانوناً جبری کر دیا جائے۔

۳۔ وِدّیا مندر کی ایک ٹرسٹ کمیٹی ہوگی، جس کے کارکنوں کا انتخاب حقِ رائے دہندگیِ بالغان کے مسلمہ اصولوں کے مطابق ہوگا۔

۴۔ وِدّیا مندر کا ٹرسٹ ایک رجسٹری شدہ انجمن ہوگی یا تو سوسائٹی ایکٹ کی رُو سے یا اگر ضرورت ہوئی۔ تو انڈین ٹرسٹ ایکٹ کی رُو سے رجسٹر کرایا جائیگا۔

۵۔ وِدّیا مندر کی جائدادِ منقولہ یا غیر منقولہ بورڈ آف ٹرسٹیز کے ماتحت ہوگی۔ جو کہ اس کے ٹرسٹ اور ملکیت کی نگرانی کرے گا۔

۶۔ اگر وہ امدادِ باہمی کے اصولوں کے مطابق تعلیمی انجمنیں قائم کر سکیں گے یا کم از کم مزید فنڈ سے ٹرسٹ میں اضافہ کر سکیں گے۔ تو محکمہ امدادِ باہمی سے

مشورہ لیا جائیگا۔

۷۔ ٹرسٹ کی آمدنی میں سے ایک ریزرو فنڈ قائم کیا جائے گا تاکہ اگر کسی سال قحط پڑ جائے یا غلے میں کمی ہو جائے، تو اس فنڈ سے روپیہ خرچ کیا جا سکے۔ اگر کوئی بچت نہ ہو، تو قحط کے ریزرو فنڈ سے مطلوبہ رقم لی جا سکے۔

۸۔ جو اُستاد ملازم رکھے جائیں، وہ پانچ سال تک عارضی رہیں گے۔ اگر ٹرسٹ اور محکمہ کے افسروں کو اُن کے کام سے تسلّی ہوگی، تو اُن کو مستقل کر دیا جائے گا۔ اسی اسکیم کے ماتحت ہر اُستاد کو اپنی زندگی کا بیمہ کرانا ہوگا اور زرِ بیمہ کی ادائیگی ٹرسٹ کے ذمے ہوگی۔ اُستاد اس امر کا مجاز ہوگا کہ ٹرسٹ کو بتائے کہ اُس کی موت کے بعد اُس کا زرِ بیمہ کس کو ادا کیا جائے۔ جس طرح کہ پراویڈنڈ اسکیم میں کیا جاتا ہے اور ہر شخص کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ وہ ودّیا مندر کے نام اپنی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد وقف کر سکے۔

۹۔ چند ایک معاون دستکاریاں اور گھریلو صنعتیں مثلاً کاتنا، بُننا، رسّے یا نواڑ بنانا، کھلونے بنانا وغیرہم، ان ودیا مندروں میں رائج کی جائیں۔ یہ کام ٹرسٹ کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے علاوہ طالب علموں کے لیے ایک آزادانہ ذریعہ معاش بھی ثابت ہونگے۔

(ب)

عطیات کے بجائے مالگزاری اور مزارعوں سے فصل کے وقت اُن کی زمین کے رقبے کے مطابق اس قدر غلہ وصول کیا جائے گا، جو کہ اُستاد کی گزر اوقات کے لیے کافی ہو اور اس کی وصولی پنچایت کے ذریعے ہو سکتی ہے۔

ٹرسٹ کی آمدنی کو بڑھانے کے لیے اُن مزارعوں اور مالگزاروں سے غلّہ اکٹھا کیا جائے گا۔ جن کی جائدادیں یا زمینیں ودّیا مندر کے قریب واقع ہیں اور اس سے ایک ذخیرہ قائم کیا جائے گا۔ جس کا مقصد یہ ہوگا کہ حصّے داروں کو اس میں سے غلّہ اُدھار دیا جائے اور اس کی سالانہ آمدنی کا نصف حصّہ ودّیا مندر کے تعلیمی مقاصد پر خرچ کر دیا جائے اور باقی منافع حصّے داروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ صرف ایک مشکل کے درپیش آنے کا احتمال ہے اور وہ اُس کے انتظامیہ پہلو کے متعلق ہے۔ جس کے لیے کوئی نہ کوئی اسکیم محکمہ امدادِ باہمی کو بنانا پڑے گی، بالکل اسی طرح جس طرح کہ ضلع رائے پور کی پنچایتی کوٹھیاں ہیں۔

موجودہ ایکٹ کے ماتحت فوری تکمیل

(ج)

۱۔ سب سے ضروری اقدام یہ ہوگا کہ ہر گاؤں میں جہاں کہ مدرسہ پہلے سے موجود ہو۔ ابتدائی تعلیم مفت اور جبری کر دی جائے۔ ایسے گاؤں میں لڑکیوں کے لیے بھی جبری تعلیم کا نفاذ کر دیا جائے۔ شہروں میں جہاں جہاں میونسپل کمیٹیاں ہیں۔ وہاں لڑکے اور لڑکیوں کے لیے جداگانہ یا مخلوط تعلیم کا انتظام کر دیا جائے۔

۲۔ انگریزی مڈل اسکول اور وظیفے کے امتحانات منسوخ کر دینے چاہییں۔

۳۔ میٹرک کے یازدہ سالہ نصاب کو دہ سالہ نصاب میں تبدیل کر دینا چاہیے اور اس تعلیم کے بعد ہر طالب علم کو ایک سال گاؤں میں مفت

تعلیم دینا ہوگی اور اس بلا اُجرت خدمت کے بعد اس کو میٹرک کا سارٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ وہ طالب علم جو اسکول کی دہ سالہ تعلیم کے بعد کالجوں میں داخل ہونا چاہیں۔ اُنھیں اس کی اجازت دے دینی چاہیے۔ لیکن اُنھیں بھی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک سال کے لیے بلا اُجرت بہ حیثیت اُستاد کام کرنا ہوگا۔ اُن کے کھانے اور رہائش کے اخراجات حکومت کے ذمے ہونگے۔

۴۔ نصابِ تعلیم دیہاتی اور شہری آبادی کی ضروریات کے مطابق مرتب کر کے اُسے عام فہم بنایا جائے گا اور اس پر قومیت کا رنگ بھی چڑھایا جائے گا۔ اگر اس اسکیم کو صحیح معنوں میں معرضِ عمل میں لایا جائے، تو اُمید کی جاسکتی ہے کہ ناخواندگی کا مسئلہ مستقبلِ قریب میں بطریقِ احسن حل ہو جائے گا۔

یہ اسکیم اس لیے پیش کی گئی ہے کہ پبلک کو رائے زنی اور نقطہ چینی کا موقع دیا جائے اسے حکومت کی طرف سے ایک مستقل اور ناقابلِ تغیر دستور نہ سمجھنا چاہیے۔

(باقی آئندہ)

ہربرٹ سپنسر کا نظریۂ تعلیم

از
غلام جیلانی ایم اے، گورنمنٹ کالج، لاہور

تعلیم کے لغوی معنے "جاننا" ہے۔ بظاہر کس قدر سادہ اور بے کیف لفظ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کے لغوی معنے اس کے پراسرار باطن کو وانشگاف نہیں کرتے۔ اس کی اصطلاحی ہمہ گیری اور معنوی اہمیت کو سمجھنے کے لیے پاکیزہ ذوق اور گہری نظر کی ضرورت ہے۔ حیاتِ انسانی سے تعلیم کا جو گہرا تعلق ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس لیے حکما اور مصلحین نے اس معرکۃ الآرا مسئلے پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ فلاسفۂ یونان نے اس موضوع پر بڑے طویل مقالے لکھے ہیں، جن کو پڑھ کر ہم اُس ملک کے ذوقی میلانات اور روحی مظاہرات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چنانچہ ارسطو اور افلاطون کے نظریاتِ تعلیم اُس زمانے کے مخصوص حالات کے آئینہ دار ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس قسم کے لٹریچر کی قیمت محض ہنگامی اور وقتی تھی۔ اب چونکہ وہ حالات بدل گئے ہیں، اس لیے اس کا مطالعہ کارآمد اور مفید نہیں ہو سکتا۔ نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس مہتم بالشان مسئلے کا ہر زاویۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تاکہ ہم جان سکیں کہ کس طرح دنیا کے ماہرینِ تعلیم نے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور کس طرح نظریاتِ تعلیم عہد بعہد بدلتے رہے ہیں۔ اس تدریجی ارتقا کے غائر مطالعہ ہی سے ہم تعلیم کی صحیح حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں۔

اُنیسویں صدی میں ہربرٹ سپنسر نے تعلیم کے موضوع پر گراں قدر مضامین لکھے۔ اُس کی مشہورِ عالم کتاب "تعلیم" انقلابی لٹریچر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُس کے جدید افکار اور لطیف نکات سے مستفید ہونا ہر اُستاد اور حامیِ تعلیم کا فریضۂ اولیں ہے۔ اسی تاثر کے تحت اُس کے بلند پایہ خیالات کا ایک مجمل سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہربرٹ سپنسر نے تعلیم کی نفسیاتی تحلیل کے لیے ایک نہایت ہی لطیف اور غورطلب نکتہ لکھا ہے اور اُس کی توضیح اُس نے چند برمحل اور دلچسپ مثالوں سے کی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ انسان کی عمرانی نشوونما میں لباس سے پہلے زیبائش ظہور پذیر ہوئی ہے۔ بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے، لیکن جب وہ اس کے اثبات میں مختلف مثالیں نقل کرتا ہے، تو یہ حقیقت بالکل آشکار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پہلی مثال اس نے یہ دی ہے کہ بعض غیر مہذب اور وحشی قوموں میں "گودنے" کی رسم پائی جاتی ہے۔ ان قوموں میں لباس پہننے کا رواج بالکل برائے نام ہوتا ہے۔ جسم برہنہ یا کم از کم نیم برہنہ ہوتا ہے، لیکن پھر بھی گودنے کی رسم اُن کی ذوقِ زیبائش کی غمازی کر رہی ہے۔ جن سیاحوں کو بادیہ نشین قوموں سے سابقہ پڑا ہے، وہ بتاتے ہیں کہ یہ وحشی لوگ لباس کی نسبت موتیوں، انگوٹھیوں اور دیگر زیورں کے زیادہ شائق ہوتے ہیں اور اپنے جسموں پر عجیب و غریب چیزیں باندھ کر ننگ دھڑنگ پھرتے ہیں۔ عورتیں عُریانی کی حالت میں باہر آ جا سکتی ہیں، لیکن بغیر نقش و نگار کے باہر نکلنا اُن کے نزدیک ایک گناہِ کبیرہ ہے۔

کیپٹن سپیک نے اپنے افریقی ملازموں کے متعلق ایک نہایت ہی دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ جب موسم خوشگوار ہوتا تھا اور سردی زیادہ نہ

ہوتی تھی، تو اُس کے نوکر کھالوں کے لبادے پہن کر اِدھر اُدھر مٹک مٹک کر چلتے تھے۔ لیکن جب بارش شروع ہو جاتی اور سردی زیادہ ہوتی، تو وہ لبادے اُتار کر رکھ دیتے، کیونکہ اس موسم میں وہ اپنے لباس کی نمائش نہیں کر سکتے۔

ان قدیم لوگوں کی بود و باش کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لباس زیبائش سے پیدا ہوا ہے۔ جب ہم موجودہ انسان کی تمدنی زندگی پر غور کرتے ہیں، تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ کیونکہ آجکل کے مہذب انسان بھی لباس کے معاملے میں باطن سے زیادہ ظاہر پر توجہ دیتے ہے۔

نمائشی علم

نہ صرف زمانۂ قدیم میں ہی بلکہ آجکل بھی ایسے علم کے حاصل کرنے میں بہت سا وقت ضائع کیا جاتا ہے، جو محض نمائشی ہوتا ہے اور درحقیقت عملی زندگی میں سود مند ثابت نہیں ہوتا۔

قدیم یونان کے مدرسوں میں موسیقی، شاعری، فصاحت و بلاغت اور فلسفہ (لیکن ایسا فلسفہ جسے عمل سے دُور کا تعلق بھی نہ تھا) نہایت ہی ضروری مضامین خیال کیے جاتے تھے اور انھیں کا درس دیا جاتا تھا۔ لیکن ایسے علم کو جسے عملی زندگی سے کوئی تعلق ہو، نصاب سے خارج رکھا جاتا تھا۔ لیکن آجکل ہمارے اداروں، علمی مرکزوں اور یونیورسٹیوں کا بھی عین یہی حال ہے۔ ہمارے ہاں کے فارغ التحصیل بچے جنھیں لاطینی اور یونانی زبانیں لازماً پڑھنا پڑتی ہیں۔ ان سے بعد میں کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ آخر بچے کو لاطینی اور یونانی کا علم بحیثیت ایک دوکاندار کے، بنک کے ڈائرکٹر

کے یا کلارک کے کس کام آتا ہے، لیکن ان بیکار زبانوں کو سیکھنے کے لیے بچے اپنا کتنا وقت ضائع کر دیتے ہیں اور اگر کبھی کوئی تعلیم یافتہ صاحب دورانِ گفتگو میں کسی لاطینی اقتباس کا استعمال کرتے ہیں یا کسی یونانی قصے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، تو اس سے اُن کا مقصود دراصل نمائش ہوتا ہے۔ موضوعِ گفتگو کو واضح کرنا نہیں ہوتا۔ ایسی باتوں سے اُن کا تعلیم یافتہ ظاہر ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ یہ اُن کے تعلیم زدہ ہونے پر دال ہے۔

معیاری تعلیم کی افادیت؟

اگر ہم اس بات کی تحقیق کریں کہ بچوں کو آخر معیاری علم (Classical knowledge) کس لیے دیا جاتا ہے، تو اُس کا جواب صرف یہ ہوگا کہ رائے عامہ کا یہی تقاضا ہے۔

لوگ اپنے بچوں کے ذہنوں کی تزئین اُسی طریق پر کرنا چاہتے ہیں، جس طرح لہ رائج الوقت فیشن کے مطابق اُن کو لباس پہنایا جاتا ہے۔ آرنیکو کا ہندوستانی اپنی جھونپڑی سے نکلنے سے پہلے اپنے جسم پر روغن کا لیپ کر لیتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کا کوئی فائدہ ہے، بلکہ محض اس لیے کہ اس کے بغیر اُسے لوگوں کے سامنے جاتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ عین اسی وجہ سے بچوں کو لاطینی اور یونانی پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ ان زبانوں کا کوئی حقیقی فائدہ ہے، بلکہ محض اس لیے کہ ایک پڑھے لکھے انسان کی ان زبانوں سے عدم واقفیت باعثِ عار خیال کی جاتی ہے۔

صنفِ نازک کی نمائش پرستی

یہ حقیقت صنفِ نازک کی زندگی میں اور بھی زیادہ واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔

طبقۂ اناث نے اپنی ذہنی اور جسمانی تربیت میں نمائشی عنصر کو ہمیشہ غالب رکھا ہے۔
پہلے ذاتی نمائش دونوں صنفوں میں مساویانہ درجہ رکھتی تھی۔ لیکن موجودہ زمانے میں
مردوں کے لباس میں آرام اور سہولت کا ظاہرداری سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے
اور اُن کی تعلیم میں بھی افادی پہلو کو نمائشی پہلو سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن
صنفِ نازک کی حالت اتنی حوصلہ افزا نہیں۔ زیورات کا استعمال اسی طرح جاری ہے۔
بھڑکیلے اور قیمتی لباس عورتوں کی جان ہیں۔ مشاطگی کے جملہ فنون ابھی تک اُن کی توجہ کا
مرکز ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آرام اور موزونیت سے کہیں زیادہ حسنِ ظاہر
کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عین اسی طرح عورتوں کی تعلیم میں بھی نام نہاد اوصافِ ظاہری
کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ دن کا زیادہ تر حصّہ ناچ، گانے بجانے
اور تصویر کشی میں صرف کیا جاتا ہے۔ اگر کسی خاتون سے سوال کیا جائے کہ آخر لاطینی
اور جرمن زبان پر اس قدر وقت ضائع کرنے کی کیا وجہ ہے، تو یقیناً وہ ان کی اہمیت
اور ضرورت پر ایک بلیغ تقریر کر دے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ محض اس کی لسانی
کے جوہر ہیں۔ ورنہ وُہ ان زبانوں کی محض اس لیے دلدادہ ہیں کہ ان کے بغیر کوئی عورت شائستہ اور
مہذّب نہیں سمجھی جاتی۔ یہ زبانیں اس لیے نہیں سیکھی جاتیں کہ قدما کے معیاری ادب کا مقابلہ کیا
جائے، بلکہ اس لیے کہ سوسائٹی میں جرمن اور لاطینی گیت گا کر خراجِ تحسین حاصل کیا جائے۔
تاریخ کا مطالعہ بھی محض اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ بھولے بسرے واقعات بیان کر کے لوگوں کو مرعوب
کیا جائے۔ یہ محض اس لیے کہ ان دقیانوسی باتوں کو ایک مہذّب انسان کا طغرائے امتیاز سمجھا
جاتا ہے۔ اگر یہ چیزیں یاد نہ ہوں، تو انسان کو اعلیٰ سوسائٹی کے قابل نہیں سمجھا جاتا غرض عہدِ
حاضر میں عورت جو کچھ سیکھتی ہے، وہ اس لیے نہیں کہ زندگی کامیابی سے بسر کر سکے، بلکہ اس لیے
کہ لوگ اُس کے متعلق "اچھی رائے" رکھیں۔ (باقی آئندہ)

لڑکپن

از
میرزا مقبول بیگ بدخشانی، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

طالب علم کی تربیت میں لڑکپن کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں زندگی کی عمارت اٹھائی جاتی ہے۔ اس لیے یہ نازک بھی بہت ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس سے عام طور پر ہمارے معلم کو سابقہ پڑتا ہے۔ ہمارے اینگلو ورنیکلر مدارس میں بچے اور بچیاں عموماً نو دس برس کی عمر میں داخل ہوتے ہیں۔ پانچ چھے برس وہ انھیں مدارس میں تعلیم پاتے ہیں۔ گویا دسویں یا ایف اے پاس کرتے تک ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہو جاتی ہے۔ اس عرصے میں زیادہ تر حصہ "لڑکپن" کا ہوتا ہے، اس لیے کچھ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے معلم کو "لڑکپن" کے نفسیات سے پوری پوری واقفیت ہو۔

لڑکپن ہے کیا؟

لڑکپن کے زمانے کی ٹھیک ٹھیک اور واضح تعریف کرنا آسان بات نہیں۔ سرسری طور سے ہم کہہ سکتے ہیں۔ لڑکپن کا زمانہ بچپن اور جوانی کے بیچ کا زمانہ ہوتا ہے۔ یہ وقت بڑھنے اور ترقی کرنے کا ہوتا ہے۔ اسی وقت میں لڑکا مرد اور لڑکی عورت ہونا شروع ہوتی ہے۔ زندگی کے اس عرصے کی وضاحت کرنے کے لیے کوئی خاص حدیں مقرر نہیں کی جا سکتیں۔ اس کا شروع اور اخیر وقت کے ساتھ بتدریج ہوتا رہتا ہے۔

لڑکپن کو ہم بلوغت کے تعلق سے اچھی طرح واضح کر سکتے ہیں۔ جسم کے اندر کے غدود

پیدائش کے وقت سے ہی اپنا اپنا کام کرنے لگتے ہیں لیکن لڑکپن کو پہنچتے تک ان کا کام سادہ سا ہوتا ہے تخلیقی غدودوں کا سا نہیں ہوتا۔ ان کا ابتدائی کام یہ ہوتا ہے کہ جسم اور دماغ کی نشو و نما میں مدد دیتے رہیں۔ ان کا ثانوی کام یہ ہوتا ہے کہ تخلیق کریں اور یہ کام بلوغت کی آمد پر شروع ہوتا ہے۔ بعض حالات میں یہ جلد جلد ہوتا ہے اور بعض حالات میں دیر دیر سے۔ اس تفریق کی وجوہ کئی ایک ہیں۔ ان کا تعلق جنس، نسل، آب و ہوا اور جسمانی بناوٹ سے ہے۔ غیر معمولی مثالوں سے اگر نظر ہٹالی جائے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلوغت لڑکوں میں تیرہ اور سترہ سال کے بیچ کے عرصے میں واقع ہوتی ہے اور لڑکیوں میں بارہ اور سولہ سال کے بیچ کے عرصے میں۔ جہاں تک لڑکپن کے وقت کا تعلق ہے، یہ پانچ سے آٹھ سال تک ہوتا ہے۔ اس کے متعلق مختلف لوگوں کی رائیں مختلف ہیں۔ بعض ماہر جسم کہتے ہیں کہ چھے سات سال تک ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں، اس کی مدت صرف چھے سال ہوتی ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا نسبتاً گرم ہے۔ اس لیے مغرب کے سرد ممالک کی نسبت یہ وقت یہاں ایک سال پہلے ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ جلدی شروع ہونا، گویا جلدی ختم ہونا ہے۔ اس لیے بلوغت کا دور بھی کچھ پہلے ہی واقع ہو جاتا ہے۔ بلوغت کا وقت تدریج کے ساتھ آتا رہتا ہے، ایک ساتھ مکمل نہیں ہو جاتا بعض کا خیال ہے، بلوغت دو سال کے عرصے میں پوری طرح سے تکمیل پا لیتی ہے۔

جسمانی خصوصیتیں

لڑکپن میں بچوں اور بچیوں کی جسمانی نشو و نما کے پہلو بڑے واضح اور نمایاں ہوتے ہیں یہ زمانہ بڑھنے اور ترقی کرنے کا زمانہ ہے۔ اس میں قد بھی بڑھتا ہے اور وزن بھی اور یہ

بڑھاؤ کچھ ایسا نمایاں ہوتا ہے کہ ہر ایک اس کو محسوس کرتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ضروری نہیں کہ دونوں ایک ساتھ اور ایک نسبت سے بڑھیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قد بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے، لیکن وزن آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ لڑکوں کا قد عام طور سے بائیس برس تک بڑھتا رہتا ہے، لیکن لڑکیوں کا قد بیس برس تک پہنچ کر رک جاتا ہے۔ ابتدائی سالوں میں پچھلے چند سالوں کی نسبت قد زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے۔ لڑکیوں کے قد اور وزن میں لڑکوں کی نسبت زیادہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکیوں کے جسم نسبتاً زیادہ سڈول ہوتے ہیں۔

قد اور وزن بڑھتے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ جسم کے دوسرے اعضا بھی بڑھتے ہیں، لیکن جسم کے سارے حصّے ایک ہی تناسب کے ساتھ نہیں بڑھتے۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ اس نشوونما کے سلسلے کو کسی سیدھے خط سے ظاہر کریں، تو یہ ممکن نہیں۔ سر اور مغز کے زیادہ سے زیادہ بڑھنے کا وقت بچپن ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں مغز کا وزن بالکل اتنا ہی ہوتا ہے، جتنا ایک بالغ کے مغز کا۔ بلوغت کے بعد اس میں کوئی بیشی نہیں ہوتی، لیکن بعض حصّے ایسے بھی ہیں، جو لڑکپن کے وقت میں جلد جلد بڑھنا شروع ہوتے ہیں، اس سے پہلے نہیں۔

ہڈیاں اور پٹھے لڑکپن کے زمانے میں زیادہ سے زیادہ بڑھتے ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں حرکی فعل (Motive activity) تیز تیز ہوتا ہے۔ جسم کے لمبے پٹھے بہت تیزی کے ساتھ بڑھتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ طلبہ کو اس عمر میں اسکول سے باہر کے مشاغل کے لیے زیادہ سے زیادہ موقعے بہم پہنچائے جائیں تاکہ جسموں کی ساخت اچھی ہو جائے صرف یہی نہیں کہ اس عمر میں حرکی فعل بڑھتا ہے، بلکہ حرکی قوت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر اگر تھوڑی سی بھی غفلت سے کام لیا جائے، تو جسموں کی خاطر خواہ طور سے نشوونما

نہیں ہو سکتی۔

دل کی جسامت بھی بڑھتی ہے۔ لیکن ہڈیوں اور پٹھوں کے ساتھ ساتھ ایک نسبت سے نہیں بڑھتی۔ پھیپھڑے بارہ سے سولہ برس تک تیزی کے ساتھ بڑھتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ نشوونما نسبتہً آہستہ سے ہوتی ہے۔ کسرت کا اثر اس پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے جسمانی نشوونما میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس کی وجہیں جنسی ہیں۔ لڑکپن کے وقت میں زندگی ایک معین راہ پر چلنا شروع کرتی ہے۔ سہارے کی پرانی زندگی کو چھوڑ دینے کے لیے دل میں رجحان پیدا ہوتا ہے اور نئی فعال زندگی کے لیے تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ الفت کے پرانے پیوند کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ نئے پیدا ہوتے ہیں اور مضبوط ہوتے جاتے ہیں۔ خوراک حاصل کرنا، ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا، محبت کرنا، گویا ان ساری باتوں کی مشق ہونے لگتی ہے۔ زندگی کی دلچسپیاں تبدیل ہوتی جاتی ہیں۔ بلوغت کیا آتی ہے، گویا دنیا ہی نئی ہو جاتی ہے۔ بعض جبلتیں اور رجحان پوری قوت کے ساتھ اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ان کے کھیلوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ منظم اور مربوط کیا جائے۔ تاکہ سماج کے جاری کیے ہوئے قاعدوں کے خلاف نہ جا سکیں۔ یہ کام ہمارے معلّم کا ہے۔

ذہنی اور جذباتی خصوصیتیں

جنسی احساس۔ جب لڑکپن کا وقت آتا ہے، تو جنسی جبلت بہت زیادہ سرگرم ہو جاتی ہے اور فرد کی زندگی میں جذباتی اور ذہنی مشاغل پر بہت زیادہ اثر ڈالتی ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جنسی جبلّت جب بالغ ہوتی ہے، تو بڑے بڑے

خطروں کو ہمراہ لاتی ہے۔ اس لیے بیحد ضروری ہے کہ اس موقع پر پوری پوری نگرانی اور رہنمائی کی جائے۔ والدین اور معلموں کا فرض ہے کہ جب بچے بارہ برس سے زیادہ عمر کے ہوجائیں، تو انھیں فہمیدہ طور سے جنسی تعلیم دیں تاکہ وہ اخلاقی ضرر سے محفوظ رہیں جنسیات کے متعلق لڑکوں اور لڑکیوں کا نظریہ بہت عجیب اور پُراسرار قسم کا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اگر رہنمائی ٹھیک طور سے نہ ہو، تو بہت سی گمراہیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور یہ گمراہیاں ایسی ہوتی ہیں کہ کبھی ٹھکانے پر نہیں آنے دیتیں۔ لڑکیوں کو مخصوص عارضوں کے متعلق ٹھیک ٹھیک تعلیم دینا چاہیے اور لڑکوں کو بھی جنسی تحریکات سے ایک حد تک آگہی ہونا چاہیے۔ اب یہ کام ہمارے معلم اور معلمہ کا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو خاص نظم و ضبط کا ماحول پیدا کرکے سیدھے راستے پر لگادیں اور اس صورت میں، کہ انھیں جبر اور دباؤ کا کوئی احساس بھی نہ ہو اور تربیت بھی پوری پوری ہوتی جائے۔ زندگی کا یہ دور نازک ترین دور ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت بھی اسی انداز سے ہونا چاہیے۔ اگر دماغ اور ہاتھ کے دلچسپ کام مہیا ہوجائیں۔ گھر سے باہر کے کھیل اور دوسری تفریحیں بہم پہنچ سکیں۔ باقاعدہ نیند اور حفظانِ صحت کے مطابق خوراک وغیرہ کا ٹھیک انتظام ہوجائے، تو یہ سب چیزیں سیدھے راستے پر لگانے میں بہت کارگر ثابت ہوتی ہیں۔

ذہنی حالتوں کا فرق۔ لڑکپن میں جذبات اور احساسات کی نشو و نما کچھ اتنی بےطور سی ہوتی ہے کہ ایک ہی فرد میں ردِّعمل کے وقت ہم نمایاں فرق محسوس کرتے ہیں۔ ایک وقت میں وہ ضرورت سے زیادہ مستعد نظر آتا ہے اور ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ وہ بے حد سست اور کاہل ہوجاتا ہے۔ ایک خاص موقعے پر وہ اتنے جوش اور سرگرمی کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی انتہا ہی نہیں اور اسی قسم کے کسی دوسرے موقعے پر وہ اُداس اور غمگین بھی اتنا

ہوتا ہے کہ کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ وہ انتہا درجے کی خود غرضی کرتا ہے، اسے اپنے سوائے کوئی نظر ہی نہیں پڑتا اور ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ جذبات کی رو میں اپنی خود غرضی اور اپنے مفاد کو بالکل ہی بھول دیتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس جیسا ایثار پیشہ انسان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا، تو گویا انسان ضدوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی جذباتی کیفیتوں میں بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ تضاد لڑکپن کے زمانے میں بہت ہی نمایاں ہوتا ہے۔

یہ عجیب صورتِ حال اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ لڑکے یا لڑکی کی جذباتی زندگی میں پورا پورا انضباط نہیں ہوتا۔ لڑکپن کے متعلق یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ یہ گویا بچپن ہی کی صدائے بازگشت ہے۔ فرق صرف درجے کا ہے۔ یہ صحیح تو ہے، لیکن بہت تھوڑی حد تک۔ ان میں بہت تفاوت پایا جاتا ہے۔ لڑکپن کا زمانہ بچپن کے زمانے سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے، تو ہر چیز اس کے لیے نئی ہوتی ہے اور اتنی نئی کہ اس کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ قریب قریب یہی حال لڑکپن کا بھی ہے۔ لڑکپن کے شروع میں بھی اُسے ہر چیز نئی معلوم ہوتی ہے اور یہ نیا ماحول اس کے لیے مانوس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی کی طرح محسوس کرتا ہے، جو کسی گلی میں ایک طرف کو ہو کے کھڑا ہو اور آنے جانے والوں کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھ رہی ہوں۔ گویا لڑکے اور لڑکیاں آغاز لڑکپن میں کچھ عجیب قسم کا حجاب محسوس کرتے ہیں۔ وہ ذہنی لحاظ سے بچوں کی نسبت زیادہ اونچے ہوتے ہیں اور انھیں یقین اور اعتماد بھی زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، ان کا حال بہت مختلف ہے۔ انھیں سکون نہیں ہوتا، ہر وقت مضطرب اور بے چین رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُنھیں متضاد قسم کے جذبات سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

ذہنی آزادی اور حاکمانہ اثر و نفوذ سے گریز۔ وہ بچہ جو پہلے دوسروں کے سہارے کا عادی ہوتا ہے، اب خود ایک فعال انسان کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، سہارا چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ جس بچے کی طبیعت کو زیادہ لاڈ پیار سے برباد کر دیا گیا ہو، وہ ممکن ہے اب بھی سہارا ہی پسند کرے۔ بہرحال اوسط درجے کے ماحول میں پلا ہوا بچہ آزادی کو پسند کریگا۔ بچے کے دل میں اعجوبہ پن بہت ہوتا ہے۔ یہ اعجوبہ پن اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے اور پورے زور شور کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ پہلے بچہ پوچھا کرتا تھا "یہ کیا ہے؟" اسے اگر اس سوال کا خاطر خواہ جواب مل جاتا، تو وہ مطمئن ہو جاتا تھا لیکن جب یہی بچہ لڑکپن کے دور میں قدم رکھتا ہے۔ اس کے سوال کا احساس اور زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اب اس کا سوال یہ نہیں ہوتا "یہ کیا ہے؟" اس سے وہ مطمئن نہیں ہوتا۔ اب وہ پوچھتا ہے "یہ ایسا کیوں ہے؟" اب اس کا وظیفہ "کیا؟" نہیں ہوتا، بلکہ "چون و چرا؟" ہوتا ہے۔ جنسیات بھی اس کے لیے بڑی عجیب بات ہوتی ہے۔ وہ ایک بالغ آدمی کی زندگی کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتا رہتا ہے اور نہایت کوشش سے معلومات حاصل کرتا ہے۔

اب وہ اپنی اہمیت محسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے، دوسرے بھی اس کی اہمیت محسوس کریں۔ اس کے دل کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے اس تبدیلی کے موافق گرد و پیش کی دنیا کو بھی تبدیل کر لے۔ وہ اپنے آپ کو ہر جبر اور ہر پابندی سے آزاد کر لینا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں خواہش ہوتی ہے کہ اس کا ذہن بھی آزاد ہو اور جسم بھی۔ جہاں تک ضبط و نظم کا تعلق ہے، وہ کسی حاکمانہ اقتدار کو پسند نہیں کرتا۔ ذہنی معاملات میں بھی کسی قسم کی گرفت اس کو نہیں بھاتی۔

لڑکا یا لڑکی گاہے گاہے اپنی بچپن کی باتوں کو دہرانا پسند کرتے ہیں۔ ماں باپ یا

معلم ان کے اس رویّے کو پسند نہیں کرتے۔ لڑکے اگر طبعی لذت کی خاطر بچوں کا سا انداز اختیار کرنا چاہیں، لیکن بزرگ اس کو ضبط کے کسی قاعدے کے خلاف سمجھیں، تو ایسی حالت میں ان کے ساتھ وہ سلوک روا رکھنا کسی صورت میں مناسب نہیں، جو عام طور سے بچوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ لڑکپن کی جذباتی زندگی بہت مضطرب اور بے سکون سی ہوتی ہے اس کی رہنمائی کے لیے تنبیہ کی نسبت ہمدردی زیادہ کارگر ہوتی ہے۔

تصوّر اور مشاہیر پرستی۔ بچے میں تصوّر کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے خاص کر وہ تصوّر جو اسے ہماری مادی دنیا سے اُٹھا کر خواب و خیال کی دنیا میں لے جائے، جہاں "بچوں کو اُٹھا لے جانے والے" بھوت پریت بھی بستے ہوں اور عورتوں کا سر کاٹنے والے بادشاہ بھی۔ لیکن ایک لڑکے کے تصوّر کی قوت اور زیادہ زرخیز ہوتی ہے۔ اس کے تصور کی جولانیاں اور بھی زیادہ وسیع ہوتی ہیں۔ چونکہ اس کے سامنے نئے نئے میدان اور نئی نئی فضائیں ہوتی ہیں۔ پہلے وہ پریوں کی داستانیں سن کر خوش ہوتا تھا۔ بھوت پریت کے قصے سن کر سر دھنتا تھا۔ اب یہ چیزیں اس کے لیے دلچسپی کا موجب نہیں رہتیں۔ اس کا مذاق کچھ اُونچا ہو گیا ہے۔ اب وہ ناول پسند کرتا ہے، ایسے ناول جن میں دُور دراز ملکوں کی سیاحت کا ذکر ہو۔ سمندری ڈاکوؤں کی جنگ کی تفصیل ہو اور تاریخی دلچسپیوں کا تذکرہ ہو۔ اس قسم کے ناولوں کے مشاہیر اس کی توجہ اپنی طرف لگا لیتے ہیں اور وہ اُنھیں اپنی زندگی کا معیار بنا لیتا ہے۔ یہ مقام ایسا ہے، جہاں اکثر بھول ہو جاتی ہے۔ یہ معیار اپنی صورتیں بدلتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات مسخ بھی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں نہایت ہی صحیح قسم کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سینما کی خوبصورت ایکٹرسوں اور رقص گھر کی حسین محبوباؤں کی محبت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ

بے راہ ہوئے، تو عمر بھر راہ پر آنا دشوار ہو جاتا ہے، اس لیے ایسے نازک موقعے پر لڑکوں کے ادبی مذاق کی تنظیم کرنا بے حد ضروری ہے۔

ذہنی مشغلے اور دلچسپیاں۔ جہاں تک ذہن و ادراک کی نشو و نما کا تعلق ہے یہ لڑکپن کے زمانے میں مکمل ہو جاتی ہے۔ مکمل ہو کر مختلف صورتوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایک دریا کی سی ہے جو کسی خاص مقام پر آ کر مختلف شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ بعض طبیعتیں علم و ادب کی طرف مائل ہو جاتی ہیں، بعض مصوّری اور موسیقی کی طرف۔ بعض تاریخ کو پسند کرتی ہیں، بعض سائنس کی طرف رجوع ہوتی ہیں۔ یہ شوق اور یہ رجوع اپنی پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور نشو و نما پانے لگتا ہے۔

ایسے موقعوں پر طلبہ کی توجہ زیادہ تر اشیا کے مادی پہلوؤں کی طرف ہوتی ہے۔ ان کی دلچسپیاں اپنے گرد و پیش کے انسانوں اور ان کے مشغلوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ اس بات میں محو ہوتے ہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ چیزوں کو دیکھ کر جو اثرات ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو بیان کرنے کے لیے وہ بیتاب ہو ہو جاتے ہیں۔ کوئی بات انھیں بھا جائے، تو پہروں اس کی خوبیاں بیان کرتے رہتے ہیں۔ ان کے دل میں تڑپ ہوتی ہے کہ جو دیکھتے ہیں، بتائیں۔ جو سُنتے ہیں، سنائیں۔ گویا اپنے دل کے اثرات کو دوسروں تک پہنچائیں۔ اس قسم کے اظہار کے موقعے اگر حاصل نہ ہو سکیں۔ پسند اور ناپسند کی چیزوں کے متعلق گفتگو کرنے کے اسباب اگر کھلم کھلا پیدا نہ ہو سکیں، تو وہ اپنے گرد دوستوں کا حلقہ بنا لیتے ہیں اور اس میں اپنے اثر کی باتیں بتا بتا کر دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ اس عمر میں وہ ایک معیار قائم کرنے میں بہت عجلت سے کام لیتے ہیں اس لیے سوچ بچار کے میدان میں بہت تیزی کے ساتھ بڑھے چلے آتے ہیں۔ سمجھنے لگتے ہیں کہ

وُہ بڑے بوڑھوں سے بھی زیادہ لائق ہیں۔

تعلیم و تربیت کے چند پہلو۔ لڑکپن کے زمانے میں جسم کے اعضا بہت تیز تیز بڑھتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ جسمانی تربیت کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ ایسے ایسے کھیل کھلائے جائیں، جو بہت منظم ہوں۔ لڑکے جو خاص خاص کسرتیں کرتے ہیں، ان کی پوری پوری دیکھ بھال ہونا چاہیے تاکہ اعصاب اور پٹھوں کی ٹھیک ٹھیک نشوونما ہوتی رہے۔ اگر لڑکے کسرت نہ کریں اور جسم کی نشوونما کا کوئی خیال نہ رکھیں۔ گویا یوں کہیے کہ ہم ان کے لیے اس قسم کے اسباب مہیا نہ کریں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی بھر ان کا جسم ڈھیلا ڈھالا رہیگا یا منحنی اور کمزور۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لڑکوں کو زیادہ سے زیادہ منظم کھیل کھلائے جائیں۔ اسکول سے باہر کے مشاغل کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنایا جائے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان کے جنسی رجحان کی حفاظت اور تربیت بھی ہوتی رہیگی۔ اچھے اچھے کھیل بچوں کے دلوں کو لطافت اور پاکیزگی کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔

لڑکوں کو اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے کی بھی خواہش ہوتی ہے، اس لیے منظم کھیلوں کے علاوہ کوئی بیرونی مشاغل بھی پیدا کرنے چاہییں۔ اس سلسلے میں بوائے سکاؤٹنگ بہت کارآمد مشغلہ ہے۔ بچوں کو اگر ہم کسی تاریخی یا تفریحی مقام کو دکھانے کے لیے باہر کہیں لے جائیں، تو اس سے بھی بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی سیر و تفریح خاص تعلیمی چیز ہے۔ ہمارے ہاں کے اسکولوں میں یہ بالکل مفقود ہے یا اگر کہیں ہے بھی، تو پورے طور پر منظم نہیں ہے۔ اس قسم کے مقامات ہر کہیں پائے جاتے ہیں، اس سے تعلیم کو چار چاند لگ سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ سیر و تفریح بڑے پیمانے پر کی جائے، جس میں بہت خرچ اُٹھے اور زیادہ وقت صرف ہو۔

لڑکوں میں آزادی کی روح ہوتی ہے، جو انہیں آپ ہی آپ کام کرنے پر اُکساتی ہے۔ ایسے موقعوں پر اگر انھیں اختیار دے دیا جائے کہ وہ اپنے کھیلوں کو خود منظم کریں اور نظم وضبط قائم رکھیں، تو اُن کی آزادی کے جذبے کی خاطر خواہ تربیت ہوتی رہتی ہے۔ اس قسم کے اختیار اور ذمّے داریوں کی تربیت کرنے کے لیے موقع و محل کے مطابق کئی قسم کے وسیلے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

بچوں کو اس قسم کے اختیار دینے سے ان کی سیرت کی بھی تربیت ہوتی ہے اور ذہن وفکر کی بھی۔ لڑکوں کو ایسے موقعے بہم پہنچانا چاہییں کہ وہ آپ ہی آپ مطالعہ کریں۔ کسی کے دستِ نگر نہ بنے رہیں۔ ہمارے ثانوی مدارس میں ہم دیکھتے ہیں کہ طلبہ کو دوسروں سے مدد حاصل کرنے کی کچھ عادت سی ہی ہو جاتی ہے اور بعض طلبہ تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ تعلیم کی انتہائی سند حاصل کرنے تک بھی یہ عادت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر بالکل اپاہج سے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دماغ تو وہ رکھتے ہیں، لیکن دماغ سے کام نہیں لے سکتے۔ ان کی کامیابیاں ہرگز کوئی امتیازی شان نہیں رکھتیں۔ منصوبی طریقِ تعلیم اور ڈالٹن پلین بالکل ذاتی اپج کی تحریکیں ہیں۔ آپ انھیں اختیار کریں یا نہ کریں، لیکن ان کی سپرٹ کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ ہمارا معلّم ان سے آسانی کے ساتھ استفادہ کر سکتا ہے۔ ہمارے تدریس و تعلیم کے طریقے ایسے ہونا چاہییں کہ وہ طلبہ کو زیادہ سے زیادہ فعال بنائیں۔ زندگی کے اس دور میں طلبہ خود تجربہ کرنا چاہتے ہیں، اپنے لیے آپ سوچنا چاہتے ہیں۔ بحث کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا ان کے لیے کچھ کیا کرے۔ مدرس کو چاہیے کہ طلبہ کے ان ولولوں کو کام میں لائے اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھے کہ ان کی دماغی اور جسمانی قوتیں درست سمتوں میں اپنا اپنا کام کرتی رہیں۔ طلبہ کے شخصی اظہار کے رجحان میں

کسی قسم کی روک نہیں پیدا کرنا چاہیے۔ اُنھیں بالکل آزاد بھی نہ چھوڑ دینا چاہیے۔ ایسا طریق اختیار کرنا چاہیے کہ ان کی ٹھیک طور سے رہنمائی ہوتی رہے۔

جہاں تک جنسی جبلتوں کی نشوونما کا تعلق ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مخلوط تعلیم کو جاری رکھا جائے یا نہیں۔ مغربی ممالک میں پرائمری اسکولوں میں مخلوط تعلیم جاری ہے۔ ثانوی مدارس میں بیشتر تعلیم جداگانہ ہوتی ہے۔ لڑکیوں کے اسکول الگ ہیں اور لڑکوں کے لیے الگ۔ لیکن یونیورسٹی کی جماعتوں میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم پاتی ہیں۔ ہندوستان میں صورتِ حال مختلف ہے۔ پرائمری مدارس میں تعلیم مخلوط نہیں اور اگر یہ مخلوط تعلیم کا طریقہ جاری ہو جائے، تو آگے چل کر ثانوی مدارس میں ہمیں لڑکوں اور لڑکیوں کو پھر الگ کرنا پڑتا ہے۔ بعض اس علیحدگی کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ جب لڑکے اور لڑکیاں جوان ہو رہے ہوں اور جنسی میلان نشوونما پا رہے ہوں، تو اُنھیں ایک ساتھ نہیں رہنا چاہیے، لیکن مخلوط تعلیم کو صرف اسی دلیل سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے ایک ساتھ لکھنے پڑھنے میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا اور اس سے اخلاق سدھرتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ رہنما معقول ہوں۔ بہرحال ان کو جدا کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو الگ الگ نصابِ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنسی اختلاف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اُن کا تعلیم کا نصاب جُدا ہو اور ہمیں یہ بات بھی تو نظر کے سامنے رکھنا ہے کہ انھیں اپنی زندگی میں الگ الگ فرض انجام دینا ہیں۔

بچپن کا زمانہ ختم ہو اور لڑکپن شروع ہو جائے، تو طلبہ کے لیے ایسی آسانیاں بہم پہنچانا چاہییں کہ وہ اپنے قوائے ذہنی کو اپنی ضرورتوں کے موافق علم حاصل کرنے پر مرکوز کر سکیں۔ لڑکوں کو اسکولوں میں خاص خاص کاموں کے لیے تیار کرانا چاہیے۔ خواہ

اس لیے کہ دنیا کو ان کاموں کی ضرورت ہے، خواہ اس لیے کہ یہ کام طلبہ کے ذوق و وجدان کے مطابق ہیں۔ ہمیں اس بات کی پوری پوری کوشش کرنا چاہیے کہ ملک کے رہنے والے تمدّنی یک جہتی سے روشناس ہو جائیں، ملک کے رہنے والے نہیں، بلکہ ساری دنیا کے رہنے والے۔

تعلیم اس ڈھب کی ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ طلبہ تنگ نظر اور متعصب ہو جائیں۔ سارے طلبہ کا پس منظر ایک ہی قسم کا مہیّا کرنا چاہیے کہ اس میں تمام شریک ہو سکیں اور یہ پس منظر ایسا ہونا چاہیے کہ ایک کاریگر، ایک وکیل، ایک طبیب اور ایک ملّاح، ایک تاجر اور ایک کسان کے درمیان سلسلے اور ربط کا کام دے سکے۔ ہمارے معلّم کو چاہیے کہ لڑکوں کا نکتۂ نظر وسیع کر دے۔ انھیں اچھا مفکّر، اچھا تاجر بھی بنائے اور ساتھ ساتھ انھیں اچھا انسان بھی بنائے۔

ڈالٹن پلین
تجویز تعلیم انفرادی

از

محمد عبد الغفور خاں خلیق بسوی، ادیب فاضل، منشی فاضل

(گزشتہ سے پیوستہ)

جیساکہ پہلے مذکور ہوا افعالِ انسانی کے اصنافِ ثلاثہ یعنی افعالِ ارادی[1]، اضطراری[2] اور قسری[3] نظامِ عصبی کے زیرِ حکم بلحاظ اپنے طریقِ صدور مختلف النوع ہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں کہ ان ہر سہ اصناف کے درمیان کوئی مستقل اور ناقابلِ عبور حدِ فاصل حائل ہے، بلکہ دو ایک افعالِ قسر کے سوا جو لازمۂ حیات ہیں، مثلاً حرکتِ قلب وغیرہ تمام افعالِ انسانی اپنی فطرت کے لحاظ سے متحد النوع ہیں اور ہر فعل کے لیے ممکن ہے کہ وہ مشق کے ذریعے سے ٹھیک اسی طرح ایک طبقے سے نکل کر دوسرے طبقے میں داخل ہو جائے۔ جیسے علم الطبیعیات میں ٹھوس، مائع اور گیس تبدیلِ حالت کر لیتے ہیں۔ اسی قوت اور اسی استعداد کا نام عادت ہے۔

افعالِ مختلف النوع کو متحد النوع بنا دینے والی اس استعداد کی کارفرمائیوں کی توضیح کے لیے اپنی روزمرہ کی زندگی سے بہت سی مثالیں موجود پاتے ہیں اور اگر غور کریں تو ان کے ذریعے بہترین و مفید قابلِ عمل اصول اخذ کر سکتے ہیں اور انھیں استعمال میں لا کر وقت و قوت کی بچت کے ساتھ کامیابی کو یقینی بنا سکتے ہیں مجلسی حفاظت اور قیامِ ہیئتِ اجتماعی

کے فرائض بسہولت انجام دے سکتے ہیں۔

مثال ۱۔ ایک تعلیمیافتہ شخص اوسطاً ہزاروں الفاظ پڑھتا اور ہزاروں ہی لکھتا ہے، مگر خیال کرو کہ یہ ایک مرکب فعلِ عادی کتنے مفرد افعالِ ارادی کا مجموعہ ہے۔ کتاب کا کھولنا، صفحات کا الٹنا۔ ہر صفحے کا ایک ایک لفظ اور ہر لفظ کا ایک ایک حرف شناخت کرنا۔ پڑھنا اور پھر ہر حرف کو دوسرے لفظ سے ربط دینا۔ ساتھ ہی اُن کے معانی کی طرف ذہن منتقل کرنا، یہ سب پڑھنے کے مراتب ہیں اور لکھنے میں قلم کا اُٹھانا ایک خاص وضع پر اُسے ہاتھ میں تھامے رہنا۔ الفاظ نیز حروف کے درمیان تناسب کتابت کا قائم رکھنا خط کی صفائی کا خیال رکھنا وغیرہ متعدد مراحل کا اضافہ ہوتا ہے۔ یاد کرو کہ انھیں دقتوں کی وجہ سے بچپن میں جب ہم ہجّے لگا کر پڑھنا سیکھتے تھے۔ اس وقت ایک لفظ کے پڑھنے میں کتنی مشقت کرنی پڑتی اور لکھنے میں تو اس سے کہیں زیادہ محنتِ شاقّہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا، مگر اب صرف عادت کی بنا پر پڑھتے لکھتے وقت ہم عموماً حروف و الفاظ کی جانب مطلق توجہ نہیں کرتے، بلکہ وہ از خود صحت کے ساتھ نکلتے چلے جاتے ہیں اور نہ ہم پڑھنے سے جلد تھکتے ہیں۔

مثال ۲۔ روزمرّہ کی عام گفتگو میں ہم کسی قسم کی خستگی اور آورد محسوس نہیں کرتے اور نہ سوچ سوچ کر الفاظ تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم وہی ہیں، جو بچپن میں اٹک اٹک کر اور تتلا تتلا کر الفاظ زبان سے نکالا کرتے تھے اور معمولی واقعات کو بیان کرنے میں کئی کئی منٹ صرف کر دیتے تھے۔

مثال ۳۔ ہم اب بھی غیر زبان میں جب گفتگو کرنا چاہتے ہیں، تو تلاش الفاظ میں وقت صرف ہوتا ہے اور تاوقتیکہ غیر معمولی مہارت حاصل نہ ہو جائے، ہم اپنی مادری زبان کی

طرح غیر زبان میں کبھی پوری صفائی، بے تکلفی اور بے ساختگی سے نہ سوچ سکتے ہیں اور نہ اظہارِ خیال ہی کر سکتے ہیں۔

مثال ۴۔ ہم بائیسکل چلانا سیکھتے ہیں، تو ہم کو سوار ہونے، ہینڈل پکڑنے اسے سیدھا رکھنے، پیڈل گھمانے اور موڑ پر ہینڈل کا رُخ بدلنے کے لیے خاص توجہ اور ارادے سے کام لینا پڑتا ہے، لیکن جب بار بار اسی عمل کو دہرانے سے ہفتے عشرے میں مشق بڑھ جاتی ہے، تو ہم بغیر کسی خاص توجہ اور قوتِ ارادی صرف کیے باتیں کرتے یا کچھ سوچتے چلے جاتے ہیں اور ہمارے پاؤں یا ہاتھ اپنے اپنے وقت پر پیڈل گھماتے یا ہینڈل گھماتے رہتے ہیں۔

مثال ۵۔ ایک جولاہا اپنی کارگاہ میں بیٹھا بڑے اطمینان کے ساتھ نال پھینکتا پکڑتا، ہتھی کھینچتا اور پاؤں کے اشاروں سے تانے کے تاروں کو باقاعدہ اوپر نیچے کرتا جاتا ہے اور ہم سے بلا تکلف باتیں بھی کرتا رہتا ہے۔ بہ خلاف ازیں اگر یہی کام سمجھ لینے کے بعد بھی ہمیں کرنا پڑے، تو دوسرے سے باتیں کرنا تو کجا ہم پہلا نال پھینکنے کے بعد ہی باوجود تمام توجہ و قوتِ ارادی کے تانی اُلجھا بیٹھیں گے اور جولاہے کے مقابلے میں دس گنا وقت صرف کرنے پر بھی دو تاریں باقاعدہ نہ ملا سکیں گے۔ آخر کیوں؟ اسی لیے کہ ہم اس کے عادی نہیں۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم اپنی روزانہ زندگی میں بہت سے افعال کو محض عادت کی بنا پر بلا تکلف انجام دیتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اکتسابِ عوائد کی استعداد ہم میں نہ ہوتی، تو ہر ادنیٰ سے ادنیٰ فعل کے لیے از سرِ نو ارادے و توجہ کی ضرورت ہوتی، تجربہ و مہارت بے معنی الفاظ ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہم بہت جلد خستہ ہو جاتے

بہت سے ضروری کام ادھورے اور نامتمام رہ جاتے اور ان افعال کے لیے ہمارے پاس نہ توقت ہی رہتی اور نہ ہی وقت ملتا، جن میں ارادے کا صرف کرنا ضروری ہے، مثلاً غور و فکر۔

اس لیے ہم کو چاہیے کہ جن افعال کو ہم نیک و مفید خیال کرتے ہیں، اُن کی جلد سے جلد اور جس طرح بھی ممکن ہو، عادت ڈال لیں اور جن افعال کو ہم بُرا و غیر مفید تصوّر کرتے ہیں، اُنھیں پہلی فرصت میں بالقصد طبیعت پر جبر کر کے ترک کر دیں۔

نظامِ عصبی کو جس میں ہمارا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا دشمن بننے کی قابلیت موجود ہے، اسے اپنا دوست بنا لیں۔ اُس سے صلح کر لیں۔ خواہ صلح کی شرائط کیسی ہی سخت کیوں نہ ہوں اور اُس کی اعانت سے ان عادات کو راسخ کر لیں۔ ان افعال کو اپنے میں خوب گہرے طور پر منقش کر لیں، جو ہمارے لیے مفید ہیں۔ لیکن یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اگر وہی آگ جو ہمیں گرم رکھتی ہے۔ جو ہمارا کھانا پکاتی، ہماری مشینوں اور انجنوں کو چلاتی ہے، کہیں بے جگہ رکھ دی جاتی ہے، تو وہ ہماری ذرا رعایت نہیں کرتی، بلکہ چشم زدن میں ہمارے تمام مکان، مال و اسباب اور خود ہم کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ بالکل یہی حال ہمارے نظامِ عصبی کا ہے۔ وہ جس طرح ہمارے وقت اور محنت میں بے حد کفایت پیدا کر دیتا ہے، ہمارے نیک خصائل کو راسخ کر کے ہمیں اُن کی طرف سے مطمئن کر دینے والا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بری عادت اس میں جڑ پکڑ گئی ہے، تو اب وہ بھی عوائدِ حسنہ کی طرح ہمارے اختیار سے تقریباً خارج ہو گئی ہے اور اس کا مٹنا سخت دشوار ہے۔

یہاں ایک حکیمانہ لطیفہ آپ کی تفریحِ طبع کے لیے بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا۔

ایک انگریز سپاہی جونس نامی، ہندوستان کی فوج میں ایک عرصہ دراز کی ملازمت

کے بعد وطن واپس آیا اور ایک روز غسل کے قصد سے بالاخانے پر گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی نہایت جھلائی ہوئی حالت میں غسل خانے سے باہر نکل آیا۔ سامنے مسز جونس بیٹھی ہوئی تھیں، اُنھوں نے متحیر ہو کر پوچھا:۔

مسز جونس۔ کیوں خیر تو ہے؟

مسٹر جونس۔ خیر کیسی؟ غسل نہ کر سکتا تھا نہ کر سکا۔

مسز جونس۔ لیکن آخر کیوں؟ کیا پانی خوب گرم نہ تھا۔

مسٹر جونس۔ نہیں پانی ٹھیک تھا، لیکن نیچے گلی میں ایک بدمعاش اطالوی کھڑا ہوا تھا میں جب ٹب کے اندر غسل کے لیے قدم رکھتا تھا، وہ بدمعاش ہر مرتبہ ارگن پر God Save the King کا فوجی ترانہ چھیڑ دیتا تھا۔

مسز جونس۔ (حیرت انگیز لہجے میں) لیکن اس راگنی کو تمھارے غسل کرنے سے کیا تعلق

مسٹر جونس۔ (غصّے سے بے خود ہو کر) کیا تعلق؟ ارے احمق! تیری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ہر راگ کے ساتھ مجھے ہر دفعہ فوجی قواعد کے مطابق ttention. یعنی، سیدھا کھڑا ہونا پڑتا تھا۔

ایسا ہی ایک ہندوستانی دیہاتی سپاہی کا سچا واقعہ ہے کہ وہ عین جوانی کے بیس سال فوجی خدمات میں صرف کر کے پنشن پر اپنے گاؤں میں واپس آیا اور اپنے کھیتی باڑی کے کام میں مصروف ہو گیا۔ دس پندرہ سال اس حال میں گزار کر جب وہ کاشت کا سخت کام کرنے کے قابل نہ رہا، تو اُس نے اور کام تو اپنے نوجوان بیٹوں کے سپرد کر دیے، اپنے لیے گھر کا عام انتظام اور کھیت میں بیٹوں اور کمیروں کی روٹی پہنچانے کا مقرر کر لیا۔ وہ روز روٹی لے کر کبھی کسی سمت جاتا اور کبھی کسی سمت۔ ایک روز حسب

دستور بہت سی چپاتیاں اور دال قرینے سے باندھ کر ایک ہاتھ میں تھامے اور چھاچھ کا گڑوا گلاس دوسرے ہاتھ میں سنبھالے بڑے اطمینان سے جا رہا تھا، قضا کار اُس کا گزر مدرسے کے قریب سے ہوا۔ جہاں صحنِ مدرسہ میں چھوٹے منشی جی بچوں کو ڈرل کرا رہے تھے۔ بیس سالہ پیشتر کا سپاہی اپنے خیال میں مگن تھا کہ یکبارگی اُس کے کان میں منشی جی کی آواز آئی "اٹن شن" (Attention..) ۔ اب کیا تھا، بوڑھا سپاہی اس حکم کی تعمیل میں ہاتھ سیدھے چھوڑ کر ٹھیک پوزیشن میں آگیا۔ پھر وہ خود ہی اصل معاملے سے آگاہی پاکر اور چھاچھ اور دال کے برتنوں کو لڑھکتا دیکھ کر ہنسنے لگا۔

اگر بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے، تو کیا اس معمولی لطیفہ کے اندر حیاتِ نفسی کی ایک گہری حقیقت، علم النفس کا ایک اہم اصول، یعنی قانونِ تعود مُضمر نہیں ہے؟ ہے اور ضرور ہے!

اب اس تمام تفصیلِ بیان کی روشنی میں ذرا غور کیجیے اور پھر انصاف سے کہیے کہ کیا عادت کو اخلاق کے پیدا کرنے یا بگاڑنے میں دخل ہے کہ نہیں اور اگر ہے، تو کوئی معمولی دخل نہیں، بلکہ عظیم ہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ عادت کی نگرانی میں پرلے درجے کی غفلت برتی جا رہی ہے۔ لوگوں کو عادت کا کہیں شعور ہوتا بھی ہے، تو اکثر ایسے آخیر وقت میں جبکہ طبیعت مغلوبِ عادت ہو چکی ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

اشتہار

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی

تختِ طاؤس

مصنفہ

مولوی محمد عبداللطیف خان کشتہ قادری

یہ کتاب مولانا کشتہ قادری کی ہفت سالہ تحقیقی و تفتیشی مساعی کا نتیجہ ہے۔ تختِ طاؤس عہدِ مغلیہ کی زرگری، جواہر تراشی، ترصیع و خوش مذاقی کا ایک مرقع تھا اور اس کی صنعت، صنعتِ ایران و ہندوستان کا ایک دلآویز سنگم تھی۔ جس کی زیارت کے لئے دور دور کے ملکوں سے لوگ صعوباتِ سفر، ہنسی خوشی برداشت کر کے آتے اور تازگی نظر و تفریحِ قلب و تحیر کا پرشاد لے کر جاتے تھے اور یہ تبرک مدتِ دراز تک ان کو تر زبان و خوش بیان رکھتا تھا۔ کتاب ہذا اسی بے مثل تخت کے وقائع تاریخی پر مشتمل ہے۔ حقیقتاً اس تخت کے پردے میں ایشیائی دماغی لطافتوں کے سینکڑوں مرقعے چھپے ہوئے تھے۔ جن کو منظرِ عام پر لا کر مولانائے موصوف نے ملک و قوم پر ایک زبردست احسان کیا ہے اور ان کی یہ کد و کاوش قابلِ شکر گزاری ہے۔ ہمارے یہاں کی بہت کم تاریخی ایسی ہیں جن میں وسعتِ مطالعہ، غور و خوض، تحقیق، تفتیش، تنقید، علمی و منطقی استدلال و آزادہ خیالی سے کام لیا گیا ہو یا ان کے مولفین و مصنفین نے روایت و درایت کی علمی جانچ پڑتال کی ہو، اپنی طبیعت سے کسی نتیجے پر پہنچے ہوں، پیچیدہ مسائل کو تقسیم و تحلیل کرتے ہوئے کوئی انکشاف کیا ہو اور اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھا کر اس طرح ترتیب دیا ہو کہ اُن کی اصلی حالت نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مگر پیشِ نظر کتاب تاریخ "تختِ طاؤس" ان تمام اوصاف سے متصف ہے۔ قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز۔ لاہور

اشتہار

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر		۱۹	کام کی باتیں حصہ اوّل	۴ر۹ پائی
	رام سروپ کوشل	۶ر	۲۰	" " " دوم	۲ر۳ "
۲	" " دوسری " "	۷ر۴ پائی	۲۱	قصص ہند حصہ اوّل	۳ر۲ "
۳	" " تیسری " "	۹ر۹ "	۲۲	" " حصہ دوم	۲ر۸ "
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر	۲۳	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۵	" " دوم	۵ر	۲۴	حسینہ اور وحشی	۱ر۵ پائی
۶	" " سوم	۷ر	۲۵	شہزادہ مہربان	۶ر۲ "
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر	۲۶	راما سیتا	۱۰ر۱ "
۸	" " دوم	۳ر۷ پائی	۲۷	جادو کا مٹکا مسٹر لیا رام	۳ر
۹	" " سوم	۷ر	۲۸	دروپدی	۱ر۸ پائی
۱۰	امرت کہانیاں نمبر۱	۹ر۲ "	۲۹	مہاراجہ رنجیت سنگھ . . .	۶ر۴ "
۱۱	" " نمبر۲	۱۰ر۳ "	۳۰	خلیفہ ہارون الرشید . .	۴ر
۱۲	" " نمبر۳	۲ر۵ "	۳۱	راجہ اشوک	۵ر
۱۳	انوار سہیل کے انمول موتی		۳۲	مہارانا پرتاپ	۲ر۱ پائی
	" " حصہ ۱ " "	۸ر۲ "	۳۳	شہاب الدین شاہجہان	۱۰ر۲ "
۱۴	" " حصہ ۲ " "	۱۰ر۴ "	۳۴	شیر شاہ سوری	۱۱ر۲ "
۱۵	" " حصہ ۳ " "	۲ر۵ "	۳۵	نصیر الدین ہمایوں	۱۰ر۲ "
۱۶	دلچسپ تاریخی کہانیاں		۳۶	اورنگ زیب عالمگیر . . .	۹ر۲ "
	" حصہ اوّل "	۷ر۷ "	۳۷	شہاب الدین غوری	۸ر۲ "
۱۷	" حصہ دوم "	۱۱ر۸ "	۳۸	سلطان علاؤالدین خلجی . . .	۱۱ر۲ "
۱۸	" حصہ سوم "	۷ر	۳۹	فیروز الدین تغلق	۳ر

اشتہار

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۰	نورالدین جہانگیر ۔ ۔	۲ر۳ پائی	۶۵	جوتی موتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر۱۰ پائی
۴۱	امیر تیمور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر۷ "	۶۶	جواہرات کا خزانہ ۔ ۔	۳ر۷ "
۴۲	پرتھوی راج ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر۷ "	۶۷	چھوا اور سونا ہوا (باتصویر)	۲ر
۴۳	محمود غزنوی ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر۶ "	۶۸	علی بابا چالیس چور ۔ ۔ ۔	۴ر
۴۴	مصر کی داستان ۔ ۔	۳ر	۶۹	علاؤالدین و عجیب و غریب لیمپ	۴ر۶ پائی
۴۵	جاپان کی کہانی ۔ ۔ ۔ ۔	۴ر	۷۰	ملّا دو پیازے کا سفر ۔ ۔	۳ر
۴۶	چین کی کہانی ۔ ۔ ۔ ۔	۳ر۶ پائی	۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۴۷	مستورات چین و جاپان	۴ر			
۴۸	ایران کی کہانی ۔ ۔ ۔ ۔	۳ر۶ "	۷۲	نیشاپور کا سوداگر ۔ ۔ ۔	۲ر۱۱ پائی
۴۹	ایشیائی روم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر۷ "	۷۳	پرستان کا موچی ۔ ۔ ۔	۳ر
۵۰	ٹرکی (یورپی روم) ۔ ۔ ۔	۲ر۷ "	۷۴	سندر پیاری ۔ ۔ ۔ ۔	۳ر
۵۱	لنکا ۔ ۔ ۔ ۔	۱ر۱۱ "	۷۵	چاندی کی کنجی ۔ ۔ ۔ ۔	۳ر
۵۲	بصرا و بغداد ۔ ۔ ۔ ۔	۵ر	۷۶	سلک جواہر نمبر ۱ (حکمرانی کا گُر)	۲ر۶ پائی
۵۳	یونان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر	۷۷	" " نمبر ۲ (اوج و پستی)	۱ر۶ "
۵۴	تین سوال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر۷ "	۷۸	" " نمبر ۳ (شہید الفت)	۱ر۶ "
۵۵	امرت ورشا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۳ر۱۰ "	۷۹	سلک جواہر ۔ مرد میدان	۶ ۱ "
۵۶	زمانہ سلف کے قصّے کہانیاں نمبر ۱ داؤد بادشاہ	۳ر۹ "	۸۰	" " نیک و بد	۱ر۹ "
			۸۱	" " عیب و ہنر	۱ر۴ "
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں حصّہ اوّل	۳ر۹ "	۸۲	" " جہاں گرد	۱ر۶ "
۵۸	" " حصّہ دوم	۴ر۵ "	۸۳	" " جواب باصواب	۱ر۱۰ "
۵۹	خوفناک خواب ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر	۸۴	" " سخاوت کی انتہا	۱ر۲ "
۶۰	ہیرالال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر۶ "	۸۵	" " حسن تدبیر	۱ر۶ "
۶۱	دولت کی بٹیاری ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر۱ "	۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہرت	۱ر۳ "
۶۲	سادھو کی چکی ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر	۸۷	ڈرامہ غمخوار عالم ۔ ۔ ۔ ۔	۱ر۷ "
۶۳	نیلا باز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۲ر۱۱ "	۸۸	مہاراجہ بکرماجیت اور اس کا تخت	۱ر۶ "
۶۴	بہادر شہزادہ	۲ر۱ "			

NATIONAL MOSLIM U...
مکتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دھلی

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

جلد (۶) | اگست ۱۹۳۹ء | نمبر (۵)

فہرست مضامین

۱	ایڈیٹوریل		۱
۲	مضمون نویسی بذریعہ افسانچہ	شیخ خادم محی الدین	۳
۳	ابتدائی مدارس میں خوشنویسی کی تعلیم	نذیر احمد، ایم اے	۱۲
۴	ہکلاپن	جمیل علوی، ایم اے	۲۲
۵	وِدیا مندر اسکیم	نیاز الدین احمد، بی اے	۲۷
۶	ہربرٹ سپنسر کا نظریۂ تعلیم	شیخ غلام جیلانی، ایم اے	۳۵
۷	سنٹرل ایڈوائزری بورڈ اور وارد ھا اسکیم	میرزا مقبول بیگ	۴۳
۸	پنجاب کے اسکولوں میں تعلیمی پستی اسباب اور تدارک	لالہ بشن داس، ایم اے، بی ٹی	۵۴

ایڈیٹوریل

اسکولوں اور کالجوں کے سلسلۂ تعطیلات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ہندوستان کے مختلف مذاہب کو بہت کچھ دخل ہے۔ موسم گرما کی تعطیلات کے علاوہ باقی تعطیلات کا شمار کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بادن ایسے تہواروں کے علاوہ طلبہ کو ہندو مذہب کی وجہ سے تقریباً دو ہفتے اسلام کی وجہ سے دس بارہ روز، عیسائیت کی خاطر دو ہفتے اور سکھ مذہب کی وجہ سے چار پانچ دن کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ چند ایک مقامی تعطیلات ہوتی ہیں، جن کی وجہ بھی مذہبی یا مقامی موسوم ہیں۔ سال بھر کی تعطیلات میں مشکل سے چار پانچ چھٹیاں ایسی ہونگی، جن کا تعلق کسی مذہب سے نہیں۔ مثلاً نیا سال، بیساکھی، بادشاہ کا جنم دن اور بنک بند ہونے کی تعطیل وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صدیوں سے ہمارا ملک مختلف مذاہب کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ یہاں بدھ مت، ہندو دھرم، اسلام، عیسائیت اور سکھ مذہب کو جو فروغ حاصل ہوا، شاید اس کی نظیر کسی دوسری جگہ نہ مل سکیگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زندگی کا تقریباً ہر شعبہ مذہب کے تابع رہا ہے۔ ہمارے خیالات اور جذبات میں بھی اس کا اثر نمایاں نظر آتا ہے لیکن جہاں پچھلے زمانے میں مذہب زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھا اب اور بھی کئی ایک چیزیں مثلاً سیاسیات اور اقتصادیات وغیرہم میدانِ عمل میں آگئی ہیں، جن سے ہم متاثر ہو رہے ہیں اور جن کا دخل ہماری زندگیوں میں دن بدن روبہ ترقی ہے۔

دنیا کی تاریخِ تہذیب میں جو نمایاں حصہ مذہب کا رہا ہے، اُسے کوئی ذی عقل انسان فراموش نہیں کر سکتا۔ زندگی کے نشیب و فراز میں بھٹکتے ہوئے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کو قلبی راحت صرف اسی کی وجہ سے ملتی رہی ہے اور دنیا کے بیشمار بکھرے ہوئے انسانوں کو یکجہتی کا سبق

پہلے پہل مذہب ہی نے سکھایا تھا لیکن اس کے برعکس ہمیں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ دنیا میں بہت سی خونریز لڑائیوں اور انسانیت سوز ہنگاموں کی وجہ بھی مذہبی عناد اور تعصب ہی تھے۔ یورپ میں رومن کیتھولک اور پروٹیسٹنٹوں کے درمیان جنگ و جدل، فلسطین میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے خون کی ارزانی اور حال ہی میں ہمارے اپنے بدقسمت ملک میں ہندو مسلم فسادات، سب اس کی بیّن شہادت ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب ایک دودھاری تلوار ہے، جسے استعمال کرنے میں عقل اور ہوشیاری کی بے حد ضرورت ہے۔

جہاں تک اسکولوں کی تعطیلات کا تعلق ہے، ہمارے خیال میں اس سلسلے کو وقت کی ضروریات کے موافق تھوڑا بہت تبدیل کرنا چاہیے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مذہبی تعطیلات کے علاوہ ہمارے مدرسوں میں کافی تعداد میں ایسی تعطیلات رائج ہوں، جن سے ہمارے طلبہ کے اندر یکجہتی اور قومیت کے جذبات پیدا ہوں اور چونکہ مذہبی تعطیلات پہلے ہی سے بہت تعداد میں دی جاتی ہیں، اس لیے انھیں کم کرنے کی ضرورت ہے۔ جن تعطیلات کا تعلق ہمارے مذاہب کے بڑے بڑے رہبروں اور رہنماؤں سے ہے، وہ تو ہر حال رہیں گی اور ان کا ہونا لازمی بھی ہے، لیکن ہر مذہب سے متعلق بعض چھٹیاں ایسی بھی دی جاتی ہیں، جو بہت ضروری نہیں۔ ہم تجویز کرتے ہیں کہ ان کی جگہ قومی تعطیلات رائج کی جائیں۔ ہمیں یہ سن کر بہت راحت ہوئی ہے کہ ہمارے صوبے کی حکومت مدت سے اس مسئلے پر غور و خوض کر رہی ہے اور عنقریب نئی تعطیلات کی ایک ایسی فہرست جاری کرنے والی ہے، جن کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہوگا اور جن کو ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی طلبہ مشترک طور سے منائیں گے۔ ان تعطیلات سے جو فائدے ہوں گے، ان کے ذکر کرنے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے نزدیک تو ہمارے صوبے کے لیے سب سے مبارک دن وہ ہوگا، جب اس سرزمین کے مختلف مذاہب کے طلبہ ان چھٹیوں کے دنوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھیلیں کودیں گے اور یہ محسوس کریں گے کہ ہم ایک متحدہ قوم کے افراد ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جب اس نئے طرزِ عمل نے پرانے طرزِ عمل کی جگہ لی، تو ہمیں اپنے مختلف مذاہب بھی نئے رنگ میں نظر آنے لگیں گے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

مضمون نویسی بذریعہ افسانچہ

از

شیخ خادم محی الدین، لیکچرر سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

فی زمانہ یوں تو ہر مضمون کی تعلیم میں جدید طریقوں کو دخل دیا جا رہا ہے۔ (اور ان طریقوں کا مشترک عنصرِ دلچسپی کا محرک اصول ہے)۔ لیکن ادب کے پڑھانے میں بالخصوص مختلف جدید طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً پڑھائی کے دوران میں بعض کھیلیں جماعت کے کمرے میں کھیلی جاتی ہیں، جن کے ذریعے پڑھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح لکھائی جیسے مشکل عمل کو آسان کرنے کے لیے اس کے مدارج قائم کر لیے گئے ہیں۔ مثلاً ہوا میں اُنگلی کے ذریعے لکھنا۔ پھر ریت پر لکھنا۔ اس کے بعد سلیٹ پر کھریا مٹی اور پنسل سے کاغذ پر لکھنا۔ آخر میں قلم دوات کا استعمال وغیرہ وغیرہ گویائی سکھانے کی غرض سے ننھے آدمی کی تقریریں (Littleman's Lectures) کا سلسلہ ایک منچلے مدرس کالڈویل کک نے اپنے اسکول میں جاری کیا۔ ایک بچہ کسی موضوع پر جو پہلے سے مقرر کر دیا جاتا ہے، یا فی البدیہہ تقریر کرتا ہے۔ جماعت سنتی ہے، داد دیتی ہے یا اس پر نکتہ چینی کرتی ہے۔ اسی مدرس نے مضمون نویسی کو دلچسپ بنانے کی غرض سے پہلے بچوں کو بیاض بنانے اور اس میں چیدہ نظموں کو درج کر کے رکھنے کی عادت ڈالی۔ اس کے بعد اُنھیں آزادانہ قصہ کہانی لکھنا سکھایا۔ وہ اس طرح کہ پانچ سے نو برس کی عمر کے بچوں میں تخیل کو نمایاں دیکھ کر انھیں ایک خیالی جزیرے کا حال لکھنے کی ترغیب دی۔ جزیرے کا خود ساختہ نقشہ کہانی کے ساتھ درج کرایا۔ اس جزیرے میں عجیب الخلقت لوگ بستے ہیں۔ دو ناک یا دو سر والے، ٹھنگنے

یادبو ہیکل۔ ننھے میاں یعنی حضرت مضمون نویس وہاں پہنچتے ہیں۔ جزیرے کی مخلوق کے ساتھ ان کی مڈ بھیڑ ہوتی ہے۔ مشکلات پر غالب آتے ہیں۔ پھر جزیرے کے مختلف اقسام کے پھل پھول، پودے ساتھ لاتے ہیں۔ غرض ہر لحاظ سے اپنے آپ کو ایک کامران وجود ثابت کر دکھاتے ہیں۔ اس قسم کی مضمون نویسی کو اس کا موجد الانڈ (Illond) کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ لفظ آئی لینڈ (Island) کا بگڑا ہوا ہے، جسے اُردو میں جزیرہ کہتے ہیں۔

یہ تو ہے مضمون نویسی کی وہ شق جس کا استعمال چھوٹی جماعتوں میں کیا جاتا ہے۔ اوپر کی جماعتوں مثلاً نویں، دسویں میں مختصر افسانہ نویسی یا افسانچہ نویسی کو اس کی فنی ہیئت کے بموجب مضمون نویسی کے لیے آلۂ کار بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے میٹرکولیشن کے درجے میں افسانچہ نویسی کو بعض مدارس کے نصاب میں کمپوزیشن کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ جب اس درجے کے بعض طلبہ مدرسے ہی میں، یا مدرسہ چھوڑ کر صحافت کے میدان میں کسبِ معاش کی غرض سے اُترتے ہیں، تو مشق کے ذریعے قابل افسانچہ نگار بن جاتے ہیں۔

بلا لحاظ اس امر کے کہ ہمارے مدارس کی تعلیم اُردو کے سلسلے میں بار آور افسانچہ نگاری سکھائی جا سکتی ہے یا نہیں جس سے ہمارے ملک کے لکھے پڑھے بیکاروں کی تعداد میں کمی ہو سکے۔ پہلے ہمیں افسانہ نگاری کے اصولوں پر نظر ڈالنی چاہیے۔ اس کے بعد معلّمین اُردو پہلے خود اس پر طبع آزمائی کریں۔ اس کے بعد اپنے طلبہ کو اس میدان میں لا کر مشق کرائیں۔ آج کل بازار میں قصہ کہانی کا ادب کثرت سے بک رہا ہے۔ اس میں رطب و یابس، مخرب الاخلاق، دلچسپ سبھی قسم کا مواد موجود ہے۔ مدرس کے لیے یہ ایک نادر موقع ہے کہ وہ ایک طرف تو دلچسپی کے قدرتی محرک کے ذریعے طلبہ کو افسانہ لکھنا سکھائے۔ دوسری طرف انھیں اخلاق آموز ادب سے روشناس کرے۔

اس قدر تمہید کے بعد اب ہم افسانچہ کی فنّی حیثیت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جہاں تک کہ اس کا تعلق مدارس میں افسانچہ نگاری سیکھنے سکھانے سے ہے۔

افسانچہ کسے کہتے ہیں۔

آج کل کے اُردو رسالوں میں جو افسانچے طبع ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ اس سے قطع نظر اگر کوئی قصّہ بفرضِ محال دلفریب ہو بھی تو یہ ضروری نہیں کہ اُس کا مصنف ذہین افسانہ نگار ہو۔ بسا اوقات اُس نے یہ فن مشق اور بعض اصولوں کی پیروی کے ذریعے حاصل کیا ہوتا ہے۔ ایسا مصنّف اپنے پیشے کی غرض سے اپنے خیالات کو افسانوی سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے اور افسانے کی ساخت کے قواعد کی پابندی تن دہی سے کرتا ہے۔ چنانچہ اکثر کامیاب افسانچے، اپنے مقررہ قواعد کے بموجب من گھڑت ہی ہوتے ہیں اور وہ اکثر ایک ہی طرز کے ہوتے ہیں۔ بات اتنی ہے کہ جو قصّہ دل کو لبھانے والا ہو، اس میں پلاٹ یعنی واقعات کی بندش میں جدت کو دخل دیا جاتا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے۔

افسانہ نگار کو ایک خیالی دنیا میں رہنے کی ضرورت ہے۔ ضروریاتِ فن اسی امر کی مقتضی ہیں کہ وہ اپنے ارد گرد کے واقعات کی اُلٹ پھیر افسانچہ لکھنے کی غرض سے ذہن میں کرتا رہے۔ اگر دیکھا جائے، تو اس اُدھیڑ بُن میں بھی ایک لذت ہے۔ کہانی کے لیے افراد (کیریکٹر) کی تلاش کرنا اور اُنھیں مخصوص حالات میں کھینچ تان کر پلاٹ میں داخل کرنا۔ پھر ان سے مختلف کارہائے نمایاں کا سرزد ہونا۔ یہ باتیں بجائے خود دلچسپی کا موجب ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ لکھنے والا اپنے کام میں خوب محو ہو اور اپنے ارد گرد کی اشیا، اشخاص اور واقعات کو اپنی بیاض میں درج کر کے ان پر غور کرتا ہے کہ کس طریق سے افسانچہ کے ایک مختصر سے میدان میں ان پر واقعیت کا رنگ چڑھایا جا سکتا ہے۔ اس طرزِ عمل کو مسلسل جاری رکھ کر یورپ اور امریکہ کے افسانہ نویس کتابی صورت یا

رسائل وغیرہ میں افسانے لکھ کر خوب روپیہ کماتے ہیں۔ ان لوگوں کی فیس چھ روپے سے پچیس روپے تک فی افسانچہ ہوتی ہے۔ ہر چند کہ ہمارے ہاں ورنیکلر ادب کی کساد بازاری ہے۔ تاہم اعلیٰ پائے کا ادب کسی نہ کسی صورت میں فروخت ہوتا ہی رہتا ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا نکلی۔ ہم بتانا یہ چاہتے تھے کہ افسانچہ کسے کہتے ہیں اور اس کی فنی ماہیت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صنف افسانہ یا ناول سے اس امر میں مختلف ہے کہ اختصار اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ضخامت کے لحاظ سے کوئی افسانچہ ایک ہزار سے پانچ ہزار الفاظ کے بین بین ہونا چاہیے۔ اس کے افراد کی تعداد محدود ہونی چاہیے اور قصے کے ہر فرد کو ایک مخصوص کام انجام دینا چاہیے۔ قصے کا عرصہ بھی جہاں تک ہو سکے، مختصر ہونا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر قصے کے واقعات کا سلسلہ ایک سال یا اس سے زیادہ عرصے میں طے ہونا ہو، تو انھیں ناول کی صورت میں لکھنا ہوگا نہ کہ افسانچے کی شکل میں۔ اس پر شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ اکثر افسانچوں میں ان قواعد کی پابندی نہیں کی جاتی۔ یہ درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو کوئی نام آور مصنف بالعموم قواعد کا پابند نہیں ہوتا۔ دوسرے اکثر اعلیٰ درجے کے افسانہ نویس، اچھے افسانچہ نگار نہیں ہوتے۔ اسی کے برعکس ایک بلند پایہ افسانچہ نگار (مثلاً منشی پریم چند) قابل افسانہ نویس یعنی ناول نویس نہیں ہو سکتا۔ افسانے کی طوالت کے باعث بہت سے افراد اور واقعات کو سمیٹنا آسان کام نہیں۔ افسانچے کی طوالت کا دارومدار اس کے پلاٹ اور عمل کی مقدار پر ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایک کمزور اور ڈھیلا افسانچہ زورِ بیان اور محدود الفاظ کے ذریعے کسا جا سکتا ہے۔

ایک اور عمل قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ افسانچہ اپنے آپ میں ایک مکمل وجود ہونا چاہیے۔ بیک وقت اس میں ایک واحد واقعہ مذکور ہونا چاہیے اور اگر واقعات کا سلسلہ ہو تو وہ اتنا مختصر ہونا چاہیے کہ ان کا تعلق ایک محدود فرد یا دو اشخاص یا زیادہ سے زیادہ تین اشخاص کے ساتھ ہو۔

شروع کیا جائے، اُس کے انجام کا خاص لحاظ رکھا جائے۔
تکمیل کے اصول کے علاوہ ہر افسانچے میں ایک خاص حد تک پیچیدگی کو دخل دینا
ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیا، زید کی عمر کے ساتھ دوستی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اگر فقط
رہو کہ زید نے عمر کے ساتھ اپنی دوستی کو عمر بھر نباہا، تو قصہ کہاں رہا؟ اگر قصے میں دوستی
ش کا ذکر ہو، چند مشکلات کا سامنا کرایا جائے اور یہ مشکلات واقعات کی صورت میں ایک
ے پہنچ جائیں۔ اس کے بعد ان سب کا ردِ عمل ہو یا نہ ہو، تو قصے میں دلچسپی پیدا ہو جائیگی۔
ڑھنے والا ایک اضطراب کی سی حالت میں انجام کا منتظر رہیگا اور اسے ختم کیے بغیر نہ چھوڑیگا۔
افسانچہ نویسی کی اصطلاح میں اسی عمل کو پیچیدگی کہا جاتا ہے یعنی دو افراد کے راستے
ے اٹکانا اور پھر انھیں اس الجھن میں سے نکالنا۔ منتہائے قصے کا نہایت ضروری پہلو ہوتا ہے
گے چل کر مزید روشنی ڈالی جائیگی۔

تخیل کی تربیت

افسانہ نویسی میں سب سے کٹھن کام پلاٹ مرتب کرنا ہے۔ بعض مرتبہ کسی واقعہ کو دیکھ کر،
ن سنا کر ذہن میں پلاٹ پیدا ہو جاتا ہے لیکن اگر اس قسم کا القا نہ ہو، تو قصے کا خاکہ پیدا
ہے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے ذیل میں پلاٹ کے مختلف ماخذ درج کیے جاتے ہیں۔
ں کو کام میں لانے کے لیے قوتِ متخیلہ کی تربیت ضروری ہے۔ مثلاً آپ بازار میں گاڑیوں
ئی حادثہ دیکھتے ہیں۔ اگر آپ انجنیر ہیں، تو ٹرام یا موٹر گاڑی کی ایک نئی قسم کی بریک کا تصور
لتے ہیں۔ اگر پولیس کے آدمی ہیں، تو شاید گاڑیوں کی آمد کی روک تھام کا کوئی نیا طریقہ
ہیں اور اگر آپ افسانہ نگار ہیں، تو اسی واقعہ یا سانحہ کو کسی نئے افسانوی رنگ میں پیش
نظر طریقوں پر غور کرتے ہیں۔

مشق کے ذریعے پلاٹ کے نقشے ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ تخیل کو افسانوی رنگ میں کام کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ اب ان ماخذوں پر ایک نظر ڈالیے، جو پلاٹ کا نقشہ جمانے میں کام دیتے ہیں:۔

(۱) **سرگزشت**۔ کوئی واقعہ یا اُن حالات کا بیان، جو کسی شخص پر بیتے ہوں، پلاٹ کا ایک معقول ماخذ ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی غیر ملک میں ایک آدمی کو غیر معمولی تجربہ پیش آتا ہے۔ اسی کو افسانوی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۲) **جانور**۔ ہم بعض جانوروں کا حال قصّوں میں پڑھتے ہیں۔ مثلاً کتّا اور اس کی وفاداری، گھوڑے کی بہادری۔ جانوروں کی دانائی پر بہت سے مضامین لکھے گئے ہیں۔ اس موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر بچوں سے کہانیاں لکھوائی جا سکتی ہیں۔ بالخصوص ایسے قصّے جن میں کوئی جانور فردِ نمایاں ہو۔

(۳) **نگار خانے**۔ اکثر تصویریں کہانی لکھنے کے لیے محرک کا کام دیتی ہیں۔ اسی طرح نگار خانے میں عجیب عجیب لوگ آتے ہیں۔ ان کا لباس، اوضاع و اطوار، طرزِ کلام وغیرہ ایک مبتصر افسانہ نویس کے لیے قصّے کا مصالحہ بہم پہنچانے کو کافی ہیں۔

(۴) **بنک**۔ بنکوں میں اکثر وارداتیں وقوع میں آتی ہیں، جو سنسنی خیز قصوں کے لیے مواد کا کام دیتی ہیں۔ مثلاً ڈکیتی، قتل و خون، آتش زدگی وغیرہ۔ فرض کرو ایک عورت گھبراہٹ کی حالت میں بنک کے کلرک سے اپنا حساب اور بقایا رقم پوچھتی ہے۔ وہ بہی کھاتہ دیکھ کر چپکے سے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر اُسے دیتا ہے، جسے پڑھ کر اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ اگر افسانوی دماغ رکھنے والا اس واقعہ کا مشاہدہ کرے، تو افسانچہ تیار ہو جانے میں دیر نہیں لگتی۔

(۵) **موٹر لاری کا سفر**۔ بعض افسانچوں کے افراد یا کہانی کا پس منظر، لاریوں کے مسافر، ان کی بات چیت اور سفر کے واقعات ہوتے ہیں۔ اگر تم سمجھ دار افسانہ نویس ہو، تو عمداً افسانہ لکھنے

کی نیت سے لاری کا سفر کرو۔ عجب عجب انسانی نمونے دکھائی دینگے۔ عجب نہیں کہ کبھی خود تمھیں کوئی رومان پیش آجائے، جس کے بل پر تم ایک چٹ پٹا افسانچہ لکھ سکو۔

(۶) **بیوپاری آدمیوں سے میل ملاپ**۔ ان آدمیوں کی زبانی، جنھوں نے کاروبار میں پڑکر خوب روپیہ کمایا، ان کی کشمکش کا حال سنو، پھر اسے قصے کی صورت میں قلمبند کرو۔

(۷) **کلب گھر**۔ یہاں بھی مبصّر کو مختلف طبائع کے لوگ ملیں گے۔ ان میں کا ہر شخص افسانچہ کے کسی خاص فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۸) **بازار کی سیر**۔ بازار میں مختلف اقسام کے لوگ ملتے ہیں۔ ان میں کسی آدمی کا غیر معمولی لباس یا فیشن توجہ کو کھینچتا ہے۔ یا فرض کرو ایک شخص گیلا کوٹ پہنے جا رہا ہے، لیکن غور سے دیکھنے پر اُسکی ٹوپی خشک معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے لبوں پر انگلیوں کو اس طرح پھیر رہا ہے، جیسے کوئی مونچھوں کو تاؤ دے۔ حالانکہ اُس کی داڑھی مونچھ صفاچٹ ہے۔ وہ جیب سے ایک ڈبیا نکال کر اُسے کھولنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن وہ نہیں کھلتی۔ چلیے، ذرا اپنے تخیل کو جنبش میں لائیے۔ یہ کون شخص ہوگا؟ کیا کرتا رہا، اور اب کیا کرنے کو ہے۔ افسانچہ کی گاڑی حرکت میں آنے لگے گی۔

(۹) **ریل کا اسٹیشن**۔ یہاں بھی وہی مضمون ہے، جو بازار کی سیر میں بیان کیا گیا۔

(۱۰) **خواب** بھی افسانچہ کے لیے مواد بہم پہنچاتے ہیں۔ جب بعض خواب ذہن میں تازہ ہوں، تو انھیں کاغذ پر فوراً لکھ لینا چاہیے۔ ورنہ وہ بھول جایا کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا ماخذوں کے علاوہ مختلف قسم کے لباس، کرکٹ یا فٹ بال کے میچ میں لوگوں کا ہجوم، ہوٹل، غیر آباد مکان، زر و جواہر، عدالت میں مقدمات کی سماعت، سنسان جنگل، اور روزمرہ کی غلطیاں و بدحواسیاں، مختلف نام، اخبارات، باغات، کتب خانے، حوالجات، گھوڑ دوڑ، کارخانے، سمندر کا ساحل، گلی کوچے، تھیٹر اور سینما، موسم، وصیت نامے، سیر، وہ غرض

افسانچہ نویسی کے لوازم کو جمع کرنے کے لیے دنیا میں بہتیرے ذرائع ہیں، بشرطیکہ چشم بینا ہو اور ہم ان سے فائدہ اٹھانا چاہیں۔

افسانہ نویس میں مضبوط قوتِ مشاہدہ اور قوتِ متخیلہ کے علاوہ یہ قابلیت ہونی ضروری ہے کہ وہ اپنے خیالات کا صاف ستھری اور سادہ زبان میں اظہار کر سکے۔ اسی کے ساتھ اسے فطرتِ انسانی کا علم ہونا چاہیے اور ساتھ ہی تخلیقی تخیل۔ آخرالذکر کی تربیت ضروری ہے۔

پلاٹ کو مرتب کرنے کے لیے سب سے ضروری چیز تخیل ہے۔ ایک مثال کے ذریعے اس کو واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرض کرو کہ کوئی امیر صاحب جائداد آدمی مر جاتا ہے لیکن اپنی جائداد کی ایک کوڑی کسی کے لیے چھوڑ نہیں جاتا۔ افسانہ نویس کے تخیل کو حرکت ہوتی ہے اور مختلف سوالات اس کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیا امیر آدمی نے اپنا روپیہ کہیں چھپا رکھا تھا؟ کہاں؟ شاید اس کے مکان میں کوئی خفیہ تہ خانہ یا الماری یا دراز ہوگی۔ شاید نہیں کہیں اس کا وصیت نامہ محفوظ رکھا ہوگا وغیرہ۔ لیکن افسانہ نویس کا ضمیر بول اٹھتا ہے "نہیں یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ تم یہ سب کچھ کہیں پڑھ چکے ہو، کوئی نئی بات پیدا کرو۔" پھر خیالات کے پہیے گھومنے لگتے ہیں۔ ہوتے ہوتے امیر آدمی کی سابقہ زندگی کا کھوج لگایا جاتا ہے اور توسنِ خیال سرپٹ دوڑتا ہوا امیر آدمی کی کسی داشتہ کے مکان پر پہنچتا ہے۔ وہاں اس کے کسی رقیب سے ملاقات ہوتی ہے اور اس کے مکان میں ایک بکس نظر آتا ہے، جس کے کسی کونے پر امیر آدمی کے نام کے ابتدائی حروف کندہ ہیں۔ اب بکس کو حاصل کر لینا اسے کھول کر دیکھنا ایک معمہ ہے۔ بکس کھلنے پر نقد و جواہرات سے لبریز پایا جاتا ہے۔ قصہ اب دو افراد کے اردگرد گھومے گا، یعنی داشتہ اور رقیب۔ مشکل کا حل قصے کی انجامی صورت ہے۔

اسی طریق سے روزمرہ کسی واقعے پر غور کرتے رہنے اور اسے پلاٹ کی صورت میں لا کر اس کا ایک خاکہ مرتب کرنے سے تخیل کی تربیت ہوتی ہے۔ اچھے پلاٹ افسانچہ کی غرض سے وہی ہوتے ہیں

بچّے کے دل میں امن اور عافیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بچّہ اپنی جان پہچان کی گلیوں میں بڑی بے پروائی اور آزادی کے ساتھ کھیلتا ہے۔ یہ بے پروائی اور آزادی حفاظت ہی کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ قدرت کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اس کے تمام کاروبار ایک قاعدے اور ایک اصول کے ماتحت چلتے ہیں۔ سائنس کا بھی یہی دعوے ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اعتقاد حفاظت ہی کی خواہش سے بنتا ہے۔ ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ہمیں غیر معمولی اور غیر متوقع حادثوں سے روز روز دوچار ہونا پڑے، اس لیے ہمیں آسانی سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، اس کے لیے قاعدہ کلیہ ایک ہے۔ بچہ کمزور ہی تو ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی ہمت بندھاتے رہیں۔ اگر اس کے سامنے کی ہر چیز ایک اٹل قانون کے ماتحت ہو، تو اس سے اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس کے دل میں کسی قسم کا کھٹکا نہیں پیدا ہوتا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے، اس کو جوکھوں کے کام کا شوق ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی غیر متوقع بات اس کی زندگی کے پہلے سال ہی میں واقع ہو جائے، تو اس سے اس کو دہشت آتی ہے۔ اگر ہو سکے، تو بچے کو خوف کا احساس نہ ہونے دیں۔ اگر وہ بیمار ہے، تو اُس کے سامنے تشویش بالکل ظاہر نہ کریں اور ایسی باتیں بھی نہ کریں، جن سے گھبراہٹ پیدا ہونے کا گمان ہو۔

اگر بچّہ وقت پر سوتا نہیں، وقت پر کھاتا نہیں یا وقت پر رفع حاجت نہیں کرتا، تو آپ ہرگز یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ اس سے آپ کو بہت تشویش ہوتی ہے۔ اس سے بچہ اپنی اہمیت کو اور بڑھالیگا۔ اس بات کا تعلق اس کی زندگی کے پہلے سال ہی سے نہیں، بلکہ آنے والے سالوں کے ساتھ بھی ہے۔ بچہ جب کچھ کھاتا ہے، تو اُسے اپنی لذت اور ضرورت کی خاطر سے کھانا چاہیے۔ آپ پر احسان کرنے کی غرض سے نہیں۔ آپ ہرگز یہ ظاہر نہ ہونے

ابتدائی مدارس میں خوشنویسی کی تعلیم

از

نذیر احمد، ایم اے، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

اس زمانے میں جبکہ ابھی مشینیں اور دیگر ایجادات، برقی و دُخانی ظہور پذیر نہیں ہوئی تھیں، انسان کے ہاتھ نے وُہ وُہ کمالات دکھائے ہیں، جو آج تک موجودہ تہذیب و شائستگی کے علمبرداروں کو محوِ حیرت واستعجاب کر رہے ہیں۔ ڈھاکے کی ململ کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں زبان زدِ عوام ہیں اور کشمیری شال، دوشالے اور ایرانی قالین تو اب تک مشینوں اور ان کے موجدوں کے لیے ایک معمّا ہیں۔

مگر جُوں جُوں مشینیں ترقی کرتی گئیں، دستی مصنوعات اور دیگر دستی کمالات زوال پذیر ہوتے گئے اور بعض قابلِ قدر ہنر تو بالکل کالعدم ہی ہو گئے اور بہت ممکن ہے کہ فنِ خوشنویسی کے انحطاط و زوال میں بھی یہی عالمگیر حقیقت کارفرما ہو۔ مگر اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ افسرانِ تعلیم خوشنویسی کی تعلیم پر زیادہ زور نہیں دیتے اور خوشنویس مدرسین کو دیگر مدرسین پر ترجیح نہیں دی جاتی۔ خوشنویسی کے متعلق عجیب عجیب نظریے پیش کیے جاتے ہیں اور بدخطی کے لیے عمدہ عمدہ جواز تراشے جاتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ خوشنویسی نکبت و افلاس لاتی ہے اور مختلف امراض کا باعث ہے۔ علم فراست التحریر کی کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھیے، اُس میں یہ لکھا ہو گا کہ خوشنویسی نویسندہ کی تہیدستی اور افلاس کا اعلان کرتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح بدخطی کے جواز میں یہ عذرِ لنگ پیش کیا جاتا ہے کہ نپولین سا فاتحِ اعظم نہایت بدخط تھا۔ کارلائل سا زبردستِ عالم ایسا بدخط تھا کہ

کہ اُسے اپنی کتابیں چھپوانے کے لیے مسودے خود ہی پڑھ کر سنانے پڑتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ دو ایک مثالیں لے کر ہم کوئی قاعدہ کلیہ منضبط نہیں کر سکتے۔ اگر چند بڑے آدمی فی الحقیقت بدخط ہوں، تو اس سے نہ تو یہ لازم آتا ہے کہ بدخطی کی وجہ سے وہ بڑے آدمی بن گئے اور نہ ہی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام بڑے آدمی بدخط ہوتے ہیں۔ اگر ایک طرف ہمیں چند جلیل القدر ہستیاں ایسی مل جاتی ہے، جو نہایت ہی برا لکھنے والی تھیں، تو دوسری طرف بہت سی عظیم الشان شخصیتیں ایسی بھی ہیں، جو باوجود اپنی فضیلت و شان کے نہایت ہی اعلیٰ درجے کے خوشنویس بھی تھے۔ قدیم یونانی تہذیب میں خوشنویسی کی بہت قدر تھی۔ قدیم روما کے علم و فضل کی یادگاروں میں خوشنویسی کے نمونے آج تک مختلف عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ اسلامی بادشاہت کے سنہری زمانے میں خوشنویسی اپنے کمال تک پہنچی۔ یاقوت جیسے خوشنویس فرمانرواؤں کے مصاحب بنے اور آج تک کاتب لوگ اپنے تئیں "یاقوت رقم" لکھنا بیحد فخر و مباہات کا باعث سمجھتے ہیں۔ معترض لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ خوشنویسی ذوقِ سلیم کو ظاہر کرتی ہے۔ صفائیِ ذہن کی علامت ہے۔ ہاتھ اور آنکھ کی عمدہ تربیت کا اظہار کرتی ہے اور یہ وہ جوہر ہے، جس کی قدر صرف فنونِ لطیفہ کے جوہری ہی جانتے ہیں۔ بابر اور ہمایوں خوشنویسی کے دلدادہ تھے اور مغل شہزادے اور شہزادیاں فرصت کے اوقات میں خوشنویسی کی مشق کیا کرتے تھے۔

ہر مضمون کی تعلیم معلّم کے ذاتی ذوق و شوق کی وجہ سے نسبتہً زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ طلبہ پر معلّم کی شخصیت کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اگر معلّم خوش الحان ہے اور اُسے قرأت سے خاص طور پر اُنس ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس کے شاگرد بھی خوش خواں قاری بن جائیں گے۔ اگر کوئی معلّم حساب کے معمے حل کرنے کا شیدائی ہے۔ تو اُس کے شاگرد بھی حساب کے چٹکلوں اور معموں کی طرف زیادہ راغب ہونگے اور اگر کوئی معلّم مطالعۂ قدرت پر فریفتہ ہے، تو اُس مدرسہ کے

طلبا کے دلوں میں مطالعۂ قدرت کا شوق خود بخود پیدا ہو جائیگا بعینہ اسی طرح اگر کوئی معلّم خوشنویس ہے اور خوشنویسی پر فدا ہے، تو یہ بالکل ناممکن ہے کہ اس کے شاگرد بدخط ہوں یا خوشنویسی کی طرف مائل نہ ہوں اور یہ بات تو بالکل بعید از قیاس ہے کہ ایک بدخط معلّم اپنے طلبہ کے خط کی اصلاح کر سکے۔ ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

پس طلبہ کو خوش نویس بنانے کے لیے سب سے پہلے معلّم کا خود خوش نویس ہونا ضروری ہے۔ جب معلّم ہی خود خوشنویس نہ ہوگا، تو طلبہ کے خط کی اصلاح کی سب کوششیں بالکل اکارت جائیں گی۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں بہت سی بیماریاں متعدی ہیں، یعنی ایک آدمی سے خود بخود دوسرے کو لگ جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں نہ صرف بیماریاں ہی متعدی ہیں، بلکہ صحت بھی متعدی ہے اور بہت سی عادات بھی متعدی ہیں۔ وہ شخص جو روزانہ پہلوانوں کے اکھاڑے میں جاتا ہے۔ کشتیاں دیکھتا ہے۔ آہستہ آہستہ خود بھی ورزش کا دیوانہ بن جاتا ہے اور کشتی کے ڈھب سیکھنے شروع کر دیتا ہے یا سیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح صبح اُٹھنا، سیر کرنا، سیگرٹ پینا، سینما دیکھنا اخبار بینی وغیرہ وغیرہ بے شمار عادات متعدی ہیں جس قسم کے لوگوں سے زیادہ میل جول ہوگا، ویسی ہی عادات تم میں بھی خود بخود پیدا ہو جائیں گی۔ بعینہٖ بہت سی ادبی عادات و رجحانات بھی متعدی ہیں پس جس مدرسے میں ایک خوشنویس مدرّس ہوگا، وہاں کے دیگر مدرسین بھی خوشنویسی کی طرف مائل ہو جائیں گے اور اگر طلبہ بھی خوشنویسی میں پوری پوری مہارت حاصل نہ کر سکیں گے، تو اتنا ضرور ہوگا کہ اُن میں نسبتہً زیادہ صاف، واضح اور عمدہ لکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائیگی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرسین کو خوشنویس کیسے بنایا جائے اور کیا یہ ممکن ہے کہ ابتدائی مدارس کے تقریبًا تمام مدرسین خوشنویس بن جائیں۔ ہاں، مندرجہ ذیل امور ملحوظ رکھنے سے

ابتدائی مدارس کے تقریباً تمام مدرسین خوشنویس بنائے جا سکتے ہیں۔ اول یہ کہ جب نورمل سکولوں میں جے، وی کلاس کے داخلے کا وقت آئے، تو امتحانِ داخلہ میں خوشنویسی کا بھی امتحان کیا جائے اور وہ اُمیدوار جو بدخط ہوں اور اُن کے خط کی اصلاح تعلیمی سال میں ممکن نظر نہ آتی ہو، داخل نہ کیے جائیں۔ اس طرح سے بدنویسوں کی ایک کثیر تعداد زمرۂ مدرسین میں شامل ہونے سے روک دی جائیگی اور پھر جب ایس۔ وی۔ کلاس کے داخلہ کا وقت آئے، تو صرف وہی جے، وی پاس اُس جماعت میں داخل کیے جائیں۔ جن میں علاوہ دیگر ضروری صفات کے خوشنویسی کا ملکہ بھی بدرجۂ اتم ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پرائمری، لوئر مڈل اور مڈل مدارس کے ہونے والے ہیڈ ماسٹر سب کے سب خوشنویس ہونگے اور اپنے طلبہ میں خوشنویسی کی رُوح پھونک سکیں گے اور اس بات کے قابل ہو جائیں گے کہ اپنے ماتحت مدرسین کی خوشنویسی میں رہنمائی اور نگرانی کر سکیں۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ بلیک بورڈ ڈرائنگ کی طرح خوشنویسی بھی جے، وی کلاس کے نصاب میں داخل کی جائے اور اس کی مشق گھر پر یا مدرسہ میں باقاعدہ ایک خوشنویس اُستاد یا ڈرائنگ ماسٹر کی زیر نگرانی کرائی جائے۔ جے، وی کلاس میں تختیوں پر لکھنے کو رواج دیا جائے، تاکہ ہمارے ہونے والے معلّم خود تختیوں پر لکھنے کی کافی مشق بہم پہنچا سکیں اور ابتدائی مدارس میں تختیوں پر لکھوا سکیں۔ اگر خوشنویسی بطور علٰحدہ مضمون کے داخل نصاب نہ کی جائے، تو کم از کم اتنا تو ضرور ہو کہ اُردو یا ڈرائنگ والے معلمین جے، وی کلاس کو گھر کا کام دیتے وقت ایک آدھ صفحہ خوشخطی بھی لکھ لانے کو کہیں۔ اس طرح سے بھی یہ مقصد حل ہو سکتا ہے۔

تیسری تجویز یہ ہے کہ جے وی کلاس میں تقریباً جتنے مضامین پڑھائے جاتے ہیں، اُن سب کے لیے علٰحدہ علٰحدہ کاپیاں بھی لکھوائی جائیں۔ اُن کاپیوں پر یا تو کمرۂ جماعت میں معلّم مختصر اشارات لکھوا دیتے ہیں یا طریقِ تفویض کے ماتحت طلبہ کو کچھ سوالات دے دیے جاتے ہیں

اور وہ گھر پر اُن کے جوابات تیار کرلاتے ہیں۔ غرضیکہ جے۔وی کلاس میں تحریری کام کافی ہوتا ہے۔ اگر یہ کام طلبہ احتیاط سے کریں اور سالانہ امتحان کے موقع پر طلبہ کی کاپیوں کا بھی معائنہ کیا جائے اس کے کچھ نمبر مقرر کردیے جائیں، جو مشقی اسباق وغیرہ کسی عملی امتحان میں شامل کیے جائیں، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جے۔وی کلاس کی مدّتِ تعلیم میں ایک معمولی لکھنے والا طالب علم اتنی استعداد بہم پہنچا سکیگا کہ ابتدائی مدارس میں جاکر وہاں خوشنویسی سکھا سکے۔

چوتھی تجویز جو مدرسین کو خوشنویسی کی طرف زیادہ متوجہ کردے گی، یہ ہے کہ افسرانِ تعلیم خوشنویسی کی طرف مائل ہوں۔ خود اگر خوشنویس نہ ہوں، تو کم از کم سیدھی سطروں میں صاف صاف لکھنے کی اہلیت ضرور رکھتے ہوں۔ افسرانِ تعلیم سے میری مراد یہاں ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحبان اور اُن کے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحبان سے ہے۔ کیونکہ انھیں حضرات کا مدرسین پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ دیہاتی پرائمری مدارس کے اُستاد اور خصوصاً دُور افتادہ اضلاع کے مدرسین ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشنز، اسسٹنٹ ڈائرکٹر یا انسپکٹر آو سکولز کو عمر بھر بالمواجہ دیکھنے سے محروم رہتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار کسی بڑے جلسے میں شمولیت کرکے ممکن ہے، وہ ایک مدرس اصحابِ متذکرہ بالا کی زیارت سے مسرت اندوز ہوجائیں یا تعلیمی کیلنڈروں پر ان حضرات کے فوٹو دیکھ لیں۔ ورنہ ہر آئے دن اُن کو اے، ڈی، آئی صاحبان اور ڈی، آئی صاحبان سے ہی سابقہ پڑتا ہے اور انھیں حضرات کی شخصیتیں مدرسین کے قلب و دماغ پر حسب الاستطاعت گہرا یا مدھم نقش قائم کرتی ہیں اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحبان بھی دُور کے مقامات پر زیادہ بار معائنے کے لیے نہیں جاسکتے۔ سال میں ایک دفعہ یا زیادہ سے زیادہ دو دفعہ دُور کے دیہاتی مدارس کا معائنہ کرآئے اور بس۔ باقی رہ گئے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحبان، انھیں مدرسین سے ہر روز واسطہ پڑتا ہے اور تعلیم کی رفتار کو اچھا یا بُرا کرنے کے لیے بہت حد تک یہی حضرات ذمّے دار ہیں۔ پس اگر یہ حضرات خود خوشنویس

ہوں اور مدرسین کی خوشنویسی میں رہنمائی اور نگرانی کر سکیں، تو تمام مدرسین کی توجہ اس فن کی طرف مبذول ہو سکتی ہے اور وہ خوشنویسی میں مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک اور مفید تجویز یہ ہے کہ مدرسین اپنے افسرِ علاقہ یا ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب سے جو خط و کتابت کرتے ہیں، وہ اچھے کاغذ پر اور حتی المقدور اچھی طرزِ تحریر میں کریں اور افسرانِ تعلیم اُن کے خوشنویسی کے مدارج کے مطابق کسی نہ کسی مدرس کی حوصلہ افزائی بھی کر دیا کریں تاکہ دوسرے ان کی مثال سے درسِ شوق حاصل کریں اور خوشنویسی کی طرف توجہ دیں۔

یہاں بطورِ جملہ معترضہ یہ اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض اے، ڈی، آئی اور ڈی، آئی صاحبان اس قدر بدخط ہوتے ہیں کہ لاگ بُک میں ان کے اُردو کے لکھے ہُوے ریمارکس دیکھ دیکھ کر طبیعت میں بے حد تکدّر پیدا ہوتا ہے اور مدرسین اُن کا دل کھول کر مذاق اُڑاتے ہیں۔ اور ایسے اشخاص بھی موجود ہیں، جو مدرسہ کی لاگ بُک (جس کے صفحات بغیر لکیروں کے ہوتے ہیں) میں سیدھی سطور میں نہیں لکھ سکتے۔ یہی وہ حضرات ہیں، جو ذوقِ خوشنویسی کو تباہ و برباد کر رہے ہیں اور جن کے ہوتے ہُوے مدرسین خوشنویسی کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہو سکتے۔

طلبہ کو خوشنویسی سکھانے کا بہترین طریقہ، جو مدت سے رائج ہے۔ اچھا نمونہ سامنے رکھ کر اس کی مشق کرنا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

گر تو مے خواہی کہ باشی خوشنویس   مے نویس و مے نویس و مے نویس

تاہم یہ مشق کرانے کے لیے بھی طلبہ کی استعداد کے مطابق کام لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ امر بہت مشکل اور حوصلہ شکن ہے کہ طالب علم جس وقت مدرسہ میں آئے۔ مدرّس اُس کے آگے خوش خطی کا ایک نمونہ رکھ دے اور کہے کہ اس کی مشق کیے جاؤ۔ لہٰذا خوش نویسی کے طریقۂ تعلیم کے مختصر سے اشارات جماعت وار نیچے درج کیے جاتے ہیں:-

جماعتِ اوّل :-

اس جماعت میں پہلے تو معمولی سادہ لکھنا سکھانا چاہیے۔ مدرّس حروف کو خوشخط تختۂ سیاہ پر لکھ دے اور طلبہ بھی چاک سے تختۂ سیاہ پر ویسے ہی حروف بنانے کی کوشش کریں۔ پھر انھیں حروف کو ریت یا مٹی سے بھری ہوئی طشتریوں میں لکھیں۔ چکنی مٹی سے حروف بنانا سیکھیں۔ مختلف دیگر اشیا مثلاً دیاسلائیاں، کوڑیاں، پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، گولیاں وغیرہ جوڑ جوڑ کر حروف کی اشکال بنائیں۔ اس طرح سے جب حروف کی اشکال خوب ذہن نشین ہو جائیں، تو موٹے قلم اور سیاہ روشنائی سے تختی پر لکھنا سیکھیں۔ مدرّس تختی کے اُوپر خود حروف لکھ دے اور طلبہ اپنا خشک قلم بار بار اُن حروف پر پھیریں اور اس طرح سے کافی مشق کر کے پھر ویسا ہی نیچے لکھنے کی کوشش کریں۔ مدرس ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی کرتا جائے اور اصلاح دیتا جائے۔ اس جماعت میں صرف ایک لکیر پر خوشنویسی کرانا چاہیے۔ پہلے مشابہ حروف کے چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر حروف کا خوش خط لکھنا سکھایا جائے۔ مثلاً مندرجۂ ذیل حروف مشابہ ہونے کی وجہ سے اکھٹے سکھائے جا سکتے ہیں :-

ا - م - ط

ب - پ - ت - ٹ - ث - ک - گ

د - ڈ - ذ - ر - ڑ - ز - ژ

ج - چ - ح - خ - ع - غ - ۶

س - ش - ص - ض - ل - ن

و - ف - ق

ہ - ی - ے

اس جماعت میں صرف اتنا بتایا جائے کہ کون کون سے حروف لکیر کے اوپر لکھے جاتے ہیں اور کون سے نیچے یا حروف کا کون سا حصّہ لکیر کے اُوپر رہنا چاہیے اور کون سا نیچے۔ مثلاً کل حروف کے دائرے لکیر کے نیچے ہونے چاہییں اور باقی حصّہ اُوپر، وغیرہ وغیرہ۔

جماعت دوم :-

اس جماعت میں پانچ لکیروں کی مدد سے خوشنویسی سکھائی جائے۔ مگر لکیریں طلبہ خود نہ کھینچیں۔ مدرس طلبہ کی قلمیں خود دیکھے اور اُن کی نسبت سے لکیریں بھی خود کھینچ دے۔ اس جماعت میں طلبہ کو حروف کی مختلف حالتوں میں اُن کی جگہیں ذہن نشین کرانی چاہییں۔ پہلے حروف کا لکھنا سکھایا جائے۔ مثلاً

ب ج س ع ی وغیرہ

پھر یہ سکھایا جائے کہ ا ب ج د وغیرہ کی مختلف شکلیں الفاظ میں کیا ہوتی ہیں اور پانچ لکیروں کے اندر ان کی جگہیں کونسی ہیں۔ مثلاً

حرف	حرف کی شکل لفظ کے شروع میں	حروف کی شکل لفظ کے درمیان میں	حروف کی شکل لفظ کے آخر میں
ب	بد بڑا	عبید	جیب
ج	جُدا	امجد	سنج
س	سدا	افسوس	شمس
ع	عمدہ	معدہ	سمیع
ی	یار	دلیر	نیکی

وغیرہ وغیرہ

حروف اور الفاظ کے ساتھ ساتھ عموماً پورے جملوں کی ایک سطر بھی خوش خط لکھوائی جائے۔ یہ جملے ایسے انتخاب کیے جائیں، جو طلبہ کو تعلیم کی طرف اور بالخصوص خوشنویسی کی طرف زیادہ راغب کریں یا کوئی اچھی عادت ان میں راسخ کرنے کا باعث ہوں۔

جماعت سوم :-

خوش نویسی پانچ لکیروں پر ہی کرائی جائے، مگر طلبہ خود لکیریں کھینچیں۔ مدرس صرف بتادے کہ لکیروں کے درمیانی فاصلے کو قلم سے کیا نسبت ہوتی ہے۔ اس جماعت کے لیے ایسے فقرات انتخاب کیے جائیں۔ جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک خاص حرف کی بار بار مشق کرانے کا باعث بھی ہوں۔ مثلاً تب سب دوست پیٹ کے بل لیٹ لیٹ کر آگے بڑھے۔ یا اچھے لڑکے اپنے وعدے کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے، وغیرہ۔ اور اس طرح سے سال بھر میں مختلف حروف کی الفاظ کے ساتھ خوب مشق ہو جائیگی۔ اسی جماعت سے کاغذ پر لکھنا بھی شروع کرانا چاہیے اور اس مطلب کے لیے کاپی سلپ کا استعمال جائز ہے۔

جماعت چہارم و پنجم :-

ان جماعتوں میں پھر ایک لکیر پر خوش نویسی کی مشق کرائی جائے اور کبھی کبھی بغیر لکیروں کے خوشخط لکھنے کی مشق کرائی جائے۔ تاکہ طلبہ کے ہاتھ اور آنکھ کی ایسی تربیت ہو جائے کہ لکیر کے سہارے کے بغیر بھی سیدھا اور درست لکھ سکیں۔ ان جماعتوں میں طلبہ کو خوشنویسی کے دیگر اصول بھی بتائے جائیں۔ مثلاً حروف کی لمبائیاں، چوڑائیاں اور دائروں کی صحت کیسے معلوم کی جا سکتی ہے، یعنی حروف کی پیمائش قلم کے قط کے ذریعے سے کیسے کی جا سکتی ہے یا سے اور ی میں ابتدائی حصے کتنے بڑے ہونے چاہییں اور ان کی درستی اور نادرستی کا معیار کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اس درجے میں طلبہ سے کاغذات پر کافی لکھایا جائے اور طلبہ میں یہ شوق پیدا کیا جائے کہ

کبھی کبھی وہ ایک یا دو پیسے کے کاغذ لے کر ان کو خود کتابی صورت میں تہ کریں اور خود ہی سی کر ایک چھوٹی سی کتاب بنا لیں اور اس کے سرورق اور اندر کا حاشیہ خود کھینچیں۔ سرورق پر کسی کہانی کا عنوان اور اپنا نام اس طرح لکھیں، جیسے کسی کتاب کے سرورق پر کتاب اور مصنف کا نام لکھا ہوتا ہے اور اندر وہ کہانی اس طرح خوشخط لکھیں کہ بالکل چھپی ہوئی کتاب معلوم ہو۔ ان کہانیوں کا لکھائی اور صفائی کے لحاظ سے انعام دیا جائے اور ایسی کہانیاں محکمانہ نمائشوں میں بھیجی جائیں اور وہاں بھی ان کے لیے انعامات مقرر کیے جائیں۔ اس طرح سے بھی طلبہ میں خوشنویسی کا شوق صفائی کی عادت اور خود اعتمادی پیدا کی جا سکتی ہے۔

کبھی کبھی ایک سنٹر کے مختلف مدارس کی مختلف جماعتوں کا خوشنویسی میں مقابلہ کرانا بھی بہت مفید ہوتا ہے۔ ایسے مقابلوں کے لیے منصف یا تو سنٹر کا ہیڈ ماسٹر ہو یا علاقہ کا اے، ڈی، آئی یا دو تین منصف اکھٹے بٹھا دیے جائیں۔ جو اتفاق رائے سے کسی نتیجے پر پہنچیں اور پھر اول رہنے والے مدرسہ کو سرٹیفکیٹ یا وہاں کے طلبہ کو انعامات دیے جائیں۔ اس طریقے سے بھی خوشنویسی کی مشق زیادہ بڑھائی جا سکتی ہے۔

اور ایک تجویز جس سے ابتدائی مدارس میں خوشنویسی کا شوق بہت ہی بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ ہے کہ امتحان وظیفہ میں ہر ضلع میں ایک وظیفہ ایسا مقرر کیا جائے، جو ضلع بھر کے سب سے اعلیٰ خوشنویس لڑکے کو دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ دیگر مضامین میں بھی ضروری نمبر لے کر پاس ہو چکا ہو۔ اس طرح سے نہ صرف خوشنویسی کا شوق ہی ہوگا۔ بلکہ چند ایک غریب طالب علموں کی ہر سال آئندہ تعلیم کے لیے مدد بھی ہو جایا کرے گی۔

ہکلا پن

از

ع، ج، جمیل علوی، ایم اے، ممبر برٹش سائیکولاجیکل سوسائٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

علاج

ہکلے پن کے علاج میں "ڈیماستھنیز" کا قدیم طریقہ بھی کافی مؤثر ہے۔ اس طریقے کا دارومدار بے توجہی پر ہے۔ "ڈیماستھنیز" کا طریقہ یہ تھا کہ منہ میں چھوٹے چھوٹے کنکر رکھ کر زور زور سے بولنے کی کوشش کی جائے یا زبان کو بولتے وقت خاص جگہوں پر رکھا جائے یا ایک خاص شریان کٹوائی جائے۔ یہ تمام طریقے حقیقت میں بے توجہی کے طریقے ہیں۔ اسی ضمن میں بعض اور طریقے بھی آتے ہیں مثلاً سانس لینے پر خاص توجہ دی جائے اور اس کی حرکات کو معین کر دیا جائے یا منہ میں کوئی کڑوی چیز رکھ کر بولنے کی مشق کی جائے یا گفتگو کے دوران میں کوئی اور کام سرانجام دیا جائے مثلاً ہر لفظ کے ادا کرنے کے وقت ایک ہاتھ سے ٹک ٹک کی جائے۔ ٹک ٹک کو توجہ کا مرکز قرار دینا چاہیے تاکہ توجہ ادھر سے دوسری طرف مبذول ہو جائے۔ یہ طریقہ "لوآر" کے عکس تشریلی طریقے کی مانند ہے۔ جب کافی مشق ہو جائے، تو بتدریج ٹک ٹک کو ترک کر دینا چاہیے۔

تاثر خواہ بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ، بہت ہی مؤثر ہے۔ اس کام کے لیے بالعموم حالت تنویم میں مریض کو اشارات دیے جاتے ہیں۔ اگر مریض کا طبیب پر اعتماد ہے، تو طبیب کے اسے یقین دلانے سے کہ وہ آئندہ نہیں ہکلائیگا، مرض کی شدت میں یقیناً کمی ہو جائیگی۔ بعض نیم حکیم تو فی الواقع اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تنویمی طریقہ یہ ہے کہ مریض پر تنویمی حالت طاری کی جاتی ہے اور گہری

مصنوعی نیند کے دوران میں اسے تاثرات دیے جاتے ہیں کہ حالتِ بیداری میں وہ آئندہ نہیں ہکلائیگا۔ پہلے اسے تنویمی حالت کے دوران میں ہی گفتگو کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ اگر تاثرات صحیح طریقے سے دیے گئے ہیں، تو مریض مطلق نہیں ہکلائیگا۔ اس کے بعد اسے کہا جاتا ہے کہ اتنا وقت گزرنے کے بعد اس کا ہکلاپن جاتا رہیگا۔ یہ ضروری ہے کہ اس حالت کے دوران میں اس میں ذاتی اعتماد پیدا کیا جائے۔ یہ جوہر اس کے مرض کے رفع کرنے میں اُمید سے زیادہ مدد دیگا۔ ایک دفعہ اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ وہ اب نہیں ہکلا رہا، یا وہ آگے کی نسبت کم ہکلا رہا ہے تو مستقل طور پر اس کا یہ مرض جاتا رہیگا۔

لیکن اگر مرض کسی صدمے یا ممتنع واقعات سے پیدا ہُوا ہے، تو اُس کا واحد علاج تجزیۃ النفس (Psycho-analysis) ہے۔ جذباتی عناصر بعض اوقات تنویم کے ذریعے سے بھی معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ جونہی کہ مریضوں کو اسی جذباتی زندگی کے اندر رکھا جاتا ہے جس میں اس کا مرض رونما ہوا تھا، تو ان کا مرض اسی جذباتی کیفیت کے طاری ہونے سے جاتا رہتا ہے۔ لیکن اس کا مکمل اور مستقل علاج تجزیہ ہی ہے جس کی مدد سے اس کی فراموش شدہ صنعتی یا جذباتی زندگی کی تحلیل کی جاتی ہے۔ جونہی کہ یہ تحلیل مکمل ہو جائے، نہ صرف اس کا علاج ہی ختم ہو جاتا ہے، بلکہ مرض کے اصلی اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جذباتی زندگی کو درست کرنے کا ایک اور حل یہ بھی ہے کہ مریض کی مبرزی (Anal) خواہشات نقاشی یا ایسے ہی کسی اور فن میں تبدیل کر دی جائیں۔ اس عمل کا نام ارتفاع (Sublimation) ہے، جس کی مدد سے جبلّی خواہشات پر ضبط حاصل کیا جا سکتا ہے۔

فلشر کے نزدیک ماحول کی درستی نہایت ہی ضروری ہے جس کے بغیر مکمل علاج ناممکن ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں ماحول کی درستی ممکن ہے اور بعض میں قطعاً ناممکن۔ یہ نقص اکثر شدید صورت

اس وقت اختیار کرلیتا ہے، جب ناتجربہ کار معلّمین یا والدین سزا یا کسی اور ذریعے
عادت کو ترک کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہکلے بعض اوقات ساری جماعت کے لیے
کا باعث بن جاتے ہیں۔ والدین اور اساتذہ کی محبّت اور شفقت سے وہ کام نکلتا ہے
اذیت اور سختی سے نہیں نکلتا۔ مریض کو اکثر ایسے مواقع دینے چاہییں کہ وہ اپنے خیالات
بلا روک ٹوک کر سکے۔ اس سے اس میں ذاتی اعتماد کا مادہ پیدا ہوگا۔

پروفیسر ڈنلپ نے ہکلانے کی عادت ترک کرانے کا ایک نیا طریقہ دریافت
دوسرے تمام طریقوں سے مختلف ہے۔ یہ اس بات کی سفارش کرتے ہیں کہ ہکلے کو اس
نجات دلانے کے لیے ہکلانے دیا جائے۔ لیکن اس قسم کے علاج کا ذمہ صرف اس شخص
چاہیے، جسے اس کی کافی مہارت ہو۔ اس طریقے کا نفسیاتی پہلو یہ ہے۔

ہکلاپن ایک قسم کا غیر ارادی جواب ہے اور چونکہ یہ غیر ارادی ہے۔ اس لیے
اثر سے ضبط رکھا جا سکتا ہے۔ جس طریقے سے یہ ارادی ضبط رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ہے
(Response) کی مشق اس خیال سے کی جائے کہ یا تو یہ جواب غائب ہو جائیگا اور یا اسے
ضبط میں لایا جا سکیگا۔ اکثر ہکلاہٹ اور بعض دوسری بدعادات ترک کرانے سے اس طر
خاطر خواہ نتائج برآمد کیے گئے ہیں۔

ہندوستان میں ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب (حیدر آباد، دکن) نے پروفیسر
طریقوں سے استفادہ کر کے ایک عمدہ طریقۂ علاج دریافت کیا ہے۔ جس کو مختصراً قارئین
کے لیے درج کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ بھی ڈنلپ کے طریقے سے مختلف نہیں، بلکہ تقریباً ا
پر مبنی ہے۔ بولنے کے نظام کو پروفیسر وائیلی وائیولن بجانے والے کے دو ہاتھوں سے تشبیہ
اس کا بایاں ہاتھ تاروں پر ہوتا ہے اور دائیں ہاتھ میں کمان ہوتی ہے۔ اگر ان کی توجہ کسی

بمنزلہ ہو جائیگی تو موسیقی زائل ہو جائیگی۔ ہمارا حنجرہ یعنی آواز پیدا کرنے والا بکس ایک ان والا ہاتھ ہے اور منہ، زبان اور تالو وغیرہ تاروں پر بجنے والا ہاتھ ہے۔ ہکلانے کی بیماری ان دو مختلف نظاموں کے ساتھ ساتھ کام نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے طریقۂ علاج کے مطابق مندرجہ ذیل طریقے کا سمجھنا ضروری ہے۔

تمام حروف تہجی کو دو قسموں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) آواز والے حروف۔ (۲) بے آواز حروف۔ اس قاعدے کے مطابق مریض کو چاہیے کہ آواز والے حروف کو پوری آواز کے ساتھ نکالے اور بے آواز کے حروف کو ہلکا سا مس کرتا چلا جائے۔ آواز والے حروف پھر دو قسموں میں تقسیم کیے گئے ہیں:۔

(۱) وہ حروف جن کی آوازیں حروف صوتی سے ملتی ہوئی ہیں۔ (۲) ایسے حروف جن کی آوازیں اصلی حروف سے ملتی ہیں۔ قسم اوّل سے تعلق رکھنے والے حروف کو اس طرح ادا کرنا چاہیے۔

اِ اس کو اِی پڑھنا چاہیے۔ و اس کو او پڑھنا چاہیے۔

وٗ اس کو اُو پڑھنا چاہیے۔ وہ اس کو ہو پڑھنا چاہیے۔

ی اس کو ای پڑھنا چاہیے۔ ج اس کو جھ پڑھنا چاہیے۔

مندرجہ بالا حروف کو پوری آواز کے ساتھ اور ابتدائی حروف پر زور دے کر نکالنا مثلاً "یسف کو "یےاویوسف"۔ اس کی مشق کے لیے اس قسم کے جملے استعمال کرنے چاہییں جن میں یہ تمام حروف آجائیں۔ "یہ یرقان کی بیماری ہے"۔ اس کو پڑھنا چاہیے۔ "ای یہ ای یرقان ئ بیماری ہے"۔ "بخار آتا ہے" کو پڑھیے۔ "ببخار آتا ہے" وغیرہ۔

۲۔ بے آواز حروف یعنی پ، ت، ٹ، ع، ح، س، ش، ف، ک، کو ادا کرنے کا مشق اس طرح کی جائے کہ اوّل لفظ کا پچھلا حصہ کئی مرتبہ کہا جائے اور پھر آہستہ سے حرف

اوّل کو شامل کر لیا جائے۔ مثلاً سینگ کو پہلے اینگ، ابنگ، اینگ کہیں۔ پھر سینگ۔

۳۔ آواز والے حروف مثلاً ب، خ، د، ڈ، ر، ز، غ، ق، ل، م، ن ا ز آواز سے زور دے کر اور موٹا کر کے پڑھنا چاہیے۔ پ کو اگر زور دے کر اور موٹا کر جائیگا، تو یہ ب بن جائیگا۔ اس کی مشق کے لیے اس قسم کے جملے تیار کرنے چاہیئں برابر بے جگری سے لڑتا رہا۔ لالہ میر الٹو پہلے لا دو۔

بلند آواز سے پڑھنا یا پڑھتے وقت گانے کی سی آواز نکالنا اور ساتھ ا اور توجہ سے سُنتے رہنا بہت ہی مفید ہے۔ اگر گانے کو بیکاری میں اپنا مشغلہ بنا ل تو ہکلے پن کے لیے بے حد مفید ہوگا۔ (پورا ہُوا)

ودّیا مندر اسکیم

از

نیاز الدین احمد، بی اے

(گزشتہ سے پیوستہ)

ودیا مندر اسکیم سے ملحق بہت سے ضمیمے اسکیم کے آخر میں درج ہیں۔ اُن میں سے چند ایک جو بہت ضروری ہیں، یہاں بھی شامل کیے جاتے ہیں۔

ضمیمہ (خ)

ودّیا مندر کی عمارت

(۱) عام طور پر ودّیا مندر کی عمارت جس میں پچاس طلبہ سما سکیں۔ ایک ایسے قطعۂ زمین پر بنائی جائیگی، جس کا رقبہ ۸۵ فٹ اور ۳۰ فٹ ہو۔ اس کے علاوہ عمارت کے چاروں طرف بہت سی کھلی زمین ودیا مندر سے ملحق ہوگی، جو کھیلوں کے میدان، باغبانی اور زراعت کے لیے استعمال کی جائیگی۔

(۲) ودّیا مندر کی عمارت میں ایک ہال کمرہ ہوگا جس کا رقبہ ۲۰ فٹ اور ۲۱ فٹ ہوگا اور اس کے تین طرف ۸ فٹ چوڑا برآمدہ ہوگا۔ ہال کمرے کے دروازے برآمدوں میں کھلیں گے اور کھڑکیاں برآمدے کی بغل میں ہوں گی۔

(۳) برآمدوں کو بند کرنے کی غرض سے کوئی دیوار نہ ہوگی، لیکن احاطہ بندی کی غرض سے لکڑی یا بانس کے پٹیوں کی دیوار تینوں برآمدوں میں لگائی جائیگی جس میں دروازے بھی ہونگے۔

(۴) ہال دروازے کی چوتھی طرف ایک ۲۸ فٹ لمبی دیوار بنائی جائیگی، جو اسکول کی عمارت اس کے متعلقات سے علیحدہ کرے گی۔ اس دیوار میں دروازے یا کھڑکیاں بالکل نہ ہونگی، لیکن دونوں ملحق برآمدوں میں دروازے رکھے جائیں گے۔

(۵) پڑھنے کے وقت بچے برآمدوں ہی میں بیٹھا کریں گے اور اُستاد درس دیتے وقت ا مرکز میں کھڑا ہوگا، جو دو برآمدوں کے ملنے سے پیدا ہو۔ ان میں سے ایک برآمدے کا ۳۰ فٹ اور ۸ فٹ ہوگا، جو ۳۰ بچوں کے لیے کافی ہوگا اور دوسرے برآمدے کا رقبہ بھی قدر ہوگا اور اس میں بھی ۳۰ بچے سما سکیں گے اور تیسرا برآمدہ بھی اسی مقصد کے لیے است ہو سکتا ہے یا اس میں ملاقاتی اور مہمان قیام کر سکتے ہیں۔

(۶) ہال دروازے کے پچھلی طرف دو کمرے ہونگے، جن میں سے ہر ایک کا رقبہ ۱۴ فٹ اور ۱۲ ہوگا۔ دونوں کمروں میں ایک ایک دروازہ ایسا ہوگا، جو برآمدے کی طرف کھلے گا۔ معلم کمرے میں ایک کھڑکی رکھی جائیگی، جو باہر کی طرف کھلے گی۔ اُن دو کمروں میں سے ایک اُستاد اور اُس کے گھر والوں کے لیے وقف ہوگا) کا ایک اور دروازہ اُس طرف کھلے گا، جو کے عین سامنے ہو اور باورچی خانے کا راستہ بھی اسی دروازے سے ہوگا۔ باورچی خا بالکل ایک طرف واقع ہوگا، لیکن یہ احتیاط کی جائیگی کہ یہ معلم کے کمرے کی بغل میں ہی بنا معلم کے کمرے میں ایک زاید دریچہ بھی ہوگا، جو اُس صحن کی طرف کھلیگا، جو باورچی خا نے کے سامنے ہوگا۔

(۷) باورچی خانے کا رقبہ ۱۰ فٹ اور ۸ فٹ ہوگا اور اس کا ایک دروازہ صحن کی طرف کھلے اور دوسرا برآمدے کی طرف۔ یہ باورچی خانہ معلم کے لیے مخصوص ہوگا۔

(۸) باورچی خانے کے بعد اُسی طرف ایک اور برآمدہ ہوگا جس کا رقبہ ۸ فٹ اور ۸ فٹ ہوگا۔

برآمدے کے باہر کی طرف ایک دیوار ہوگی، جو معلم کے کمرے سے شروع ہو کر اسٹور روم کے آخر تک جائیگی اور جس کی کل لمبائی ۵۰ فٹ ہوگی اور جس میں ۲۰ فٹ حصہ برآمدے کے کے رلیے مخصوص ہوگا۔ برآمدے کے اس حصہ کی دیوار میں ایک دروازہ ہوگا جسے معلم کے گھر والے استعمال کریں گے۔

(۹) اس برآمدے میں بھی ایک دروازہ اُس طرف رکھا جائیگا جو باورچی خانے کی طرف کھلتا ہے اور اس دروازے سے غلہ خانے (Grain store-room) کو بھی راستہ جائے گا۔

(۱۰) غلہ خانہ اس برآمدے کے آخر میں واقع ہوگا۔ غلہ خانے میں صرف ایک دروازہ اور دو کھڑکیاں ہونگی۔ جن میں سے ایک صحن اور معلم کے کمرے کی طرف کھلے گی اور دوسری اُس دیوار میں ہوگی، جو اسٹور روم اور مویشی خانے کے درمیان ہوگی۔ غلہ خانے کے باہر دونوں طرف کوئی دروازہ یا کھڑکی نہیں ہوگی۔

(۱۱) غلہ خانے کے بڑھاؤ کی طرف اور معلم کے کمرے کے سامنے ایک مویشی خانہ ہوگا، جس کا رقبہ ۱۶ فٹ اور ۱۰ فٹ ہوگا اور جہاں مویشیوں کو پالا جائے گا۔ باہر کی طرف ۱۶ فٹ لمبی دیوار ہوگی، جو غلہ خانے کی ۱۲ فٹ لمبی دیوار کے ساتھ ملحق ہوگی۔ غلہ خانے میں علاوہ اُس کھڑکی کے جس کا ذکر دسویں پیرے میں آیا ہے، دو عدد اور کھڑکیاں ہونگی، جو مویشی خانے کی بیرونی دیوار میں سے نکالی جائیں گی۔ مویشی خانے کی چوتھی طرف جو صحن کے سامنے ہوگی، ایک احاطہ بنایا جائیگا۔ اس میں ایک بہت کشادہ دروازہ ہوگا، جس میں سے مویشی گزرا کرینگے۔

(۱۲) ایک کھلا صحن، جو رقبہ میں ۳۰ فٹ اور ۲۰ فٹ ہوگا۔ اُس جگہ واقع ہوگا، جہاں مویشی خانہ، غلہ خانہ، معلم کا برآمدہ، معلم کا باورچی خانہ، معلم کا رہائشی کمرہ اور مہمان خانہ ہونگے۔ یعنی یہ صحن کو تین طرف سے گھیرے ہوئے ہونگے اور چوتھی طرف (جو باورچی خانہ اور برآمدہ

کے سامنے ہوگی) ایک بڑا دروازہ ہوگا، جو مویشی خانہ کے بہت نزدیک ہوگا۔ باقی کھلی
جو بڑے دروازے کے دونوں طرف ہوگی، احاطے کے طور پر استعمال کی جائے گی۔ اس
کی حدبندی مضبوط لکڑی یا اینٹوں کے ستونوں سے کی جائیگی۔ احاطے کی دیوار کی
ایک عام دروازے کے برابر ہوگی۔

(۱۳) دو کمروں میں سے ایک جن کا ذکر چھٹے پیرے میں آچکا ہے۔ (جس کا رقبہ ۴ افٹ اور ۲
ہوگا) مہمان خانے کے طور پر استعمال کیا جائیگا، لیکن جس کا کوئی دروازہ یا کھڑکی صحن کی
نہیں کھلے گی۔ اس کمرے کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلے گا اور دوسرے دروازے
اسکول کے برآمدے کو راستہ ہوگا۔ مہمان خانے اور معلّم کے کمروں کے درمیان کوئی د
یا کھڑکی نہیں ہوگی اور نہ ہی مہمان خانے اور ہال کے درمیان۔

(۱۴) سب سے آخر ہال کمرے کی باری آتی ہے۔ ودّیا مندر میں سب سے زیادہ اہم
اسی کمرے کو حاصل ہے۔ یہ ہال بطور عجائب گھر، لائبریری اور دارالمطالعہ کے استعما
لیکن اس کے علاوہ ودّیا مندر کی دوسری روزمرّہ کے استعمال کی چیزیں بھی اسی
میں رکھی جائیں گی۔

(۱۵) باورچی خانے اور اُستاد کے کمرے کے سامنے جو کھلی جگہ ہے، وہ "عقبی سمت" کہلائ
اور وہ جگہ، جو مہمان خانے کے سامنے ہے "سمتِ مقابل" کہلائیگی۔

(۱۶) سمتِ مقابل جنوب کی طرف ہوگی۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ پچھلی طرف، یعنی شم
کی طرف پچھتے ہوئے احاطہ کی ضرورت نہیں رہیگی۔ ذیل میں ضمیمہ (ف) درج کیا
ہے، جس میں ودّیا مندر کی عمارت کا نقشہ درج ہے :-

ضمیمہ (ف)

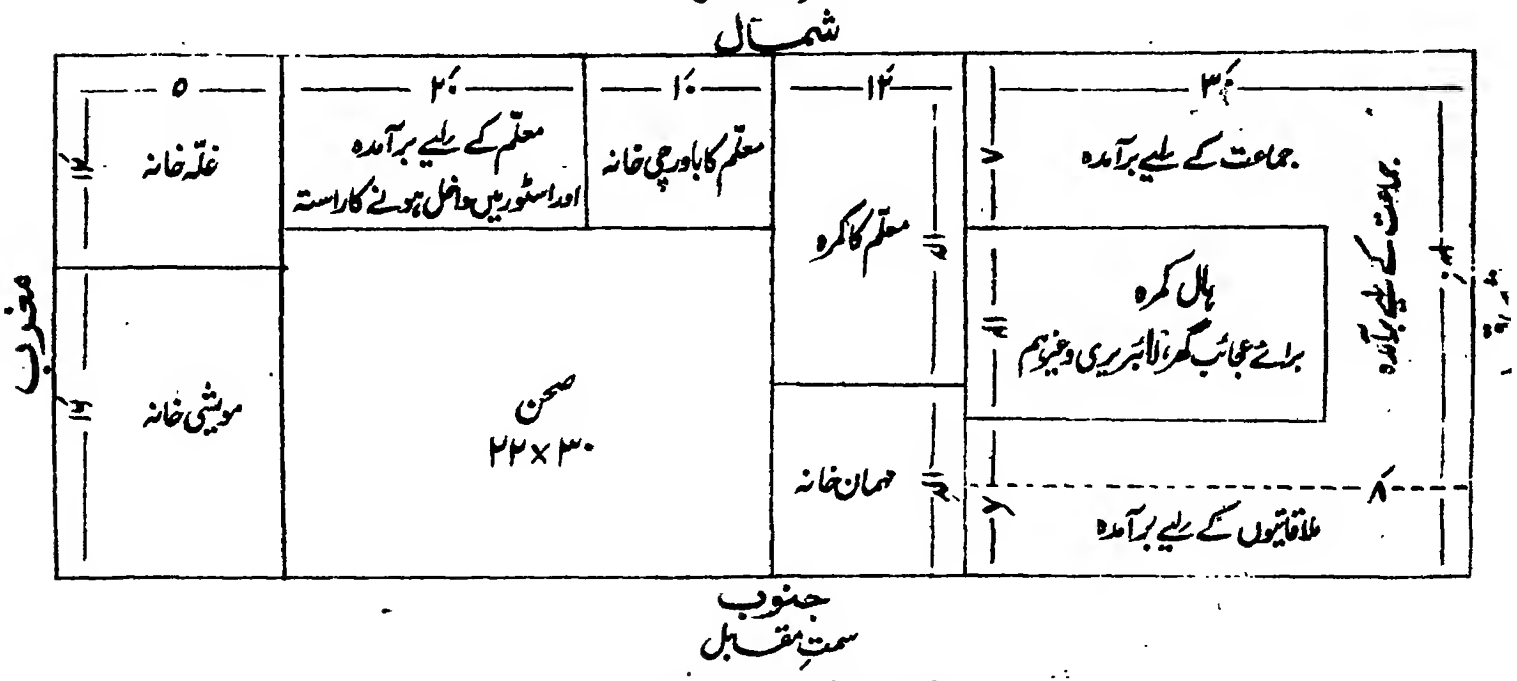

عمارت کی زمین کا کل رقبہ = ۸۵ × ۳۰

ضمیمہ (ک)

پنچائتی کوٹھیاں یا دیہاتی غلے کے بنک

(ان پنچائتی کوٹھیوں کے متعلق تفصیلات جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں، را
ڈی، آر موہری کار صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت رائے پور نے فراہم کی ہیں۔)
موضع باغمارہ جو بلود تحصیل، ضلع ڈرگ، سی پی میں واقع ہے، پنچائتی کوٹھی
نہایت اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں جب اس گاؤں میں کام شروع ہوا،
گاؤں کے مارواڑی سے غلہ بطور "باڑھی" کے لیا کرتا تھا۔ اُس کی ضروریات دھان کی تع
کھانڈیاں[2] ہوتی تھیں۔ کاشت کار کو اس قرض پر ۵۰ فیصدی سود دینا پڑتا تھا۔ وہ کاش
دس کھانڈیاں قرض پر لیتا تھا، اُسے چھے ماہ کے بعد پندرہ کھانڈیاں واپس کرنا ہوتی
کوشش کی گئی کہ اس گاؤں میں ایک پنچائتی کوٹھی قائم کی جائے تاکہ کاشت کار اس نقص
بچ جائیں۔ ۱۹۲۶-۲۷ء میں ۴۲ کاشت کاروں نے مل کر باہم دھان کی ۴۲ عدد کھانڈیا
۴۲ ممبروں میں سے ہر ایک نے ایک ایک کھانڈی پیش کی۔ اگلے سال یہ جمع شدہ کھا
فیصدی قرض کاشت کاروں کو دی گئیں اور ان پر ساڑھے آٹھ کھانڈیاں بطور سود کے وہ
اور اس طرح اب اسٹاک ساڑھے بیالیس کھانڈیوں پر مشتمل ہو گیا اور دوسرے سال نئے
کے شامل ہو جانے کی وجہ سے اسٹاک ۶۷ کھانڈیوں پر مشتمل ہو گیا۔ ذیل کے اعداد و شمار سے
کوٹھیوں کی ترقی کی کیفیت ظاہر ہو جائیگی۔

---

[1] پنچائتی کوٹھیوں کا ذکر اس اسکیم کی پہلی قسط میں آچکا ہے۔
[2] ایک کھانڈی کا وزن ۱۴۰ پونڈ کے برابر ہوتا ہے۔

سال	اسٹاک شروع سال میں (کھانڈیاں)	ممبروں کی تعداد
۱۹۲۶-۲۷	۳۴	۳۴
۱۹۲۷-۲۸	۷۶½	۴۰
۱۹۲۸-۲۹	۸۷	۳۸
۱۹۲۹-۳۰	۱۱۳	۳۸
۱۹۳۰-۳۱	۱۴۱	۳۸
۱۹۳۱-۳۲	۱۶۸	۳۸
۱۹۳۲-۳۳	۲۰۹	۴۰
۱۹۳۳-۳۴	۲۳۶	۴۲
۱۹۳۴-۳۵	۲۶۳	۴۲
۱۹۳۵-۳۶	۳۶۴	۴۲

مختلف سالوں کے کاروبار کی کیفیت ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

سال (کھانڈیاں)	غلہ جو پیشگی دیا گیا (کھانڈیاں)	منافع "بارھی"
۱۹۲۶-۲۷	۳۴	۸½
۱۹۲۷-۲۸	۷۶	۱۹
۱۹۲۸-۲۹	۸۷½	۲۱⅝
۱۹۲۹-۳۰	۱۱۳	۲۸¼
۱۹۳۰-۳۱	۱۰۶	۲۶½
۱۹۳۱-۳۲	۷۶	۱۹

سال (کھانڈیاں)	غلّہ جو پیشگی دیا گیا (کھانڈیاں)	منافع "باڑھی"
۱۹۳۲-۳۳	۱۶۸	۴۲
۱۹۳۳-۳۴	۱۰۸	۲۷
۱۹۳۴-۳۵	۱۴۳ ½	۶۰ ¾
۱۹۳۵-۳۶	۱۹۸ ½	۴۹
میزان		۳۰۲ ⅜

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں صرف "باڑھی" کے ذریعے پنچایتی کوٹھی کی آمدنی تقریباً ۳۰۲ کھانڈیوں پر مشتمل تھی۔ اسی قدر مقدار پس انداز کی گئی۔ ممبروں کی باہمی امداد سے جن کی تعداد اب بیالیس ہے، کافی اندوختہ جمع ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلّہ قرض دینے والے مارواڑی یا مہاجن اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ بہت کم شرح سود پر غلّہ قرض دیں لیکن اب ممبروں کو اس نقصان کا پوری طرح احساس ہو گیا ہے، جو اُنھیں مہاجن سے قرض لینے میں اٹھانا پڑے گا۔ گرد و نواح کے کاشت کاروں کو بھی اب ہوش آگیا ہے اور وہ بھی اس اسکیم میں کافی تعداد میں شامل ہو رہے ہیں۔

ہربرٹ سپنسر کا نظریۂ تعلیم

از
شیخ غلام جیلانی، ایم اے، لکچرار گورنمنٹ کالج لودیانہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس میں شک نہیں کہ عورت ایک خاص قسم کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لیے کہ وہ اپنے علم کی نمائش کر سکے۔ لیکن یہ کمزوری اُسی کی ذات تک محدود نہیں، بلکہ ایک عالم، تاریخ دان اور فلسفی کا اکتساب علم بھی بہت حد تک اسی جذبے کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ ہم میں سے اکثر کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اپنے علم وفضل سے اگر ہو سکے، تو دوسروں کو پوری طرح مرعوب کریں۔ اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنا وقت، روپیہ اور دماغ ایسے علوم کو حاصل کرنے میں ضائع کر دیتے ہیں، جن کی درحقیقت ہمیں عملی زندگی میں قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے ہمارے نصابِ تعلیم ناقص ہیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ ماہرینِ تعلیم بھی اس مسئلے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ وہ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ کن کن علوم کا اکتساب کن کن حالتوں میں بچوں کے لیے سود مند ثابت ہوگا، بلکہ وہ ان علوم کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، جن کے حاصل کرنے سے اور جن کی نمائش سے بچہ سماج سے دادِ تحسین وصول کر سکے اور بس۔ اندریں حالات تعلیم کا مقصد محض "نمائش" ہے، "حقیقت" نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کوئی علم بے کار محض نہیں ہوتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کون سا علم بہ نسبت دوسرے علموں کے زیادہ مفید ہے؟ مثال کے طور پر وہ شخص جو نقابت (Heraldry)

کے متعلق سال بھر تک تحقیق کرتا ہے، ضمناً پرانی تہذیب کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جو کچھ اُس نے حاصل کیا وہ اس قابل تھا کہ اس اس قدر محنت کی جاتی؟

حیاتِ انسانی بہت مختصر ہے اور اس کے علاوہ کسبِ معاش کے لیے انسان کو اس قدر جد و جہد کرنا پڑتی ہے کہ حصولِ علم کے لیے اُس کے پاس بہت ہی کم وقت رہ جاتا ہے۔ خاص حالات میں خاص لوگوں کے لیے خاص قسم کے علوم سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مندرجۂ بالا وجوہ اس بات کے مقتضی ہیں کہ انسان کو صرف اُسی علم یا اُنھیں علوم کے سیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے، جن کی اُسے ضرورت ہو یا جن کا وہ اہل ہو۔ غیر ضروری علوم کا سیکھنا وقت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

مضامین کی اہمیت کا تعین

ان حالات کے تحت تعلیم کے سلسلے میں سب سے ضروری مسئلہ یہ ہے کہ مختلف مضامین کو کس نسبت سے اہمیت دی جائے۔ ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ کون سے علوم ہمارے لیے عملی زندگی میں سود مند ہونگے۔ جیسا کہ بیکن (Bacon) نے ایک جگہ کہا ہے۔ "ہمیں مختلف علوم کی اہمیت کا تعین کرنا لازمی ہے"۔ اگر ہم بیکن کے اس نظریے کو تسلیم کر لیں، تو سب سے اوّل ہمیں مختلف علوں کی اہمیت کا تعین کرنے کے لیے گویا ایک پیمانے کی ضرورت ہوگی۔ اگر ہمیں کسی نہ کسی طرح اس قسم کا پیمانہ کہیں سے حاصل بھی ہو جائے، تب بھی یہ قطعی طور پر قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ دنیا میں ہر شخص کے حالات اور ضروریات مختلف ہیں۔ ممکن ہے، زید کے لیے ریاضی کا سیکھنا اشد ضروری ہو۔ اس لیے کہ اُس کے حالات اسی کی ذات تک محدود ہیں۔ اور امر کے مقتضی ہیں اور بکر کے لیے مختلف حالات میں تاریخ کا علم اُسی قدر ضروری ہے، جس قدر کہ زید

کے لیے ریاضی کا اس لیے ایک ریاضی داں، زبان داں، فلسفی اور سائنس داں کے لیے مختلف علوم کا سیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک خوشنویس کے لیے جس قدر ضروری فنِ خوشنویسی کا سیکھنا ہے دوسرے نہایت ہی ضروری علموں کا اکتساب اس کے لیے اس قدر ضروری نہیں ہوسکتا۔ چونکہ اس فن سے وہ روزی کماتا ہے، اس لیے وہ جس قدر بھی اس کی اہمیت پر زور دے کم ہے۔ لیکن اگر پرانے واقعات کا فراہم کرنے والا اس امر کو ثابت نہیں کرسکتا کہ اس کی محنت انسان کے لیے مجموعی طور پر سود مند ثابت ہو گی، تو اُس کی تمام کاوش اکارت گئی۔ اس لیے اگر مختلف علموں کی اہمیت کو متعین کرنے کا کوئی معیار ہوسکتا ہے، تو وہ بس یہی ہے کہ کون کون سے علم کس حد تک انسان کے لیے سود مند ثابت ہوسکتے ہیں اور کس حد تک اُس کی عملی زندگی میں ممد ہوسکتے ہیں۔

ہمہ گیر تعلیم

جس تعلیم کا ذکر اُوپر آچکا ہے، وہ محض معاشی ہے، "حقیقی" نہیں۔ دراصل ہر فرد کے لیے دو قسم کا علم سیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک وہ جو اُس کی معاش میں ممد ہو اور دوسرا وُہ جو اُسے بحیثیتِ انسان سیکھنا چاہیے۔ ایک خاص قسم کا علم یا فن جس کے سیکھنے سے کوئی شخص اپنی روزی کماتا ہے، ضروری تو ہے۔ لیکن وہ انسانی زندگی کے ساتھ صرف ایک ہی تعلق رکھتا ہے یعنی اُس کی معاشیات سے۔ آخر اس میں کس کو کلام ہوسکتا ہے کہ انسانی زندگی ایک بہت ہی پُر پیچ اور مشکل مسئلہ ہے۔ اس لیے اس کو کامیاب بنانے کے لیے ایک ہمہ گیر تعلیم کی ضرورت ہے۔ وہ تعلیم جو محض معاشی غرض سے حاصل کی جائے، ظاہر ہے ہمہ گیر نہیں ہوسکتی اور چونکہ فرد کو اس دنیا میں نہ صرف زندہ رہنا ہے، بلکہ اپنے آپ کو دوسروں کے لیے سود مند بھی ثابت کرنا ہے۔ اس لیے اسے دو قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ ایک تو وُہ، جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے اور جسے ہم "معاشی تعلیم" کے نام سے منسوب کرتے ہیں اور دوسرے وہ تعلیم جس کی مدد سے فرد اپنے آپکو

سماج کے لیے سودمند ثابت کرسکتا ہے۔ وہ تعلیم جو اُسے خلقِ خدا کی خدمت کرنے کے قابل
سکے۔ وہ تعلیم جو اُسے سچ بولنا سکھا سکے، غیبت سے بچا سکے وغیرہم۔ اس لیے مؤخرالذکر
حاصل کرنا ہر انسان کا فرض ہے، کیونکہ یہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہر انسان اپنے آپ
سماج کا بہترین فرد ثابت کرسکے۔

ہماری زندگی کے بہت سے پہلو ہیں، جنھیں سمجھنا بہت مشکل ہے اور یہ آپس میں
طرح اُلجھے ہوئے ہیں کہ ان کو سلجھانے کے لیے انسان کو ایک خاص قسم کی تعلیم حاصل کرنا ضر
ہے۔ اُس خاص قسم کی تعلیم کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ "ہمیں کس طریق پر زندگی بسر کرنا چاہیے؟" یہ ایک
اہم سوال ہے۔ زندگی کا بسر کرنا عام مادی مفہوم میں نہیں، بلکہ مقصود اس سے اصل مفہوم ہے
سے مراد نیک کردار زندگی بسر کرنا ہے۔ فرد کو لازم ہے کہ ہر حالت میں نیک کردار رہے اور ا
لیے ایک صحیح راستہ اختیار کرے، جو خلقِ خدا کی خدمت پر مشتمل ہو۔ ہمیں ایسی تعلیم کی ضرورت
جو فرد کو ان تمام صفات سے آراستہ کردے اور اُسے مکمل زندگی بسر کرنے کے قابل بنادے۔
اس لیے ہمیں ایک ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے، جو فرد میں یہ صلاحیت پیدا کرسکے کہ و
صرف مادی طور پر بلکہ اخلاقی اور روحانی طور پر بھی۔ غرض کہ مجموعی طور پر کامیاب زندگی بسر
سیکھ لے۔ "کامیاب زندگی" سے مقصود جیسا کہ بتایا جاچکا ہے محض مادی کامیابی نہیں،
مجموعی طور پر کامیاب زندگی بسر کرنا ہے۔ تعلیم کا مقصد انسان کو "کامیاب زندگی" بسر کرنا سک
اس لیے اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ آیا، وہ کون سے مضامین ہیں، جن کی مدد سے
کامیاب زندگی بسر کرنا سیکھ سکتے ہیں۔

مختلف علموں کی اہمیت

ایک ایسا نظامِ تعلیم تجویز کرنا، جو بچے کو کامیاب زندگی بسر کرنا سکھادے، کوئی آسا

نہیں۔ اس غرض کے لیے سب سے اوّل اُن افعال کا تجزیہ کرنا لازمی ہے، جن پر انسانی زندگی مشتمل ہے۔

اوّل :- وہ افعال جن کا بقائے نفس سے بلاواسطہ تعلق ہے۔

دوم :- وہ افعال جن کا بقائے نفس سے بالواسطہ تعلق ہے۔

سوم :- وہ افعال جن کا بچوں کی تربیت سے تعلق ہے۔

چہارم :- وہ افعال جن کا فرد کی سماجی اور سیاسی زندگی سے تعلق ہے۔

پنجم :- وہ متفرق افعال جن کا تعلق فرد کے لمحاتِ فرصت سے ہے (یعنی یہ کہ لمحاتِ فرصت کا بہترین استعمال کیا ہونا چاہیے)۔

اس میں کلام نہیں کہ وہ علم جس کا تعلق بلاواسطہ بقائے انسانی سے ہے، سب سے زیادہ اہم ہے۔ مثلاً آج کل بڑے بڑے شہروں میں ٹریفک ہونے کی وجہ سے پولیس نے کنٹرول کے خاص طریقے وضع کیے ہیں، جن کا علم ہر شہری کو ہونا چاہیے۔ لیکن ایک ایسا عالم جو اپنے حجرے سے کبھی باہر ہی نہ نکلا ہو، اس کو سکو دھنیے کو دیکھ کر بھونچکا سارہ جائیگا اور بہت ممکن ہے کہ کسی نہ کسی حادثے کا باعث بھی ثابت ہو۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی ضروری باتیں ہیں، جن سے ہر ایک شہری کما حقہٗ واقف ہونا چاہیے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ فرد کے لیے سب سے ضروری علم وُہ ہے، جس کا تعلق بقائے نفس سے ہے۔ دوسرے درجے پر جیسا کہ اُوپر ذکر آچکا ہے، وہ علم ہے جس کا تعلق بقائے نفس سے بالواسطہ ہے، یعنی وہ علم جو انسان کی معاشی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ علم جس کا تعلق فرد کی اپنی ذات اور اُس کی بہبودی سے ہے، زیادہ ضروری ہے بہ نسبت اُس علم کے جس کا تعلق فرد کے بچوں کی بہبودی سے ہے، یعنی فرد کو لازم ہے کہ اپنی ذات کو اپنی اولاد پر ترجیح دے، لیکن اس کو یہ بھی

لازم ہے کہ اپنی اولاد اور اپنے کنبے کی بہبودی کو سٹیٹ (State) کی بہبودی پر ترجیح دے۔ لیے کہ آخر سٹیٹ بذاتِ خود بہت سے افراد پر مشتمل ہے۔ پس اگر فرد کی حالت ارفع و بلند ہے، سٹیٹ کی حالت خود بخود ارفع و بلند ہو جائیگی۔ اس ضمن میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مندرجہ بالا قسم کے افعال ایک دوسرے سے قطعی بے تعلق یا جُدا جُدا نہیں، بلکہ ان میں ایک خاص قسم کا اور رشتہ ہے۔ ایک فعل باقی افعال سے متعلق ہے اور یہ سب بڑی حد تک ایک دوسرے کے ہیں۔ الغرض ان تمام مصروفیتوں کا اختصار "انسان" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال کہ اس مرکب کے اجزائے ترکیبی خاص مقدار سے بڑھنے نہ پائیں، تاکہ نتیجہ حسب دلخواہ ہو۔ فرد کی اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اُس نے ان پانچوں افعال کے ضمن میں پوری طرح نہیں کیا لیکن اس امر کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ ان میں سے کسی ایک خاص فعل پر زیادہ ز دیا جائے اور نہ ہی ان میں سے دو یا تین کو خاص توجہ کا مرکز بنا لیا جائے۔ بلکہ فرد کی توجہ ان پا افعال کی طرف اُسی قدر ہونی چاہیے جس قدر ضروری ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کی ط غفلت یا بے نیازی نہیں برتنی چاہیے۔ اس لیے کہ اقتضائے انسانیت یہی ہے۔

علم کی قسمیں

بچے کو تعلیم دیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ علم تین قسم کا ہوتا ہے:-

اوّل:- وہ علم جس کی اہمیت معنوی ہے (nowledge of intrinsic value

دوم:- وہ علم جس کی اہمیت تقریباً معنوی ہے (nowledge of quasi-intrinsic value)

سوم:- وہ علم جس کی اہمیت محض رواجی یا رسمی ہے، (nowledge of conventional value)

ان حقائق کا علم کہ جسم کے کسی حصے پر فالج گرنے سے پہلے وہ حصہ بالکل بے حس ہو جاتا ہے یا یہ کہ تیرتے وقت پانی کا دباؤ انسانی جسم یا آبدوز کشتیوں یا دیگر پانی کے اندر تیرنے

چیزوں پر مختلف گہرائیوں میں مختلف ہوتا ہے یا سائنس کے متعلق چند ضروری حقائق رسمی باتیں ہیں، جن کا علم ہر انسان کو ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ان کی اہمیت دائمی ہے۔ یہ واقعات دس ہزار سال بعد بھی اسی طرح پیش آئیں گے، جیسے کہ آج آ رہے ہیں۔ یہ علم ایسا ہے جس کے اوصاف معنوی ہیں۔

لاطینی اور یونانی زبانوں کے سیکھنے سے ہم انگریزی کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے ان زبانوں کا علم اگرچہ قطعی طور پر معنوی تو نہیں، لیکن کافی حد تک معنوی ضرور ہے۔ لیکن ان کی اہمیت دائمی نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے لیے ان زبانوں کا فائدہ اُسی وقت ہو سکتا ہے، جب تک انگریزی زبان زندہ ہے اور ہم اسے بولتے اور لکھتے ہیں۔

چند ایک مضامین ایسے بھی ہیں، جن کی اہمیت محض رسمی ہے۔ مثلاً تاریخ خصوصاً اس قسم کی تاریخ جو آجکل ہماری درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہے، جو مشتمل ہے محض ناموں، تاریخوں اور بے ربط واقعات پر۔ اس لیے اس علم کو محض رواجی قرار دیا جاتا ہے اور اس کی اہمیت محض رسمی ہے۔ ایسی تاریخ کو ہمارے افعال سے دور کا تعلق بھی نہیں اور ایسی تاریخ جو ہمارے موجودہ ماحول اور موجودہ مسائل سے بے علاقہ رہے، "علم التاریخ" کہلانے کی کسی طرح بھی مستحق نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس علم کو جس کی اہمیت معنوی یا تقریباً معنوی ہو، اُس پر ترجیح دینی چاہیے جس کی اہمیت محض رسمی ہو۔

بقائے نفس کے متعلق تعلیم

خوش قسمتی سے وہ واقفیت، جس کا تعلق بقائے نفس کی تعلیم سے ہے، فطرت نے فرد کو بہت فیاضی سے ودیعت کی ہے۔ مثلاً دودھ پیتے بچے کو بھی اتنا شعور ہے کہ وہ اجنبی اور ڈراؤنی چیزوں سے خوف کھائے۔ وہ کتے، بلی، اور آگ ایسی چیزوں سے خود بخود ڈرتا ہے۔ اس کو ان چیزوں سے ڈرنا کسی نے سکھایا نہیں۔ فرد بقائے نفس کے متعلق بہت سے حقائق خود بخود سیکھتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً وہ خود بخود سیکھ لیتا ہے کہ اپنے جسم کے توازن کو کس طرح قائم رکھا جائے تاکہ تنگ اور پہاڑی راستوں پر چلتے

وقت انسان گر نہ پڑے اور یہ کہ پگڈنڈیوں پہ چلتے وقت اِدھر اُدھر بھٹکتا نہ پھرے۔ اُسے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سی اشیا سخت ہیں اور اگر جسم کے کسی حصہ پر آ پڑیں، تو ان سے تکلیف کا احتمال ہے۔ کون سی اشیا انسان اُٹھا سکتا ہے اور کون کون سی ایسی ہیں، جن کا اُٹھانا اس کی ... سے باہر ہے اور اُسے اس امر کا بھی احساس ہو جاتا ہے کہ آگ سے کیا تکلیف ہوگی اور یہ کہ تیز ... والے اوزار لگنے سے انسانی جسم میں گھاؤ پڑ جاتے ہیں۔ اس طرح انسان دُکھ دینے والی اور ایذا ... چیزوں سے اجتناب کرنا سیکھ جاتا ہے۔ اس لیے جہاں تک بقائے نفس کے سلسلے میں تعلیم کا تعلق ... خود بخود معلّم کے فرائض ادا کرتی ہے۔ پھر بھی ہمارا فرض ہے کہ فرد کو اس قسم کے تجربات سے روشناس ... کی انتہائی کوشش کی جائے، جن سے انسان اپنے آپ کو محفوظ رکھنا سیکھ لے۔ اس لیے یہ ضرور ... کہ بچوں کو شروع ہی سے ورزش کرنے اور دیگر کھیلوں میں حصہ لینے کا عادی بنائیں۔ کیونکہ ورزش ... کھیلوں سے بچوں میں توازن کا احساس بڑھتا ہے اور اُن کے دماغ اور جسم اس قابل ہو جاتے ہیں ... خطرناک مقامات سے صفائی سے بچ کر نکل جائیں۔ قطع نظر اس بات کے ورزش بیماریوں ... محفوظ رکھتی ہے۔ مکمل طور پر زندہ رہنے کے لیے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو خ... مقامات سے محفوظ رکھنے پر قادر ہو، بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ حفظِ ماتقدم کے ... اپنے آپ کو ہر آنے والے خطرے کے لیے پوری طرح تیار کر لے۔ اس لیے ورزش ہی ایک ا... ہے، جس سے انسان اپنے اندر نہ صرف خطرناک مقامات سے بچ نکلنے کی صلاحیت پیدا کر سکتا ... بلکہ اپنے جسم اور خون کو اس قابل بھی بنا سکتا ہے کہ انسان ہر قسم کی بیماریوں کے حملوں کا پو... طرح مقابلہ کر سکے۔ بیماریوں کی روک تھام کس طرح کی جا سکتی ہے؟ صحت کے عام اصو... ہیں؟ یہ ایسا علم ہے، جس کا جاننا ہر انسان کا فرض ہے اور جو بقائے نفس کے لیے بہت ضرو...

(باقی آئندہ)

سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن

اور

واردھا اسکیم

از

میرزا مقبول بیگ بدخشانی، بی اے ہنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کا ایک اجلاس جنوری ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اس اجلاس میں منظور ہوا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جو واردھا اسکیم کی پیش کی ہوئی تجویزوں کی تحقیق کرے اور ان پر ووڈ ایبٹ رپورٹ کی مذکورہ عام تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم اور اسی قسم کی دوسری مطبوعات کی روشنی میں غور کر کے سفارشات پیش کرے۔ اس کمیٹی کو اپنی طرف سے ممبر نامزد کرنے کا اختیار بھی دیا گیا۔

اس کمیٹی کا اجلاس ۲۸، ۲۹، اور ۳۰ جون کو شملے میں ہوا۔ ذیل کے ممبران شریک ہوتے رہے۔

۱۔ آنریبل مسٹر بی، جے، کھیر جو حکومتِ بمبئی کے وزیرِ اعظم اور وزیرِ تعلیم بھی ہیں۔ صدر۔

۲۔ آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیرِ تعلیم حکومتِ بہار

۳۔ آنریبل پنڈت آر، ایس شکلا وزیرِ تعلیم حکومت صوبجات متوسط و برار۔

۴۔ لیڈی گرگ۔

۵۔ راجکماری امرت کور۔

۶۔ ڈاکٹر سید ضیاء الدین احمد سی آئی ای، پی ایچ ڈی، ڈی ایس سی، ایم ایل اے۔

۷۔ مسٹر ڈبلیو، ایف، ایچ آرم سٹرانگ۔ آئی ای ایس ڈائرکٹر تعلیمات

۸۔ مسٹر سیاما پرشاد مکرجی، وائس چنسلر کلکتہ یونیورسٹی۔

۹۔ ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

۱۰۔ خان فضل محمد خان کمشنر، سیکرٹری حکومت ہز ایگزالٹڈ ہائی نس شعبہ صنعت و پیشہ

۱۱۔ مسٹر جے ای پارکنسن، سی آئی ای، ایجوکیشنل کمشنر حکومت ہند۔

مسٹر آر، ایم، سٹاتھام، سی آئی ای، آئی ای ایس ڈائرکٹر تعلیمات مدراس شریک اجلاس نہ ہو سکے۔ چونکہ وہ رخصت پر تھے اور ہندوستان سے باہر گئے ہوئے تھے مسز ہنسا مہتا آنریبل وزیر تعلیم حکومت بمبئی کی پارلیمنٹری سکرٹری، کمیٹی کی نامزد کی گئیں اور شریک اجلاس ہوئیں۔ کاغذات متعلقہ جن کا رپورٹ ہذا کے ضمیمہ ۱ میں وقت سے پیشتر رائے زنی کے لیے ممبروں کے پیش کیے گئے۔

واردھا اسکیم کا بنیادی مواد:۔

ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم کو اس وجہ سے رد کیا جا رہا ہے کہ یہ بدلتے ہوئے ... کے مطابق ڈھل نہیں سکا۔ اس کے پیش نظر کوئی زندہ اور تخلیقی معیار نہیں ہے۔ ۱۹۳۷ء ... گاندھی جی نے ہریجن رسالے میں ہندوستان کے تعلیمی مسائل پر بحث شروع کی تھی۔ بہت سی تجویزیں پیش کیں۔ ان کے موٹے موٹے اصول ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

ا۔ ابتدائی تعلیم کا نصاب ہفت سالہ ہونا چاہیے۔ اس عرصے میں طالب علم ... لیاقت ہو سکے، جتنی ایک دسویں پاس طالب علم کو ہوتی ہے۔ فرق صرف انگریزی ہی کی تعلیم ... کوئی کارآمد پیشہ بھی سکھایا جائے۔

ب۔ بچوں اور بچیوں کی کامل نشوونما کے لیے جہاں تک ممکن ہو، ساری کی ساری ...

ایسے پیشے کے ذریعے ہو، جس سے کچھ یافت بھی ہو سکے۔

ج۔ ابتدائی تعلیم سے دماغی تربیت بھی ہوتی جائے اور طالب علم اس قابل بھی ہو جائیں کہ اپنی روٹی آپ کما سکیں۔ پیشہ ورانہ کام حکومت مہیا کریگی اور طلبہ کے ہاتھوں کی بنی ہوئی اشیا کو مقررہ نرخوں پر خریدنے کی ذمے داری بھی حکومت ہو گی۔

د۔ ایسی تعلیم بحیثیتِ مجموعی اپنا خرچ آپ نکال سکتی ہے اور ضروری بھی ہے کہ یہ اپنا خرچ آپ نکالے۔

ہ۔ اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کا بار حکومت پر نہیں، بلکہ قومی اداروں پر ہونا چاہیے۔ یونیورسٹیوں کے ذمے محض امتحان کرنے کے فرائض ہونگے۔

۴۔ آل انڈیا نیشنل تعلیمی کانفرنس کا اجلاس گاندھی جی کی صدارت میں واردھا میں منعقد ہوا تاکہ اس اپنا خرچ آپ نکالنے والی، اسکیم پر غور کیا جا سکے۔ اجلاس میں ذیل کی قراردادیں منظور ہوئیں۔

ا۔ سات سالہ جبری اور مفت تعلیم کا ہمہ گیر پیمانے پر بندوبست کیا جائے۔

ب۔ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔

ج۔ یہ کانفرنس گاندھی جی کی اس تجویز کی تائید کرتی ہے کہ اس ہفت سالہ نصاب میں تعلیم کسی دستکاری یا کسی ایسے کام کے ذریعے دی جائے جس سے کچھ یافت بھی ہو سکے۔ بچوں کو جو تربیت دی جائے یا جن جن قابلیتوں کی نشوونما کی جائے، ان کا تعلق اس بنیادی دستکاری کے ساتھ ہونا چاہیے، جو بچوں کے ماحول کے مناسب اختیار کی گئی ہو۔

د۔ کانفرنس کا یہ خیال ہے کہ رفتہ رفتہ اس طریقِ تعلیم سے معلموں کی تنخواہیں نکل آئیں گی۔ اسکول میں داخلے کی عمر سات برس کی ہو گی اور سات برس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد علمی لیاقت اتنی ہونا چاہیے، جتنی ایک دسویں پاس طالب علم کی ہوتی ہے۔ فرق صرف انگریزی کی تعلیم کا ہو۔

۵۔آل انڈیا نیشنل تعلیمی کانفرنس نے ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی، تاکہ وہ ان تجویزوں کی روشنی میں کوئی اسکیم تیار کرے۔ اس کمیٹی نے انھیں تجویزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے واردھا اسکیم کی ایک مفصل رپورٹ تیار کی۔

۶۔یہ رپورٹ جسے حوالے کی غرض سے ذاکر حسین رپورٹ بھی کہا جاتا ہے، سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن سب کمیٹی کے ہر ممبر کے پاس تھی۔ اس سے پہلے کہ واردھا اسکیم کے اصول یا ان کی تفصیلات پر بحث شروع ہو، ڈاکٹر ذاکر حسین نے جن کی موجودگی اس سب کمیٹی میں بہت اہم تھی اس امر کی وضاحت کردی کہ واردھا اسکیم پر بہت سی تنقیدیں محض اس لیے ہو رہی ہیں کہ اسکیم ہٰذا کے بنیادی خیالات ٹھیک نہیں سمجھے گئے یا ان بیانات کی وجہ سے، جو انھیں کے سیاق و سباق سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے غلط نتیجے اخذ کر لیے جاتے ہیں۔

۷۔ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ اگر اسکیم کی بعض غلط فہمیوں کو دور کر دیا جائے، تو بحث و تمحیص کی تیزی بڑی حد تک کم ہو جائیگی۔ غلط فہمیوں کے ازالے اور غلط مبحث کی درستی ہو جانے سے ممبر اس قابل ہو جائیں گے کہ ان کی بات چیت اصل اسکیم پر ہو، نہ کہ کسی فرضی اسکیم پر۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بے تعلق باتوں سے نجات ہو جائیگی۔

۸۔آپ نے یہ بھی کہا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ اسکیم کا مقصد سب سے بڑا یہی ہے کہ بچے اپنی محنت سے جو چیزیں بنائیں، ان کو فروخت کرکے تعلیم کے اخراجات پورے کیے جائیں اور بس۔ گویا یہ اسکیم ایک پیداوار کی اسکیم ہے، جو بچوں سے بیگار لے کر چلائی جائیگی۔ یہ گمان محض غلط ہے۔ اسکیم کی اصل غرض تعلیم ہے، اشیائے کی پیداوار نہیں۔ زور زیادہ تر دستکاری اور مشاغل کے تعلیمی پہلو پر دیا گیا ہے، مالی پہلو کی حیثیت بالکل دوسرے درجے کی ہے۔ واردھا طرز کے مدرسوں میں روزمرہ کے مطابق تعلیم دی جائیگی، ایسے روزمرہ کے مطابق جو بچوں کے سماجی اور قدرتی حالات کا نتیجہ ہو

ذریعۂ تعلیم کوئی بنیادی دستکاری ہوگا۔ آجکل کے ماہرینِ تعلیم تقریباً سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ عملی کام ہی پوری پوری تعلیم دینے کا بہترین اور پُراثر ذریعہ ہے۔

۹۔ اس رپورٹ میں واردھا اسکیم کی غرض و غایت کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے "اس سے یہ مراد نہیں کہ ایسے کاریگر پیدا کر دیے جائیں، جو آپ ہی آپ مشین کی طرح کام کرتے جائیں، بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ دستکاری کے اندر جو قدرتی وسائل موجود ہیں، انھیں تعلیمی مقصدوں کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ یہ اسکیم ہمیں اس خطرے سے آگاہ کرتی ہے کہ موجودہ وقت میں تعلیم کے اقتصادی پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیمی اور تمدنی مقصد بالکل بھلا دیے گئے ہیں۔ واردھا اسکیم کے نزدیک ایسی محنت قابلِ قبول نہیں جس کے ذریعے اسکولوں میں مشین کے طور سے کام ہوتا ہے اور ذاتی اپج کو بالکل دخل نہ ہو۔ تعلیم کی اس ضروری شرط کو پورا کرنے کے لیے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کوئی حرفہ یا مشغلہ جو تعلیم دینے کی غرض سے انتخاب کیا جائے، ایسا ہو جس میں تعلیم دینے کے زیادہ سے زیادہ امکانات موجود ہوں۔ اس میں ایسے قدرتی اسباب پائے جائیں جو انسانی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کے مطابق ہوں۔ یہ نظریہ ووڈ ایبٹ رپورٹ کے پیراگراف ۱۰-۱۷ اور ۲۴-۲۵ سے ملتا جلتا ہے اور جدید تعلیم کی ضرورتوں کے عین موافق ہے۔ واردھا اسکیم کا تعلق صرف پرائمری جبری تعلیم سے ہے۔ اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ ثانوی مدارس اور کالجوں کو جو سرکار کی طرف سے امداد ملتی ہے وہ بالکل بند کر دی جائے۔

۱۰۔ اس لیے وہ بحث تو قطعاً بے محل ہے جس سے کسی نہ کسی طرح یہ نتیجہ نکلے کہ مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بچوں سے بیگار لی جائیگی اور اس بیگار کے ذریعے اسکول کے تمام یا کچھ اخراجات پورے کیے جائیں گے۔ واردھا اسکیم کے وہ نقاد جن کا یہ خیال ہے کہ اس سے اسکول نہایت محدود شکل میں صنعتی اور حرفتی ہو کر رہ جائیں گے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے ننھے بچوں کو مقررہ پیشوں کو اختیار

کرنے پر مجبور کر دیا جائیگا، یقیناً واردھا اسکیم کی حقیقی اہمیت کو نہیں جانچ سکے۔

۱۱۔ ڈاکٹر صاحب اس بحث کو روک دینا چاہتے ہیں، جو بے خبری کا نتیجہ ہو۔ آپ کا خ
کہ ایسی بحث ان لوگوں کے بیانات کا نتیجہ ہے، جو گرمجوش تو ہیں، لیکن غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اس
آپ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے بیروزگاری کا عدو دورہ ختم ہو جائیگا۔ اس رپورٹ میں بے
کے مسئلے کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ تاہم آپ یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ واردھا اسکولوں کے طالب
ہمارے موجودہ طالب علموں کی نسبت زیادہ مفید کارکن ثابت ہونگے، چونکہ اس اسکیم کا منشا
"ایسے کارکن پیدا کیے جائیں، جن کو اس بات پر یقین ہو کہ اگر کوئی مفید کام اپنے ہاتھ سے کر
بے عزتی کی بات نہیں، بلکہ عین عزت کی بات ہے اور وہ اس قابل بھی ہوں کہ اپنے پاؤں پ
کھڑے ہو سکیں۔ آپ نے یہ بھی کہا۔ اسکیم کا یہ اقتضا ہرگز نہیں کہ اسکول کا نصاب ختم کرنے کے
بعد حکومت فارغ التحصیل طلبہ کو ملازمتیں مہیا کرے یا یہ کہ موجودہ اسکول فوراً ہی واردھا
کے اسکولوں میں تبدیل کر دیے جائیں۔

۱۲۔ مسلمانوں کی طرف سے عموماً جو یہ بحث شروع ہوئی ہے کہ اسکیم کے مجوزہ اسکولوں میں
تعلیم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور یہ تعلیم بالکل غیر دینی ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے آپ تسلیم
کہ یہ اسکیم مذہبی تعلیم کا کوئی نصاب پیش نہیں کرتی۔ چونکہ اس کے راستے میں بڑی بڑی مش
لیکن اس کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر مذہب کا احترام کیا جائے۔ اگر کوئی جماعت
خرچ پر گورنمنٹ یا بلدیات وغیرہ کے اسکولوں میں طلبہ کو علاوہ اوقات میں مذہبی تعلیم دینا
جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے تو اس میں واردھا اسکیم کی رو سے کوئی تبدیلی نہیں ہوگی
اس میں اس قسم کی تبدیلی کا کوئی اشارہ ہی ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ اسکیم کا یہ منشا ہرگز نہیں
کسی مذہب یا غیر مذہبی رسم کو روکے۔ اس سلسلے میں کسی فرقے کو کوئی خدشہ نہ ہونا چاہیے

۱۳۔ مخلوط تعلیم کے سلسلے میں بھی بعض غلط فہمیاں ہیں۔ واردھا اسکیم کی رُو سے مخلوط تعلیم کو کسی خاص عمر تک لازمی قرار نہیں دیا گیا۔ البتہ اسے لڑکوں، لڑکیوں یا مخلوط اسکولوں میں رائج کیا جا سکتا ہے۔ اس اسکیم میں یہ ذکر نہیں کہ آیا اس قسم کی تعلیم پسندیدہ ہے یا نہیں۔ واردھا اسکیم کی رُو سے والدین کو یہ اختیار حاصل ہے کہ بارھواں سال ختم کر کے چاہیں، تو اپنی لڑکیوں کو اسکول سے ہٹا لیں۔ لیکن اس سے یہ معنی ہرگز نہیں نکلتے کہ اس عرصے تک لازمی طور سے بچے اور بچیاں اکٹھے ہی تعلیم پائیں گے۔

۱۴۔ واردھا اسکیم کے تعلیمی اور سماجی اصول پر روشنی ڈالنے کے بعد آپ اس اعتراض کا ذکر کرتے ہیں کہ "اس اسکیم کی رُو سے یونیورسٹیاں صرف امتحان کرنے کے ادارے ہونگے اور انھیں حکومت کی طرف سے کوئی مالی امداد نہیں ملے گی"۔ اس اعتراض کی تردید کی ضرورت نہیں چونکہ چودہ سال کے اُوپر کی ثانوی تعلیم کے متعلق کوئی ذکر نہیں۔ اگر واردھا اسکیم اختیار کر لی جائے، تو واردھا اسکیم کی تحت میں کوئی اعلیٰ تعلیم کا حل بھی نکالا جا سکتا ہے۔

۱۵۔ واردھا اسکیم کا خلاصہ:-

ا۔ زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ تعلیم دستکاری کے ذریعے دی جائے، لیکن اس کا اولیں مقصد یہ نہیں کہ بیچنے کی غرض سے چیزیں تیار کی جائیں۔

ب۔ کاتنا اور بننا ہی صرف بنیادی دستکاریاں نہیں۔ ایسی اور دستکاریاں بھی شامل کی جا سکتی ہیں جن میں ان کے برابر یا ان سے زیادہ تعلیم دینے کی صلاحیتیں پائی جائیں۔

ج۔ اگر کوئی جماعت مذہبی تعلیم کی ضرورت محسوس کرتی ہے، تو اسکیم کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ اس کی سہولتوں پر غور ہی نہ کیا جائے۔ اور

د۔ اسکیم میں یہ بھی مذکور نہیں کہ اساتذہ کی تنخواہیں براہ راست اسکول کی تیار کردہ اشیا کی

قیمتوں سے ادا کی جائیں گی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے بیان کی وجہ سے کمیٹی کے ممبران کے دماغوں سے وہ خطرہ دور کچھ تو اسکیم مرتب کرنے سے پہلے کے لٹریچر نے پیدا کر رکھا تھا اور کچھ اس رپورٹ کے مصطلح چنانچہ تفصیلات کی بحث کے لیے میدان بہت کچھ صاف ہو گیا۔

۱۶۔ چونکہ ہندوستان کی آبادی کا زیادہ تر حصہ دیہات میں ہے۔ اس لیے اسکیم کے ب والوں نے اپنی تجویزوں کو دانستہ دیہاتی تعلیم تک ہی محدود رکھا۔ اس لیے یہ اسکیم اولاً دیہ کے لیے ہے۔ کمیٹی اس بات پر زور دینا چاہتی ہے کہ یہ اسکیم پہلے دیہات میں جاری اگرچہ کہ "تعلیم بذریعہ دستکاری" کا اصول شہری علاقوں پر بھی ویسا ہی صادق آتا ہے جیسے علاقوں پر۔ لیکن جب تک اس میں ضروری ترمیمیں نہ کر لی جائیں، شہری علاقوں میں جاری نہ کی

۱۷۔ بنیادی تعلیم کے لیے عمر کا تعین۔ ذاکر حسین کمیٹی نے تعلیم کا سات سے چودہ سال ت ہفت سالہ نصابِ تعلیم پیش کیا ہے۔ ممبران اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ اسکول داخل ہو سات سال مقرر ہونے سے بچے کی زندگی کا نہایت ہی ضروری حصہ نظر انداز ہو جاتا ہے۔ لی مشکلات اور دوسری باتوں کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے اُنھوں نے مناسب سمجھا کہ سات سے کم عمر کے بچے کو لازمی تعلیم شروع کرادی جائے۔ یہ خیال ان کے ذہن میں ضرور تھا کہ ایسے کے لیے حکومت کی طرف سے پرورش گاہیں یا بالکوں کے مدرسے کھول دیے جائیں گے۔

۱۸۔ تمام ترقی یافتہ ملکوں میں اسکول داخل ہونے کی اوسط عمر پانچ یا چھے برس ہے۔ تک کہ ہندوستان میں بھی موجودہ طریقِ تعلیم کے مطابق چھے برس کے لگ بھگ عمر کے بچے مدر داخل کیے جاتے ہیں۔ تعلیمی لحاظ سے بچے کی عمر کا یہ حصہ بے حد اہم ہے۔ اس اہمیت کے خ اکثر ممبروں نے اس بات کو ترجیح دی کہ لازمی تعلیم کے لیے چھے سے چودہ برس کی عمر مقرر ہونا

لیکن پانچ برس کے نیچے کو بھی اسکول سے باہر نہ رہنا چاہیے۔ اس بات پر سب متفق تھے کہ جبری تعلیم کو ہمہ گیر بنانے کے لیے قانون بنانا زیادہ موثر ثابت نہیں ہوگا۔ یہ طریق کار دانشمندانہ نہیں اور ناقابل عمل بھی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جو مشکلات پیش آئیں، ان کا مقابلہ کرکے جبری تعلیم کو جلد از جلد عام کرنا چاہیے۔

۱۹۔ جن جن صوبوں میں جبری تعلیم جاری ہے، وہاں تعلیم کے لیے چھے سے گیارہ برس تک عمر مقرر کی گئی ہے (ضمیمہ ۲) کمیٹی اس بات پر متفق ہے کہ گیارہ کے بجائے چودہ کی حد مقرر کردی جائے۔ واردھا اسکیم کے حامی اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اگر جبری تعلیم کے لیے سات برس سے کم عمر کا عرصہ مقرر کرنا ہو، تو یہ سات، چودہ سے نیچے کو گننا چاہییں (گویا سات سے چودہ تک) چھے سے اوپر کو نہ گننا چاہییں۔ دوسرے لفظوں میں گویا نو سے چودہ سال تک جبری تعلیم چھے سے گیارہ تک کی جبری تعلیم کی نسبت زیادہ بہتر ہے۔ اس دعوے کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ موجودہ واقعات میں ابتدائی بچپن کی تعلیم چنداں سود مند نہیں ہوتی۔ اس عمر میں بچوں کی تعلیم پر خرچ زیادہ اٹھتا ہے۔ تعلیمی ترقی کوئی نہیں ہوتی۔ اس عمر میں تعلیم دینا گویا سرمایے کا ضائع کرنا ہے۔ لڑکپن اور بلوغت کی تعلیم میں بچپن کی نسبت زیادہ فائدے کے موقعے ہیں۔ اگر عمر کی حد بڑھادی جائے، تو شہریت اور سماجی نشو و نما زیادہ بہتر طریقے سے ہوسکے گی۔ حرف شناسی اور صنعتی مہارت زیادہ صحیح طور سے تربیت پاسکیگی۔

۲۰۔ کمیٹی نے جب یہ سفارش کی تھی کہ جبری تعلیم کے لیے عمر چھے سے چودہ برس تک مقرر کی جائے، تو وہ مالی اور دوسری مشکلات سے خصوصاً اچھے معلموں کی فراہمی سے بے خبر نہ تھی۔ کمیٹی کو اس بات کا احساس ہے کہ جبری تعلیم کا انحصار مختلف صوبوں کے مالی اور دیگر وسائل پر ہے۔ بعض ممبر اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ جبری تعلیم چھے سال سے شروع ہو اور چودہ سال تک جاری رہے۔

۲۱۔ تعلیم کے درجے۔ واردھا اسکیم کی تحت جتنے اسکول جاری ہونگے، سب کے سب بنیادی

ہونگے۔ اس لیے پرائمری یا ثانوی جماعتوں یا درجوں کے نصابی ناموں میں کسی قسم کا فرق نہ
پرائمری اور ثانوی تعلیم کے درجے اپنی اپنی جگہ نہایت واضح ہیں۔ ہر ایک کا نصب العین ا
اور ہر ایک کے معیار اور طریقے بھی اپنے اپنے ہیں۔ یہ فرق جو ان درجوں کے معیار اور طریقوا
اسے نظر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ ہیڈو رپورٹ میں اس سلسلے میں تفصیل سے بحث ہو چکی۔
سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن نے اپنے پہلے اجلاس میں جو ۱۹۳۵ء میں منعقد ہوا تھا
کے نظم و نسق کے سلسلے میں یہ سفارش کی تھی کہ پرائمری کا درجہ چار سالوں پر مشتمل ہو اور اعلیٰ د
سالوں پر۔ وڈ ایبٹ رپورٹ کے مصنفوں نے بھی اس مجوزہ ترمیم کی تائید کی ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ ہر صوبہ میں پرائمری یا ثانوی یا مڈل کی تعلیم میں فرق ہوتا ہے۔ بعض صوبوں میں ا
کو ظاہر کرنے والی حد چوتھی جماعت کے اخیر میں ظاہر ہوتی ہے اور بعض صوبوں میں پانچویں جما
کے اخیر میں۔ کمیٹی یہ محسوس کرتی تھی کہ اس سلسلے میں کوئی سفارش کرنا ضروری نہیں۔ کیونکہ
واردھا اسکیم کے آخری خاکے کو اعلیٰ تعلیم سے ربط دینے کا وقت آئیگا، تو اس مسئلے پر پور
سے غور کیا جائیگا۔ اس بات پر سب کا اتفاق تھا کہ اینگلو ورنیکلر یا دوسرے اسکولوں میں
تو اُس کے لیے یہ شرط ہے کہ طالب علم پانچویں جماعت پاس کرلے یا اس کی عمر گیارہ برس
زیادہ کی ہو جائے۔

۲۲۔ ذریعۂ تعلیم۔ واردھا اسکیم میں یہ بات طے ہوئی ہے کہ تعلیم مادری زبان کے ذ
دی جائیگی، یعنی طالب علموں کی اپنی زبان میں۔ وڈ ایبٹ رپورٹ میں بھی یہی سفارش کی گ
اور اس سے اختلاف کسی کو کیا ہوگا؟ اگرچہ کہ یہ بات بھی ان کے علم میں تھی کہ بعض صوبوں میں
ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں، اس لیے دقتیں بھی پیش آئیں گی۔ اس کے باوجو
سب نے اتفاق رائے سے منظور کیا۔ اس سفارش کے سلسلے میں کمیٹی یہ بات واضح کر دینا چاہ

کہ مادری زبان سے مقامی بولی زبان مراد ہے، وہ زبان مراد نہیں جو عام بول چال میں استعمال ہوتی ہو۔

۲۳- ہندوستانی - اس اسکیم کے مطابق ہندوستانی کو اسکول کے نصاب میں لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ طالب علم جو ان بنیادی اسکولوں میں تعلیم پائیں، ایک عام مشترکہ زبان میں کافی آگہی حاصل کر کے نکلیں۔ کمیٹی نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ جن جن علاقوں میں ہندوستانی بولی جاتی ہو۔ وہاں کی مادری زبان یہی ہونا چاہیے، لیکن طالب علموں اور معلموں کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ دونوں رسم الخط سیکھیں تاکہ اردو اور ہندی دونوں طرز میں لکھی ہوئی کتابوں کو پڑھ سکیں۔ جہاں جہاں ہندوستانی نہیں بولی جاتی اور مقامی زبان ہی وہاں کی مادری زبان ہے، ان علاقوں کے اسکولوں میں پانچویں اور چھٹے برس میں ہندوستانی کی تعلیم لازمی ہونا چاہیے۔ لیکن طلبہ کو اختیار ہوگا، چاہے اردو رسم الخط سیکھیں یا ہندی لیکن چونکہ معلموں کو دونوں طرح کے طالب علموں سے سابقہ پڑتا ہے، اس لیے ان کے لیے ضروری ہے کہ ہر دو میں دسترس رکھتے ہوں کمیٹی اس بات کو بھی پسند کرتی ہے کہ ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان ہونا چاہیے، یعنی ہندوستانی۔ اور یہ مشترکہ زبان اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے۔ اگرچہ بعض کا یہ خیال بھی ہے کہ اگر رسم الخط "رومن" اختیار کر لیا جائے، تو اس سے پڑھنے پڑھانے کی بہت سی دقتیں جاتی رہیں گی اور اس سے مختلف فرقوں کے درمیان یگانگت پیدا ہو جائیگی۔ یہ خدشہ ہے ممکن ہے کہ بچوں پر ایسا رسم الخط اختیار کرنے کے لیے ناجائز دباؤ ڈالا جائے، جسے وہ پسند نہیں کرتے۔ خاص طور سے ایسے اسکولوں میں جہاں پر مختلف رسم الخط اختیار کرنے والے بچوں کی تعداد کم ہو۔ کمیٹی اس بات پر زور دینا چاہتی ہے کہ رسم الخط انتخاب کرنے کے سلسلے میں بچوں کو پورا پورا اختیار ہونا چاہیے اور انھیں اس رسم الخط میں تعلیم دینے کے لیے آسانیاں بھی بہم پہنچانا چاہییں۔

پنجاب کے اسکولوں میں تعلیمی پستی

اسباب اور تدارک

از

لالہ بشن داس، ایم اے، بی ٹی

موجودہ زمانے کا نہایت ہی اہم مسئلہ تعلیمی پستی کا ہے۔ ہر شخص شاکی ہے کہ آج سے بیس پچیس برس پہلے کے تعلیم یافتہ موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ اشخاص سے زیادہ قابل ہوتے تھے اور یہ کہ اس زمانۂ تعلیم میں طلبہ محنت کرنے کے زیادہ عادی ہوتے تھے اور آجکل کے طلبہ سست ہیں۔ فی زمانہ خرچ فی طالب علم بھی زیادہ اُٹھتا ہے لیکن اس کا نتیجہ اُمید افزا نہیں۔ آخر کیوں؟ ذیل میں ہم اس کے اسباب پر فرداً فرداً بحث کرینگے اور ان کے تدارک کی تدبیریں بھی پیش کریں گے:۔

تعداد طلبہ۔ کسی اسکول کے ایک کمرے کا جائزہ لیجیے۔ آپ کو طلبہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا نظر آئیگا۔ کسی جماعت میں تیس چالیس سے تو کیا کم طالب علم ہوں گے۔ ایک مدرس کے لیے طلبہ کی اتنی بڑی تعداد کو تعلیم دینا آسان بات نہیں۔ وہ لاکھ کوشش کرے، اتنے زیادہ طلبہ کو انفرادی طور پر توجہ نہیں دے سکتا۔ آج سے بیس برس پہلے تعداد طلبہ بہت کم ہوتی تھی۔ مدرسین جماعتی طریق کے ساتھ انفرادی طریقِ تعلیم کو بھی استعمال کرتے تھے اور اس طرح تعلیم بہتر ہوتی تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں دیہاتی پرائمری اسکولوں کی اوسط تعدادِ طلبہ ۲۵ کے قریب ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی کم۔ ہر جماعت میں تین چار طالب علم ہوتے تھے۔ انھیں تعلیم دینے کا کام بہت آسان ہوتا تھا۔ اب دیہاتی اسکولوں میں تعداد بہت بڑھ گئی ہے اور قصباتی اسکولوں میں ان سے بھی کہیں زیادہ ہوگئی ہے۔ طالب علم کی انفرادی ترقی

مدرس کے لیے اب باعث تسکین نہیں رہی۔ مڈل اسکول ہو یا ہائی، مدرس سے اب یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ پاس شدہ طلبہ کی فیصدی تعداد اچھی دکھائے۔ اگر کوئی مدرس انفرادی طور پر کسی ذہین طالب علم کی طرف توجہ دے کر اُسے اچھے نمبر حاصل کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن مجموعی طور پر پاس ہونے والے طلبہ کی فیصدی اوسط کم ہے، تو مدرس اس نتیجے پر فخر نہیں کر سکتا۔ منتظمانِ اسکول یا انسپکٹر صاحبان کی نظر پاس شدگان کی تعداد کی طرف ہوتی ہے، خواہ اس کے لیے کوئی سا ذریعہ اختیار کیا گیا ہو۔ اس لیے مدرسین کا بھی اسی رو میں بہہ نکلنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں انفرادی طریق تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ اس لیے ضروری ہے کہ طلبہ کی تعداد کم کی جائے۔ میرے خیال میں تیس سے زیادہ طالب علم کسی جماعت میں نہیں ہونے چاہییں۔ ڈالٹن پلین میں بھی انفرادی توجہ پر زور دیا گیا ہے۔ یہ طریقے پنجاب میں ابھی اچھی طرح استعمال نہیں ہوتے۔ ان کے لیے کافی سامان کی ضرورت ہے اور ہمارے یہاں کے اسکول اس کے متحمل نہیں ہو سکتے اور نہ حکومت ہی اس قدر زیادہ روپیہ خرچ کر سکتی ہے لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہیں، تو ہمیں ایسے اخراجات کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔ یہ اخراجات جائز ہیں۔ نارمل اور ایس وی جماعتوں کے متعلموں کو یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے، وہ انفرادی طریق کے ذریعے طلبہ کی لیاقت بڑھانے میں کوشاں رہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ پرائمری اسکولوں میں ڈالٹن پلین پر عمل کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ تاہم انفرادی طور پر طلبہ کی بہتری میں کوشاں ہونا مشکل نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نیک نیتی سے کام کیا جائے۔

۲۔ مدرس۔ زمانۂ ماضی اور زمانۂ حال کے مدرسین میں بھی ہم بہت فرق دیکھتے ہیں۔ زمانۂ حال کا مدرس پہلے کی طرح مہربان، متواضع اور بے لوث نہیں رہا۔ پرانے وقتوں کے مدرس قناعت اور نیکی

کا مجسمہ ہوتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں روحانی باپ ہوتے تھے۔ آجکل ہم اپنے آپ کو صرف ا
سمجھتے ہیں۔ ہمیں پدرانہ محبت سے کوئی سروکار نہیں رہا اور یہ قدرتی بات ہے کہ بچے بھی ہمیں
نظر سے نہ دیکھیں۔ مدرسین طلبہ کے اس جوابی فعل سے شاکی ضرور ہیں، لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش
کر دیتے ہیں کہ اس بات کے وہ خود ذمے دار ہیں، طالب علم نہیں۔

موجودہ زمانے کے مدرس کے متعلق مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ وہ جب کالج سے فارغ
ہو کر نکلتا ہے، تو وہ نئی تہذیب میں پوری طرح سے رنگا ہوتا ہے۔ وہ باقی تمام باتوں کی نسبت ا
لباس اور وضع قطع کا زیادہ خیال رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک مدرس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ا
لباس برجستہ ہو۔ اس کی جیب میں ریشمی رومال ہو۔ نکٹائی بھی درست لگی ہو، خوشبو بھی لگائی جا
خط کی تراش بھی موزوں ہو، تاکہ طالب علم اس کی عزت کریں۔ گویا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی عزت کا با
لباس اور وضع قطع ہے، اس کی علمیت اور لیاقت نہیں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ چست پوش
مدرس کو نہ پہننا چاہیے اور اپنی ہیئت ظاہری کی پروا نہ کرنا چاہیے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں
لباس کے معاملے میں سادگی اور کفایت شعاری کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ بچوں کی طبیعت میں نقل
کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ وہ اُستاد کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور اس نمود و نمائش کی تقلید نہ صرف یہ کہ
کے والدین پر بار ثابت ہوگی، بلکہ ممکن ہے کہ اس سے ان کی اخلاقی زندگی پر بھی بُرا اثر پڑے۔ لب
کے سلسلے میں ضروری بات یہ ہے کہ سادہ ہو اور صاف ستھرا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ بچوں کے
استہزا کا موجب بنے۔ اس صورت میں خرچ کی بچت بھی ہوگی اور اُستاد ایک صحیح نمونہ بھی پیش کر
لیکن یہاں صورت بالکل برعکس ہے۔ اساتذہ نمود و نمائش کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اخراجات
زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ اخراجات کی زیادتی کے سبب اُستاد ہر ممکن طریق سے زیادہ روپیہ کمانے
کوشش کرتے ہیں۔ شہروں میں ٹیوشن کا رواج ہو گیا ہے۔ بعض مدرس کتابیں اور خلاصے لکھ کر

کماتے ہیں اور یہی خلاصے تعلیم کی جڑ کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ ان خلاصوں کی وجہ سے طالب علم اُستاد پر بھروسہ نہیں کرتے اور نہ ہی جماعت میں توجہ کرتے ہیں۔ دیہات کے مدرس بیوپار کرنے لگ جاتے ہیں یا طبابت وغیرہ کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کی توجہ دو طرف ہونے لگتی ہے اور تعلیمی کام اچھی طرح نہیں ہو سکتا۔ یہ سب اس لیے بھی ہے کہ اخراجات بڑھے ہوئے ہیں تنخواہیں ان کی کفیل نہیں ہو سکتیں اور اس لیے بھی کہ تنخواہیں بہت کم ہیں۔ ضرورت ہے کہ محکمہ مدرسین کی تنخواہیں بڑھا دے۔ محکمہ کو اس بات کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ کساد بازاری کے سبب سستے مدرس نہ رکھ لیے جائیں۔ مدرس کا سب سے پہلا حق دلی سکون ہے۔ اگر کمی تنخواہ کے سبب وہ ہر وقت فکرمند رہتا ہے، تو اُس کا سبق کامیاب نہیں ہو سکیگا۔ اکثر قومی اسکولوں میں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ چار پانچ سال کے بعد جب مدرس کی تنخواہ زیادہ ہو جاتی ہے تو اس کو کسی نہ کسی بہانے سے الگ کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ کم تنخواہ لینے والے معلم سے پُر کر دی جاتی ہے۔ محکمہ تعلیم یا پبلک نے ایسے اسکولوں کے متعلق کوئی انتظام نہیں کیا۔ اگر پبلک اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیمی معیار پر لانا چاہتی ہے۔ تو مدرس کے دلی سکون کا ہر ممکن انتظام کرنا چاہیے۔ چند سال ہوئے ایک تحقیقاتی کمیشن نے محکمہ تعلیم کی توجہ اس امر کی طرف دلائی تھی اور سفارش کی تھی کہ مدرسین کی تنخواہیں بڑھائی جائیں اور ٹیوشن سسٹم بند کر دیا جائے۔ محکمہ تعلیم نے ٹیوشن سسٹم یا تو بند کر دیا یا محدود لیکن تنخواہوں کے متعلق کوئی ہمدردانہ غور نہ کیا۔

۳۔ **افسرانِ معائنہ**۔ جہاں معلمین اور متعلمین اس پستی کے ذمے دار ہیں۔ وہاں افسرانِ معائنہ بھی اس ذمے داری سے بری نہیں ہو سکتے۔ انسپکٹر صاحبان نکتہ چینی زیادہ کرتے ہیں۔ اور ارادی یا غیر ارادی طور پر سمجھاتے بھی خود ہی ہیں کہ فرضی کام دکھانا ہی کافی ہے۔ مدرسین سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اُردو یا انگریزی میں زیادہ سے زیادہ مرتبہ انشا پردازی کرائیں یا جغرافیہ کے نقشہ جات بنوائیں اور انھیں باتوں سے ان کے سال بھر کے کام کی جانچ ہوتی ہے۔ گویا مدرس کے کام کا اندازہ اس بات

سے نہیں لگایا جاتا کہ طلبہ صحیح طور سے مضمون لکھ سکتے ہیں یا نہیں، بلکہ اس بات سے کہ مدرّ
طلبہ کو کتنی دفعہ انشا پردازی کرائی اور کتنی مرتبہ انھیں درست کیا۔ گزشتہ وقتوں میں معائنہ
وقت طلبہ کو سادہ مضمون لکھوا کر ان کی لیاقت کا امتحان کیا جاتا تھا۔ مضامین کی کاپیوں کو
نہیں۔ میں نے چھٹی سے دسویں تک مشکل سے بیس دفعہ انگریزی کی کمپوزیشن لکھی ہوگی اور ا
کے باوجود میں انٹرنس میں خاصی اچھی انگریزی لکھ سکتا تھا۔ اب مدرسین چالیس چالیس مضم
خطوط وغیرہ سال بھر میں لکھوا دیتے ہیں اور ان کو درست کرکے یا ان پر دستخط کرکے طلبہ ک
کر دیتے ہیں اور پھر نیا کام دے دیتے ہیں۔ طلبہ کو اپنی اپنی غلطیوں پر غور کرنے، ان کو
اور ان کو درست کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اگر مدرس طلبہ کی غلطیاں ان کے سا
کرے یا اُن سے ہی درست کرائے، تو طلبہ زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں لیکن چونکہ اس صورت
زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے افسران یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مدرس محنتی نہیں۔ چنانچہ مدرسین مجبو
ہیں کہ وہ درسی کتب کو ضرور ختم کرائیں۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ علم طلبہ کے دماغ میں ٹھو
کوشش کی جاتی ہے۔ طلبہ اپنے سبق پر غور نہیں کر سکتے اور اس پر اچھی طرح حاوی نہیں
افسرانِ معائنہ اگر زیادہ کام کے بجائے تھوڑا مگر ٹھوس کام دیکھنے کی کوشش کریں، تو اب
پہلے سے دن لائے جا سکتے ہیں۔ تعلیم کے علاوہ مدرّس سے کئی اور کاموں کی توقع کی جاتی
افسران سکوٹنگ، ڈرل، باغبانی وغیرہ کی طرف بہت دھیان دیتے ہیں۔ تعلیمی کام کو ثانو
سمجھا جاتا ہے۔ مدرس یہ سمجھتا ہے کہ اگر نمائشی کام درست ہوگا، تو انسپکٹر صاحب خوش ہو
اور کسی حد تک یہ ہے بھی درست۔ ہمارے ٹریننگ اسکولوں میں کھرپہ وغیرہ کا استعمال
کرایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے علمی معیار کو بلند کرنے اور اس میں مطالعہ کا ذوق پیدا کرنے
کوشش نہیں کی جاتی۔ مدرس کے فرائض بڑھ گئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ وہ کسی

بھی خوش اسلوبی سے انجام نہیں دے سکتا۔

۴۔ طالب علم کی عمر و جسمانی صحت وغیرہ۔ محکمۂ تعلیم کی مقرر کردہ حد کے مطابق ۵ سال کا بچہ پہلی جماعت میں داخل ہو سکتا ہے۔ مدرسین چونکہ تعداد طلبہ زیادہ کرنے کے درپے ہوتے ہیں، وہ سب پانچ سال کے بچوں کو یا بعض دفعہ اس سے ذرا کم عمر کے بچوں کو بھی داخل کر لیتے ہیں اور کاغذات میں ان کی عمر پانچ سال ہی درج کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کے دماغ پر قبل از وقت بوجھ پڑنا شروع ہو جاتا ہے اور بڑا ہو کر اس کا دماغ مشکلات کو حل کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کی صحت پر بھی بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ پہلے وقتوں کے طالب علم بڑے قد کے اور زیادہ طاقتور ہوتے تھے۔ اب اسکولوں کے طلبہ کی اوسط عمر مقابلتہً کم ہے اور جسمانی صحت کمزور۔ جسمانی کمزوری، دماغی اور روحانی کمزوری کا پیش خیمہ ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ اگر ہم اپنے بچوں کے تعلیمی معیار کو بلند کرنا چاہیں، تو چھے سال سے کم عمر کے بچے کو مدرسے میں داخل نہ کریں۔ میرا قیاس ہے کہ پانچ سال عمر کی حد مقرر کرنے سے محکمہ کا منشا یہ نہ تھا کہ اس عمر کے سب بچے داخل کیے جائیں۔ یہ تو عمر کی کم از کم حد تھی لیکن مدرسین نے بچوں کو پانچ سال تک پہنچنے سے پہلے داخل کرنے کے ہی جال بچھا لیے۔ میرا خیال ہے کہ داخلے کی عمر کی حد چھے سال ہو جانی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بچے کم سنی سے ہی بڑے ذکی و ذہین ہوتے ہیں۔ چھے سال تک فارغ رہنے سے ممکن ہے، ان کی تربیت میں حرج واقع ہو۔ ایسے بچوں کے والدین کو چاہیے کہ وہ اُنھیں گھر پر ضروری تعلیم دیں لیکن مدرسے کی باقاعدہ تعلیم چھے سال سے ہی شروع ہونی چاہیے۔ بچے کی خوراک کا خاص خیال رکھ کر اس کی صحت کو قائم رکھنا والدین اور مدرسین کا نہایت ضروری فرض ہے۔ ان کے لیے خالص دودھ کا مہیا کرنا ضروری ہے، اور ورزش کا انتظام کرنا لازمی۔ فٹ بال و ہاکی کے علاوہ دیسی کھیلیں بھی کھلائے جائیں۔

۵-فی صدی نتیجہ-ایک اور قباحت فی صدی نتیجے کی ہے۔کسی پبلک امتحان کا پرچہ مشکل آجائے، تو اخبارات میں آرٹیکل نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ہیڈ اگزیمینرز کو کوسا جاتا ہے۔ یونیورسٹی ہدایتیں جاری کرتی ہے اور ان بیچاروں کو اپنا معیار بہت کم کرنا پڑتا ہے، تاکہ زیادہ طالب علم فیل نہ ہو جائیں اور کہیں آئندہ کے لیے یونیورسٹی انھیں اگزیمینر بنانے سے ہی انکار کر دے۔اس صورت سے دن بدن قابلیت کا معیار کم ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ معیارِ تعلیم بھی۔معیارِ امتحان یقیناً اونچا ہونا چاہیے اور ایسا کہ جس سے طالب علم کی اصلی لیاقت کی پرکھ مقصود ہو، نہ کہ اس کے حافظے کی۔

اشتہار

تختِ طاؤس

مصنفہ

مولوی محمد عبد اللطیف خان کشتہ قادری

یہ کتاب مولانا کشتہ قادری کی ہفت سالہ تحقیقی و تفتیشی مساعی کا نتیجہ ہے تختِ طاؤس عہدِ مغلیہ کی زرگری، جواہر تراشی و خوش مذاقی کا مرقع تھا اور اس کی صنعت، صنعتِ ایران و ہندوستان کا ایک دلآویز سنگم تھی جس کی زیارت کے لیے دور دور کے ملکوں کے لوگ صعوباتِ سفر ہنسی خوشی برداشت کر کے آتے اور تازگیِ نظر و تفریحِ قلب و تحیر کا پرشاد لے کر جاتے اور یہ تبرک مدتِ دراز تک ان کو تر زبان و خوش بیان رکھتا تھا۔ کتاب ہذا اسی بے مثل تخت کے وقائع تاریخی پر مشتمل ہے۔ حقیقتاً اس تخت کے پردے میں ایشیائی دماغی لطافتوں کے سینکڑوں مرقعے چھپے ہوئے تھے۔ جن کو منظرِ عام پر لا کر مولانائے موصوف نے ملک و قوم پر ایک زبردست احسان کیا ہے اور ان کی یہ کد و کاوش قابلِ شکر گزاری ہے۔

ہمارے یہاں کی بہت کم تاریخی کتب ایسی ہیں، جن میں وسعتِ مطالعہ، غور و تحقیق، تفتیش، تنقیدِ علمی و منطقی استدلال و آزادہ خیالی سے کام لیا گیا ہو اور اُن کے مؤلفین و مصنفین نے روایت و درایت کی علمی و منطقی جانچ پڑتال کی ہو۔ اپنی طبیعت سے کسی نتیجے پر پہنچے ہوں۔ پیچیدہ مسائل کو تقسیم و تحلیل کرتے ہوئے کوئی انکشاف کیا ہو اور اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھا کر اس طرح ترتیب دیا ہو کہ اُن کی اصلی حالت نمایاں طور پر نظر آنے لگے مگر پیشِ نظر کتاب تاریخ "تختِ طاؤس" ان تمام اوصاف سے متصف ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

دیہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لئے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس کا مضمون حال ہی میں ورنیکلر فائنل امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لئے مخصوص ہوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر جامع کتاب نہ تھی۔ طلبہ کی اس دقت کا احساس کرتے ہوئے زر کثیر صرف کر کے مجوزہ سکیم کے عین مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ بہ سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب برائے جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے۔ جس کی عبارت نہایت سادہ اور عام فہم ہے اور ہر امر کو روزمرہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ تصاویر سے واضح کیا گیا ہے اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے۔ سلسلہ ہذا طلبہ کے لئے ہر لحاظ سے مفید ہے۔ اس مطالعے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان و دیگر سکولوں کے مدرسین اصحاب اپنے مدارس میں جاری کرا کے جہاں ہمیں ممنون و مشکور فرمائیں۔ وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبودی میں بھی خوشی محسوس کریں گے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت	۵ آنے	۴ پائی	
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	"	۵ "	۲ "	
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	"	۷ "	۱۰ "	
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	"	۱۴ "	۲ "	

المشتہر

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز۔ لاہور

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر		۱۹	کام کی باتیں حصۂ اوّل	۳ر۹ پائی
	رام سروپ کوشل	۶ر	۲۰	〃 〃 حصۂ دوم	۳ر۹ 〃
۲	〃 〃 دوسری 〃 〃	۷ر۴ پائی	۲۱	قصصِ ہند حصۂ اوّل	۲ر۳ 〃
۳	〃 〃 تیسری 〃 〃	۹ر۹ پائی	۲۲	〃 حصۂ دوم	۸ر۲ 〃
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر	۲۳	قصصِ ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۵	〃 〃 دوم	۵ر	۲۴	حسینہ اور وحشی	۱ر۵ 〃
۶	〃 〃 سوم	۷ر	۲۵	شہزادہ مہربان	۲ر۶ 〃
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر	۲۶	راماسیتا	۱ر۱۰ 〃
۸	〃 〃 دوم	۳ر۷ پائی	۲۷	جادو کا مٹکا مسٹر لیارام	۳ر
۹	〃 〃 سوم	۷ر	۲۸	دروپدی	۱ر۸ 〃
۱۰	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲ر۹ پائی	۲۹	مہاراجہ رنجیت سنگھ	۴ر۶ 〃
۱۱	〃 〃 نمبر ۲	۳ر۱۰ 〃	۳۰	خلیفہ ہارون الرشید	۴ر
۱۲	〃 〃 نمبر ۳	۵ر۲ 〃	۳۱	راجا اشوک	۵ر
۱۳	انوار سہیلی کے انمول موتی		۳۲	مہارانا پرتاپ	۲ر۱ پائی
	〃 〃 حصہ ۱ 〃	۲ر۸ 〃	۳۳	شہاب الدین شاہجہان . .	۲ر۱۰ 〃
۱۴	〃 〃 حصہ ۲ 〃 〃	۴ر۱۰ 〃	۳۴	شیر شاہ سوری . . .	۲ر۱۱ 〃
۱۵	〃 〃 حصہ ۳ 〃 〃	۵ر۲ 〃	۳۵	نصیر الدین ہمایوں . .	۲ر۱۰ 〃
۱۶	دلچسپ تاریخی کہانیاں		۳۶	اورنگ زیب عالمگیر . .	۲ر۹ 〃
	حصۂ اوّل	۷ر 〃	۳۷	شہاب الدین غوری . . .	۲ر۸ 〃
۱۷	〃 〃 حصہ دوم 〃	۸ر۱۱ 〃	۳۸	سلطان علاؤالدین خلجی .	۲ر۱۱ 〃
۱۸	〃 〃 حصہ سوم 〃	۷ر	۳۹	فیروز الدین تغلق	۳ر

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

اشتہار

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۰	نورالدین جہانگیر . .	۲/۳ پائی	۶۵	جوتی موتی	۲/۱۰ پائی
۴۱	امیر تیمور	۲/۷ //	۶۶	جواہرات خزانہ . . .	۳/۷ //
۴۲	پرتھوی راج	۲/۷ //	۶۷	چھوا اور سونا ہوا (باتصویر)	۲/
۴۳	محمود غزنوی	۲/۶ //	۶۸	علی بابا چالیس چور	۴/
۴۴	مصر کی داستان . . .	۳/	۶۹	علاؤالدین و عجیب و غریب لیمپ . .	۴/۶ پائی
۴۵	جاپان کی کہانی . . .	۴/			
۴۶	چین کی کہانی	۳/۶ پائی	۷۰	ملا دو پیازے کا سفر . . .	۳/
۴۷	مستورات چین و جاپان . .	۴/	۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳/
۴۸	ایران کی کہانی	۳/۶ //			
۴۹	ایشیائی روم	۲/۷ //	۷۲	نیشاپور کا سوداگر	۲/۱۱ پائی
۵۰	ٹرکی (یورپی روم) . . .	۲/۷ //	۷۳	پرستان کا موچی	۳/
۵۱	لنکا	۱/۱۱ //	۷۴	سندر پیاری	۳/
۵۲	بصرہ و بغداد	۵/	۷۵	چاندی کی کنجی	۳/
۵۳	یونان	۲/	۷۶	سلک جواہر نمبر۱ (حکمرانی کا گُر)	۲/۶ پائی
۵۴	تین سوال	۲/۷ پائی	۷۷	// // نمبر۲ (اوج و پستی)	۱/۶ //
۵۵	امرت ورشا	۳/۱۰ //	۷۸	// // نمبر۳ (شہید الفت)	۱/۶ //
۵۶	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبر۱ داؤد بادشاہ	۳/۹ //	۷۹	سلک جواہر - مرد میدان	۱/۶ //
			۸۰	// // نیک و بد	۱/۹ //
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اول	۳/۹ //	۸۱	// // عیب و ہنر	۱/۴ //
			۸۲	// // جہاں گرد	۱/۶ //
۵۸	// // دوم //	۴/۵ //	۸۳	// // جواب باصواب	۱/۱۰ //
۵۹	خوفناک خواب	۲/	۸۴	// // سخاوت کی انتہا	۱/۲ //
۶۰	ہیرا لال	۲/۶ //	۸۵	// // حسن تدبیر	۱/۶ //
۶۱	دولت کی پٹاری	۲/۱ //	۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہرت	۱/۳ //
۶۲	سادھو کی چکی	۲/	۸۷	ڈرامہ غم خوار عالم	۱/۷ //
۶۳	نیلا باز	۲/۱۱ //	۸۸	مہاراجہ بکرماجیت اور اس کا تخت	۱/۶ //
۶۴	بہادر شہزادہ	۲/۱ //			

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

جلد (۶)	ستمبر ۱۹۳۹ء	نمبر (۶)

فہرستِ مضامین

۱	ایڈیٹوریل		۱
۲	مضمون نویسی بذریعہ افسانچہ	شیخ خادم محی الدین	۵
۳	کامیاب سبق	نذیر احمد ایم اے	۱۰
۴	سنٹرل ایڈوایزری بورڈ محکمہ تعلیم ہند اور وار دھا اسکیم	مقبول بیگ	۱۹
۵	ترکی میں تعلیم		۳۲
۶	ہربرٹ سپنسر کا نظریۂ تعلیم	شیخ غلام جیلانی، ایم اے	۴۲
۷	تعلیمِ بالغاں	نیاز الدین احمد، بی اے	۵۰

ایڈیٹوریل

تعلیم بالغاں کے سلسلے میں اس وقت اہم ترین سوال یہ ہے کہ اس تعلیم کو جلد از جلد رائج کرنے کے لیے کون کون سے ذرائع اختیار کیے جائیں۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے یورپ کے ترقی یافتہ ممالک کے تجربات ہمارے لیے دلیل راہ بن سکتے ہیں۔ اس لیے ہم یہاں اختصار کے ساتھ اُن کا ذکر کریں گے۔ سب سے پہلے جب ان ممالک کی حکومتوں نے تعلیم عامہ کے مسئلے پر غور کیا، تو وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ لازمی ابتدائی تعلیم کے بغیر تعلیم بالغاں کا خیال کرنا محض عبث ہے۔ اس لیے انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے ممالک میں پہلے ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سالوں میں وہاں نوّے اور سو فیصدی کے درمیان اشخاص لکھنا پڑھنا سیکھ گئے اور اس وقت وہاں تعلیم بالغاں کے معنی نوشت و خواند ہی نہیں، بلکہ کلچرل اور شہری تعلیم کے ہیں۔ اس کے برعکس چونکہ ہمارے ملک میں صرف آٹھ فیصدی اشخاص لکھے پڑھے ہیں۔ یہاں بالغوں کی تعلیم کافی عرصے تک نوشت و خواند تک ہی محدود رہیگی۔ لیکن اگر ہمارے ملک میں ابتدائی تعلیم صحیح معنوں میں لازمی قرار دی جائے، تو ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ پندرہ بیس سال کے بعد یہاں خواندگی کی اوسط بہت بڑھ جائیگی اور پھر شاید

ہم بھی تعلیمِ بالغاں کو انھیں معنوں میں سمجھنے لگ جائیں، جن معنوں میں آجکل یورپ
ترقی یافتہ ممالک سمجھتے ہیں۔ لازمی ابتدائی تعلیم کے بغیر تعلیم بالغاں پر زور دینا
ہی ہے کہ ایک درخت سے ہم اچھے پھلوں کی تو اُمید رکھیں، لیکن جس زمین میں
پرورش پاتا ہے، اُس کی طرف دھیان نہ دیں۔

دوسری بات جو ہم ان ممالک سے سیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ تعلیم عامہ کی ذ
زیادہ تر سٹیٹ کے کندھوں پر ہی ہونی چاہیئے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے
ممالک میں انفرادی طور پر اشخاص یا انجمنیں اس کام میں حصّہ نہیں لیتی رہیں، بلکہ
ممالک میں تو اُن کی خدمات اور حسن کارکردگی کا اعتراف سنہرے الفاظ میں ہوتا رہا۔
اور جن اشخاص نے ان سے فائدہ اُٹھایا ہے، وہ ابھی تک ان کے مرہونِ منت
لیکن جہاں تک ایک ملک کی کل آبادی کو خواندہ کرنے کا سوال ہے، اس پر کوئی ذ
انسان اعتراض نہیں کرسکتا کہ اسے سوائے ملکی حکومت کے اور کوئی واحد طاقت
نہیں کرسکتی۔ کیونکہ اشخاص یا انجمن کی مالی حیثیت اس اہم ذمّے داری کو پورا کرنے
لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ ہاں وہ اس کام میں سٹیٹ کا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ لیکن اس
کام کی زیادہ تر ذمّے داری حکومت کے سوائے کسی اور پر عائد نہیں ہوسکتی اور
ہونی چاہیئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ذاتی اور اجتماعی طور سے کس حد تک تعلیمِ با
کے کام میں سرکار کی مدد کرسکتے ہیں۔ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے، جس پر ہمیں غ
غور و خوض کرنا چاہیئے۔ ہماری رائے میں ملک کی مختلف تعلیمی، سیاسی، اقتصاد
اور مذہبی انجمنیں اس کام میں بہت کچھ حصّہ لے سکتی ہیں۔ چونکہ ان کے حلقہ اثر

سیکڑوں بلکہ ہزاروں اشخاص ہوتے ہیں، اس لیے اگر وہ تعلیم بالغاں کو بھی اپنی سرگرمیوں کا ایک جزو بنالیں، تو بہت کچھ کامیابی کی امید ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم مذہبی انجمنوں سے خاص طور پر اپیل کرنا چاہتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں تو ہر ایک مندر اور مسجد کے ساتھ پاٹھ شالا اور مکتب ہوتے تھے۔ جن میں ہزاروں اشخاص تعلیم پاتے تھے۔ آجکل بھی ایسے مدارس دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن وہ اتنے کم ہیں کہ ان سے ملک کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس لیے ہمارے خیال میں اگر مندروں، مسجدوں اور گوردواروں میں تعلیم بالغاں کا کام شروع کیا جائے، تو بہت خاطر خواہ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ مذہبی انجمنیں اس تجویز پر بھی غور کر سکتی ہیں کہ وہ اپنے فنڈوں کا ایک خاص حصّہ اس تعلیم پر خرچ کریں۔ لیکن اگر وہ مالی کمزوری کے پیشِ نظر یا کسی دوسری مجبوری کی وجہ سے ایسا نہ کر سکیں، تو وہ اور ذرائع پر سوچ بچار کر سکتی ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر ہر عبادت خانے میں ایک تعلیمی فنڈ کھول دیا جائے۔ جس میں ہر شخص چند آنے فی ماہ بطور چندہ دیا کرے، تو اس کام کے لیے کافی روپیہ جمع ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بہت سے کارخانے ہیں، جن میں اَن پڑھ مزدوروں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔ ان اشخاص کو ابتدائی تعلیم دینے کا کام کارخانہ داروں کے ذمّے ہونا چاہیے۔ مغرب کے بہت سے ممالک میں ایسے قوانین بھی رائج ہیں، جن کی رو سے کارخانہ داروں کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے مزدوروں کی صحت اور تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کریں۔ ہمارے ملک میں بھی ایسے قانون کی ضرورت ہے، لیکن نیک سرمایہ داروں کی اخلاقی ذمے داری بہتر نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ اصحاب اپنی آمدنی کا کچھ حصّہ مزدوروں کی تعلیم پر خرچ

کریں، تو اس سے دو فائدے ہونگے۔ ایک تو غریب مزدوروں کی زندگی میں ا
کی روشنی کے نمایاں تبدیلی نظر آئیگی اور دوسرے جو کام وہ کریں گے، وہ پہلے سے
زیادہ بہتر ہوگا، کیونکہ ایک روشن دماغ شخص ایک اَن پڑھ کی نسبت زیادہ اچھی
سے اپنے کام کی تکمیل کر سکتا ہے۔

اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبہ تعلیم بالغاں میں جو نمایاں حصہ
سکتے ہیں، اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے خیال میں اگر ہر
تعلیمی ادارے کے کارکن اس بات کا تہیّہ کرلیں کہ جس حلقے میں کام کر رہے
اس میں کوئی بالغ شخص ناخواندہ نہیں رہے گا، تو تھوڑے ہی عرصے میں جو تعلیم
اس وقت اتنی مشکل نظر آ رہی ہے، بڑی حد تک آسان ہو جائے گی۔ اس
علاوہ یہ کام جیلوں، ریلوے ڈیپارٹمنٹ، سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں
بخوبی ہو سکتا ہے۔

مندرجۂ بالا ذرائع کا ذکر ہم نے صرف اشارۃً کیا ہے، جو صاحبان اس
مصروف ہیں، وہ اور ذرائع بھی سوچ سکتے ہیں۔ لیکن ان سب کوششوں کے
اگر ملکی حکومت اس کام کو پورے طور پر اپنے ہاتھ میں نہ لے اور اپنی واحد ذ
نہ سمجھے، تو تعلیم بالغاں کا کارواں راستے میں ہی رک جائیگا اور اپنی منزل مقص
نہ پہنچ سکیگا۔ ہم اگلے ماہ حکومت کی اس ذمّے داری پر مزید بحث کرینگے۔

مضمون نویسی بذریعہ افسانچہ

از
شیخ خادم محی الدین، لیکچرر سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس مضمون کی پہلی قسط میں مختصر افسانہ نویسی کے چند ابتدائی اصولوں پر بحث کی گئی تھی۔ مثلاً پیچیدگی، منتہٰے، پلاٹ کے ماخذ وغیرہ۔ اس قسط میں تعلیم افسانہ نویسی کی غرض سے انہیں اصولوں پر مزید روشنی ڈالی جائیگی۔

پلاٹ بنانا۔ افسانہ نویسی کی غرض سے پلاٹ مرتب کرنے کا کام سب سے زیادہ کٹھن ہے۔ قصہ خواہ کتنی ہی دلفریب زبان میں لکھا جائے۔ اگر اس کے پلاٹ کی چولیں ڈھیلی ہیں۔ تو وہ دلچسپی سے عاری اور ناکام ثابت ہوگا۔

پلاٹ کی غرض سے خیالات کا ذخیرہ فراہم کرنا ضروری ہے۔ بسا اوقات خیالات گھڑے گھڑائے مل جاتے ہیں۔ لیکن اکثر صورتوں میں انھیں پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کو اس معاملے میں فقط یہ سیکھنا ہے کہ قصہ نویسی کی غرض سے خیالات کی کیونکر جوڑ توڑ کی جائے۔ مثلاً اکثر مرتبہ ایک بھری مجلس، یا بازار کی بھیڑ بھاڑ میں کسی شخص کی زبان سے نکلا ہوا کوئی کلمہ، ہاتھ کا اشارہ، کوئی غیر معمولی شکل وشباہت یا کوئی ہنگامہ ہمارے ذہن میں خیالات کی ایک رَو پیدا کر دے سکتا ہے۔ جو قصے کے ایک پلاٹ کی شکل اختیار کر لیتی ہے پس ضروری یہ ہے کہ قصہ گوئی کے ڈھب پر ذہن کی تربیت کی جائے اور تخیل افسانچہ نگاری کا

فیشن سیکھے۔ اس لیے کہ روز مرہ صبح سے شام تک ہمارے نیم شعوری نفس میں بے شمار خ
اور تاثرات جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ان میں سے بعض خیالات کو افسانچہ کی غرض سے محفو
کرتے رہیں یا انھیں اپنی بیاض میں درج کرتے جائیں، تو بہت سا ذخیرہ جمع ہو سکتا ہے

خیالات سے پلاٹ کی طرف چلنا۔ کسی ایک خیال کو کیونکر پلاٹ کے قال
میں ڈھالا جا سکتا ہے؟ ذیل کی مثال سے یہ حقیقت ذہن میں آجائیگی :۔

فرض کیا کہ ہم نے اپنی بیاض میں کسی وقت پھرتے پھراتے یہ جملہ درج کیا "دریا
پل پر تمام ریل گاڑیاں رُک جاتی ہیں"۔ یہ مشاہدہ کوئی غیر معمولی نہیں۔ اکثر پلوں پر یہی ہوتا
ریل کی سڑک کمزور ہوتی ہے یا وہ زیر مرمت ہے یا پُل ہی کمزور ہے۔ لیکن افسانہ نگاری کا عا
ذہن اس معمولی مشاہدے کو غیر معمولی صورت میں لا سکتا ہے۔ یہ کیونکر؟ اپنے آپ سے چند
سوالات پوچھو۔ ریل گاڑی اس پُل پر کیوں ٹھیری۔ حقیقت سے قطع نظر کر کے کوئی ایک نظر یہ
قائم کرو۔ گاڑی اچانک کیوں رُکی؟ کیا پُل میں کچھ خرابی تو نہ تھی؟ اگر اس کا علم انجن چلانے وا
کو دیر سے ہوتا، تو کیا حادثہ رونما ہوتا؟

اب تخیل کی گاڑی روانہ ہوتی ہے۔ افسانے میں تیقّن کا پہلو پیدا کرنے کی غرض سے
ذہن میں ایسا منظر پیدا کرو۔ جہاں ایک بہت بڑے پاٹ کا دریا بہ رہا ہے، مثلاً دریائے گوداو
یا چناب۔ پلاٹ میں جدت پیدا کرنے کی غرض سے فرض کرو کہ آدھی سے زیادہ ریل گاڑی آ
پل پر چڑھ آئی ہے اور ایک دو گاڑیاں پیچھے رہ گئی ہیں۔ اِنھیں میں سے ایک گاڑی میں
تمھارا ہیرو بیٹھا ہے۔

اب آگے چلیے۔ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ ہیرو کون آدمی ہے؟ آپ اُسے جو چاہیں
بنا دیں۔ آئیے اسے ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے رکھیں۔ مثلاً سول کا ایک بڑا افسر کالی چرن۔

اس ریل گاڑی میں کسی مقام کا دورہ کرنے کا جا رہا ہے، پیچیدگی پیدا کرنے کی غرض سے فرض کر لیا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر وہ اپنی بیوی سے لڑ جھگڑ کر گھر سے نکلا اور لڑائی کا باعث ایک تیسرا شخص رام رتن ہے، جو اس کی بیوی کا ملاقاتی تھا۔ اب قصے کا نفسِ مضمون تین اشخاص پر مجتمع ہوگا، جسے اصطلاح میں "مثلث" کہتے ہیں۔ پلاٹ پر پھر کے نظر ڈالئے اور واقعات کو مناسب ترتیب کے ساتھ یوں منسلک کیجیے:۔

کالی چرن نے اپنی استری آندرا سے رام رتن کے متعلق لڑائی جھگڑا کیا۔ کیونکہ رام رتن کو آندرا سے محبت تھی۔ کالی چرن نے گھر سے نکل کر بریلی کی راہ لی لیکن وہ ابھی بریلی پہنچا ہی تھا کہ اسے ایک ضروری سرکاری تار ملا کہ فوراً بجنور پہنچ کر ایک بلوے کی تحقیقات میں پولیس کی مدد کرو۔ کالی چرن ایک لوکل گاڑی میں سوار ہوتا ہے۔ آدھی رات کو بیدار ہونے پر اُسے یہ علم ہوتا ہے کہ وہ جس گاڑی میں سوار ہے، وہ ایک شکستہ پُل کے کنارے پر آلگی ہے۔ رات اندھیری ہے۔ نیچے دریا زوروں پر بہ رہا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ڈبے کے سوا باقی تمام ڈبے انجن سمیت دریا میں گر چکے ہیں۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔ وہ نیچے اُتر کر دیکھتا ہے۔ اتنے میں اسے اپنے ڈبے کے قریب دریا میں ایک چیخ سنائی دیتی ہے۔ ایک عورت غوطے کھا رہی ہے۔ کالی چرن جلدی سے بندھے ہوئے اسباب میں سے ایک رسّہ کھول کر عورت کی طرف پھینکتا ہے۔ عورت اُس وقت ایک غرق شدہ گاڑی کی چھت پر تھی اور اسی کے پاس ایک ساتھی بیہوش پڑا تھا۔ کالی چرن دونوں کو رسے سے باندھ کر باری باری خشکی کی طرف کھینچتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں خود دریا میں گر پڑتا ہے اور دریا کا تیز پانی اسے بہا لے جاتا ہے۔ اس اثنا میں عورت چیخ مار کر بیہوش ہو جاتی ہے۔ اس کا ساتھی (رام رتن) ہوش میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رام رتن آندرا کو بھگا لے گیا تھا۔ اب صبح ہوتی ہے۔

زمین پر ریل کی آخری گاڑی کھڑی ہے۔ دونوں اسی میں چڑھ کر پناہ لیتے ہیں۔ اسباب پر نظر دوڑانے سے آندرا کو ایک سوٹ کیس پر کالی چرن کا نام دکھائی دیتا ہے۔ اس کا موت کے چنگل سے بچ جانا واقعی ایک معجزہ ہے۔ لیکن اسے کس نے بچایا؟ آندرا پر فوراً یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اسے اس کے خاوند ہی نے بچایا۔ اب اس پر اپنی اصل حالت عیاں ہوتی ہے۔ یعنی غیر کے ساتھ نکل بھاگنے والی عورت! لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

اوپر درج کی ہوئی کہانی کا نام رکھ دو "پل کا کنارہ"۔ اس مثال سے یہ امر واضح ہو سکتا ہے کہ ہم پلاٹ کو کیونکر مرتب کر سکتے ہیں۔ بالعموم مختلف مشاہدوں سے پلاٹ کا ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے۔ مشاہدوں کے علاوہ دوسروں کے تجربات بھی افسانچہ کا مسالہ ہو سکتے ہیں، اسی طرح کسی دیر سے بچھڑے ہوئے دوست کا خط، یا غیر ممالک کے اخبارات قصہ نویسی کے ذرائع ہیں۔ اخبار اس شغل کے لیے بہترین ذرائع میں سے ایک ہے۔ بالخصوص مقبول عام اخبارات، جن میں کوئی سنسنی خیز خبر یا واقعہ۔ کوئی مضمون یا روئداد یا پیرا، افسانوی غرض کا منبع یا مرکز بنایا جا سکتا ہے۔ افسانہ نگار کو چاہیے کہ اس قسم کی خبروں کو تراش کر ایک رجسٹر میں چسپاں کرتا رہے۔ اس رجسٹر کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ مثلاً پُراسرار واقعات، عشق و محبت، سراغرسانی، ظرافت، بہادری کے کارنامے وغیرہ۔ ان حصوں میں اپنے معلومات اور اخباری تراشے ہوئے صفحے یا کالم جمع کرتے رہنا چاہیے۔

ضمناً یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہر افسانچہ کسی خاص مقصد کا حامل ہونا چاہیے اور پلاٹ میں حتی الامکان جدت کو دخل دینا چاہیے۔ جب تک پڑھنے والا قصے کے آخر تک نہ پہنچ جائے، اس کے مقصد کو ظاہر نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ لوگ اسے پڑھے بغیر چھوڑ دیں گے

انشائے راز، افسانچہ کا ضروری مقصد ہے اور یہ بالعموم قصّے کے آخری حصّے ہی میں منتہیٰ کی صورت میں آتا ہے۔ پس منتہیٰ کو افسانچہ کا نہایت مضبوط پہلو قرار دینا چاہیے۔ اس کے ذریعے پڑھنے والے پر ظاہر ہونا چاہیے کہ اُس نے قصّہ پڑھ کر وقت ضائع نہیں کیا، بلکہ کچھ حاصل کیا ہے۔ مشاق قصّہ خواں کو آپ کی چکنی چپڑی باتیں درکار نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ پلاٹ اور کردار نگاری کا متلاشی ہوتا ہے۔ اگر آپ افسانچہ نویسی سیکھنا چاہتے ہیں، تو پہلے اِنھیں دو ضروری عناصر کی ترکیب پر حاوی ہونا سیکھیں۔

مشقیں:-

(۱) کسی اچھوتے پلاٹ کا مختصر خاکہ لکھو۔ جس سے قصّے کا نفسِ مضمون واضح ہو۔

(۲) کسی افسانچہ کا ابتدائی منظر لکھ کر دکھاؤ۔ اس میں پانسو سے زیادہ الفاظ نہ ہوں۔

(۳) مندرجۂ ذیل پلاٹ کے مطابق ایک افسانچہ لکھو:-

حامد گھر سے پانچ سال تک ماں سے جدا رہ کر ولایت میں تعلیم پاتا رہا ہے۔ واپس آنے پر گھر میں دُور کے رشتے کی ایک جوان خاتون عذرا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے، جو اُس کی ماں کی شریک تنہائی رہی تھی۔ عذرا کی نسبت ایک ایسے شخص سے ہو چکی ہے جو افریقہ میں ملازم ہے۔ حامد کو عذرا سے محبت ہو گئی ہے لیکن عذرا کی موجودہ بندش کو دیکھ کر وہ گھر سے پھر چلے جانے کا ارادہ اپنی والدہ پر ظاہر کرتا ہے۔ ماں اس کا باعث سمجھ لیتی ہے۔

(پہلے پلاٹ کو مکمل کرو۔ پھر افسانچہ لکھو)۔

(باقی آئندہ)

کامیاب سبق

از

نذیر احمد ایم اے، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

"بھئی! آج نریندر کا سبق نہایت کامیاب رہا" حمید نے بی۔ٹی کلاس کی کلاز میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے تمام ہم جماعت اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

انور نے ہاں میں ہاں ملائی۔

سعید نے کہا۔ "واقعی، وہ سو نمبر میں سے سو نمبر کا ہی مستحق تھا۔"

"بھئی! وہ لائق اور ذہین بھی تو بہت ہے نا۔ آخر انگریزی علم ادب میں ایم اے ڈگری حاصل کرنا کوئی آسان کام تو نہیں۔" کرشن نے نہایت وثوق سے کہا۔

منصور جو ایک سلیم الفطرت طالب علم تھا اور گہرے غور و فکر کا عادی۔ کچھ عرصہ بالکل خاموش رہا اور پھر یوں لب کشا ہوا۔ "دوستو! میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرے خیال میں اس نے نہایت شاندار لیکچر دیا اور اس میں شک نہیں کہ اس کی زبان نہایت شستہ اور لب و لہجہ نہایت برجستہ۔ مگر اس لحاظ سے کہ اس نے چھوٹے بچوں کو سبق پڑھانا تھا، وہ بہت حد تک ناکام رہا۔"

حمید اپنی رائے کی مخالفت سہار نہ سکا۔ غصے سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ برافروختہ ہو کر بولا۔ "منصور! کیا تمہارے خیال میں پروفیسر نند لال کم لائق ہیں، جنہوں نے اسے سو میں سے سو نمبر دے دیے۔"

"جی ہاں"۔ انور نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ حضرت تو دنیا میں اپنے سوا کسی کو لائق سمجھتے ہی نہیں"۔

"منصور"! سعید نے حقارت کے لہجے میں کہا۔ "چاند پر تھوکنے سے کیا حاصل۔ اُس کا سبق فی الحقیقت نہایت ہی کامیاب سبق تھا اور اگر تمہارے خیال میں پروفیسر نند لال کم لائق ہیں، تو کیا ہم سب بھی اندھے ہیں۔ آخر ہم نے بھی تو تمہارے برابر کی تعلیم پائی ہے اور یہاں ٹریننگ کالج میں طریقۂ تعلیم سیکھتے ہوئے اور مشقی اسباق پڑھاتے ہوئے بھی تو نو دس مہینے گزر گئے اور اگر بفرضِ محال ہم سب بھی اندھے ہیں، تو کیا پروفیسر ڈاکٹر ارشد ایم اے، ایم ای ڈی، پی ایچ ڈی بھی ناتجربہ کار ہیں، جنھوں نے اسباق کے پہلے ہی دور میں نریندر کو سو میں سے اسّی نمبر دیے تھے اور اُس کے سبق کی کافی تعریف ہر فریق میں کی تھی"۔

غرض کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ بعض نے منصور کے مغرور، خود بین اور خود رائے ہونے کا فتوےٰ دیا اور بعض نے اُسے حاسد اور تنگ نظر کا خطاب دیا۔ آخر جب ان کے غصّے کی بھڑکی ہوئی آگ قدرے فرو ہوئی، تو منصور نے کہا۔

"دوستو، معاف فرمانا۔ مَیں نہ تو پروفیسر نند لال کو ناتجربہ کار کہتا ہوں۔ نہ ڈاکٹر ارشد کو اور نہ ہی آپ حضرات کو۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ حضرات کورانہ تقلید کے عادی ہیں۔ اسباق کے پہلے دَور میں ڈاکٹر ارشد نریندر کی شخصیت، زبان، طرزِ ادا، روانی اور لب و لہجہ سے اس قدر متاثر اور مسحور ہو گئے کہ اُنھوں نے سبق کی بہت سی اہم جزئیات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور بغیر اس کے کہ وہ سبق کے متعلق ہماری جماعت سے بحث کرتے۔ ہماری رائے طلب فرماتے اُنھوں نے اُس کو کافی نمبر دے دیے اور سبق کی کافی تعریف فرمائی۔ بس پھر کیا تھا۔ نریندر کی اُس دن سے اوسط درجے کے طالب علموں اور پروفیسروں میں دھاک بیٹھ گئی۔ بھلا پروفیسر نند لال

جو کہ پُرانے بی اے، بی ٹی ہیں۔ ڈاکٹر ارشد کی رائے کے خلاف جانے کی جرأت کہاں سے لاتے۔"

لیجیے ٹھیک نشدو وشد کرشن نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی بات تو پوری کر لینے دی ہوتی، پھر ٹوکا ہوتا" منصور نے قدرے درُ سے کہا اور پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"ہاں، تو آج پھر پروفیسر نند لال نے بھی اس سبق کے متعلق بحث نہیں کی۔ انفرادی رائے طلب نہیں کی گئی اور ہمارے دلائل پرکھے نہیں گئے۔ بس خود ہی رائے قائم اور نتیجہ سُنا دیا۔ اس طرح سے . . . ."

حاضرین میں سے ایک (بات کاٹ کر)۔ اس طرح سے کیا ہرج ہے؟ جو رائے پروفیسر صاحبان اپنے تجربے کی بنا پر قائم کرتے ہیں، وہ عموماً درست ہوتی ہے اور عموماً ہمیں بھی اُن کی رائے سے اتفاق ہوتا ہے۔

دوسرا۔ مگر ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ اُن کی ذاتی رائے ہوتی ہے اور ممکن ہے اُن کی وہ انفرادی رائے غلط بھی ہو۔ آپ کو اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ ایک جماعت بحث و تکرار سے جس نتیجے پر پہنچتی ہے، ایک فرد اُس پر نہیں پہنچ سکتا۔ کیا اسمبلی ایوان میں بحث و تمحیص بے سُود ہوتی ہے؟"

"ہاں"۔ منصور نے اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے کہا۔ "تو میں عرض کر رہا تھا کہ اس طرح سے ہم کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ ممکن ہے کہ سبق میں چند ایک بہت بڑی خوبیاں ہوں اور عین ممکن ہے کہ خوبیوں کے باوجود سبق میں چند ایک بہت بڑی خامیاں ہوں۔ جن کی وجہ سے وہ سبق معیار سے بہت نیچے گر گیا ہو۔ ممکن ہے کہ سبق دینے والا نہایت عمدہ زبان میں

روک ٹوک تقریر کر رہا ہو۔ مگر طلبہ کو اس سے کچھ فائدہ نہ پہنچا ہو۔"

ایک آواز: منصور بھئی۔ واللہ، کیا خوب بات کہی تم نے۔ اسی وجہ سے تم کہہ رہے تھے کہ اُس کا لیکچر نہایت اچھا تھا، مگر سبق ناکام۔"

"جی ہاں۔ آپ سب اپنی توجہ چند منٹ کے لئے آج کے سبق کی طرف کیجیے، دیکھیے اور انصاف کیجیے کہ نریندر کے سبق کا مقصد ساتویں جماعت کو جہانگیر کے حالات پڑھانا تھا۔ اُس . . . . ."

"تو کیا اُس نے اورنگ زیب کے حالات پڑھا دئے؟" حمید نے جل کر کہا۔

"خدا کے لیے مجھے فقرہ تو مکمل کر لینے دیا ہوتا۔ اُس نے جہانگیر کے حالات خوب بتائے اور وہ باتیں بھی بتا گیا، جو ساتویں جماعت کے نصابِ تعلیم سے خارج ہیں۔"

"مگر لڑکوں کی توجہ کا تو یہ حال تھا کہ بُت بنے بیٹھے تھے۔ کیا یہ سبق کی کامیابی کی دلیل نہیں؟" انور نے کہا۔

سعید نے پوچھا کہ کیا وہ سبق جس میں طلبہ کو نئی واقفیت حاصل ہو، کامیاب سبق نہیں کہلاتا؟ کیا چبائے ہوئے نوالے کا چبانا اور نئی بات نہ بتانا سبق کی کامیابی ہے؟

"انور!" منصور نے نرمی سے کہا۔ خدا کے لئے اپنی آنکھوں سے تعصب کی عینک دُور کرو۔ میں نے کب کہا ہے کہ عدم توجہی سبق کی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے۔ بے شک، وہ سبق نہایت ہی کامیاب ہے، جس میں طلبہ سبق کی طرف پورے پورے متوجہ ہوں۔ لیکن فرض کرو کہ طلبہ کو اصل سبق دینے کے بجائے اگر ہم انھیں جن اور بھوتوں کی ہیبت ناک کہانیاں سُنانا شروع کر دیں، تو کیا وہ بُت بنے نہ بیٹھے رہیں گے۔ یہی حال آج کے سبق میں ہُوا۔ بجائے جہانگیر کے عہدِ حکومت کے واقعات کے نریندر نے اُس کے ذاتی اور شخصی حالات بتانے شروع

کر دیے۔ یہ حالات بچوں کے لئے نئے تھے۔ اس لیئے دلچسپ تھے اور اسی وجہ سے وہ ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے۔ مگر ذرا غور کرو، تو معلوم ہوگا کہ اُس نے اصلی نفس مضمون کو چھوا بھی نہ تھا کہ پیریڈ ختم ہوگیا۔

اور سعید صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ بے شک نئی واقفیت دلانا ہی نئے سبق کا مقصد ہوتا ہے۔ بلکہ آموختہ اسباق کا اعادہ بھی اس طرز سے کرانا چاہیے کہ طلبہ اُس سے کچھ نہ کچھ نئی واقفیت حاصل کریں یا کم از کم قند مکرر کا مزہ ضرور لیں۔ مگر ذرا سوچو تو کہ یہی جہانگیر کے حالات ساتویں کے نصابِ تعلیم میں شامل ہیں اور پھر یہی چیز دسویں، الف اے اور بی اے کی جماعتوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔ کیا جو کچھ ہم نے بی اے میں پڑھا تھا، وہی ساتویں اور دسویں جماعت میں پڑھانا چاہیے یا کچھ کم۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اچھے سبق میں ہمیشہ تدریج کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر کسی سبق میں تدریج کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو، تو سبق کو کامیاب کہنا غلطی ہے۔"

"بھئی یہ تو خدا لگتی بات کہہ رہے ہو۔" کرشن نے اعتراف کیا۔

اس کے علاوہ اور امور کی طرف غور کرو۔" منصور نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو کہ نریندر نے تختۂ سیاہ کا کتنا استعمال کیا؟ کیا اُس نے تختۂ سیاہ پر کچھ لکھا؟ یا کوئی نقشہ اُس پر بنایا؟"

"نہیں"۔ سعید نے مایوسی کے لہجے میں کہا۔

"یاد رکھو"۔ منصور نے کہا۔ "تختۂ سیاہ کا مناسب اور برمحل استعمال سبق میں جان ڈال دیتا ہے۔ جو کچھ معلم تختۂ سیاہ پر نقش کرتا ہے۔ وہ طلبہ کے دل پر منقوش ہوتا جاتا ہے اور تاریخ جغرافیے کی جان ہے نقشہ۔ اگر معلم تختۂ سیاہ پر نقشہ کھینچے اور طلبہ سے اُن کی

کاپیوں پر خاکے پُر کروائے، تو تاریخ جغرافیہ کے اسباق نہ صرف زیادہ دلچسپ ہی ہونگے، بلکہ طلبہ کے ذہن نشین بھی ایسے ہونگے کہ بُھلائے سے نہ بُھولیں۔ علاوہ ازیں تختۂ سیاہ کے ذریعے سے ہم طلبہ کے لکھنے کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ مشکل اور غیر مانوس الفاظ اور اُن کے ہجے اُن کے دلنشین کر سکتے ہیں اور خلاصہ تختۂ سیاہ سے چند منٹ میں پڑھاتے ہُوئے سبق کا اعادہ کرا سکتے ہیں۔ غرض تختۂ سیاہ کی مدد کے بغیر سبق کا پڑھانا کوئی طریقۂ تعلیم بھی روا نہیں رکھتا۔ یہ تو پھر طوطوں کو رٹوانا ہُوا، سبق کا بے کو ہُوا۔"

حمید حیرانی سے مُنہ کھولے ہُوئے، بت بنا ہوا، منصور کی باتیں سُن رہا تھا اور اپنی رائے کی دھجیاں یوں اُڑتی دیکھ کر دل ہی دل میں نادم ہو رہا تھا۔

"کام بھی ایک بڑا معلّم ہے"۔ منصور نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ جو کچھ ہم اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں، وہ زیادہ جلدی ذہن نشین ہو جاتا ہے، بہ نسبت اُس چیز کے جو ہم کسی کو کرتے دیکھیں۔ مثلاً ہم بڑھئی کو کرسی بناتے دیکھتے رہتے ہیں، وہ کئی کرسیاں بناتا ہے۔ لیکن ہمیں محض اس دیکھنے سے کرسی بنانا نہیں آسکتا اور اگر ہم اپنے ہاتھوں سے ایک ہی کرسی بنالیں، تو سمجھو کہ ہمیں کرسیاں بنانا آگیا۔ اب تعلیمی مضامین کو لو۔ اگر معلّم تختۂ سیاہ پر خود ہی سوالات حل کرتا جاتا ہے اور مٹاتا جاتا ہے، حتّٰی کہ ایک ساری مشق ختم کر دیتا ہے تو کیا تمام طلبہ میں بھی وہ مشق حل کرنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے؟ نہیں۔ (اور خصوصًا چھوٹی جماعتوں میں) ہرگز نہیں چھوٹی جماعتوں کے بچّے جب حساب کی کسی مشق کو بار بار حل کرتے ہیں، تب کہیں جا کر وہ مشق حل کرنے کی صحیح قابلیت اُن میں پیدا ہوتی ہے۔

پس ایک کامیاب سبق کی یہ بھی ایک علامت ہے کہ اس میں طلبہ سے بھی کچھ کام کرایا جائے۔ تاریخ جغرافیہ کے اسباق میں نقشے پُر کروائے جائیں۔ سبق کا مختصر خلاصہ لکھوایا

جائے۔ حساب کے سبق میں سوالات حل کرائے جائیں۔ زباندانی کے اسباق میں الفاظ کے ہجے لکھوائے جائیں۔ الفاظ کو فقرات میں استعمال کرایا جائے۔ غلط فقرات کو درست کروایا جائے خالی جگہوں میں مناسب الفاظ پُر کرائے جائیں، وغیرہ وغیرہ۔

چونکہ آج کے سبق میں طلبہ سے کوئی کام نہیں کرایا گیا۔ اس لحاظ سے بھی یہ سبق چنداں کامیاب نہیں ہے۔"

ایک آواز: "واللہ بالکل بجا کہہ رہے ہو۔"

"منصور یار۔" انور نے شکست خوردہ حریف کی طرح ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا "معاف کرنا ہم نے تمہارے متعلق بہت غلط اندازہ لگایا ہوا تھا۔ تم تو چھپے رستم ہو۔ سبق کی اچھی تنقید کر رہے ہو۔ واللہ، ہمیں آپ کی آج کی گفتگو سے بہت فائدہ ہوا۔

"اس تعریف کا شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔" منصور نے انور سے مخاطب ہو کر کہا "اگر اجازت ہو، تو ایک دو اور امور بھی پیش کروں، جس سے سبق کے اچھے یا بُرے ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"بسر و چشم۔" حاضرین نے بیک آواز کہا۔

"تکلیف معاف:" منصور نے کہنا شروع کیا۔ "آپ کی توجہ پھر چندمنٹ کے لیے آج کے سبق کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ بتائیے کہ نریندر نے جماعت پر کتنے سوالات کیے اور طلبہ نے کیسے جوابات دیے؟"

"میرے خیال میں۔" حاضرین میں سے ایک نے کہا۔ "نریندر نے جماعت پر سوالات کیے ہی نہیں۔ بس لڑکوں کو ترتیب سے بٹھا کر اُس نے خود تقریر شروع کر دی۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔" منصور نے کہا۔ "لیکچر اور سبق میں ایک واضح فرق یہ ہے

کہ لیکچر میں تو لیکچر کرنے والا بولتا جاتا ہے اور جو کچھ رطب و یابس اُس کے پاس ہوتا ہے، سامعین کے پیش کرتا جاتا ہے۔ سامعین اپنی اپنی استعداد کے مطابق اُس کے لیکچر سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی، تو لیکچر کرنے والا اس کی چنداں پروا نہیں کرتا۔ مگر ایک معلم کا فرض ہوتا ہے کہ سبق میں تمام طالب علموں کو اپنے ساتھ ساتھ چلائے۔ اُس کا سبق چند ہوشیار طلبہ کے لیے ہی نہیں ہوتا، بلکہ تمام جماعت کے لیے۔ اگر تمام جماعت سبق کو یکساں طور پر نہیں سمجھ سکی، تو بھی سبق کامیاب نہیں ہے۔ ہاں تو معلم یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا تمام طلبہ اُس کے سبق سے یکساں استفادہ کر رہے ہیں یا نہیں۔ طلبہ پر مختلف سوالات کرتا رہتا ہے۔ سوالات ساری جماعت پر کرتا ہے اور پھر کسی ایک لڑکے سے جواب لیتا ہے اور اس سوال وجواب سے اپنے سبق کو واضح کرتا جاتا ہے"۔

"سوالات بھی ایک کامیاب سبق کی جان ہیں۔ سوالات کے ذریعے سے مدرس تمام طلبہ کی توجہ کو سبق کی طرف قائم رکھ سکتا ہے۔ سوالات کے ذریعے سے کند ذہن اور لاپروا لڑکوں کو سبق ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ یہ سوالات ہی تو ہیں، جو طالب علم کے ذہنی عمل کو بیدار رکھتے ہیں اور دورانِ سبق میں طالب علم کے خیالات کو کسی اور طرف بھٹکنے نہیں دیتے"۔

"میں اب سمجھا کہ تم آج کے سبق کو لیکچر کیوں کہہ رہے تھے۔ واقعی نزہت نے سوالات بہت ہی کم کیے اور اپنی ہی کہے گیا"۔ حمید نے دبی زبان میں کہا۔

"لیکچر اعلیٰ جماعتوں میں کامیاب ہو سکتا ہے"۔ منصور نے پھر کہنا شروع کیا۔ "کیونکہ اعلیٰ جماعتوں میں طلبہ بڑی عمر کے ہوتے ہیں اور اپنی عمر کے لحاظ سے کسی ایک چیز کی طرف کافی عرصہ تک توجہ دے سکتے ہیں۔ مگر چھوٹی جماعتوں کے بچے کسی ایک چیز کی طرف زیادہ دیر تک توجہ ہی نہیں دے سکتے۔ حتیٰ کہ بعض چھوٹے بچے ایک منٹ کے بعد اپنی توجہ دوسری

طرف کر لیتے ہیں، ابھی تو رو رہے تھے اور کسی چیز کے لیے مچل رہے تھے یا ابھی کسی وہ
چیز کو دیکھ کر بے اختیار اچھل رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں پس یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم
جماعتوں میں دورانِ سبق میں کافی سوالات کیے جائیں۔"

"اب صرف ایک اہم بات باقی رہ گئی" منصور نے قدرے تامل کے بعد کہا۔
یہ کہ ہر سبق کے دو مدّعا ہوتے ہیں۔ ایک تعلیمی، یعنی وہ مقررہ سبق، مقررہ اصولوں کے مطا
اس طرح پڑھانا کہ سابقہ واقفیت سے بھی اس کا تعلق ہو اور آئندہ علم کے لیے بھی وہ بنیا
بن سکے۔ دوسرا نفسیاتی یعنی قوائے ذہنی اور دماغی کی نشو و نما۔ ہر تعلیمی مضمون کسی
کسی ذہنی قوت کو تقویت دیتا ہے۔ مثلاً حساب سے قوتِ توجہ اور قوتِ استدلال اور قوتِ فیـ
کی نشو و نما ہوتی ہے۔ ڈرائنگ سے ہاتھ اور آنکھ کی قوتوں کی تربیت ہوتی ہے اور تاریخ
جغرافیے سے حافظے کی۔ زباندانی سے قوتِ متصورہ اور قوتِ متخیلہ ترقی پاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ
"تو ہمیں ہر نئے سبق کے متعلق اپنی رائے دینے سے پیشتر یہ بھی غور کرنا چاہیے
کہ اس سبق سے قوائے ذہنی اور دماغی کی تربیت ہوئی یا اُن پر بے جا بوجھ ڈالا گیا۔ یعنی
تم طلبہ کو اتنی چیزیں بتا گئے ہو، جو وہ یاد نہیں رکھ سکتے، تو اُن کی قوتِ حافظہ کو بجائے فائدہ کے
اُلٹا نقصان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بچے جن سے چھوٹی عمر میں زیادہ دماغی کام لیا جاتا ہے ہمیشہ
طبعاً کمزور ہو جاتے ہیں اور اُن کی ذہنی تربیت بھی پوری نہیں ہوتی۔"

اس اصول کے مطابق بھی نریندر کا سبق کامیاب نہیں رہا۔ کیونکہ اُس نے طلبہ کو
بہت سی ایسی چیزیں بتائی ہیں، جو اُن کے لیے نہ تو ضروری ہیں۔ نہ اُن کو یاد رہ سکیں گے۔

اتنے میں نریندر بھی ہانپتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے کپڑے پانی سے تر تھے کیونکہ
باہر بارش ہو رہی تھی۔ کمرے میں اتنا مجمع دیکھ کر حیرانی سے پوچھنے لگا۔ کیا بحث ہو رہی تھی؟
کرشن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کاش، تم کچھ پہلے ہی آجاتے۔"

سنٹرل ایڈوائزری بورڈ محکمہ تعلیم ہند

اور

واردھا اسکیم

از

مقبول بیگ، بدخشانی

(گزشتہ سے پیوستہ)

۲۴۔ انگریزی کی تعلیم۔"بنیادی" اسکولوں میں انگریزی پڑھائی جائے یا نہیں۔ اس مسئلے پر بہت سا اختلاف تھا۔ کمیٹی کے بعض ممبروں کا یہ خیال تھا۔ چونکہ یہ اسکول زیادہ تر دیہات میں ہونگے۔ اس لیے انگریزی کی تعلیم کو نصاب میں شامل نہ کرنا چاہیے۔ ایسے اسکولوں میں انگریزی کی تعلیم دینا تعلیمی نکتہ نگاہ سے ٹھیک نہیں۔ انگریزی تعلیم میں وقت زیادہ صرف ہوگا۔ لیکن فائدہ نسبتہً کم ہوگا اور تعلیم کی بنیاد کو مضبوط نہیں ہونے دے گا۔

۲۵۔ دوسری طرف ایسے ممبر بھی تھے۔ جن کا خیال تھا، اعلیٰ تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ ایسے اسکولوں میں انگریزی تعلیم کی بنیاد مضبوطی سے قائم کی جائے، جب تک ہمارے کالجوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ جب تک ہماری زندگی کے ہر شعبے میں 'انگریزی' اس طرح سے مسلط ہے، انگریزی کی تعلیم بھی ضروری ہے اور یہ تعلیم چودہ برس کی عمر سے پیشتر شروع ہو جانا چاہیے۔ ووڈ ایبٹ رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انگریزی مدنیکر کے ذریعے پڑھائی جائے لیکن اس میں یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ جن ثانوی اسکولوں میں طالب علم انگریزی

پڑھنا چاہیں، وہاں کے نصاب میں انگریزی تعلیم ایک اختیاری مضمون کی صورت میں شامل کی جائے۔

کمیٹی اس بات پر متفق ہے کہ اگر بعض طالب علم انگریزی پڑھنا چاہیں، تو پانچواں درجہ پاس کرنے کے بعد یا اس وقت جب کہ ان کی عمر گیارہ برس سے اوپر ہو جائے، بنیادی سکول چھوڑ کر ایسے اسکول میں داخل ہو جائیں، جہاں انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہو، لیکن بنیادی مدارس اسکولوں کے نصاب میں انگریزی تعلیم کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔

۲۶۔ صنعت گری اور دستی کام۔ واردھا اسکیم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تعلیم ایسے دستی کام کے ذریعے دی جائے، جس سے کچھ آمدنی بھی ہو سکے۔ اگر اس کے بجائے یوں کہا جائے کہ تعلیم ایسی دستکاری کے ذریعے دی جائے، جو تخلیقی اور تعمیری ہو، تو ماہرینِ تعلیم اسے زیادہ موزوں خیال کرینگے۔ چونکہ جہاں آمدنی کا سوال آتا ہے۔ اس سے عام طور پر یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ مالی اغراض ہمارے تعلیمی مفاد کو پس پشت ڈال دینگی۔ ہم یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ واردھا اسکیم دستکاری کے مالی پہلو پر نہیں، بلکہ تعلیمی پہلو پر زیادہ زور دیتی ہے۔ اونچے درجوں میں اگر اشیا بیچنے کی غرض سے تیار کی جائیں، تو اس سے اسکیم پر کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں آتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اشیا فروخت کرنے کی غرض سے تیار نہ کی جائیں، تو دستکاری کے علمی جوہروں سے پورا پورا کام نہیں لیا جا سکیگا۔ اس قسم کی اشیاء کو بیچنے سے جو آمدنی ہو، وہ اسکول کی دیکھ بھال پر خرچ کی جا سکتی ہے۔

۲۷۔ "کام کے ذریعے سیکھنا" ایک ایسا تعلیمی اصول ہے کہ اس پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آجکل تمام ماہرینِ تعلیم تصنیف و تالیف کے ذریعے اسی بات پر زور دے رہے ہیں۔ جن جن اسکولوں کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان میں زمانے کی ضرورت کے مطابق

تعلیم دی جاتی ہے، وہاں اسی اصول سے کام لیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ بچوں کو مختلف دستکاریوں کے ذریعے تعلیم دینا تعلیم جدید کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔ کمیٹی کے ممبر سب اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کو ایسی مفید تخلیقی دستکاریوں کے ذریعے تعلیم دینا چاہیے، جو رفتہ رفتہ اس قابل ہو جائیں کہ ان سے کچھ آمدنی بھی ہو سکے۔

۲۸۔ اسکول کے ابتدائی درجے میں جہاں عام طور سے چھ سال کے بچے تعلیم پاتے ہیں، کسی بنیادی دستکاری کو جاری کرنا تعلیمی لحاظ سے ٹھیک نہیں۔ ان ابتدائی درجوں میں جو عملی کام جاری کیے جائیں، وہ ایسے ہوں، جن کو بچے پسند کریں اور ان میں دلچسپی بھی لیں۔ بچوں کے لیے کوئی دلچسپ دستکاری اسی وقت تک مفید ہوتی ہے، جب تک کہ اس میں مشق اور عقل سلیم درکار ہو۔ اس سلسلے میں وہ آپ ہی آپ غور کر سکیں اور آپ ہی حساب وغیرہ بھی کریں۔ وہ جب کام شروع کریں ——— ایسا کام جو وہ آپ ہی آپ تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں ——— تو وہ ان سب باتوں کو کام میں لا سکیں۔ جیسا کہ وڈ ایبٹ رپورٹ میں مذکور ہے۔ کوئی چیز بنا لینا، یا کسی قسم کام کو ختم کر لینا اصل چیز نہیں، بلکہ اصل چیز تو وہ اجزا ہیں، جن کی وجہ سے اس چیز یا کام کی تکمیل ہوتی ہے، تعلیمی اہمیت بھی انھیں اجزا کی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین "عملی مدرسہ" کے ضمیمے میں اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ مہارت حاصل کر لینا، اتنی زیادہ تعلیمی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ اس مہارت کو حاصل کرنے میں جن جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے، ان کو بہت زیادہ تعلیمی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے س کی دلچسپیاں بھی بدلتی جاتی ہیں۔ بیشتر ان میں سے ایسے ہوتے ہیں، جن کی طبیعتیں زیادہ تغیر پسند نہیں ہوتیں اور کسی ایک بنیادی دستکاری سے ہی جس میں وہ خاصی مہارت کر سکیں مطمئن ہو جاتے ہیں۔ زراعت، لکڑی کا کام، کپڑا بننے کا کام، دھات کا کام ایسی دستکاریاں ہیں؛

جو تعلیمی نشوونما میں بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ جب بچے کچھ بڑے ہو جائیں، تو اُن کے د
میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے کام کریں اور خود چیزیں بنائیں۔ اس لیے وہ
دستکاریوں سے بہت دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ان میں خودداری کا احساس بھی
کرتا ہے۔ چونکہ اُنھیں یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں کارآمد ہیں اور باز
میں فروخت بھی ہو سکتی ہیں، اس لیے ان کے دلوں میں یہ بھی بات پیدا ہوتی ہے کہ ہاتھ سے
کرنا اعتراض کی بات نہیں۔

کمیٹی کا خیال ہے کہ نچلی جماعتوں میں (دس برس کی عمر تک) کوئی بنیادی دستکا
رائج نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے بجائے ایسے عملی کام جاری کرنا چاہییں، جو کسی بنیادی دستکا
کے لیے تیاری کا کام دے سکیں اور اُونچی جماعتوں میں بنیادی دستکاری کی صورت اختیا
کر سکیں اور جس سے پھر آمدنی بھی ہو سکے۔

۲۹۔ اس لیے لازمی ہے کہ بنیادی اسکولوں میں خصوصاً تمام ابتدائی جماعتوں میں
دستکاری کے تمام ضروری سامان مہیا ہوں۔ جب تک کافی سامان موجود نہ ہو، اسکول عم
کام کاج کا مرکز نہیں بن سکتا۔

۳۰۔ معلم۔ کسی تعلیمی اسکیم کو اگر کامیاب بنانا مقصود ہو، تو اس کے لیے نہایت ض
شرط "معلم" ہے۔ طریق تعلیم میں آپ ترمیمیں تجویزیں کریں، نئے نئے طریق کار ایجاد کر لیں، کوئی
نیا نظام پیش کر دیں، لیکن تاوقتیکہ معلموں میں اتنی قابلیت نہ ہو کہ وہ تبدیل ہونے والے حا
کو جانچ سکیں اور اُنھیں اچھی طرح سمجھ سکیں اور ان میں اتنی لیاقت نہ ہو کہ ان سے
حسب ضرورت کام لے سکیں۔ یہ سب باتیں بے اثر اور بے نتیجہ ثابت ہوں گی۔
جیسے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں۔ "یہ ضروری ہے کہ ان استاد

اسکیم کے نئے تعلیمی اور سماجی تصورات کی سمجھ ہو اور ان میں اتنی قوتِ عمل بھی ہو کہ ان سے کام لے سکیں؟

۳۱۔ ضروری ہے کہ معلم میں اتنی استعداد ہو کہ میٹریکولیشن کے درجے کے عام مضامین پڑھا سکے اور وہ ان عام مضامین کو بنیادی دستکاری کے ذریعے پڑھانے کے طریقے بھی اچھی طرح جانتا ہو اور خاص خاص دستکاریوں کے کاروبار میں بھی دسترس رکھتا ہو۔ ایسے معلموں کے بغیر واردھا اسکول کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن فی الحال ایسے معلموں کا دستیاب ہونا محال ہے۔ اگر اس اسکیم کو کسی وسیع علاقے میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی، تو ناکامی کے سوائے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

۳۲۔ اسکول کتنے کتنے فاصلے پر قائم کیے جائیں؟ یہ بات تربیت یافتہ معلموں کے ملنے پر منحصر ہے، جو اسکیم کو کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔ اس لیے کمیٹی ڈاکٹر ذاکر حسین رپورٹ کی سفارش سے اتفاق کرتی ہے کہ تجربہ کرنے کے لیے ایک کافی وسیع علاقہ منتخب کر لیا جائے اور محکمۂ تعلیم سے کہا جائے کہ اس علاقے کی تعلیمی سروے کا کام کرے۔ پھر اساتذہ کی مطلوبہ تعداد کو موجودہ نارمل اسکولوں میں ٹریننگ دینے کا جلد از جلد انتظام کیا جائے۔ بعد میں اسکولوں کے نظام کو ضرورت کے مطابق بدل لیا جائے اور ان میں اسٹاف بھی ایسا رکھا جائے، جو ٹریننگ کی نئی اسکیم کے موافق ہو۔ اس اثنا میں جوں جوں موزوں اساتذہ ملتے جائیں، نارمل اسکولوں کو موقع اور محل کے مطابق ترتیب دے لیا جائے اور دوسرے اسکولوں کو رفتہ رفتہ عملی اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ جب طلبہ واردھا اسکولوں سے تعلیم پا کر معلمی کی ٹریننگ کے لیے آئیں گے اور یہاں انھیں ٹریننگ کے جوہر سے پوری پوری طرح روشناس کرایا جائیگا اور اس سلسلے میں وہ کسی بنیادی دستکاری میں دسترس بھی حاصل کر لینگے، تو پھر یہ مشکل آسان

ہو جائے گی اور بہت جلد اچھے معلّم دستیاب ہو جائیں گے۔

۴۳۔ موجودہ صورت میں پرائمری کے معلّم کے لیے شرط یہ ہے کہ اُس نے ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کر لیا ہو اور اس کے بعد نارمل اسکول میں سال یا بعض صورتوں میں دو سال ٹریننگ لے لی ہو۔ پرائمری کے بہت سے اُستاد ایسے بھی ہوتے ہیں، جنھوں نے اس شرط کو پورا نہیں کیا ہوتا۔ چند ایسے بھی ہوتے ہیں، جنھوں نے میٹریکولیشن کی سند حاصل کی ہوتی ہے۔ پرائمری کے درجوں کو تعلیم دینے کے لیے دسویں پاس ہونا، مڈل پاس ہونے کی نسبت کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوتا۔ چونکہ انگریزی کی تعلیم سے جو فائدہ ہوتا ہے، وہ اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتا، جو اُسے دوسرے طریقوں سے پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی علمی قابلیت کے معلّموں سے ہم یہ اُمید نہیں رکھ سکتے کہ وہ اسی درجے کے طالب علموں کو تعلیم دے سکیں گے، جس درجے تک خود اُنھوں نے تعلیم پائی ہے۔ واردھا اسکیم معلّم کی اہمیت پر بہت زور دیتی ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔

۴۴۔ صرف اس خیال سے کہ اسکیم پر فوراً عملدرآمد کر دیا جائے، سال بھر کا ایک مختصر نصاب تجویز کیا گیا ہے، تاکہ چند منتخب اساتذہ ٹریننگ حاصل کر لیں اور فوری کارروائی کے لیے آسانی ہو جائے۔ لیکن ٹریننگ کے لیے پورا نصاب تین سال کا ہے۔

۴۵۔ ٹریننگ کالج کے داخلے سے پہلے ضروری ہے کہ اُمیدوار نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر لیا ہو یا ورنیکلر مڈل یا اسی درجے کا کوئی دوسرا امتحان پاس کرنے کے بعد اُس نے دو سال کا تجربہ حاصل کر لیا ہو۔ کمیٹی یہ بات تسلیم کرتی ہے۔ چونکہ اسکیم کی کامیابی کا راز زیادہ تر معلّموں پر ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ لائق اساتذہ بہم پہنچائے جائیں۔ بعض ممبروں کو یہ خدشہ ہے کہ چونکہ پرائمری کے معلّموں کی موجودہ تنخواہیں بہت قلیل ہیں، اس لیے ممکن ہے تنخواہوں

کی قلت کا خیال کرتے ہوئے امیدوار تین سال کی ٹریننگ لینا پسند نہ کریں۔

۳۶۔ لیکن تین سال کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد بھی یہ معلّم اس قابل نہیں ہونگے کہ بنیادی دستکاری کے اسکولوں میں اونچے درجے کے طلبہ کو کامیابی کے ساتھ تعلیم دے سکیں۔ ذاکر حسین کمیٹی اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے کہ اونچے درجوں میں اعلیٰ تعلیمی قابلیت کے معلّم مقرر کیے جائیں اور انھیں زیادہ تنخواہیں دی جائیں۔ یہ کمیٹی اس خیال سے اتفاق کرتی ہے۔

۳۷۔ کمیٹی اس بات کی سفارش کرتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لائق اُستانیاں مہیا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ذاکر حسین اور ووڈ ایبٹ رپورٹ دونوں میں اُستانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ بالخصوص نچلے درجوں کے لیے۔ اس سلسلے میں گرلز پرائمری اسکولوں کے نصاب کی رپورٹ پر (سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن ۱۹۳۷ء) سیر حاصل بحث ہو چکی ہے۔ اور اُستانیوں کی ضرورت اور اُن کی تقرری کے سلسلے میں جو نتیجے اخذ کیے گئے تھے، ان پر کمیٹی زور دینا چاہتی ہے۔ کمیٹی کے متعدد ممبروں کا خیال تھا کہ بعض بعض صوبوں میں تنخواہیں بہت قلیل ہوتی ہیں اور اتنی قلیل کہ بسا اوقات ادنیٰ خدمتگاروں سے بھی کم ہوتی ہیں اور دیہات میں معلّم کی سماجی حیثیت بھی معمولی ہوتی ہے، اس لیے بہتر قسم کے لوگ اس طرف رجوع نہیں ہونگے۔ کمیٹی ذاکر حسین رپورٹ کی اس سفارش کی تائید کرتی ہے کہ پرائمری اسکول کے ایک ٹرینڈ اُستاد کی تنخواہ اگر ممکن ہو، تو پچیس روپئے مقرر ہونا چاہیے۔ یہ تنخواہ بیس سے تو کسی صورت میں بھی کم نہ ہونا چاہیے۔ یہ کوشش بھی ہونا چاہیے کہ خاص خاص قومی اور اجتماعی تقریبوں پر اس کے حق اور درجے کے مطابق معلّم کی عزت افزائی کی جائے اور اس طرح اس کے مرتبے کو بڑھایا جائے۔

۳۸۔ کلچرل مضامین۔ کمیٹی نے اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے کہ کیا بنیادی دستـ کے ذریعے کامیابی کے ساتھ تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں موگہ اور دوسرے بعض کے طریق تعلیم کا بھی ذکر کیا گیا۔ لیکن جوں جوں طالب علم بڑا ہوتا ہے اور اونچے درجوں میں جاتا تو اُس کے کلچرل کام کاج اور ذہنی ترقی کے لیے بنیادی دستکاری کی تعلیم کافی ثابت نہیں ہو نُو نچے درجوں میں بھی اگرچہ بنیادی دستکاری کے ساتھ بہت سے تعلیمی کام کا تعلق پیدا کیـ سکتا ہے۔ لیکن کلچرل مضامین کے بعض پہلوؤں کی تدریس کے لیے، جن کا کسی بنیادی دستـ کے ساتھ تعلق پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ ضمنی تعلیم کا انتظام کرنا ازبس ضروری ہے۔ ڈاکٹر ذاکر اس بات پر متفق ہیں کہ اسکول کو ایسی تعلیم کے لیے بھی انتظام کرنا چاہیے جس کا تعلق عمل ا تجربے سے نہیں۔ ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ "ہمارا سارا علم، ہمارے عمل و تجر سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اسلاف کے تجربوں کے سرمایے سے بھی حاصل ہوتا ہے" (عملی مدرسہ

۳۹۔ نصاب کے مضامین اور مضامین کے سلیبس پر مختلف زاویہ نظر سے غور کیا گ جن نکتوں پر غور ہوا، ان میں یہ بھی تھے۔ بنیادی دستکاری کے لیے وقت کا تعین۔ سماجی و تدریس کے نصاب میں سیاسی رنگ۔ الجبرا اور بڑی بڑی کھیلوں کا اخراج۔ بعض مضامین بہت زیادہ امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اچھی درسی کتابوں کی کمی۔ ان کے علاوہ بعض ا باتیں بھی تھیں، جنھیں قدرے کم اہمیت حاصل ہے۔

۴۰۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے یہ بھی کہا کہ مجوزہ سلیبس محض آزمائشی ہیں۔ اس کی کام انحصار معلم اور اچھی کتابوں کی بہم رسانی پر ہوگا۔ جوں جوں تجربہ ہوگا، معلوم ہوتا رہیگا کہ سلیـ میں کس کس تبدیلی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ سلیبسوں میں ساتھ ساتھ ترمیمیں بھی ہوتی رہـ واردھا اسکیم کے لیے جو سلیبس تیار کیے گئے ہیں، وہ ہمیں صرف واردھا اسکولوں کے کام

کی نوعیت بتاتے ہیں۔ تجربے کے ساتھ تفصیلات بھی شامل کی جائیں گی۔ واردھا اسکیم یہ بھی تجویز کرتی ہے کہ ہر صوبے میں تعلیمی معاون مقرر کیے جائیں، جو تعلیمی اور دوسرے مطالبات کے پیش نظر نصاب کا متواتر معائنہ کرتے رہیں گے۔ جب مدرسی کتابوں کی تیاری کا کام شروع ہوگا، تو اُس وقت نارمل اسکولیں اور ٹریننگ کالجوں میں مزید تفصیلات بھی تیار ہونگی۔

اس بیان کے ساتھ کمیٹی نے یہ بھی قلمبند کیا کہ واردھا اسکولوں کے نصاب اور تعلیمیں بے لوچ نہیں ہونگے، بلکہ تجربے کے مطابق ان میں تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔

۴۱ - مذہبی تعلیم۔ نصاب میں مذہبی تعلیم شامل نہ ہونے کی وجہ سے اس پر بہت لے دے ہوئی۔ اس مسئلے پر ممبران کے خیالات میں بنیادی اختلاف تھے۔ بعض یہ کہتے تھے کہ اگر حکومت ہر ایک کے لیے تعلیم لازمی قرار دیتی ہے، تو اُسے مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کرنا چاہیے۔ مسلمان ممبروں نے کہا کہ مذہبی تعلیم عام تعلیم کا نہایت ہی ضروری حصہ ہے۔ اگر لازمی تعلیم کی اسکیم میں مذہبی تعلیم شامل نہ ہو، تو اُسے مسلمان قبول نہیں کریں گے۔

۴۲ - ڈاکٹر ذاکر حسین نے یہ بھی جتادیا کہ واردھا اسکیم کی رُو سے تمام مذاہب کے مشترکہ اصول کی تعلیم کا انتظام کیا جائیگا، تاکہ اس سے باہمی عزت اور رواداری کا احساس ترقی کرے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی کے الفاظ پیش کیے جاتے ہیں: "ہم نے واردھا تعلیمی اسکیم سے مذہبی تعلیم کو خارج کر دیا ہے۔ چونکہ ہمیں ڈر ہے کہ جس صورت میں آج کل مذہبی تعلیم دی جاتی ہے اور جس طرح اس پر عمل کیا جاتا ہے، وہ اتحاد اور یگانگت کے بجائے تفریق کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ہمارا خیال ہے کہ وہ سچائی جو سب مذہبوں میں مشترک ہے اس کا سبق بچوں کو دیا جا سکتا ہے اور اس کا سبق ضرور ہی دیا جانا چاہیے۔ لیکن ایسی سچائی کا سبق لفظوں کے ذریعے نہیں دیا جا سکتا۔ ایسی سچائی کا سبق لڑکے صرف معلم کی روزمرہ کی زندگی سے ہی سیکھتے

کہ پانچواں درجہ پاس کرلیں یا ان کی عمر گیارہ برس سے زائد ہوجائے۔

۴- تعلیم بچوں کی اپنی ورنیکلر میں دی جائیگی۔

۵- ہندوستان کے لیے ایک مشترکہ زبان پسند کی جاتی ہے۔ یہ زبان "ہندوستانی" چاہیے جو اُردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائیگی۔ طلبہ کو اجازت ہوگی کہ خط چاہیں اختیار کریں اور اس خط میں تعلیم دینے کے لیے ہر ممکن آسانی بہم پہنچائی جو ہر معلم کے لیے اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط جاننا ضروری ہونگے۔ بعض ممبر ایسے بھی ہیں جو یہ تجویز کرتے ہیں کہ رومن رسم الخط اختیار کیا جائے۔ اس سے زبان کی بہت سی مشکلات ختم ہو جائیں گی اور طلبہ اور معلم کا کام بڑی حد تک ہلکا ہو جائیگا۔

۶- جہاں تک دستکاری کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کا تعلق ہے، وادرھا اسکیم مطابیہ رپورٹ سے متفق ہے۔ چھوٹی جماعتوں میں یہ عملی کام مختلف قسم کا ہونا چاہیے اور ایسا کہ آگے چل کر اُونچے درجوں میں بنیادی دستکاری کی صورت اختیار کرلے۔ جو چیزیں بنیں گی، انھیں فروخت کیا جائیگا اور اس سے جو آمدنی ہوگی، اسے اسکول کی نگہداشت پر خرچ کیا جائیگا۔

۷- کلچرل مضامین کے خاص خاص پہلو، جن کا بنیادی دستکاری سے تعلق نہیں پیدا کیا جاسکتا، ان کی جداگانہ تعلیم دینا چاہیے۔

۸- معلموں کی ٹریننگ کا انتظام نئے سرے سے ہونا چاہیے۔

۹- کسی معلم کو بیس روپے ماہوار سے کم تنخواہ نہ ملے۔

۱۰- کوشش کی جائے کہ اور زیادہ اُستانیاں مہیا ہو سکیں۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو تعلیم و تدریس کی طرف راغب کیا جائے۔

۱۱- "بنیادی" اسکول اس وقت شروع کیے جائیں جب کہ موزوں تربیت یافتہ معلم دستیاب ہو جائیں۔

۱۲- نصاب میں تجربے کی رو سے ترمیم ہوگی۔

۱۳- بنیادی اسکولوں میں "انگریزی" کو اختیاری مضمون کے طور سے شامل نہ کیا جائے۔

۱۴- حکومت کو چاہیے کہ اگر کوئی قوم مذہبی تعلیم دینا چاہے، تو اُس کے لیے آسانی بہم پہنچائے جیسا کہ آجکل ہوتا ہے۔ لیکن اس کا خرچ حکومت کے ذمّے نہیں ہوگا۔

۱۵- خارجی امتحان نہیں ہونگے۔ بنیادی اسکول کے ایک دور ختم ہونے پر داخلی امتحان کے بعد سرٹیفکیٹ دیا جائے۔

۱۶- وہ طلبہ جو پانچواں درجہ پاس کرلیں یا گیارہ برس سے زائد عمر کے ہو جائیں، انھیں اسکول چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ دینا چاہیے۔

۱۷- داخلی امتحانوں کے نتیجوں کو معائنہ کرنے والے افسر بھی دیکھیں گے لیکن درجہ بدرجہ ترقی دینے کے ذمّے دار اسکول ہی ہونگے۔

دستخط:—

بی، جی کھیر — ایس، پی، مکرجی

سیّد محمود — فضل محمد خان

آر، ایس، شکلا — ہنسا مہتا

گرٹ روڈ سی گرگ — جے، ای، پارکنس

امرت کور — [ڈاکٹر ذاکر حسین بیمار ہونے کی وجہ سے رپورٹ پر دستخط نہیں کرسکے لیکن آپ نے اسے منظور کرلیا ہے۔]

ضیاءالدین احمد

ڈبلیو، ایچ، ایف، آرم سٹرانگ

ترکی میں تعلیم

ترکی میں مسئلہ تعلیم کی تاریخ تین عہدوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے :۔

(۱) دینی تعلیم کا دور۔ آغاز سے تنظیمات تک، یعنی ۱۸۳۹ء تک

(۲) درمیانی دور۔ تنظیمات سے جمہوریت کے اعلان تک ۱۸۳۹ء سے ۱۹۲۳ء

(۳) اصلاحات کا دور۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۷ء

پہلے دور کی مدت پانچ صدی۔ دوسرے کی تقریباً ایک صدی یا کچھ کم اور تیسرے جس میں حیرت انگیز تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے، پندرہ سال۔

جب پہلے پہل ترکوں نے خانہ بدوشی کو ترک کیا اور مفتوحہ علاقوں میں آبسے، تو انھیں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے فوجی نظام اور دیوانی محکمہ جات کے افسروں کے لیے تعلیم و تربیت سہولتیں مہیا کریں۔ اس غرض کے لیے ترکوں نے نیسیا اور بروصہ میں قاضی اور مفتی تیار کرنے کے لیے مدارس جاری کیے۔ سلیمان اعظم کے عہد حکومت کے اختتام تک یہ مدرسے تعداد میں اور ترقی کرتے گئے اور انھیں اداروں سے سلطنت عثمانیہ کے بڑے بڑے علما اور حکام تربیت پاکر

تنظیمات اس تحریک کا نام ہے، جس کے زیر اثر ترکی سلطنت نے ترکی کی شاہراہ گامزن ہونے کی کوشش کی۔ اس تحریک نے جدید اسکول کی بنیاد ڈالی۔ مگر پرانے مدرسے جوں کے توں رہے۔ اس عہد میں پرانی دینی قسم کی تعلیم اور زمانہ جدید کی تعلیم دونوں برابر جاری رہیں۔ پرانے مدارس کی تنظیم اور انصرام تو شیخ الاسلام کے ہاتھ میں رہا اور نئے اسکولوں اور اداروں کے لیے ایک نیا محکمہ معارف قائم کیا گیا۔ وزارت معارف کے اسکولوں میں نصاب تعلیم محض جد

زبان پر ہی موقوف نہ تھا، بلکہ حکومت کی طرف سے انجینئرنگ اور گلاطہ سرائے کالیسے کھولے گئے۔ لیسے میں بذریعۂ تعلیم فرانسیسی اور اساتذہ بھی فرانسیسی تھے۔ اس ادارے سے پرانی اور نئی طرز حکومت کے سیاسئین فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔

صوبجات کے والی اور حکام کی تربیت سول سروس اسکول "ملکیہ" (۱۸۷۷) میں کی جاتی تھی۔ قانون کے لیے ایک علیحدہ ادارہ حقوق مکتبی (۱۸۷۹) تھا۔ مگر تعلیمی ترقی کے لحاظ سے سب سے شاندار اور اہم دور اصلاحات کا ہے۔ جس میں نظام تعلیم کے بنیادی اصول چار قرار پائے گئے۔ (۱) تعلیم کو مذہبی اثرات سے آزاد کرنا (۲) اتحاد ملی (۳) لڑکوں اور زنانہ تعلیم کے طریقوں کی مغائرت دُور کرنا (۴) طلبہ کی ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت کا انتظام۔

پچھلے دس سال میں ترکوں کی تمدنی اور سیاسی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور مغربی تمدن کے اختیار کرنے کی تحریک کے جدید تعلیمی تحریک سے گہرے تعلقات ہیں۔ اس تحریک کا سب سے اہم اقدام لاطینی رسم الخط کا اختیار کرنا تھا۔ دوسرے ترکی تاریخ کی تدریس کی اصلاح اور ترکی زبان کی اصلاح۔

ترکی سیکڑوں سال سے عربی اور فارسی الفاظ اور تراکیب ترکی لغت میں شامل ہوتی رہی ہیں۔ در حقیقت زیادہ مشکل تو تراکیب اضافی، وصفی اور اسماء الجمع وغیرہ کی تھی۔ ان اجنبی تراکیب کی وجہ سے زبان بہت مشکل اور بے ڈھنگی ہو گئی اور طرز بیان غیر واضح اور پیچدار ہو کر رہ گیا۔ در حقیقت یہ زبان محض ادبی اور کتابی بن گئی۔ جس کا حلقۂ اثر تعلیم یافتہ طبقہ تھا۔ اس کی وجہ سے تحریری زبان اور عام فہم زبان میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی۔

شمسی، نمیق کمال اور اکرم اور دوسرے جدید مصنفین کے اثر سے ترکی زبان بہت سے اجنبی اثرات سے پاک ہو گئی۔ لیکن جدت پسند طبیعتوں کے لیے اس تحریک کی رفتار بہت سست

تھی، اس لیے بعض مصلحین نے یہ کوشش کی کہ جن عربی اور فارسی الفاظ کے بجائے ترکی
مل سکتے ہیں، وہ ترکی لغت سے خارج کر دیے جائیں۔ پس ترکی ماہرین السنہ نے صوبو
دیہاتوں اور ان غیر ممالک میں جہاں ترکی زبان بولی جاتی ہے، نئے ترکی الفاظ کی جستجو میں
تحقیقات شروع کر دی، تاکہ یہ الفاظ اجنبی خارج شدہ الفاظ کی جگہ لے سکیں۔ آغاز جمہوریت
آزادی کے جوش و خروش میں تو یہ تحریک خوب زور پکڑ گئی مگر اب کچھ ٹھنڈی پڑ گئی ہے تا
کا اصلاحی کام چل رہا ہے اور ابھی تک اس کے نتائج پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

ابتدائی مدارس ۔ سلاطین ترکیہ کے زمانے میں اب سے بیس سال پہلے تک ابتدائی
انتظام وزارت معارف کے ہاتھ میں تھا بعض مدارس غیر ملکیوں کے تھے ۔ دوسرے غیر مسلم اقوام
مذہبی ابتدائی مدارس شیخ الاسلام اور محکمہ اوقاف کے ماتحت تھے۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کے قا
تحت یہ مختلف النوع ادارے یک قلم موقوف کر دیے گئے اور ابتدائی تعلیم کا مکمل نظام وزارت
کو تفویض کیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کی مدت گاؤں میں تین سال اور قصبوں میں پانچ سال ہے۔ پہلی
جماعتوں میں ایک جامع مضمون پڑھایا جاتا ہے جس کا نام علم حیات (حیات بلگیسی) ہے۔
میں معلومات انسانی کے ابتدائی امور شامل ہیں۔ بچوں کو ان کے ماحول کی اشیا کا مطالعہ کرایا
اور ایسے مشاہدات پر غور و فکر کرنا سکھایا جاتا ہے، جو ان کی قوت متخیلہ کو بیدار کر دیں۔ نیز ا
تقریر، تحریر، نقاشی اور ورزش کی مشق کرائی جاتی ہے تاکہ ان میں قوت بیان اور طاقت اظہار
ہو۔ ان اداروں کی تعلیم مشہور و معروف حقیقی واقعات پر مبنی ہوتی ہے اور بالعموم سبقوں کے عنو
روزانہ اخباروں سے لیے جاتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں ترکوں کی توجہ مسئلہ سنجک پر مرکوز تھی۔ ا
موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچوں کو بتایا گیا کہ ملک شام ایک زمانے میں ترکوں کے قبضے میں
یا اس سے متعلق دوسرے مسائل مثلاً بحیرۂ روم کی سیاسی اہمیت کیا ہے، ہم زبان احساس ملی کو زندہ

ذریعہ کیوں ہے؟ انتخاب (BALLOT) مجلس اقوام اور سیاسی عہدنامے کیا ہیں، وغیرہ وغیرہ۔
ہر سال ۱۴ر جنوری سے ۱۵ر جنوری تک سودیشی، یا کفایتی ہفتہ منایا جاتا ہے۔ اگر موسم خوشگوار ہوا، تو اس ہفتے کے دوران میں ملکی صنعت و حرفت کی ترقی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بچے کارخانوں، بنکوں اور ریلوے اسٹیشنوں کی سیر کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں ان کو علم اقتصادیات کی بھی کچھ واقفیت ہوجاتی ہے۔ مثلاً ملکی پیداوار، درآمد، برآمد، بنک کا سود اور قرضۂ ملی وغیرہ بہت سے ضروری مسائل سے روشناسی ہوجاتی ہے۔

گرامر اسکول۔ گرامر اسکول ابتدائی مدارس اور لیسے کی درمیانی کڑی ہے۔ گرامر اسکول کی مدت تعلیم چھ سال ہے۔ جس کو دو برابر حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ آخری تین سال درجہ لیسے کے لیے مخصوص ہیں۔

لیسے۔ لیسے نے دورِ اصلاحات میں ولایات کے عدادیہ مدارس کی جگہ لے لی ہے۔ اس کا نصاب وسیع اور جدید کر دیا ہے۔ معیارِ تعلیم بھی پہلے سے بلند ہے۔ یونیورسٹی میں بہتر طلبہ بھیجنے کی غرض سے میٹرک امتحان کو اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ سے علیحدہ قرار دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں طلبہ کی تعداد ۲۰۷،۴۶ تھی، جو ۱۹۲۶ء سے دس گنی ہے۔ بعض ولایات (صوبوں) میں بہت سے نئے مدارس قائم کیے گئے ہیں اور ان میں دار الاقامۃ، ورزش خانے، معمل اور کتب خانے تعمیر کیے گئے ہیں۔

اگرچہ اب نصاب میں سائنس کے مختلف مضامین کا اضافہ ہوگیا ہے تاہم عربی اور فارسی کی لازمی تعلیم خارج کرنے کی وجہ سے کام کافی ہلکا ہوگیا ہے۔ عربی اور فارسی نکال دینے سے کچھ ایسا تعلیمی نقصان واقع نہیں ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان زبانوں کے پڑھانے کے طریقے پرانے اور فرسودہ تھے اور زیادہ زور طالب علم کی قوتِ حافظہ پر دیا جاتا تھا۔ اس کی قوتِ ادراک

عورتوں کی ارتقا کے لیے اس طریقۂ تعلیم میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ان غلط طریقوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ۔
ان اصحاب کے ہاتھ میں جو پرانے اصلاحیہ مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں، فارسی یا عربی زبان کی کو
کتاب دے دی جائے، تو اس کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتے۔

یونیورسٹیاں۔ آج کل ترکی میں صرف استنبول کی یونیورسٹی ہے۔ جس میں پانچ شعبے ہ
قانون، ادب، اقتصادیات، سائنس، طب۔

یونیورسٹی کے اساتذہ میں ایسے اصحاب ہیں، جو اپنے علم وفضل کی وجہ سے یورپ بھ
مشہور ہیں۔ ان میں بیشتر اہل جرمنی ہیں۔ جن کو نازی حکومت نے ملک بدر کر دیا ہے۔ لکچ
بالعموم جرمن یا فرانسیسی زبان میں ہوتے ہیں اور نوجوان ترک پروفیسر جو غیر ملکی یونیورسٹیوں
سند یافتہ ہیں، ان کا ترجمہ ترکی زبان میں کر دیتے ہیں۔ ان اساتذہ کے ساتھ یہ معاہدہ ہے
وہ چار سال کے بعد ترکی زبان میں لکچر دیا کریں گے۔ ان میں سے بعض نے تو اس مدت معید
سے پہلے ہی اس شرط کو پورا کر دیا ہے۔ چند سالوں میں انگورا میں بھی ایک یونیورسٹی قائم کی جائ
فی الحال وہاں قانون، السنہ جدیدہ، جغرافیہ، تاریخ اور طب حیوانات کے شعبے موجود ہیں۔ علاو
سیاسی کا مدرسہ جو دیوانی محکموں کے لیے امیدوار تیار کرتا ہے، حال میں ہی انگورہ منتقل کر دیا
گیا ہے اور عنقریب ہی شعبہ طب کا افتتاح بھی ہو جائیگا۔ انگورہ اور استنبول میں مدارس میں لڑکیو
کی تعداد لڑکوں سے ایک چوتھائی ہے۔ صرف استنبول کے شعبۂ ادب میں لڑکیاں کچھ زیادہ ہیں
یعنی لڑکے ۲۰۷ اور لڑکیاں ۲۸۷۔ لڑکیوں کا مقصد یونیورسٹی کی تعلیم سے محض ذہنی تربیت ہی
نہیں، بلکہ وہ اس تعلیم کے ذریعہ اقتصادی آزادی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ترکی میں لڑکیوں کے
لیے کوئی ملازمت یا پیشہ ممنوع نہیں۔ منشی گری میں عورتوں کی بھرمار ہے ہی۔ مگر آج کل عورتیں
منصف، وکیل، طبیب، سلوتری اور سرکاری ملازم بھی ہونے لگی ہیں۔

آج ہم انگورہ اور ترکی کے ہر بڑے شہر میں علی الصبح جب سیکڑوں عورتوں کو بنکوں اور دفاتر وزارت میں روزانہ کام پر جاتے دیکھتے ہیں، تو خواہ مخواہ دل میں خیال آتا ہے کہ بیس برس پیشتر انھیں کی بہنیں حرم سرا کی چار دیواری میں مقید رہا کرتی تھیں۔ ترکیہ جدید کی ترقی پر حیرت ہی نہیں ہوتی، معجزہ کا گمان ہوتا ہے۔

مدارس کی تعداد زیادہ ہو جانے سے طلبہ کے رہنے سہنے کا مسئلہ بھی زیادہ اہم ہوتا جا رہا ہے۔ انگورا کو ہی لے لیجیے۔ اس کی آبادی چالیس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ تیس ہزار ہو گئی ہے اور انگورا یونیورسٹی کی تجویز کے ساتھ ساتھ رہنے سہنے کے انتظامات کا مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ وزارت تعلیم جب کبھی کوئی نیا مدرسہ کھولتی ہے، تو ساتھ ہی دارالاقامے کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ترکیہ جدیدہ میں یونیورسٹیوں نے ایک بہت ہی اہم کام اپنے ذمے لے لیا ہے اور وہ علمی تحقیقات ہے۔ اب ترک اپنی تاریخ کو غیر ملکی مصنّفین کی عینک لگا کر نہ پڑھیں گے۔ ترکی نوجوان کو تاریخی اور آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جدید طریقوں پر تربیت دی جا رہی ہے تاکہ محکمہ آثار قدیمہ اجنبی محققین کا مرہونِ منّت نہ رہے۔

فنی تعلیم۔ ترکی حکومت جو تجاویز صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لیے عمل میں لا رہی ہے۔ ان سے ہر صنّاع اور پیشہ ور کے سامنے ترقی کی نئی راہیں کھل گئی ہیں۔ اس لیے وہ فنی اور صنعتی ادارے جو عملی اور جدید تعلیم دیتے ہیں، مقبول عام ہو گئے ہیں۔ تین ماہ ہوئے، جب انگورہ میں گھریلو صنعت و دستکاری کی نمائش کی گئی تھی جس کے مطالعے سے پتہ چلا کہ ترکی صنّاع کی مہارت اور نفاست کس طرح دوبارہ نئی زندگی حاصل کر رہی ہے۔ فوجی اور جہاز رانی کے مدارس کے علاوہ اور بہت سے فنی ادارے کھولے گئے ہیں، جو اپنی قبیل کے یورپی مدارس سے لگا کھا سکتے ہیں۔ مثلاً نارمل ہائی اسکول، انجنیروں کا ہائی اسکول، فنون لطیفہ کا مدرسہ، زراعتی مدرسہ اور ٹریننگ

احتیاط نہ برتی جائے، بچے کے ہکلے ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ ایسے اسباب یعنی خوف وغیرہ صرف ہکلے پن کو بڑھانے میں مدد دیتے ہیں اور ایک یا دو فی صدی ہکلاپن ان سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ صحیح وجوہ، جن سے بچوں میں بات بات پر جھجکنے کی عادت پڑجاتی ہے، وہ والدین کی بے جا حمایت اور ضرورت سے زیادہ احتیاط ہیں۔ بہت دفعہ یوں ہوتا ہے کہ باپ بے جا سختی پر آمادہ رہتا ہے اور ماں بے جا حمایت پر، چنانچہ ہکلے پن کا مرض بچوں میں ہوجانا یقینی امر ہے۔

قوتِ گویائی میں کچھ نقص، ہکلے پن کے بڑھ جانے کی دوسری وجہ ہے۔ یہ نقص عموماً جسمانی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مختصراً ہماری گفتگو میں دو اجزا شامل ہیں۔ اوّل، وہ بات جو ہم ادا کرنا چاہتے ہیں اور دوم وہ حرکات جن کی مدد سے ہم بات ادا کرتے ہیں۔ ان دو اجزاء میں وہ سب باتیں شامل ہیں، جنھیں ہم "الفاظ" "ذخیرۂ الفاظ" یا "زبان" کہتے ہیں۔ بولنے والے میں ایک ایسی حس موجود ہوتی ہے، جو گفتگو کو حرکت میں لاتی ہے۔ عموماً ہم کچھ ایسی بات سنتے یا دیکھتے ہیں، جو ہمیں فوراً بولنے پر آمادہ کرتی ہے۔ مثلاً اپنے دوست کو دیکھ کر ہمارا جی بے اختیار بولنے کو چاہے گا۔ اخبار میں کوئی دلچسپ خبر پڑھ کر ہم فوراً باآوازِ بلند اُسے دوسروں کو سنانے کے خواہش مند ہوں گے۔ کسی خوبصورت شے کو دیکھ کر تعریف کرنا چاہیں گے۔ کسی خوش الحان جانور کا گانا سن کر بے اختیار گانے پر مجبور ہوجائیں گے۔ یہ خواہشات یکدم ہمارے دل سے نکل کر دماغ تک پہنچتی ہیں اور اپنے ساتھ اُن تمام تصاویر اور الفاظ کو کھینچ لے جاتی ہیں، جنھیں دماغ بولنا یا بیان کرنا چاہتا ہے۔ ان حرکات کے ساتھ فوراً ہماری قوتِ گویائی بیدار ہوتی ہے۔ جملے کو ادا کرنے میں جن لوازمات کی ضرورت ہے۔ وہ "سانس"، "آواز"، "حرفِ حلق کی آواز" اور "لفظوں کی ہم آہنگی" ہیں۔ جب یہ تمام طاقتیں باہم مل کر کام کرتی ہیں، تو بات ادا

کے فارغ التحصیل طلبہ کے معیارِ لیاقت کو بلند کرنے سے ہی یونیورسٹی تعلیم کا معیار بلند ہو سکتا ہے اور وزارت کے محکموں میں آجکل یونیورسٹی کے سند یافتگان ہی بھرتی کیے جاتے ہیں۔ السنۂ جدیدہ کی تعلیم کا مسئلہ ملک کے لیے بے حد اہم اور ضروری ہے۔ ادبِ ملی کی تکمیل کا مسئلہ بھی فوری توجہ کا محتاج ہے۔ بہت سے مغربی شاہکار اب تک ترکی زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکے۔ اس بارِ عظیم کی ذمہ داری آئندہ نسلوں پر ہے۔

ترکی سیاستین کی دوراندیش پالیسی کی وجہ سے استنبول یونیورسٹی کا معیارِ تعلیم بہت بلند ہو گیا ہے۔ نصابِ تعلیم وسعت اور یونیورسٹیوں سے کسی حالت میں کم نہیں ہے۔ اگر کوتاہی ہے، تو اساتذہ کی طرف سے نہیں، بلکہ طلبہ کی طرف سے ہے۔ اسی غرض سے حکومت لیسے کا معیار بڑھانے کی انتہائی کوشش کر رہی ہے۔ انگورا یونیورسٹی کی تجویز کے بعد حکومت تیسری یونیورسٹی کے قیام پر غور کرے گی۔

ادب کی تدریس۔ ترکی زبان کی اصلاح نے ایک اور مشکل پیدا کر دی ہے۔ موجودہ اسکولوں میں فارسی اور عربی کی صرف و نحو نہیں پڑھائی جاتی، اس لیے پچھلے دس سال کے عرصے میں بہت سے فارسی الفاظ بیکار اور غیر مستعمل ہو گئے ہیں۔ نہ تو سرکاری تحریر میں استعمال ہوتے ہیں اور نہ اخباروں میں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی طلبا اب ترکی متقدمین کا کلام پڑھ نہیں سکتے اور نیفی، نبی، فضلی اور ندیم جیسے شعراء ان کے لیے معمہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ادب قدیم کو مدارس کے نصاب سے خارج کرنے کا تخیل بھی کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا۔ ادب تو قوموں کی حیاتِ ماضی کا آئینہ اور حیاتِ ملی کا اہم جزو ہوتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس پرانے کلام میں سے غیر مستعمل اور غیر مانوس الفاظ نکال دیے جائیں۔ اس میں یہ دقت ہے کہ اصل اور جدید ایڈیشن میں کوئی مطابقت نہ رہیگی۔ ترکی کے تعلیمی حلقوں میں اس مسئلہ پر بہت غور کیا

جا رہا ہے۔

دیہاتی مدارس۔ ترکی میں گاؤں دور دور واقع ہوئے ہیں اور آبادی کم ہے۔ فاصلہ کے سبب گاؤں کو تعلیمی ضروریات کے لیے ملحق نہیں کیا جا سکتا۔

بعض حالات میں جغرافیائی مشکلات تو دور ہو سکتی ہیں، مگر اس سے عام مسئلہ تو حل نہیں ہو پاتا۔ درحقیقت چالیس ہزار مدارس کی تعمیر اور اساتذہ کی فراہمی کے لیے بہت کی ضرورت ہے۔ اعلان جمہوریت سے سال بسال تعلیم عامہ کی مد پر خرچ کا اضافہ ہی ہوتا ہے لیکن ضروریات اس قدر وسیع ہیں کہ ایک معمولی میزانیہ کی مدات سے اس کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اُمید ہے کہ مستقبل قریب میں جب حکومت کی صنعتی اسکیم تکمیل پا چکے گی تو ایک پنج سالہ تعلیمی لائحہ عمل کی بنیاد ڈالی جائے گی۔ ترکی میں تعلیمی پالیسی کی تعمیر جمہوریت اور شہر کے اصولوں پر استوار کی گئی ہے۔ ابتدائی مدارس کے نچلے درجوں سے لے کر یونیورسٹی کے اعلیٰ درجے تک کہیں بھی سماجی امتیازات کا نام و نشان نہیں ہے۔ بالعموم تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ دارالاقامہ کے طلبہ سے بھی رہنے سہنے کے لیے کچھ نہیں لیا جاتا۔ جہاں کہیں فیس لگائی گئی ہے، محض برائے نام ہے اور مقامی اقتصادی حالات کا جائزہ لے کر اس نسبت سے لگائی جاتی ہے۔

مدرسے نہ صرف طلبہ کو کشمکش حیات کے لیے تیار کرتے ہیں، بلکہ ایسے شہری پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جن کو فرائض ملی کا پورا پورا احساس ہے۔ بچوں کو موجودہ حکومت سے محبت کرنے کا سبق سکھایا جاتا ہے، جس نے ترکی کو آزادی، تحفظ نفس اور خودداری کی تعلیم دی۔ حب وطن کے اس جذبے کو ہر طریق سے بیدار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ترک بچے اور بچیاں نہ صرف یہ جانتے ہیں کہ کیا کچھ کیا جا چکا

بلکہ اُنھیں اس امر کا بھی شدید احساس ہے کہ کیا کچھ کرنا باقی ہے۔ اُنھیں بتایا جاتا ہے کہ اس اہم کام کی ذمہ داری ان کے شانوں پر ہے۔ ان میں بجائے ایک مصنوعی جذبۂ افتخار اور طمانیت پیدا کرنے کے ایک پیہم قوت عمل بیدار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اُنھیں یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ ترکی ایک بہشت ہے، بلکہ یہ کہ اس کو بہشت بنانا ان کے ہاتھ میں ہے۔ تعلیمی ترقی کا راستہ وادی پُرخار میں سے گزرتا ہے، لیکن پچھلے پندرہ سال کی کوششوں کے نتائج بے حد حوصلہ افزا ہیں۔ تجربی اور نامکمل کوششوں کا دور جلد ہی ختم ہوجائیگا۔ ترکوں نے ضبط و تنظیم کی خداداد قابلیت کا عجیب شاندار مظاہرہ دنیا کے سامنے پیش کردیا ہے۔ آئندہ نسل اپنے پیشرو مصلحین کے تجربے اور اُن تھک کوششوں کا پھل اُٹھائے گی اور ان کے لیے ترقی کی شاہراہ پُرفضا اور آسان ہوگی۔ (ایشیاٹک ریویو)

ہربرٹ سپنسر کا نظریۂ تعلیم

از
شیخ غلام جیلانی، ایم اے، لکچرار گورنمنٹ کالج لودیانہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

بقائے نفس کے لیے صحت کے عام اصولوں کی پابندی لازمی ہے۔ اگر کام کرنے کے بعد آرام کر لیا جائے۔ کھانا وقت پر کھایا جائے اور پانی اسی وقت پیا جائے، جب واقعی پیاس محسوس ہو، تو انسانی نظام خوب اچھی طرح کام کرتا رہے گا اور انسان بیماریوں سے بچا رہیگا۔ لیکن عام طور پر لوگ اتنے سادہ اور آسان صحت کے اصولوں پر عمل نہیں کرتے۔ تجربے کے طور پر ان دوستوں اور رشتے داروں پر جن کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہے، ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ ان میں کون کون سے ایسے ہیں، جن کی صحت قائم ہے۔ یقیناً ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی۔ ان میں سے بیشتر طرح طرح کی بیماریوں کے شکار ہونگے اور قطع نظر امراض مخصوصہ کے قبل از وقت بڑھاپا اور جسمانی نقاہت ان پر مستزاد ہوگی۔ عام لوگوں سے اگر دریافت کیا جائے، تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائیگی کہ اگر انھیں صحت کے عام اصولوں کا علم ہوتا تو وہ بہت سے ایسے مرضوں سے بچے رہتے، جن کا وہ شکار ہوئے۔ ایک شخص کو دل کا عارضہ محض اس لیے ہے کہ اس نے نہایت لاپرواہی سے ایک گرم کمرے میں دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد اپنے آپ کو ایک دم باہر کی کھلی ہوا کے سپرد کر دیا۔ دوسرے شخص کی آنکھیں عمر بھر کے لیے اس واسطے خراب ہو گئیں کہ اس نے جسم کا یہ اہم ترین حصہ مطالعے کی نذر کر ڈالا۔ تیسرا شخص

لنگڑا اس لیے ہوگیا کہ وہ ٹانگ پر چوٹ آنے کے باوجود پھرتا رہا اور علاج معالجہ سے بے نیاز رہا اور چوتھے شخص کو برسوں تک اس لیے لیٹنا پڑا کہ وہ اختلاجِ قلب کے باوجود لکڑیاں پھاڑنے کا کام بدستور کرتا رہا۔ بچے کو شروع ہی سے ایسی تعلیم دینی چاہیے، جس سے اُسے اس بات کا احساس ہو جائے کہ "صحت" اور "کامیابی" ہم معنی الفاظ ہیں۔ انسان کی صحت اگر قائم ہے تو کامیابی کی اُمید ہو سکتی ہے، ورنہ نہیں۔ اور نیز یہ کہ صحت کے اصولوں سے عدم واقفیت کا انجام ناکامی ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس کا ایک اور نتیجہ یہ بھی ہوتا کہ انسانی عمر کم ہو جاتی ہے۔ بچوں کو اس امر کا پوری طرح احساس دلانا چاہیے کہ فرد ایک معمولی سی بیماری کے بعد وہ نہیں رہتا جو پہلے تھا۔ ہر بیماری خواہ وہ کیسی ہی ہو، انسان پر اپنا اثر ضرور چھوڑ جاتی ہے اور بہت سے مرض ایسے ہیں، جن کا اثر دائمی ہوتا ہے۔

زیادہ تر انسان چھوٹے چھوٹے عارضوں کو سہتے سہتے اپنی صحت وقت سے بہت پہلے کھو بیٹھتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ انسان اپنی نصف عمر ان چھوٹی چھوٹی بیماریوں کی نذر کر دیتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ بچوں کے بقائے نفس کے سلسلہ میں اس واقفیت کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے، جس سے انسانی صحت قائم رہ سکے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک پڑھا لکھا انسان یونانی علم الاصنام سے متعلق ایک موہوم دیوتا کے نام سے لاعلمی کا اظہار کرتا ہوا، تو شرماتا ہے۔ لیکن اُسے کھلم کھلا ان حقائق سے عدم واقفیت کا اقرار کرتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ نبض ایک منٹ میں کتنی مرتبہ حرکت کرتی ہے؟ یا یہ کہ پھیپھڑے کس طرح پھولتے ہیں؟ کیا یہ غضب نہیں کہ ہمارے ماہرانِ تعلیم تو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بچوں کو ہزاروں برس کی فرسودہ بدعتوں کا جو یونانی علم الاصنام سے متعلق ہیں، پوری طرح علم ہو جائے لیکن اگر وہ انسانی جسم اور نظام سے بے بہرہ محض رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ ان کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ

بچے کو اگر موخر الذکر حقائق سے بے بہرہ ہی رکھا جائے تو اچھا ہے۔ قائم شدہ دستور العمل ذرا سی ترمیم کرنے کے خیال ہی سے وہ آتش زیر پا ہو جاتے ہیں، لیکن جب تک یہ رہے گا، تعلیم صحت بے حد ناقص رہیگی۔ خدا جانے وہ "زیادہ" کو "افادیت" پر اس قدر ترجیح کیوں دیتے ہیں۔

عمل کی اہمیت

ظاہر ہے کہ وہ علم جو بلا واسطہ بقائے نفس سے متعلق ہے اور جس سے انسانی صحت برقرار رکھی جا سکتی ہے، نہایت ہی ضروری ہے۔ اس سے یہ مقصود نہیں کہ اس علم کے محض سیکھ لینے ہی سے انسانی صحت کا مسئلہ حل ہو جا سکتا ہے، بلکہ ضروری جزو عمل ہے۔ صحت کے اصولوں پر عمل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بچے کو شروع ہی سے ان پر عمل کرنا سکھانا چاہیے۔ حتی الوسع کوشش کی جائے کہ اس میں عمل کی صلاحیت پیدا ہو جائے، جو بڑھتے بڑھتے عادت کی صورت اختیار کر لے۔ اسمیں شک نہیں کہ موجودہ مادہ پرست اور مشین زدہ زمانے میں صحت برقرار رکھنا دشوار ہے۔ بڑے بڑے صنعتی شہروں کی آب و ہوا ناقص ہے۔ کھلی ہوا ملنا مشکل ہے۔ ورزش کے لیے کھلے میدان عنقا ہیں۔ دھوئیں کی فراوانی اور روشنی کی کمی اس پر مستزاد ہے۔ اس کے علاوہ لمحاتِ فرصت کا بہترین استعمال تھیٹر سمجھا جاتا ہے جو صحت کے لیے بہت ہی مضر ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے دس بارہ گھنٹے کے قریب کارخانوں کے تنگ کمروں میں مشینیں چلائی ہوں اور جہاں کسی قسم کے معدنی تیلوں سے فضا حد درجہ کثیف اور غلیظ کر رکھی ہو، شام کو اپنی فرصت کا وقت گزارنے کے لیے ایک بند کمرہ میں چلا جاتا ہے اور اس بند کمرے میں اپنے آپ کو گھنٹوں قید رکھتا ہے۔ سگرٹوں وغیرہ کے دھوئیں سے کمرہ پُر ہوتا ہے اور وہ مرد خدا اس کو اپنی تفریح سمجھتا ہے۔ کیا اس ماحول میں

انسانی صحت برقرار رہ سکتی ہے۔ اس لیے ان حالات میں کیا یہ اور بھی ضروری نہیں کہ بچے کو صحت کے اصولوں کی پوری طرح واقفیت بہم پہنچائی جائے اور نہ صرف یہ بلکہ اسے مجبور کیا جائے کہ وہ اس پر عمل کرے۔ حتیٰ کہ یہ عمل اس کی فطرتِ ثانیہ ہو جائے۔ اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بچے کے نصابِ تعلیم میں علمِ صحت ایک نہایت ضروری مضمون ہونا چاہیے جسے باقی تمام مضامین سے زیادہ اہمیت دی جائے۔

منتہائے تعلیم

ہمیں اس علم کی اہمیت پر زیادہ زور نہیں دینا چاہیے، جو فرد کی معاشی زندگی میں ممد ہو اور بالواسطہ تعلق رکھتا ہو۔ اگرچہ عوام ایسے علم کو تعلیم کا منتہا خیال کرتے ہیں، لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اچھے اچھے سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگ بھی منتہائے تعلیم کا سطحی سا مطالعہ کرتے ہیں اور غضب تو یہ ہے کہ ماہرینِ تعلیم کا زاویۂ نگاہ بھی کچھ اسی قبیل کا ہوتا ہے۔ انسانی زندگی محض معاشیات سے عبارت نہیں۔ آخر انسان محض روپیہ کمانے کی کل کیوں بنا رہے۔ فطرت کا اقتضا ہے کہ وہ ایک کامیاب سماجی اور مذہبی اور اگر ہو سکے، تو ملی اور سیاسی زندگی بسر کر سکے۔ خلقِ خدا کی خدمت کر سکے اور اپنے آپ کو سماج کے لیے سودمند بنا سکے۔ اگر فرد کو تعلیم محض ایک ہی مقصد سے دی جائے یعنی یہ کہ وہ ایک کامیاب معاشی زندگی بسر کر سکے، تو مؤخر الذکر ارفع و بلند مقصد میں ناکام رہے گا۔ ایسی یک طرفہ تعلیم اسے خود غرضی کا ایک پتلا بنا دے گی اور وہ سماج کی خدمت کے لیے یکسر ناکارہ ہو جائے گا، تو ظاہر ہے کہ بچے کو ایسی ہمہ گیر تعلیم دینا چاہیے، جس سے اس کے خیالات پاکیزہ اور بلند ہوں اور اس کے دل میں سماج اور اپنے کم نصیب بھائیوں کی خدمت کا ولولہ پیدا ہو، جو اُسے ملکی، قومی اور ملی خدمت کے لیے ابھارے۔

علم ریاضی کی اہمیت

چونکہ اس مادہ پرست زمانے میں ایسی تعلیم کو جو فرد کی معاشی زندگی کو کامیاب بنا سکے، بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس لیے اب اس کی طرف بہت توجہ دی جاتی ہے علاوہ دنیاوی زندگی کو کامیاب بنانے کے ضمن میں علم ریاضی کو بہت ہی اہمیت دی جاتی ہے۔ مثلاً صنعتی زندگی کا انحصار زیادہ تر علم ریاضی ہی پر ہے۔ اس ضمن میں خواہ اشیا کا خریدنا اور بیچنا ہو یا حساب کتاب رکھنا یہ سب ریاضی کے ذریعے ہی کیا جائیگا۔ عمارتوں کے بنانے کے سلسلے میں خاص اُونچے درجے کے علم ریاضی کی ضرورت ہوگی۔ گویا ایک معمولی بڑھئی سے لے کر ایک بہت بڑے انجنیر تک کا کام ریاضی کے بغیر نہیں چل سکتا۔ زمین کی پیمائش، عمارتوں کے نقشے، تعمیر کا کام وغیرہم سب ریاضی کے ایک خاص شعبے یعنی اقلیدس کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ریلوے کا سب کام مثلاً پلوں کا بنانا، سرنگوں کا کھودنا، لائنوں کا بچھانا وغیرہ، اقلیدس کی مدد سے کیا جاتا ہے اور آجکل تو کسان کو بھی ریاضی کی ضرورت ہے کیونکہ اسے بھی ہل ایک سیدھی قطار میں چلانا پڑتا ہے۔

ملکۂ فطری

آجکل سب کام مشین کے ذریعے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے مستری اور انجنیر کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے مشینوں کا بنانا اور مشینوں کی مرمت کا کام ایک مرغوب پیشہ ہوگیا ہے۔ بعض بچے شروع ہی سے پرزوں کا مطالعہ بہ نظرِ عمیق کرتے رہتے ہیں۔ ان کا جوڑ توڑ کرتے رہتے ہیں اور ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ ان پرزوں کے گورکھ دھندے سے ایک مشین نما ڈھانچہ سا کھڑا کرلیں۔ ایسے بچے بہت کامیاب مستری یا انجنیر بن سکتے ہیں۔ ان سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ یونیورسٹیوں میں جاکر تاریخ یا ادب کی

میابی سے حاصل کرلیں گے غلطی ہے اور والدین کو چاہیے کہ ایسے بچوں کو ان کے میلان
ے مطابق تعلیم دیں، جو صنعتی ہو۔

اگر بچے کی حرکات کا شروع ہی سے بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے، تو اس کے ملکہ فطری
، سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ والدین کے لیے یہ کام بہت صبر آزما ہے، لیکن
ب بچے کے حق میں اس سے مفید تر کوئی اور خدمت نہیں کر سکتے۔ ہزاروں نوجوان زندگی
رِ ناکامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ غبی ہوتے ہیں یا کسی اور وجہ سے ناکارہ
ہیں، بلکہ اس لیے کہ اُنھیں ایسی تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی ہے، جو اُن کے میلان
خلاف ہوتی ہے۔

آج کل کی صنعتی دنیا میں تیسرے درجے پر علم کیمیا کی اہمیت ہے۔ رنگ سازی،
کا کام، کپڑوں کو رنگنے کی صنعت سب کے سب علمِ کیمیا کے مرہونِ منت ہیں۔ اس
ہ کچی دھاتوں مثلاً تانبا، قلعی، سکہ، چاندی اور لوہے کو پگھلانا اور صاف کرنا بھی علمِ
، کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ آج کل زراعت کے بہت سے کاموں میں بھی اس علم کی
ت ہے۔ مثلاً مصنوعی کھاد کا استعمال وغیرہم۔ اس کے علاوہ کھانڈ صاف کرنے، گیس
، صابون بنانے اور بندوق کا بارود بنانے میں بھی بہت حد تک علم کیمیا کی ضرورت
ہے۔ آج کل شاید ہی کوئی صنعت ایسی ہوگی، جس میں علمِ کیمیا کو دخل نہ ہو۔ اس لیے
ب بچے کے نصاب میں عام واقفیت کا تعلق ہے، علمِ کیمیا کی اہمیت تیسرے درجے

اس کے بعد علمِ ہیئت کا درجہ ہے۔ جہاز رانی کا تمام علم اس کا مرہونِ منت ہے اور
، کی وجہ سے خارجی تجارت کو اس قدر فروغ حاصل ہوا ہے۔

آج کل علم طبقات الارض (GEOLOGY) بھی بہت ضروری ہو گیا ہے۔ بہت حد تک صنعت کو فروغ اسی علم کے طفیل ہوا ہے۔ اب چونکہ صنعتی انقلاب کی وجہ سے کوئلہ اور دھاتیں بہت اہم چیزیں ہو گئی ہیں۔ اس لیے ارضیات کو اور بھی زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ ملک میں بہت سے ایسے ادارے قائم ہو گئے ہیں، جہاں دھرتی ودیا کی تعلیم دی جاتی ہے۔

علم حیات کی اہمیت

آج کل علم حیات (BIOLOGY) کا مطالعہ بھی ضروری ہو گیا ہے۔ قطع نظر اس امر کے کہ فرد اس سے کئی رنگ میں استفادہ کرتا ہے۔ بقائے نفس کے سلسلہ میں اس کی اہمیت بالواسطہ ہے۔ مثلاً خاص قسم کی کھاد خاص قسم کی فصل کے لیے مفید ہے۔ ایک خاص قسم کی فصل زمین کو بیکار کر دیتی ہے۔ گھوڑوں کو اگر گھٹیا قسم کی خوراک دی جائے، تو وہ سخت کام نہیں کر سکتے۔ جانوروں کو امراض کن حالات میں لاحق ہوتے ہیں؟ وغیرہم، اس لیے ظاہر ہے کہ کسانوں کے لیے علم حیات کے موٹے موٹے اصولوں کا جاننا اشد ضروری ہے۔ ہر بچے کے لیے عموماً اور کسانوں کے بچوں کے لیے خصوصاً اس علم کا جاننا لازمی ہے۔ علم حیات نے کسانوں کو ایسی ضروری باتیں بتائی ہیں، جن سے انھیں بہت فائدہ پہنچا ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر مویشیوں کے چارے میں کمی کرنی ہو، تو انھیں گرم رکھنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ اگر ان کے جسم میں حرارت موجود ہوگی، تو انھیں چارے کی حاجت نسبتہً بہت کم محسوس ہوگی۔

صنعتی کامیابی اور علم مدن

صنعتی کامیابی کے لیے ایک اور علم کی بھی ضرورت ہے اور وہ علم مدن (SCIENCE OF SOCIETY) ہے۔ وہ لوگ، جو روپے کے مدوجزر، اشیا کے نرخوں اور فصلوں

کی حالت پر نظر رکھتے ہیں۔ علم مدن کے طالب علم ہوتے ہیں اور وہ جوان کا گہرا مطالعہ کرنے کے اہل ہیں، مادی نقطۂ نگاہ سے بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیاوی لحاظ سے ایک کامیاب انسان بننے کے لیے ان تمام علوم کی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، بہت ہی ضرورت ہے۔ سائنس اور صنعتی انقلاب نے ہماری زندگی بہت کچھ زیادہ پیچیدہ بنادی ہے اور جب تک ہم اپنے آپ کو زندگی کی اس کڑی جدوجہد کے لیے پوری طرح تیار نہیں کرلیں گے، ہم اس دنیا میں کامیابی سے زندگی بسر نہیں کرسکیں گے۔ لیکن یاد رہے، جیساکہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ محض دنیاوی کامیابی ہمارا مطمحِ نظر نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ کامیاب زندگی درحقیقت عبارت ہے خدمتِ خلق سے۔

اس تمام بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بچوں کا نصاب دو طرح کے علموں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اوّل تو وہ علوم جن سے معاشی زندگی کامیاب بنتی ہے۔ دوم وہ جو فرد کے دل میں غریبوں اور اپاہجوں کی مدد کرنے کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ یہ وہ علوم اور مضامین ہیں، جن کا بچوں کے نصاب میں داخل کرنا اشد ضروری ہے۔ نہ کہ وہ جن کا درس کہ تو بہت عرق ریزی سے مدرسوں میں دیا جاتا ہے، لیکن ان کا فائدہ نسبتہً بہت ہی کم ہے۔

(باقی آئندہ)

۵۰

تعلیمِ بالغاں

از

نیاز الدین احمد، بی اے

ہندوستان میں صوبجاتی نفاذ کی وجہ سے قوم پرور محکمہ جات مثلاً تعلیم، صحت عامہ، زراعت، صنعت و حرفت وغیرہم کو ترقی دینے کی حتی الوسع کوشش کی جارہی ہے۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں پنجاب، سندھ، آسام اور صوبہ سرحد میں حکومتِ ہند کے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رُو سے لوگوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں، یعنی دفتری حکومت کا جہاں تک صوبوں کا تعلق ہے، خاتمہ ہوگیا اور اس کی جگہ جمہوری حکومت نے لے لی یعنی صوبائی حکومتوں کو آزادی حاصل ہوگئی۔ لیکن باقی سات صوبوں میں جہاں کانگریس پارٹی کی اکثریت تھی، حکومتیں جولائی کے مہینے میں قائم کی گئیں، اس لیے کہ اپریل میں کانگریس اور انگریزی حکومت کے درمیان تصفیہ نہ ہوسکا۔ اب چونکہ صوبائی معاملات اور شعبہ جات میں ہماری حکومتیں آزاد ہیں، اس لیے قدرتی طور پر ان کی توجہ قوم پرور محکموں کی طرف بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ ان محکموں میں سب سے زیادہ اہم محکمہ تعلیم کا ہے۔ اس مضمون میں اس محکمہ کے ایک خاص شعبے تعلیمِ بالغاں کے متعلق کچھ ضروری باتوں پر جو عام طور پر نظر انداز کر دی جاتی ہیں، روشنی ڈالی جائیگی۔

مالی مشکلات

تعلیمِ بالغاں کے اہم مسئلے پر خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے، آئی ای ایس (ریٹائرڈ) سابق پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور کا ایک معرکۃ الآرا مقالہ ۱۲ اگست ۱۹۳۶ء

کے ٹریبیون میں چھپا تھا۔ اس میں خان بہادر صاحب نے نہایت وضاحت سے اس مسئلے کے عملی پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقالے میں فاضل مضمون نگار نے اپنے کم و بیش سی سالہ تجربے کا نچوڑ نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ تاہم بدیں راقم الحروف کو ان کے چند ایک نتائج سے جن پر وہ پہنچے ہیں، اتفاق نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تعلیم بالغاں اس وقت تک محض ایک خواب رہے گا جب تک کہ درج ذیل دو مسئلوں کا حل تسلی بخش طریقے پر نہیں پیش کیا جائیگا۔

اوّل روپے کا مسئلہ: فاضل مضمون نگار کے اندازے کے مطابق سارے پنجاب کے بالغوں کو خواندہ کرنے کے لیے ایک خطیر رقم کی ضرورت ہوگی، جو پانچ اور دس کروڑ روپے کے درمیان ہونی چاہیے۔

دوم رغبت کا مسئلہ: خان بہادر صاحب کا خیال ہے کہ بالغوں کو تعلیم کی طرف رجوع کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے ان کی رائے یہ ہے کہ صوبۂ پنجاب کی حکومت ایک قانون پاس کرے۔ جس کی رُو سے بالغوں کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ تعلیم حاصل کریں۔ جیسا کہ جاپانیوں اور ترکوں نے کیا۔ اس لیے ان کے خیال میں جب تک دونوں شرائط پوری نہیں کی جائیں، اس مسئلے کا حل ہونا دشوار ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ میاں سر فضل حسین صاحب مرحوم نے اپنی وزارت کے دوران میں اس معاملے پر اپنی پوری پوری توجہ مبذول فرمائی اور اپنی اور اپنے محکمہ کے تمام کارکنوں کی انتہائی کوشش کے باوجود وہ اس مسئلے کا خاطر خواہ حل نہ پیش کر سکے اور بالآخر یہ تجربہ ناکامیاب محض رہا۔

ہمارے صوبے کی کل آمدنی گیارہ کروڑ روپے سالانہ سے کچھ اوپر ہے۔ اس میں سے محکمۂ تعلیم کے حصے ڈیڑھ کروڑ روپیہ آتا ہے۔ اگر ابتدائی تعلیم کو صحیح معنوں میں جبری اور مفت

کر دیا جائے تو صوبے کی ساری آمدنی محکمہ تعلیم کی نظر ہو جائے گی۔ اس لیے موجودہ حالات میں یہ ممکن نہیں کہ تعلیم بالغاں پر پانچ دس کروڑ روپے کی رقم خرچ کر دی جائے۔ میں سمجھتا ہوں، تعلیم بالغاں کا مسئلہ درحقیقت اس قدر پیچیدہ نہیں، جیسا کہ خان بہادر صاحب کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے یا جیسا کہ بادی النظر میں ہے۔ جیسے کہ کپڑے کی صنعت اور دیگر صنعتوں میں آج کل سائنس کی وجہ سے بہت کم مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح سائنس نے تعلیم کی مدد بھی کی ہے، یعنی سائنس کی ایجادوں کی امداد سے صرف ایک معلّم بالغوں کے ایک کثیر مجمع کو تعلیم دے سکتا ہے۔ آگے چل کر ان ایجادوں کا ذکر وضاحت سے کیا جائیگا۔

بالغوں کو خواندہ بنانے کے کئی طریق ہیں، جن میں سے چند ایک ذیل میں درج کیے جاتے ہیں اور ضمناً یہ ذکر کر دینا شاید غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہ وہی طریقے ہیں، جو جاپان اور سویٹ روس نے اپنے بالغوں کو خواندہ کرنے کے لیے استعمال کیے۔ اوّل، سینما۔ دوم، ریڈیو اور سوم پروپیگنڈا۔

بالغوں کی خواندگی کے سلسلے میں ریڈیو کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے ریڈیو کے ذریعے تعلیم بالغاں کے لیے ایک قسم کا "پس منظر" تیار کیا جاتا ہے اور یہ پس منظر مشتمل ہوتا ہے، بہت آسان، سادہ اور دلچسپ تقاریر پر، ڈراموں پر اور اپیلوں پر، جو بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر بالغوں کو تعلیم کی طرف راغب کرتے ہیں۔ ان کی توجہ ملک کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے۔ ان کو اپنی ذمے داری کا احساس دلایا جاتا ہے۔ ان کو شہریت کے فرائض سے آگاہ کیا جاتا ہے، تاکہ وہ تعلیم بالغاں کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ دراصل یہ کام بہت ہی زیادہ اہم اس لیے ہے کہ ایک عام بالغ تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اس عمر میں اسے ایک بہت بڑا بوجھ خیال کرتا ہے۔ آخر اتنے سالوں کے

بعد اس کا پڑھنے کی طرف میلان نہ ظاہر کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں قطع نظر اس بات کے کہ ریڈیو ایک نہایت ہی اچھا "پس منظر" تیار کر سکتا ہے۔ یہ ایک بالغ کو تعلیم یافتہ بھی بنا سکتا ہے۔ دراصل کسی شخص کے "خواندہ" اور "تعلیم یافتہ" ہونے میں بہت فرق ہے۔ بہت ممکن ہے، ایک شخص تعلیم یافتہ نہ ہو، لیکن خواندہ ہو اور برعکس اس کے ممکن ہے کہ دوسرا خواندہ ہو، لیکن تعلیم یافتہ نہ ہو۔ درحقیقت یہ دو چیزیں لازم و ملزوم نہیں، بلکہ ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ اکبر اعظم تعلیم یافتہ تو یقیناً تھا، لیکن خواندہ نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں، ایک بالغ کے لیے خواندہ ہونا اس قدر ضروری نہیں، جس قدر کہ تعلیم یافتہ ہونا ہے۔ اگر ایک بالغ خواندہ نہیں، لیکن اُسے شہریت کے فرائض وغیرہم کا پوری طرح احساس ہے اور اگر وہ اپنے فرائض کو بطرزِ احسن سرانجام دینے کے لیے عملی اقدام بھی کرنے کے لیے تیار رہے، تو اُسے یقیناً تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے، ریڈیو کا کام، جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، قطع نظر پس منظر تیار کرنے کے بالغ کو تعلیم یافتہ کرنا بھی ہے۔

پنجاب میں بالغوں کے لیے ریڈیو کے ذریعے پس منظر تیار کرنے کا خرچ بہت معمولی ہوگا۔ اگرچہ اس کے فائدے کا اندازہ اسی وقت ہوگا، جب بالغوں کو خواندہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ اس سلسلے کی سب سے پہلی اور اہم کڑی ہے۔

متذکرہ "پس منظر" کے مہیا کرنے کے بعد خواندگی کا درجہ ہے۔ بظاہر یہ مسئلہ مشکل نظر آتا ہے اور کسی حد تک ہے بھی۔ لیکن جاپان اور روس نے اس کا حل دنیا کو مہیا کر دیا ہے۔ پانچ سو سے ایک ہزار بالغوں کو سینما کے ذریعے بیک وقت محض ایک معلّم تعلیم دیتا تھا۔ اس سے دو فائدے مدِنظر تھے۔ اوّل یہ کہ کم از کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ بالغوں کو تعلیم دی جا سکے اور دوسرے یہ کہ خرچ بھی برائے نام ہو۔ اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں سینما کے آلے اور دیگر ضروری چیزوں کے خریدنے پر بہت زیادہ روپیہ خرچ آ جائے گا۔ لیکن اس

مقصد کے لیے حکومت قرضہ لے سکتی ہے۔ آخر یہ خرچ ایک ہی بار کیا جائیگا اور جہاں تک تعلیم بالغاں کا تعلق ہے، یہ خرچ آئندہ کے لیے بند ہو جائیگا۔ یہ مسئلہ جب ایک دفعہ حل ہو گیا، تو گویا ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا۔ اس کے علاوہ پروپیگنڈے کی بھی بہت ضرورت ہے اس غرض کے لیے دیہات سدھار کا محکمہ حقیقتاً بہت مفید کام کر سکتا ہے اور یہ غرض بہت حد تک ڈراموں، فارسوں، تقریروں اور تماشوں سے پوری کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر لیباخ کا طریقہ

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ حالات میں وہ کون کون سے ایسے طریق ہو سکتے ہیں جن سے تعلیم بالغاں کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی صوبجاتی حکومتوں کی اقتصادی بدحالی بھی ہمارے پیش نظر ہونی چاہیے، تاکہ نفس مضمون اس اہم مسئلے کا عملی پہلو ہاتھ سے نہ کھو دے۔ اس میں شک نہیں کہ بالغوں کو تعلیم دینا کوئی آسان کام نہیں قطع نظر اس بات کے کہ ان کو خواندہ بنانے کے لیے طریقے بھی مختلف ہیں۔ اساتذہ ابھی تک ان طریقوں سے واقف نہیں ہوئے۔ ان میں سے دو طریقے تو ایسے ہیں، جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے یعنی ریڈیو اور سینما لیکن ان کے علاوہ ایک اور بھی ہے، جسے ڈاکٹر لیباخ کا طریقہ کہتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے صوبے کا تعلق ہے، فروری ۱۹۳۷ء میں موگہ کے مقام پر سرکاری اور غیر سرکاری ماہران تعلیم بالغاں کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ یہاں انھوں نے ڈاکٹر لیباخ کے اصول "ہر خواندہ ایک ان پڑھ بالغ کو خواندہ کرے" پر بحث کی۔ اسی سال مئی کے مہینے ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ جہاں قطع نظر اور امور کے اس بات کا فیصلہ ہوا کہ مشن اسکول موگہ میں ڈاکٹر لیباخ کے طریقے کے مطابق بالغوں کو تعلیم دی جائے۔ اس مقصد کے لیے محکمہ تعلیم نے ایک ہزار پچاس روپے کی رقم منظور کی۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ موگہ کے علاوہ جالندھر، لکھ

سانگلہ، سیالکوٹ اور قصور میں بھی ڈاکٹر لیباخ کے طریقے کی روشنی میں تجربات کیے گئے، جو بہت کامیاب ثابت ہوے۔ اس کے علاوہ گکھڑ، کرنال اور لالہ موسیٰ کے نارمل اسکولوں نے بھی اس سلسلے میں بہت مفید کام کیا۔ گکھڑ نارمل اسکول نے تجربے کے طور پر موضع کوٹ نورا کی تمام بالغ آبادی کو تعلیم دینا شروع کی اور کرنال نارمل اسکول نے اس مقصد کے لیے مقامی جیل کے قیدی چن لیے اور لالہ موسیٰ اسکول نے اپنی توجہ ریلوے کے مزدوروں کی طرف مبذول کر دی۔ تینوں جگہ اساتذہ کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

دیہاتی بالغ اور تعلیم

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان میں خواندہ لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ ہمارے صوبے میں خواندگی دس فیصدی سے بھی کم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ ہمارے ملک کی تقریباً اسی فیصدی آبادی کا پیشہ زراعت ہے۔ غیر خواندہ لوگوں کا بیشتر حصہ دیہات میں رہتا ہے اور جو تھوڑے بہت پڑھے لکھے ہیں بھی، وہ زیادہ تر شہری ہیں، اس لیے تعلیم بالغاں کو دیہات میں رواج دینا چاہیے۔ ڈاکٹر سر ایم وِس وِس وریا صاحب ایل، ایل ڈی اپنی کتاب "ہندوستان میں بے روزگاری، اس کی وجہ اور علاج" میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی بیشتر آبادی کا انحصار زراعت اور متعلقہ حرفتوں پر ہے اور اس تمام کی تمام آبادی کو سال میں کم و بیش چھ ماہ مطلقاً کوئی کام نہیں ہوتا اور ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے افلاس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس ملک کی تقریباً اسی فیصدی آبادی نصف سال بیکار رہتی ہے اور اس لیے قوم کو اتنا زیادہ اقتصادی نقصان ہر سال پہنچتا ہے۔ اس لیے یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک ہمارے بالغوں کا تعلق ہے، وقت تو ان کے پاس بہت سا فاضل ہے۔ اگرچہ خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب کی دانست میں تعلیم بالغاں کے راستے میں سب سے

بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کے پاس قطعاً کوئی وقت نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ بیچارے دن بھر کی محنتِ شاقہ کے بعد اس قدر تھک جاتے ہیں کہ بشام کو سبق لینے کی طرف راغب ہو ہی نہیں سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ متذکرہ مقالہ سپردِ قلم کرتے وقت خان بہادر صاحب کے پیشِ نظر محض شہری بالغ تھے، جو دن سے رات تک کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے رہتے ہیں، لیکن ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ اگر ہم فی الحال ان کی طرف کوئی توجہ نہ دیں، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ دیہاتی بالغ جن کے پاس بہت سا فالتو وقت ہوتا ہے، آسانی سے ان کو خواندہ بنانے کے لیے وقف کیا جا سکتا ہے اور اگر یہ کام ریڈیو اور سینما کے ذریعے کیا جائے، تو تعلیم ان کے لیے گویا مبدّل بہ تفریح ہو جا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب تک ہم اپنے دیہاتیوں کو خواندہ نہیں بنائیں گے، وہ کبھی صنعت و حرفت یا گھریلو صنعتوں کی طرف راغب نہ ہوں گے اور جب تک کسی ملک کی آبادی کا زیادہ حصہ صنعت و حرفت کو اپنا ذریعہ معاش نہ بنائے، کبھی خوشحال نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانیوں کی خوشحالی کا انحصار صنعت و حرفت پر ہے اور صنعت و حرفت کے فروغ کا انحصار خواندگی پر ہے۔ آخر تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے، جس سے ہمارے کروڑوں بے زبان اور ناکارہ بھائی خواندہ اور سماج کے لیے مفید بنائے جا سکتے ہیں۔ اس لیے جب تک ہمارے ملک میں بالغ خواندہ نہیں ہوتے اور بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم مفت اور جبری نہیں کی جاتی، ہمارے ملک کا مستقبل نہایت حوصلہ شکن رہے گا۔

ابھی مجھے خان بہادر صاحب کے متذکرہ مقالہ کے ایک اور پہلو سے بحث کرنا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں تعلیم بالغاں کبھی کامیاب ثابت نہیں ہو گی، جب تک ہم اس مقصد کے لیے قانون نہیں بناتے، یعنی بالغوں کو قانونی طور پر مجبور کیا جائے کہ وہ تعلیم حاصل کریں۔

مجبوری کے ذریعے بالغ خواندہ تو ہو جائیں گے، لیکن تعلیم یافتہ کبھی نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ ہمارے بالغوں کے لیے خواندہ ہونے کی نسبت تعلیم یافتہ ہونا زیادہ ضروری ہے۔ تعلیمِ بالغاں محض خواندگی سے عبارت نہیں۔ درحقیقت اس سے مقصد یہ ہے کہ بالغ کو اپنے فرائض سے روشناس کرا کے اُسے عمل کی طرف راغب کیا جائے۔ اُسے اس امر کا احساس دلایا جائے کہ اُس کو ملکی، ملّی، شہری اور قومی فرائض ادا کرنے ہیں۔ اس لیے محض چھاپے کے الفاظ پڑھ لینا کچھ اتنا ضروری نہیں، جس قدر کہ فرائض کے احساس کی تخلیق کا ہے۔

اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ تعلیمِ بالغاں کے سلسلے میں پس منظر کی تخلیق بہت ہی ضروری ہے۔ ریڈیو اور سینما کا اس کی تخلیق میں اہم حصّہ ہے۔ تیسرا عنصر پروپیگنڈا ہے۔ پروپیگنڈا بھی باقی دو عنصروں کی طرح بالغ کو کتابی تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ ان تینوں عنصروں سے اجزائے ترکیبی ایسے ہیں کہ بالغ کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش خواہ مخواہ پیدا کر دینگے۔ چھپی ہوئی کتابوں کے مطالعے سے پہلے متکلم کتابوں کا سُننا بہت ضروری ہے اور جو تجربے روس اور جاپان میں ہوتے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک تعلیمِ بالغاں کا تعلق ہے "متکلم" اور چھپی ہوئی کتابیں لازم و ملزوم ہیں۔ ہمارے ہاں ان پڑھ ہندو اور مسلمان کو اپنے اپنے مذہب سے متعلق بہت سی روایتوں کا علم ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ان کی تفصیلات سے واقف نہیں ہوتا۔ ہندو رامائن اور مہابھارت اور پرانوں کی کہانیوں سے واقف ہوتا ہے۔ مسلمان بھی اپنی تاریخ سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے۔ خصوصاً کربلائے معلّی کے حالات وغیرہم۔ اس کے علاوہ ہمارے صوبے میں ان پڑھ لوگ ہیر رانجھے اور سسّی پنوں کے قصّے اور مرزا صاحباں کے افسانے سے خوب

اچھی طرح واقف ہیں۔ قطع نظر ان کے پنجابی گیتوں کو اگر یکجا کیا جائے اور کتابی صورت میں پیش کیا جائے، تو بالغوں کے لیے یہ مجموعہ ایک بہت بڑی نعمت ہوگا، جو ان کو خوا بنانے میں بہت ممد ثابت ہوسکتا ہے۔ پروفیسر دیوندر ستیارتی صاحب نے پنجاب بنگال کے دیہاتی گیتوں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں چھپوایا ہے، جو اس مقصد کے بخوبی استعمال ہوسکتے ہیں۔ ان تمام قصوں، کہانیوں اور گیتوں کی مدد سے ڈرامے کیے جاسکتے ہیں، جو دیہات میں اسٹیج کیے جائیں۔ ایسا کرنے سے ایک بہت ہی پس منظر قائم ہوجائے گا اور اس کے بعد بالغ کو الفاظ سے روشناس کرایا جائے اور انھیں قصوں، کہانیوں کو دیہاتی بالغوں کی زبان میں لکھا جائے اور چھپوانے کے بعد انھیں کتابی صورت میں بالغوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ بالغوں کو کتابی تعلیم دیتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ انھیں درس ڈاکٹر لیباخ صاحب کے سسٹم یا کسی اور موزوں طرز کے مطابق دیا جاتا ہے یا نہیں۔ روس میں بالغوں کو تعلیم ایک اور دلچسپ ذریعہ سے دی گئی ہے، جو بہت کامیاب ثابت ہوا۔ یعنی والدین کو تعلیم یافتہ بنانے کا فرض بچوں کے سپرد کیا گیا اور انھوں نے یہ فرض بطریق احسن ادا کیا۔ ممکن ہے، ہمارے سماجی اصول اس تجربہ کے راستے میں مزاحم ہوں۔ کیونکہ یہاں بچوں کو والدین سے بے تکلف ہونے کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ چہ جائیکہ بچے کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنے والدین کا استاد بھی بن جائے۔ ممکن ہے، شروع شروع میں اس کے خلاف آوازیں اٹھیں، لیکن کچھ عرصے کے بعد سب مخالفت کافور ہوجائے گی۔ چھے برس سے سولہ برس کی عمر کے بچوں نے ایک عرصے تک جہالت کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ وہ اکھٹے ہو کر جلوس نکالتے، تقریریں کرتے، دیواروں پر پوسٹر لگاتے اور اسی طرح کے کئی اور دلچسپ مظاہرے کرتے، جو یقینا

بہت سود مند ثابت ہُوے۔ چنانچہ ذیل میں روسی بچوں کے ایک پوسٹر کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو انھوں نے تعلیمِ بالغاں کے سلسلے میں ایک شہر کے مرکز میں چسپاں کیا :۔

"ہمارے ملک میں ہر بالغ کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیے، تاکہ وہ قبیح عادات کے پنجہ سے نجات حاصل کرے۔ مثلاً وہ والدین جو شراب پیتے ہیں، ان کے بچے عموماً نالائق رہ جاتے ہیں۔ اس امر کو ہر وقت ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ ایک شراب کی بوتل کے دام سے بچے کے لیے ایک اچھی سی کتاب یا اسٹیشنری خریدی جا سکتی ہے۔" الغرض روس میں بچوں نے بالغوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں بہت ہی اہم حصہ لیا۔ مائیں جب درس لینے جاتی تھیں، تو بڑے بچے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی نگہداشت کرتے تھے۔

اقتصادی پہلو

اس تمام بحث کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارا ملک مفت ابتدائی جبری تعلیم اور تعلیمِ بالغاں کا خرچ برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ جویندہ یابندہ۔ ان حوصلہ شکن حالات کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ ہو سکتا ہے۔ ذیل میں اس مقصد کے لیے کچھ زائد روپیہ حاصل کرنے کے ذرائع پیش کیے جاتے ہیں :۔

اوّل : مرکزی حکومت دیہات سدھار کے سلسلے میں ایک کروڑ روپیہ سالانہ منظور کرتی ہے۔ یہ سارا روپیہ تعلیم پر خرچ ہونا چاہیے اور اس کے علاوہ ہندوستان کے سب صوبوں کو چاہیے کہ کم از کم اسی قدر رقم اور تعلیم کے لیے مرکزی حکومت سے طلب کریں۔

دوم : اب چونکہ صوبجاتی حکومتیں شعبۂ مالیات میں بھی آزاد ہیں، اس لیے انھیں لازم ہے کہ تعلیم پر زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کریں اور یہ سب ابتدائی تعلیم اور تعلیمِ بالغاں کی نذر

کیا جائے۔

سوم: میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو چاہیے کہ وہ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے لوگوں پر ٹیکس کی رقم ذرا زیادہ کردیں۔

چہارم: متمول لوگوں سے اپیلیں کی جائیں کہ وہ اس کار نیک کی دامے، درمے، قدمے ہر ممکن طریق سے مدد کریں۔

پنجم: مدرسوں کی عمارتیں بنوانے اور ریڈیو و سینما کے آلے اور متعلقہ سامان خریدنے کا ابتدائی خرچ علاقے کے لوگوں سے چندہ کرکے پورا کیا جائے۔ اس کار خیر میں ہمارے وزیر صاحبان، دیگر افسران اور سرکاری و غیر سرکاری بہی خواہ بہت سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔

اشتہار

تخت طاؤس

مصنفہ

مولوی محمد عبداللطیف خان کشتہ قادری

یہ کتاب مولانا کشتہ قادری کی ہفت سالہ تخلیقی وتفتیشی مساعی کا نتیجہ ہے۔ تختِ طاؤس عہدِ مغلیہ کی زرگری، جواہر تراشی وخوش مذاقی کا مرقع تھا اور اس کی صنعت صنعت ایران وہندوستان کا ایک دلآویز سنگم تھی جس کی زیارت کے لئے دُور دُور کے ملکوں کے لوگ صعوباتِ سفر ہنسی خوشی برداشت کر کے آتے اور تازگیِ نظر وتفریحِ قلب وتحیر کا پرشاد لے کر جاتے اور یہ تبرک مدت دراز تک ان کو تر زبان وخوش بیان رکھتا تھا۔ کتاب ہذا اسی بے مثل تخت کے وقائع تاریخی پر مشتمل ہے۔ حقیقتاً اس تخت کے پردے میں ایشیائی دماغی لطافتوں کے سینکڑوں مرقعے چھپے ہوئے تھے، جن کو منظرِ عام پر لاکر مولانائے موصوف نے ملک وقوم پر ایک زبردست احسان کیا ہے اور ان کی یہ کد وکاوش قابلِ شکر گزاری ہے۔

ہمارے یہاں کی بہت کم تاریخی کتب ایسی ہیں، جن میں وسعتِ مطالعہ، غور وتحقیق، تفتیش، تنقید، علمی ومنطقی استدلال وآزادہ خیالی سے کام لیا گیا ہو اور ان کے مولفین ومصنفین نے روایت ودرایت کی علمی جانچ پڑتال کی ہو۔ اپنی طبیعت سے کسی نتیجے پر پہنچے ہوں پیچیدہ مسائل کو تقسیم وتحلیل کرتے ہوئے کوئی انکشاف کیا ہو اور اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھا کر اس طرح ترتیب دیا ہو کہ ان کی اصلی حالت نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مگر پیشِ نظر کتاب تاریخ "تختِ طاؤس" ان تمام اوصاف سے متصف ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

اشتہار

دیہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لئے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس کا مضمون حال ہی میں ورنیکلر فائنل کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لیے مخصوص ہوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر کوئی جامع کتاب نہ تھی طلبہ کی اس وقت کا احساس کرتے ہوئے زرِ کثیر صرف کر کے مجوزہ سکیم کے عین مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ بہ سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب، برائے جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے جس کی عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے اور ہر امر کو روزمرہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ تصاویر سے واضح کیا گیا ہے اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے سلسلہ ہذا طلبہ کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔ اس کے مطالعے سے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان و دیگر سائنس کے مدرسین اصحاب اپنے مدارس میں جاری کرا کے جہاں ہمیں ممنون و مشکور فرمائیں گے، وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبودی میں بھی خوشی محسوس کریں گے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت	۵	آنے	۴	پائی
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	"	۵	"	۲	"
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	"	۷	"	۱۰	"
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	"	۱۴	"	۲	"

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر		کام کی باتیں حصۂ اول . .	۳ر۹ پائی
	رام سروپ کوشل	۶ر	″ ″ ″ دوم . . .	۲ر۳ ″
۲	″ ″ دوسری ″ ″	۷ر۴ پائی	قصص ہند حصۂ اوّل . . .	۳ر۲ ″
۳	″ ″ تیسری ″ ″	۹ر۹ ″	″ ″ حصۂ دوم . . .	۳ر۸ ″
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ . .	۱۱ر
۵	″ ″ دوم	۳ر۷ ″	حسینہ اور وحشی	۱ر۵ ″
۶	″ ″ سوم	۷ر	شہزادہ مہربان	۲ر۶ ″
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر	راما سیتا	۱ر۱۰ ″
۸	″ ″ دوم	۳ر۷ ″	جادو کا مٹکا مسٹر لیا رام . .	۳ر
۹	″ ″ سوم	۷ر	دروپدی	۱ر۸ ″
۱۰	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲ر۹ ″	مہاراجہ رنجیت سنگھ . . .	۴ر۶ ″
۱۱	″ ″ نمبر ۲	۳ر۱۰ ″	خلیفہ ہارون الرشید . . .	۴ر
۱۲	″ ″ نمبر ۳	۲ر۵ ″	راجہ اشوک	۵ر
۱۳	انوار سہیلی کے انمول موتی		مہارانا پرتاپ	۲ر۱ پائی
	″ ″ حصہ ۱ ″ ″	۲ر۸ ″	شہاب الدین شاہجہان . .	۲ر۱۰ ″
۱۴	″ ″ حصہ ۲ ″ ″	۳ر۱۰ ″	شیر شاہ سوری	۲ر۱۱ ″
۱۵	″ ″ حصہ ۳ ″ ″	۲ر۵ ″	نصیر الدین ہمایوں	۲ر۱۰ ″
۱۶	دلچسپ تاریخی کہانیاں		اورنگ زیب عالمگیر . .	۲ر۹ ″
	″ حصہ اوّل	۷ر۷ ″	شہاب الدین غوری	۲ر۸ ″
۱۷	″ حصہ دوم	۸ر۱۱ ″	سلطان علاؤالدین خلجی . . .	۲ر۱۱ ″
۱۸	″ حصہ سوم	۷ر	فیروز الدین تغلق	۳ر

اشتہار

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۰	نورالدین جہانگیر	۲ر۳ پائی	۶۴	بہادر شہزادہ	۲ر۱ پائی
۴۱	امیر تیمور	۲ر۷ //	۶۵	جوتی موتی	۲ر۱۰ //
۴۲	پرتھوی راج	۲ر۷ //	۶۶	جواہرات کا خزانہ	۳ر۷ //
۴۳	محمود غزنوی	۲ر۶ //	۶۷	چھوا اور سونا ہوا (باتصویر)	۲ر
۴۴	مصر کی داستان	۳ر	۶۸	علی بابا چالیس چور	۴ر
۴۵	جاپان کی کہانی	۴ر	۶۹	علاؤالدین و عجیب و غریب لیمپ	۴ر۶ پائی
۴۶	چین کی کہانی	۳ر۶ پائی	۷۰	ملّا دو پیازے کا سفر	۳ر
۴۷	مستورات چین و جاپان	۴ر	۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۴۸	ایران کی کہانی	۳ر۶ //			
۴۹	ایشیائی روم	۲ر۷ //	۷۲	نیشاپور کا سوداگر	۲ر۱۱ پائی
۵۰	ٹرکی (یورپی روم)	۲ر۷ //	۷۳	پرستان کا موچی	۳ر
۵۱	لنکا	۱ر۱۱ //	۷۴	سندر پیاری	۳ر
۵۲	بصرہ و بغداد	۵ر	۷۵	چاندی کی کنگھی	۳ر
۵۳	یونان	۲ر	۷۶	سلک جواہر نمبر۱ (حکمرانی کا گُر)	۲ر۶ پائی
۵۴	تین سوال	۲ر۷ //	۷۷	// // نمبر۲ (اوج و پستی)	۱ر۶ //
۵۵	امرت ورشا	۳ر۱۰ //	۷۸	// // نمبر۳ (شہید الفت)	۱ر۶ //
۵۴	تین سوال	۲ر۷ //	۷۹	سلک جواہر۔ مرد میدان	۱ر۶ //
۵۶	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبر۱ داؤد بادشاہ	۳ر۹ //	۸۰	// // نیک و بد	۱ر۹ //
			۸۱	// // عیب و ہنر	۱ر۴ //
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں حصۂ اوّل	۳ر۹ //	۸۲	// // جہاں گرد	۱ر۶ //
			۸۳	// // جواب باصواب	۱ر۱۰ //
۵۸	// دوم	۴ر۵ //	۸۴	// // سخاوت کی انتہا	۱ر۲ //
۵۹	خوفناک خواب	۲ر	۸۵	// // حسن تدبیر	۱ر۶ //
۶۰	ہیرا لال	۲ر۶ //	۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہرت	۱ر۳ //
۶۱	دولت کی پٹاری	۲ر۱ //	۸۷	ڈرامہ غم خوار عالم	۱ر۷ //
۶۲	سادھو کی چھلی	۲ر	۸۸	مہاراجہ بکرماجیت اور اس کا تخت	۱ر۶ //
۶۳	نیلا باز	۲ر۱ پائی			

DELHI

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

جلد (۶) | اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء | نمبر (۷)

فہرستِ مضامین

۱	ایڈیٹوریل — تعلیم بالغاں		۱
۲	مضمون نویسی بذریعہ افسانچہ	شیخ خادم محی الدین	۵
۳	واردھا کی تعلیم اسکیم پر ایک نظر	سید محمد عبد اللہ ایم اے	۱۳
۴	سوالات	نذیر احمد، ایم اے	۲۵
۵	ہٹلر کا نظریہ اور جرمن نصابِ تعلیم	محمد انور قریشی	۳۵
۶	بچوں کا لباس	میرزا مقبول بیگ	۴۵
۷	ریفریشر کورس کاہنہ نو		۵۷
۸	کوٹ ادو میں تعلیمی کانفرنس		۵۹

ایڈیٹوریل

گزشتہ ماہ تعلیمِ بالغاں پر بحث کرتے ہوئے، ہم نے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ گو اس مہم میں انفرادی طور پر اشخاص اور انجمنیں بہت کچھ مدد دے سکتی ہیں، لیکن یہ کام اتنا اہم اور وسیع ہے کہ اس کی ذمے داری ملکی حکومت کو ہی لینی چاہیے۔ کسی واحد شخص یا انجمن کی آمدنی اس قدر زیادہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اتنے بڑے کام سے عہدہ برآ ہو سکے۔ تمام ترقی یافتہ ممالک میں یہ کام وہاں کی حکومتوں ہی کے ذمے ہے۔ پچھلے ایڈیٹوریل میں ہم نے روس اور ٹرکی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ کس طرح ان دونوں حکومتوں نے زرِ کثیر خرچ کر کے تعلیم عامہ اور تعلیم بالغاں کو ترقی دینے کی کوشش کی اور کس طرح اور کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں مختلف صوبجاتی حکومتیں اس مسئلے کو حل کرنے میں کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ ہم اس سلسلے میں تجویز کرتے ہیں کہ مختلف صوبوں میں ملکی مدبروں اور تعلیمی ماہروں کی کمیٹیاں بنائی جائیں، جو تعلیم بالغاں کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے ضرورت وقت کے موافق لائحہ عمل تیار کریں اور خاص کر ایسی تجویزیں پیش کریں، جن سے اس تعلیم کے لیے آمدنی کے ذرائع معلوم ہو سکیں۔ ملکِ روس میں چونکہ تعلیم بالغاں سیاسی تعلیم کا ایک اہم جزو سمجھی جاتی ہے اور چونکہ سیاسی تعلیم کو پھیلانا حکومت اپنا فرض اولین سمجھتی ہے، اس لیے وہاں اس تعلیم کے اخراجات ملک کے سالانہ بجٹ میں شامل کیے جاتے ہیں۔ گویا تعلیم بالغاں کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اس کا شمار ملک کی ضروری تحریکوں میں ہوتا ہے اور اس کے اخراجات کا تمام بار حکومت نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں تعلیم بالغاں نے نمایاں ترقی کی ہے۔ ۱۹۲۶ء میں روس میں ۵۰ فی صدی بالغ ناخواندہ تھے لیکن اب وہاں صرف چند فی صدی باقی رہ گئے ہیں اور روسی

مدبروں کا خیال ہے کہ ۱۹۶۲ء کے بعد جب اُن کا تیسرا پانچسالہ پروگرام Third 5-Year Plan ختم ہوگا، اس ملک میں ایک فیصدی اشخاص بھی اَن پڑھ نظر نہ آئیں گے۔

ہمارے ملک کی سیاسیات اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ ہم ایک ہی قسم کے خیالات کو مشتہر کریں اور نہ ہی ہم اس پالیسی کو درست سمجھتے ہیں کہ کسی ایک پارٹی کے خیالات کو تعلیم عامہ یا تعلیم بالغاں میں اس قدر دخل ہو، اس لیے ہمارے ملک میں شاید رُوس کی طرح تعلیم بالغاں سیاسی تعلیم کا کبھی بھی جزو نہ بن سکے۔ لیکن اس ملک سے ہم یہ سبق ضرور سیکھ سکتے ہیں کہ تعلیم بالغاں ایک ایسا اہم مسئلہ ہے، جسے حکومت کو خود حل کرنا چاہیے اور جس کے اخراجات اسے بخوشی اپنے سالانہ بجٹ میں شامل کرنا چاہییں۔ اگر ایسا ہو جائے اور لوگ محسوس کرنے لگیں کہ جو عام ٹیکس ہم ادا کرتے ہیں، اُن سے ہمارے ملک کے بچوں اور بالغوں کی تعلیم بھی ہوتی ہے، تو اغلب ہے کہ وہ خود بخود اس تعلیم کی اہمیت کو سمجھنے لگ جائیں اور تھوڑے ہی عرصے میں ہمارے ملک میں ناخواندگی کا اوسط کافی حد تک کم ہو جائے۔

دوسرا اہم کام جو صرف حکومت ہی خاطر خواہ طور پر کر سکتی ہے، وہ بالغوں کے لیے موزوں لٹریچر کا پیدا کرنا ہے۔ اس بات سے کوئی ذی عقل انسان انکار نہیں کر سکتا کہ بالغ چاہے ناخواندہ ہی کیوں نہ ہو، اس کا تجربہ بچوں سے بہت زیادہ اور مختلف ہوتا ہے۔ اس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا ہے۔ اُس کے اتار چڑھاؤ کو محسوس کیا ہے اور اپنی روزی کمانے میں کئی طرح کی تکلیفات کا سامنا کیا ہے، اس لیے جو کتب بچوں کو محظوظ کرتی ہیں، اغلب ہے کہ وہ ایک بالغ انسان کے لیے کسی قسم کی دلچسپی کا باعث نہ ہوں۔ بچے اکثر جنوں اور پریوں کی کہانیوں کے شوقین ہوتے ہیں، یا ایسے واقعات کے جن میں دوڑ بھاگ یا لڑائی جھگڑا زیادہ ہو۔ اس کے برعکس ایک بالغ شخص سوچ بچار کی زندگی بسر کرتا ہے اور قدرتی طور پر ایسی چیزوں کو پسند کرتا ہے، جن کا تعلق اس کے ماحول سے ہو۔ اس لیے بالغوں کے لیے ان کی ضروریات کے مطابق نئے لٹریچر کا پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ جن کمیٹیوں

کا ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے، وہ اس بارے میں بھی تجویزیں پیش کر سکتی ہیں کہ بالغوں کے لیے کتب لکھتے وقت مصنف یا مؤلف حضرات کن کن باتوں کا خاص طور پر خیال رکھیں۔

اس کے علاوہ مختلف مقامات پر بالغوں کے استعمال کے لیے حکومت کو لائبریریاں قائم کرنی چاہییں۔ یہ بات تجربے سے ظاہر ہوتی ہے کہ خواندگی کو پیدا کرنے کی نسبت خواندگی کو برقرار رکھنا زیادہ مشکل ہے۔ ایک شخص کو کچھ عرصے کی محنت کے بعد آپ لکھنا پڑھنا تو سکھا دیتے ہیں، لیکن اگر آپ اس کے ماحول کو اس طرح تبدیل نہیں کرتے، جس سے کہ وہ اپنے نئے شوق کو بڑھا سکے یا قائم رکھ سکے، تو اغلب ہے کہ کچھ عرصے کے بعد دوبارہ ناخواندوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔ اس لیے اس کے ماحول کی تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں جگہ جگہ بالغ طلبہ کے مطالعے کے لیے لائبریریاں قائم کی جائیں اور اُن میں وہ کتب رکھی جائیں، جو اُن کے لیے مفید اور دلچسپ ہوں۔

یورپ کے کئی ایک ملکوں میں دو طرح کی لائبریریاں پائی جاتی ہیں۔ ایک مقامی اور دوسری گشتی۔ بڑے بڑے شہروں و قصبوں میں پہلی قسم کی لائبریریاں قائم کی گئی ہیں، لیکن جو مقامات ریلوے اسٹیشنوں سے بہت دور ہیں یا پہاڑوں و غیر آباد علاقوں میں پائے جاتے ہیں، وہاں حکومت کی طرف سے مقررہ اوقات پر کتب بھیجنے کا انتظام کیا گیا ہے، تاکہ ایسی جگہوں کے طلبہ ان سے پوری طرح مستفید ہو سکیں۔ جن مقامات میں بڑی بڑی لائبریریاں قائم نہیں ہو سکتیں، وہاں دارالمطالعہ بنائے جا سکتے ہیں۔ روس میں تو اس قسم کے دارالمطالعہ عام لوگوں میں روشنی پھیلانے کا بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ ملک کے چاروں طرف گویا اُن کا جال بچھا ہوا ہے۔ ایک چھوٹی سی عمارت بنائی جاتی ہے، جس میں ایک کشادہ کمرہ ہوتا ہے۔ اس کے درمیان میں ایک میز اور اس کے چاروں طرف بیس پچیس کرسیاں لگی ہوتی ہیں۔ میز پر مختلف قسم کے اخبار اور میگزینیں رکھی جاتی ہیں اور کمرے کے ایک طرف الماریوں میں کچھ مفید اور دلچسپ کتب بھی ہوتی ہیں۔ علاقے کے لوگ وہاں

آتے ہیں اور اخبارات اور میگزینیں پڑھنے کے علاوہ وہاں اپنے مفاد کے لیے مجلسیں بھی منعقد کرتے ہیں۔ یعنی یہ دارالمطالعہ لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کرنے کے علاوہ اُن کی سماجی زندگی میں یک جہتی پیدا کرنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہمارے ملک میں بھی اسی طرح کے دارالمطالعہ قائم ہوجائیں، تو ہم بھی اُن سے اسی قدر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

آخری لیکن نہایت ضروری کام جو موجودہ حالات میں حکومت کو کرنا ہے، وہ صحیح قسم کی نشر و اشاعت کا کام ہے۔ جو لوگ تعلیمِ بالغاں کا کام کر رہے ہیں، وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم کے راستے میں ہمارے ملک کے اَن پڑھ بالغ ہی سب سے زیادہ رُکاوٹ پیش کرتے ہیں۔ ان کی حالت بعینہٖ اس فرانسیسی قیدی کی مانند ہے، جو بیس سال پیرس کے بیسٹیل جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہا اور جب اُسے رہا کیا گیا، تو اُس نے نکلنے سے اس لیے انکار کر دیا کہ وہ باہر جا کر سورج کی روشنی کو برداشت نہ کر سکیگا۔ ملک کے تمام ناخواندہ بالغوں کو علم کی برکات سے بہرہ ور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں سمجھایا جائے کہ جو تعلیم ہم انھیں دینا چاہتے ہیں، وہ صرف اُن کی فلاح و بہبودی کے لیے ہے۔ اس میں ہمارا کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ جس شخص کا دماغ علم کی روشنی سے منوّر ہے، وہ اپنے نفع و نقصان کو سوچ سکتا ہے اور زندگی کی راہ پر آنکھیں کھول کر چلتا ہوا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ علم حاصل کرنے سے انسان ان توہمات سے جلد ہی نجات پا لیتا ہے، جو لاعلمی کی حالت میں اس کے دماغ پر غلبہ پائے رہتی ہیں۔ یہ کام کہنے کو تو آسان نظر آتا ہے، لیکن دراصل ہے بہت مشکل۔ ایک کم عمر بچے کی عادات کو آپ جس سانچے میں چاہیں ڈھال سکتے ہیں، لیکن جب انسان سنِ بلوغ کو پہنچ جاتا ہے، تو اُس کی عادات کا رُخ بدلنا ایک کافی مشکل مہم کا سامنا کرنا ہے۔ اس لیے لوگوں کے اندر تعلیمِ بالغاں کے بارے میں صحیح خیالات پھیلانے کی اشد ضرورت ہے۔

مضمون نویسی بذریعہ افسانچہ

از

شیخ خادم محی الدین، لیکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس مضمون کی دوسری قسط میں پلاٹ مرتب کرنے کے متعلق چند اشارات اور مثالیں بیان کی گئی تھیں۔ موجودہ قسط میں افسانچہ کی ساخت کے متعلق چند ضروری امور پر بحث کی جائیگی۔

افسانچہ نویس مبتدی عموماً یہ سوال کرتا ہے۔ "میں اپنا قصّہ کیونکر شروع کروں؟" اس کا جواب یہ ہے کہ "اسے ابتدا ہی سے شروع کرو"۔ کیا مطلب؟ مدّعا یہ ہے کہ آپ دو امور ذہن میں رکھیے۔ اوّل یہ کہ جب ایک دفعہ قصّہ شروع کر دیا جائے، تو پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے، یعنی جو واقعہ اور سرگزشت بیان کی جا رہی ہو، اس کی تشریح نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ پڑھنے والا جسے قصّے کے واقعات یا عمل سے دلچسپی ہے، بے صبر ہونے لگیگا یا عجب نہیں کہ جھنجلا کر کتاب کو (جس میں آپ کا قصّہ طبع ہوا ہے) دیوار سے پٹخ دے۔

دوم یہ یاد رکھیے کہ ہر قصّے کی ابتدا کسی ایسے سبب یا اسباب سے کیجیے، جن پر واقعات مابعد کا انحصار ہو یا وہ ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ ایسے اسباب کو اصطلاح میں تکرار یعنی مرحلہ اور انگریزی میں کرائی سس (crises) کہا جاتا ہے۔

یہ فرض کرتے ہوئے کہ آپ نے اپنے مجوزہ افسانچہ کا پلاٹ ذہن میں بخوبی قائم کر رکھا ہے،

سب سے پہلی چیز سوچنے کے متعلق یہ ہے کہ افسانچہ کس زاویۂ نگاہ سے بیان کیا جائے گا۔ آپ کے ہاں ایک مرکزی فرد ضرور ہونا چاہیے۔ یا ممکن ہو، تو وہی پس اسی ایک یا دو افراد کے گرد اگرد افسانچہ کے واقعات کو گھمانا چاہیے، تاکہ پڑھنے والا دیکھے کہ قصّے کے دوسرے افراد کے طرزِ عمل کا اثر مرکزی فرد پر کیا ہوتا ہے۔ بار بار ایک فرد سے دوسرے کے حالات اور واقعات کی طرف رجوع کرنا غلط طریق سمجھا جاتا ہے۔ شاید آپ کا مقصد یہ جتانا ہو کہ بحیثیتِ مصنّف، آپ کی توجہ سبھی اطراف میں کام کر رہی ہے، لیکن اس طریق سے پڑھنے والے کو آپ کے خاص فرد سے دلچسپی پیدا نہ ہو سکیگی۔ واضح رہے کہ افسانچہ میں فردِ واحد کا طریق عمل اور اس کے ایک آدھ کارنامے کو بیان کر دینے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ البتّہ ناول یا افسانے میں آپ کئی ایک افراد کے حالات اور اُن کے کارناموں کو بیان کر سکتے ہیں، بشرطیکہ آخر میں ان سب کو سمیٹ کر کسی خاص نتیجے پر پہنچ سکیں۔ افسانچہ میں آپ کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے ہیرو یا ہیروئن کو بلحاظ اس کے اعمال کے کسی منتہے تک لے جائیں۔ پس قصّے کی ابتدا بھی اسی مرکزی فرد سے کیجیے اور انتہا پر بھی اسی کا ذکر ہونا چاہیے۔

افسانچہ کی ابتدا۔ آپ کا پہلا پیرا، بلکہ پہلا جملہ ایسے الفاظ میں ہونا چاہیے جنھیں پڑھ کر فوراً دلچسپی بیدار ہو جائے۔ اگر آپ ایسی عبارت نہ لکھ سکیں، تو خیر پہلے چوں توں کر کے تمام افسانچہ لکھ جائیے اور بعد ازاں پھر اس کی ابتدا کی طرف آئیے۔ عموماً رسالوں وغیرہ کے ایڈیٹر قصّے کا پہلا جملہ یا پیرا ہی توجہ سے پڑھا کرتے ہیں اور اگر اس میں کشش ہو، تو باقی ماندہ افسانچہ بھی پڑھ لیتے ہیں، ورنہ نہیں پس سب سے اچھی ترکیب یہ ہے کہ قصّے میں جو عمل جاری ہوتا ہے، فوراً آپ اس میں کود پڑیں۔ اس کے بعد اگر آپ کے پلاٹ میں جان ہے، تو پڑھنے والا ضرور متوجہ ہوگا اور اس کی دلچسپی متحرک رہیگی۔ یہی ہمارا اصل مقصد ہے۔ اب دو ایک افسانچوں

کی ابتدائی عبارت کے متعلق مندرجۂ ذیل مثالوں پر غور کیجیے:۔

(۱) "دادا جان کو ان کی کرسی پر رسّوں سے جکڑ دیا گیا اور اُن کی کلائیوں پر کوڑے لگائے گئے۔" (ماخوذ از انگریزی افسانچہ ٹوٹل مصنّفہ ڈیوس)

دیکھیے اس ایک ہی جملے میں قصّے کے عمل کو ظاہر کرنے کے علاوہ افسانچہ کی فضا بھی پیدا کر دی گئی ہے، جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس قسم کی کہانی ہے یعنی سنسنی خیز۔

(۲) "گاڑی ایک دھماکے کے ساتھ کالا شاہ کاکو کے اسٹیشن پر ٹھیری اور میرے والے ڈبے میں کسی نے ایک زرد رُو میلے کچیلے زرغل آدمی کو کندھوں پر اُٹھا کر اچانک میرے سامنے لا بٹھایا۔" (ماخوذ از "شیطان کا اثر" مصنّفہ خاکسار)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک پُر اسرار افسانچہ ہوگا۔

ان مثالوں سے مدّعا یہ ہے کہ ایک اچھا ابتدائی پیرا ایسا ہونا چاہیے جس میں افسانچہ کی فضا، کردار نگاری اور افسانچہ کی قسم سبھی کچھ ظاہر ہو سکے۔ بعض اوقات مبتدی، قصّے کے شروع میں اپنی قوتِ بیانیّہ سے کام لے کر طول طویل واقعات لکھنے شروع کر دیتا ہے، جن کا تعلق یا تو بعض افراد سے ہوتا ہے اور یا کسی سر زمین اور اُس کے نظاروں سے۔ دیکھا جائے، تو یہ طریق مشکل ہے، لیکن آج کل اس کا رواج نہیں رہا کیونکہ افسانچہ میں طولِ عمل کے بجائے اختصار کا اصول زیادہ بکار ہے۔

کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ افسانچہ کی ابتدا مکالمہ سے کر دی جاتی ہے۔ بشرطیکہ وہ بے تعلق اور دور از کار نہ ہو، جامع اور مختصر ہو، مثلاً

(۳) "طبقۂ نسواں سے نفرت کرنے والا شخص وہی ہوتا ہے، جس کی روح عورت کی شکل دیکھتے ہی فنا ہونے لگے۔" سعید نے کہا۔

غرض واضح ہُوا کہ آپ کے افسانچہ کی ابتدا کیسے ہی الفاظ میں ہو، پڑھنے والے کی توجہ کو ضرور اپنی طرف مائل کرے۔ مبتدی کے لیے اسی میں آسانی ہے کہ افسانچہ کے عمل میں فوراً چھلانگ لگائے۔ بعد میں کسی قسم کی الجھن پیدا نہ ہوگی۔ لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ ابتدا کا دارومدار زیادہ تر افسانچہ کی قسم پر ہوتا ہے۔

پیچیدگی کو دخل دینا۔

افسانچہ شروع کر دینے کے بعد مصنّف کو چاہیے کہ جس قدر جلد ہو سکے، واقعات کو پہلی نکڑّ کی طرف لے آئے۔ واقعات کی سڑک پر نکڑّ کا نشان صاف نظر آنا چاہیے تاکہ قصّے کا مطلب سمجھ میں آنے لگے۔ نکڑ ایک قسم کا سمتی نشان ہوتا ہے، جو پلاٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً دو افراد (مرد، عورت) میں محبت کا تذکرہ ایک ایسے منتہٰے پر پہنچتا ہے، جسے شادی یا ناکامیٔ الفت سے نامزد کرتے ہیں۔ اگر شادی ہے، تو واقعات کے ربط یا رشتے میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن ناکامی کی صورت میں اس رشتے کی گنجلک بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً اس طرح کہ مرد کو اس عورت کی زندگی کے کسی خفیہ راز کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ نکڑّ کی ایک صورت ہے اور مصنّف کا کام یہ ہو گا کہ کامرانی یا ناکامی (دونوں صورتوں میں) مزید نکڑوں کو افسانچہ میں داخل کرے۔ جن کے ذریعے یا تو رکاوٹ دُور کر دی جائے اور انجام شادمانی ہو یا دونوں افراد میں قطع تعلق ہو جائے۔

مضمون ہٰذا کی سابقہ قسط میں "پُل کا کنارا" والے افسانچہ کے خلاصہ میں پہلی نکڑّ دریافت کرو، تو معلوم ہو گا کہ وہ باہمی نزاع ہے، جو ہیرو اور ہیروان کے مابین ہُوا تھا۔ دوسری نکڑّ پُل کا حادثہ ہے۔ تیسری عورت اور اس کے ساتھی کا بچایا جانا اور خاوند کا دریا میں گر پڑنا اور چوتھی عورت کا ہوش میں آ کر گاڑی کے اندر اپنے خاوند کے سامان کو شناخت کرنے یہ

معلوم کرنا کہ اُسے موت سے نجات دینے والا خود اسی کا خاوند تھا۔ یہی افسانچہ کا منتہیٰ ہے۔

اشتباہ پیدا کرنا۔

یہ نہایت ضروری ہے کہ افسانچہ میں شبہ کی حالت پیدا کی جائے جس سے پڑھنے والا اس فکر میں ہو کہ نہ جانے اس کا کیا انجام ہوگا۔ یہ عمل آسان نہیں پس مصنّف کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ناظرین کے ذہن کو یہ ترغیب دے کہ جو کچھ وہ واقعات کے انجام کے متعلق سمجھ رہے ہیں، دراصل وہ نہیں، بلکہ اس کے برعکس ہے۔ یہ ترغیب دراصل ذہن کو دھوکا دینے کی ایک صورت ہے۔ اس حالت میں بعض پڑھنے والے اصل قصّے کو پورے طور پر پڑھنے کے بجائے کتاب کے اوراق کو اُلٹتے پلٹتے ہیں اور اس کے آخری صفحے کو دیکھ کر انجام معلوم کیا چاہتے ہیں۔ اصطلاح میں اسے مصنّف کے نقطۂ خیال سے "اصلیت کا دھوکا" کہتے ہیں۔ پس اس حالت کو پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مصنّف اپنے افراد کو اس قدر اصلی اور قصّے کی فضا کو اتنا مکمل بنائے، گویا پڑھنے والا خود اُن واقعات کا تجربہ کر رہا ہے۔ وُہ پڑھتے وقت قصّے کی فضا میں ایسا گم ہو جائے کہ ورق اُلٹنے اور صفحوں کا شمار کرنے سے بھی غافل ہو۔ نہ وہ یہ دیکھے کہ افسانچہ کے مختلف حصّے یا ابواب کتنے ہیں۔ اس کی آنکھ ایک مشین کی طرح کتاب کے صفحوں پر تیرتی چلی جائے۔ یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ قصّے میں موافقت کا رنگ موجود ہے اور افراد محض ناچنے والی پُتلیاں نہیں، بلکہ زندہ روزمرّہ کے چلتے پھرتے انسان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ذہن میں ان افراد کا ایک گہرا نقش قائم ہو جاتا ہے۔ ہم ان کا نام پڑھتے ہی ان کی شکل و شباہت اور چال ڈھال وغیرہ کا تصوّر کر لیتے ہیں۔ آپ نے اب تک جتنے افسانے یا افسانچے پڑھے ہیں، ان میں سے کتنے ہی قصّوں کے ایسے افراد کا تصوّر آپ کے ذہن میں فقط اس کا نام لینے ہی سے

۴۔ سیارے کیا ہوتے ہیں؟

۵۔ کس سیارے کو ہم سب سے زیادہ جانتے ہیں؟

۶۔ جو اجرام کسی سیارے کے گرد گردش کرتے ہیں، اُنھیں کیا کہتے ہیں؟

۷۔ اقمار سے کیا مُراد ہے؟ وغیرہ

(۵) آخری بات یہ ہے کہ جو اسباق پڑھائے ہُوئے یا مطالعہ کیے ہُوئے ہوں، ان پر کرنے میں کتابی عبارت ہوگی، تو جوابات میں بھی طلبہ وہی عبارت بڑی آسانی سے ڈال دیں اور مدرّس کو یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ آیا طلبہ اُس مضمون کو سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔

جوابات کے لحاظ سے سوالات عموماً دو قسم کے ہوتے ہیں۔ سوالات انفرا (Individual questions) اور سوالات جماعتی (Class questions)۔ جب ایک ہی لڑکے سے سوال پوچھا جائے اور وُہی اس کا جواب دے یا اُسے نہ آنے پر کوئی دوسر لڑکا جواب دے، تو اُسے انفرادی سوال کہتے ہیں اور جب ساری جماعت پر سوال کیا جا۔ کسی ایک لڑکے کو جواب دینے کے لیے چُن لیا جائے، تو اسے جماعتی سوال کہتے ہیں۔

سبق کے دلنشین کرنے اور سبق کا امتحان کرنے کے لیے جماعتی سوالات بہت مفید ہیں۔ ان سے ساری جماعت کی توجہ سبق کی طرف قائم رکھی جا سکتی ہے۔ تمام طلبہ سوچنے کا موقع ملتا ہے اور ہر ایک لڑکا اپنی اپنی جگہ پر جواب دینے کے لیے تیار ہوتا ہے مدرس کو چاہیے کہ ایسے سوالات کے جوابات پہلے کمزور لڑکوں سے لے اور پھر اُن کے جوابا کی درستی ہوشیار لڑکوں سے کرائے، تاکہ مطالب اور مضامین بخوبی ذہن نشین ہو جائیں۔

انفرادی سوالات بھی کم مفید نہیں ہیں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بعض لڑکے چہرے۔ تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ سبق کو پوری توجہ سے سُن رہے ہیں۔ سوالات پوچھنے پر دوسرے لڑکو

کی طرح ہاتھ بھی کھڑا کرتے ہیں، مگر دراصل اُن کے خیالات پریشان ہوتے ہیں۔ وہ خیالی دنیا میں کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ایسے لڑکوں کے لیے انفرادی سوالات اکسیر کا کام دیتے ہیں۔ اُن کی توجہ کو سبق کی طرف کھینچ لاتے ہیں اور دلچسپی کو نئے سرے سے قائم کر دیتے ہیں۔

سوالات ساری جماعت پر کرنے چاہییں۔ مگر جواب عموماً نالائق اور کمزور لڑکوں سے لینا چاہییں تاکہ وہ ہوشیار لڑکوں کے ساتھ ساتھ چل سکیں اور سبق کے ہر حصّے کو بآسانی ذہن نشین کر سکیں۔

بعض لڑکے اپنی لیاقت پر مغرور ہو جاتے ہیں اور اپنی ہر حرکت سے ظاہر کرتے ہیں کہ سبق تو بالکل معمولی سی چیز ہے۔ اس کی طرف توجہ دینا اور نہ دینا برابر ہے۔ اس قسم کے لڑکوں کا جماعت کے دوسرے لڑکوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ پس کبھی کبھی ان لڑکوں پر مشکل اور پیچیدہ سوالات کیے جائیں، تاکہ وہ جواب نہ دے سکیں اور ساری جماعت کے سامنے شرمندہ ہوں۔ پھر دیکھیے کہ اُن کا غرور کیسے دُور ہوتا ہے اور وہ سبق کی طرف کس طرح توجہ دیتے ہیں۔

بعض اسباق یا اسباق کے بعض حصّے قدرے مشکل ہوتے ہیں اور بآسانی ذہن نشین نہیں ہوتے۔ ان مشکلات کا حل یہ ہے کہ طلبہ کو بھی سوالات پوچھنے کی اجازت دی جائے۔ طلبہ کو کہا جائے کہ جو چیز وہ نہیں سمجھتے، مدرس سے پوچھیں۔ مگر یہ ضروری ہے کہ طلبہ سبق کے متعلق ہی سوالات پوچھیں اور مدرّس ہر بات کو بخوبی ذہن نشین کرائے۔ اگر طلبہ کے سوالات سبق کے متعلق نہ ہونگے، تو مدرّس کو جوابات کے لیے خواہ مخواہ پریشان بھی ہونا پڑیگا اور جماعت کا وقت بھی ضائع ہوگا۔

چھوٹے بچّوں کے لیے ایک خاص قسم کے سوالات بہت ہی مفید ہوتے ہیں، یعنی مدرّس ایک فقرہ اس طرح سے بولے کہ لڑکے جواب کو سمجھ جائیں اور وہ فقرے کو مکمل نہ کرے، بلکہ کسی

لفظ پر زور دے کر اُسے سوالیہ فقرہ سا بنا دے اور طلبہ اس فقرے کو پورا کریں۔ مثلاً

مدرس پوچھے :- ہمارے ضلعے کا سب سے بڑا حاکم ؟

لڑکے جواب دیں :- ڈپٹی کمشنر کہلاتا ہے۔

یا کوہِ ہمالیہ ہندوستان کے ؟

شمال میں واقع ہے۔

اِس قسم کے سوالات کو محذوفی سوالات (ELLIPTCAL QUESTION.) کہتے ہیں۔

اِن سوالات سے چھوٹے بچوں میں جواب دینے کی جُرأت پیدا ہوتی ہے۔ بعض بچے فطری طور پر زیادہ شرمیلے ہوتے ہیں۔ اکیلے جواب دینے کی جُرأت نہیں کر سکتے۔ مگر ساری جماعت کے ساتھ خُوب جواب دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ خود بھی جواب دینے کی جرأت کرنے لگ جاتے ہیں۔

یہ سوالات چھوٹے بچوں تک ہی محدود رکھنے چاہییں، کیونکہ ان سوالات سے سوچنے کی قوت کی کچھ زیادہ نشوونما نہیں ہوتی۔ جو بچے سمجھ جاتے ہیں، وہ فوراً جواب دے دیتے ہیں، دوسرے جواب نہیں دے سکتے، دوسروں کے ساتھ صرف اپنی آواز ملا دیتے ہیں اور مدرس معلوم نہیں کر سکتا کہ کن کن کو جواب آتا ہے اور کن کو نہیں۔

دُوسرا نقص اِن سوالات میں یہ ہے کہ ایک سوال کا ایک ہی جواب نہیں ہوتا۔ طلبہ کی توجہ منتشر ہو جاتی ہے اور وہ ایک خاص بات کی طرف سوچنے کی کوشش نہیں کر سکتے۔

بہرکیف سوالات ہماری تعلیمی مساعی میں ہمارے ہتھیار ہیں اور معلم کو ان ہتھیاروں کے استعمال کرنے میں پوری پوری مہارت حاصل کرنی چاہیے اور پھر ان کا بجا استعمال۔

ہٹلر کا نظریہ اور جرمن نصاب تعلیم

از
محمد انور قریشی، اے ڈی آف سکولز، ہوشیار پور

اس وقت تمام اطراف سے ہمارے موجودہ نصابِ تعلیم کی خامیاں عریاں کی جا رہی ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہماری طرزِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کہنہ ہو چکے ہیں جس وقت یہ نصاب مدرسوں میں رائج کیا گیا، اُس وقت ہماری حکومت کا نصب العین کچھ اور تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے دفاتر چلانے کے لیے کلرکوں کی ضرورت تھی، چنانچہ اسی مدعا کے زیرِ تحت انگریزی تعلیم کو ہندوستان میں رائج کیا گیا۔ رفتہ رفتہ ان بابوؤں کی تعداد انتہا کو پہنچ گئی۔ اس زمانے میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بہتات اور اُن کی ارزانی کون نہیں سمجھتا۔ اس وقت ہماری تعلیم کے اربابِ حل و عقد پر لازم آتا ہے کہ وہ سلسلۂ تعلیم کو از سرِ نو منظم کریں۔ اس کا ایک اور طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم دوسرے بیدار ممالک کے طریقہ ہائے تعلیم کا مطالعہ کریں اور خصوصاً یورپین ممالک کا، کیونکہ ان قوموں کو بھی ہماری طرح مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا، لیکن ان قوموں میں ایسے بیدار مغز اشخاص موجود تھے، جنھوں نے اپنی تعلیمی مشکلات کا حل خود پیدا کر لیا۔

ذیل کے مضمون میں ہٹلر کے نظریۂ تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہٹلر کا ہر ایک نظریہ قومی اشتراکیت پر مبنی ہے اور ہندوستان میں ابھی ان چیزوں کو رائج نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پھر بھی ہم بہت حد تک اس کے اصولوں پر کاربند ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے جرمنی کے تمام قسم کے مدرسوں کی ترتیب اور نظم و نسق کو بھی واضح کر دیا ہے۔

ہٹلر نے نصابِ تعلیم میں جسمانی صحت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اُس کے نزدیک جسم کی تربیت دماغی اور قلبی نشوونما سے پیشتر ہونی چاہیے۔ چنانچہ اُس نے اپنی کتاب "میری جدوجہد" میں لکھا ہے کہ قومی ریاست کے بچے کے دماغ میں علم ٹھونسنے کے بجائے صحت اور جسم کی پرورش کا خیال پیدا کرنا چاہیے۔ قوتِ جسمانی پیدا ہونے کے بعد دماغی نشوونما کی ضرورت ہے۔ اُس کے نزدیک تعلیم ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ دماغی نشوونما میں بھی اعلیٰ چلن کو پہلی حیثیت دی گئی ہے۔ بچے کے کیریکٹر میں قوتِ ارادی اور احساس ذمے داری کا پیدا کرنا مدرس کا فرضِ اولیں ہے۔ اسکول کا نصاب اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ہٹلر کے خیال میں وہ مرد جو درمیانے درجے کا علم رکھتا ہے، لیکن اس کا جسم اور چلن نہایت اعلیٰ ہے اور اُسے اپنی قوت اور ارادوں پر یقین ہے، اُس شخص سے ہزار درجے بہتر ہے، جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، مگر جسم کا کمزور۔ جسمانی حالت کو ترقی دینا صرف افراد کا فریضہ ہی نہیں، بلکہ بقائے نسل کے لیے ایک نہایت اہم چیز ہے۔ لہٰذا ریاست کا یہ فرض ہے کہ اس کی حفاظت کرے۔ حکومت کو چاہیے کہ جسم کی پرورش اوائل عمر ہی سے شروع کر دے۔ ملک میں یا قوم میں ایسے انسان نہ پیدا کیے جائیں، جو باہر گھومنے کے بجائے گھر کے اندر بیٹھنے کو ترجیح دیں۔ مدرسوں میں جسمانی ورزش کے لیے سب سے زیادہ وقت صرف کرنا چاہیے۔ ہر روز صبح و شام طلبہ اور طالبات کو جسمانی ورزش کرائی جائے۔ ورزش میں کھیل اور جمناسٹک بھی شامل ہیں۔ یہ بات قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو گی کہ ہٹلر کے نزدیک مکّہ بازی نہایت اعلیٰ کھیل اور ورزش ہے۔ اب تک جرمنی میں اس حرکت کو گنواروں کا فعل سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم یافتہ نوجوان اس کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کرتے تھے۔ لڑائی اور کشتی لڑنے کو ایک باعزت اور قدرتی چیز جانتے تھے۔ اگر انھیں مکّہ بازی کے لیے کہا جاتا، تو وہ اُسے ایک دیہاتی حیلہ سمجھتے۔ ہٹلر مکّے بازی کو اس لیے اچھا سمجھتا ہے کہ اس فعل

سے انسان کے حملہ آور ہونے کی خصوصیت ترقی کرتی ہے جسمانی حالت اور قوتِ ارادی بڑھتی ہے۔ وہ نوجوانوں کا کسی امر کے متعلق تلوار سے فیصلہ کرنے کے بجائے مکّے سے فیصلہ کرلینا بہتر ہے۔ ہٹلر کا یہاں تک خیال ہے کہ اگر جرمن تعلیم یافتہ جماعت مکّے بازی کے فلسفے کو سمجھ لیتی، تو انقلاب کے زمانے میں اس قوم میں بدمعاش یا ڈرپوک آدمی پیدا نہ ہوتے۔ ہٹلر اعلیٰ تعلیم کے یہاں تک خلاف ہے کہ اس کی نظر میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا انسانیت کے درجے سے گرنا ہے چنانچہ وہ جرمن افسران، انجنیر، قانون دان، ماہرین علم و ادب اور سب سے بڑھ کر پروفیسران سے بہت مایوس ہے۔ اُستادوں کی روزمرّہ کاوش سے علم و ہنر کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے لیکن جرمن قوم کی قوتِ ارادی ہمیشہ خام ہی رہی۔

علامہ اقبال مرحوم کا مشہور شعر ہے ؎

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم   جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اس شعر کی عملی تصویر صرف جرمنی میں نظر آتی ہے۔ ہٹلر کے عہد سے پہلے جرمن قوم کیریکٹر کے لحاظ سے بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ ہر ایک غالب قوم ان کو اپنی مرضی کے مطابق مجبور کرسکتی تھی۔ ہٹلر نے اس کمزوری کو ایک قومی بیماری کا نام دیا ہے۔ اُس کے نزدیک اس مرض کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ وہ یہ کہ قوم کے افراد میں علم الیقین پیدا کیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے جرمن مدرسہ کو سب سے پہلی درسگاہ قرار دیا گیا۔ بچوں کو اگر چھوٹی عمر ہی سے صحیح تعلیم و تربیت دی جائیگی، تو وہ نوجوان ہونے تک ایک اعلیٰ کیریکٹر کے حامل بن سکیں گے۔ ہٹلر کے نزدیک بچوں کی تعلیم کا مقصد صرف یہی ہے کہ اُنھیں اس حقیقت کا یقین دلایا جائے کہ وہ دوسروں سے بہت بہتر ہیں۔ یہی بچے جب جوان ہونگے، تو ان کو اپنی قوتِ بازو پر پورا پورا اعتماد ہوگا اور وہ اپنے آپ کو ایک ناقابل تسخیر قوم تصوّر کریں گے۔ چنانچہ جنگِ عظیم کے دَوران میں جرمن قوم کو جو فتح نصیب ہوئی، ہٹلر اُسے

یقین اور ایمان کی فتح سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک قومی قوت ارادی آزادی کی قومی خواہش
عمل پیہم ہی شکست خوردہ قوموں کو معراجِ ترقی تک پہنچا سکتے ہیں۔ ان اوصاف کے پیدا
سے پیشتر مدرسوں کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔ ریاست کا بھی فرض ہے کہ طلبا کی جسم
صحت کا خیال صرف تعلیمی زندگی تک ہی محدود نہ رکھے، بلکہ یہ چیز اسکول کی زندگی کے بعد تک
جاری رہنی چاہیے۔ صحت اور جسم کا خیال دونوں عرصوں کے درمیان بھی رکھا جائے۔ فوج
اور اس کی تعلیم کوچ یا سیدھے کھڑے ہونے کی تعلیم نہیں ہے، بلکہ سپاہیانہ زندگی قومی تعلیم کی آ
اور بہترین درس گاہ ہے۔ نوجوان رنگروٹ جس طرح ہتھیار کا استعمال سیکھتا ہے اسی طرح وہ اپنے مستقب
کے لیے ٹریننگ بھی لیتا ہے۔ اسی اسکول میں لڑکا مرد بنے گا، وہ حکم کی اطاعت ہی نہیں سیکھ
بلکہ زمانۂ مستقبل میں حکم دینا بھی سیکھیگا۔ اُسے تنبیہ کیے جانے پر خاموش رہنا ہوگا اور بے انص
کو بھی برداشت کرنا پڑے گا۔ جسمانی قوت کا احساس جس میں فوجی تنظیم کوٹ کوٹ کر بھر دی گئ
لڑکے کو یقین دلا دے گی کہ اُس کی قوم اور اُس کا وطن ناقابلِ تسخیر ہے۔ جب اُس کی فوجی تعلیم ختم
جائے، تو اُسے دو تحریریں دکھانی پڑینگی۔ اولاً قانونی کاغذات جو اُسے ایک شہری ثابت کرتے ہی
اور عام کاموں میں حصہ لینے کی اجازت دیتے ہیں۔ ثانیاً صحت کا سرٹیفکیٹ جو یہ ثابت کرے ک
شادی کرنے کے قابل ہے۔ مندرجہ بالا حقیقتوں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہٹلر کے نزدیک دورِ
تعلیم میں صحت کا قائم رکھنا اور اُسے ترقی دینا کتنی اہم چیز ہے۔ یہاں تک کہ جو نوجوان اسکول ختم
کرنے کے بعد اعلےٰ جسمانی صحت کا سرٹیفکیٹ حاصل نہ کرے، اُسے شادی کرنے کی اجازت نہیں ہو
تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں جسمانی ورزش پر اتنا ہی زور دیا گیا ہے۔ اس کے بعد چلن اور سب سے آخر
قابلیت اور علمیت کا شمار ہوتا ہے، لیکن تعلیمِ نسواں کا جرمنی میں واحد مقصد یہ ہے کہ دورانِ تعلیم میں
لڑکیوں کو یہ سکھایا جائے کہ وہ زمانۂ مستقبل میں مائیں بنیں گی۔ نسوانی تعلیم کے متعلق ہٹلر کا نصب العین

کتنا بلند ہے۔ کاش ہم ہندوستان میں بھی اس کی پیروی کر سکیں۔

جنگِ عظیم کے دوران میں ہٹلر کے نزدیک جرمن شکست کا باعث یہ بھی تھا کہ جرمن فوجی میدانِ کارزار میں خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ جس سے فوجی ضبط بھی خراب ہوگیا اور مخالفین بھی فائدہ اُٹھاتے رہے۔ لہٰذا ہٹلر نے خاموشی کی ٹریننگ کو اسکول کی تعلیم میں بہت ہی اہمیت دی ہے۔ ہٹلر سے پیشتر جرمنی میں تعلیم کے اس پہلو پر زور نہیں دیا جاتا تھا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ صرف جرمنی میں ہی نہیں، بلکہ تمام دنیا میں کروڑہا روپیہ عدالتوں اور قانونی چارہ جوئی پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اس کا باعث اکثر یہ ہوتا ہے کہ دو آدمی کسی بات کے متعلق خاموش نہ رہ سکے۔ اکثر اوقات لاپرواہی سے گفتگو کی جاتی ہے اور ویسے ہی لاپرواہی کے انداز میں اُس کا جواب موصول ہو جاتا ہے۔ ہٹلر کو یہ چیز بہت دُکھ دیتی ہے کہ اُس کی قوم اور ملک کے دستکاری کے راز فاش ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ لوگ خاموش نہیں رہ سکتے اور کسی حالت میں بھی اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتے۔ دورانِ جنگ میں زیادہ بولنے کی عادت اکثر اوقات شکست کا باعث ہو جاتی ہے۔ لہٰذا خاموش رہنا ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ لیکن خاموشی کی ٹریننگ اگر بچپن ہی سے دی جائے، تو جوان ہونے تک ایک پختہ عادت بن سکتی ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر ملک اور مذہب کے رہنماؤں نے خاموشی کو ایک عبادت قرار دیا ہے، لیکن اس خاموش قوت کی صحیح عملی تصویر ہٹلر کی پیش کردہ ہے۔ چنانچہ جرمن اسکولوں میں جہاں بچوں کو ہزار قسم کے علوم و فنون سکھائے جاتے ہیں، خاموش رہنے کی بھی تعلیم دی جاتی ہے طلبہ میں اعلیٰ خصوصیات کا پیدا کرنا جرمن اساتذہ کا فرض ہے۔ اُن کے نزدیک اعتماد، ذاتی قربانی اور خاموشی ایسی خوبیاں ہیں، جن کی ملک اور قوم کو اشد ضرورت ہے۔ لہٰذا نصابِ مکتب کی دیگر باتوں پر ان امور کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس بحث سے صاف ظاہر ہے کہ ہٹلر طفلِ مکتب

میں اعلیٰ جسمانی صحت اور کیرکٹر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس حقیقت کو تو تمام دنیا کے ماہرینِ تعلیم خوب سمجھتے ہیں، لیکن نظریوں کو عملی جامہ پہنانا صرف ہٹلر ہی کا کام ہے۔ بات کہہ دینا، یا ایک اصول بنا دینا آسان ہے، لیکن کسی کام کو عملی طور پر یا عملی صورت میں پیش کرنا صرف زندہ قوموں کا ہی حصہ ہے۔ اسی عمل پیہم میں اقوام کا رازِ حیات مضمر ہے اور ہٹلر نے اس بات کو خوب سمجھ لیا ہے۔

نومبر، دسمبر ۱۹۱۸ء میں جرمنی کو پے در پے شکستیں ہوئیں۔ اُن کا باعث ہٹلر نے یوں بیان کیا ہے۔ بادشاہ سے لے کر چھوٹے افسر تک کوئی شخص بھی آزادانہ فیصلے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ یہ صرف ہماری ناقص تعلیم کی لعنت تھی۔ کیونکہ ہم معمولی معمولی باتوں پر جھگڑنے کے عادی ہو چکے تھے۔ لہٰذا اہم قومی امور کے متعلق بھی کوئی تصفیہ نہ کر سکے۔ اس قوتِ ارادی کی خامی نے ہمیں جنگِ عظیم میں شکست دلائی، نہ کہ اسلحہ جات کی کمی نے۔ یہ خامی ہماری قوم میں بُری طرح گھر کر گئی ہے۔ ایک جرمن جرنیل نے ایک فارمولا ہی بنا لیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مَیں اُس وقت تک میدانِ جنگ میں نہیں کُودتا، جب تک مجھے اکیاون فیصدی فتح کی اُمید نہ ہو۔ یہ اکیاون فیصدی کا سوال ہی ہماری شکست کا باعث ہوا۔ یہ خامی اور یہ تباہی ہم میں کیوں پیدا ہو رہی ہے، صرف اس لیے کہ ہمارے اسکولوں کا تعلیمی نصاب نہایت بوسیدہ ہے۔ یہی کمزوری پبلک زندگی میں بھی جاری رہی یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے بڑے بڑے عہدیدار بھی اس سے بری نہ تھے۔ چنانچہ ہٹلر کی خواہش ہے کہ جس طرح اسکولوں میں قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کی تعلیم دی جا رہی ہے، اُسی طرح طلبہ میں ذمے داری کا احساس پیدا کر دیا جائے اور اُنھیں اپنی خامیوں کو تسلیم کرنا بھی سکھایا جائے۔

ہٹلر نے گزشتہ نصابِ تعلیم میں تین اہم تبدیلیاں کی ہیں:۔

۱۔ بچّے کو ایسے مضامین نہ سکھائے جائیں، جن کی اُسے نوّے فیصدی ضرورت ہی

نہیں ہے اور جنھیں وہ دماغ سے فوراً محو کردیتا ہے۔ نصابِ تعلیم میں زباندانی کو کوئی خاص جگہ نہیں دی گئی۔ اگر کوئی شخص زبان سیکھنا چاہے، تو وہ اختیاری طور پر سیکھ سکتا ہے۔ سب سے پہلے جسمانی حالت اور اُس کے بعد دیگر چیزوں کو لیا گیا ہے۔ مضامین کی اہمیت قوم اور ملک کی ضروریات کے مطابق ہونی چاہیے۔ خصوصاً تاریخ کی تعلیم میں ایک اہم تبدیلی پیدا کی گئی ہے۔ چونکہ اسی مضمون کے پڑھانے کے نتائج قابلِ افسوس تھے۔ تاریخ پڑھنے کے بعد طلبہ کو فقط چند ایک تاریخیں اور نام یاد رہ جاتے تھے۔ واقعات کا صحیح سلسلہ دماغ سے محو ہو جاتا ہے، لیکن واقعات کا تسلسل ہی ایسی چیز ہے، جو طلبہ کو یاد رکھنا چاہیے۔ ہٹلر کے نزدیک علمِ تاریخ کی وسعت کو قدرے کم کردینا چاہیے۔ کیونکہ تاریخ اس لیے نہیں پڑھائی جاتی کہ پُرانے واقعات کو رٹ لیا جائے۔ بلکہ اس لیے کہ پُرانے واقعات سے اپنی زندگی کے مستقبل اور قومی ہستی کو ترقی دینے کے لیے نتائج اخذ کیے جائیں۔ قرونِ اولیٰ کی تاریخ ضرور پڑھائی جائے۔ اسی خیال سے پُرانی رومن تاریخ نازی مدرسوں میں بڑی شد و مد سے جاری کی گئی ہے ہٹلر کی خواہش ہے کہ دنیا کی تاریخ دوبارہ لکھی جائے اور اس میں امتیازِ نسل کو خاص اہمیت دی جائے۔ جرمن اسکول اور اس کے موجودہ نصاب پر ہم آخر میں بحث کریں گے۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ ہٹلر خاص خاص چیزوں کو رٹ لینے کے بجائے عام قسم کی تعلیم پر زیادہ زور دیتا ہے۔ لہٰذا اُس نے گزشتہ ثانوی اسکولوں کے نصاب کو بالکل بدل دیا ہے۔

۳۔ جرمن تعلیم میں دوسری اہم تبدیلی یہ پیدا کی گئی ہے کہ عام اور مخصوص ٹیکنیکل ٹریننگ کو علیحدہ علیحدہ کردیا ہے۔ ہٹلر کے نزدیک مخصوص پیشہ ور تعلیم اُسی وقت ترقی کرسکتی ہے جبکہ اُس کی پشت پر ایک عام قسم کی تعلیم مروّج ہو، کیونکہ یہی تعلیم طلبہ کو دستکاری، سائنس اور بیوپار کا علم حاصل کرنے پر آمادہ کرے گی۔

اسی ضمن میں ہٹلر نے ریاست کے نظریہ کو بھی بدل دیا ہے۔ اس سے پہلے جرمنی میں حب الوطنی کے لحاظ سے یکسانیت نہیں تھی۔ لوگ مقامی بادشاہوں یا راجاؤں کی فتوحات پر خوش ہوا کرتے تھے۔ جس قدر اُن کی تعداد بڑھی ہوئی تھی، اُسی قدر حب الوطنی کا تصور بوسیدہ اور فرسودہ تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جرمن طلبہ علم التاریخ کے مقصد کو بالکل نہ سمجھ سکے۔ لہذا جرمن اپنی قومی ترقی کی راہ پر گرمجوشی سے گامزن نہ ہو سکے۔ کوئی جرمن اُستاد بچوں کے سامنے اپنے قومی رہنماؤں کو صحیح شکل میں پیش نہ کر سکتا تھا۔ کسی ملک کے باشندے ایک نقطہ ماسکہ پر جمع نہیں ہو سکتے، جب تک کہ وہ اپنے آپ کو ایک قوم تصور نہ کریں۔ چنانچہ ہٹلر نے اپنے ملک میں تعلیم تاریخ کو صرف اس مقصد کے لیے رائج کیا ہے کہ بچے چھوٹی عمر ہی سے قوم کے فلسفہ کو سمجھیں چونکہ اسی بات کے ذہن نشین ہو جانے کے بعد اس نسل میں صحیح قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ دنیا میں کمزور مرد اور کمزور قوم کسی کام کی بھی نہیں ہیں۔ کمزور قوم کو وہی لوگ پسند کریں گے، جو اس کے افراد کو بے وقوف بنا کر ان سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ چنانچہ اس قومی جذبے کی بنیادیں مدرسے ہی میں مستحکم کی جاتی ہیں اور تاریخ کو اس نظریہ کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ ہٹلر کی تیسری خواہش سائنٹفک طریقۂ تعلیم کے متعلق ہے۔ وہ سائنس کو صرف قومی اقتدار کے ترقی دینے کے لیے رائج کرنا چاہتا ہے۔ صرف دنیاوی تاریخ ہی نہیں، بلکہ دنیا کی تہذیب کی تاریخ اسی نقطۂ نظر سے پڑھائی جاتی ہے۔ ایک موجد کو صرف اس لیے بڑا نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک موجد ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ایک وطنی ہے۔ اس کی ایجاد سے ہماری طبیعتوں میں غرور پیدا ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ ہماری قوم کا ایک فرد ہے۔ قومی رہنماؤں، رہبروں، موجدوں اور سائنس دانوں کو بچے کے سامنے اس طریق سے پیش کیا جائے کہ اُن کی زندگی اُس کے دل میں ایک زبردست قومی تصور پیدا کر دے۔ جیسے دنیا کا ایک بڑے

سے بڑا ہیجان بھی نہ ہلا سکے۔ قومی غرور اسی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے، جب قوم کی اہمیت اور بڑائی کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس سمجھ کے پیدا کرنے کے لیے اسکول بہترین درسگاہ ہے۔ ہٹلر کے اس نظریہ کی بنیاد قومی اشتراکیت ہے، جو امتیازِ نسل پر مبنی ہے۔ وہ آریہ نسل کو دنیا کی بہترین جماعت تسلیم کرتا ہے اور اس کی لڑائی یہودی سے ہے، جو سامی نسل سے ہے۔ اس ضبط کی بنا پر وہ اپنی قوم کے افراد کو ایک زبردست جنگ کے لیے تیار کرنا چاہتا ہے، جس کا واحد مقصد امتیازِ نسل ہے۔ جو قوم اور نسل اس جنگ کے لیے سب سے پہلے میدانِ عمل میں آ دھمکے گی، وہی آخر میں کامیاب ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہٹلر کی جرمنی میں تعلیم مدرسہ کا اختتام فوجی تعلیم و تنظیم پر ہوتا ہے۔

آمریت سے پیشتر جرمنی میں صرف اعلیٰ طبقے کے بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی لیکن موجودہ دور میں روایات بدل دی گئی ہیں۔ چنانچہ ایک دہقان کا بیٹا، اُس بچے سے جس کے والدین پشت ہا پشت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہوں، ہزار درجے بہتر ہو سکتا ہے۔ موخرالذکر کی اعلیٰ تعلیم روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ غریبوں کے بچے مدرسے میں آ کر اعلیٰ تعلیم یافتہ بن رہے ہیں تعلیم کا انحصار وراثت کے اعتبار پر نہیں، بلکہ دماغی قابلیت پر ہے۔ چنانچہ جرمنی میں زیادہ توجہ غربا کے بچوں پر دی جاتی ہے، کیونکہ ملک کی حالت جبھی بہتر ہو سکتی ہے، کہ عام دنیا کے بچے بھی بہتر ہو سکیں۔ لہٰذا اس وقت جرمنی میں یہ اصول رائج ہے کہ بلالحاظ جماعت ہر خاندان اور طبقے سے بچوں کو کھینچ کر مدرسے میں لایا جاتا ہے۔ گزشتہ عہد میں اُونچے طبقے کے لوگ جمہور سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور نہ نچلے طبقے کی سوسائٹی سے کوئی دلچسپی ہی تھی۔ یہ لوگ غربا سے بالکل بیگانگی کا اظہار کرتے تھے۔ ثانیاً اعلیٰ طبقہ کی قوت خام اور ارادے مستحکم نہ تھے۔ ان لوگوں کو صرف اپنی عیاشیوں سے سروکار تھا۔ یہ خوبیاں تو صرف غربا ہی میں ہو سکتی ہیں، لیکن ان سے

اچھا برتاؤ نہ کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جس قدر سیاسیات میں ماہر تھا، اُسی قدر وہ
زندگی میں ناکام تھا یعنی اُن کی اجتماعی کاوشوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلتا تھا۔ ہٹلر نے گزشتہ لڑ
کی شکست کا باعث بھی اسی چیز کو قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں شکست اس لیے نہیں اُٹھ
پڑی کہ ہم تعلیم یافتہ نہ تھے، بلکہ اس لیے کہ ہماری قوم کا وہ حصہ جس کے ہاتھ میں حکومت
باگ ڈور تھی، بہت تعلیم یافتہ تھا، لیکن اُن کا چلن خام تھا۔ اُن کی خواہشات پختہ نہ تھیں۔ اُ
کے ارادے مستحکم نہ تھے۔ اُن کے نفس میں گرمی نہ تھی۔ ہٹلر اس بات کا بھی نوحہ کرتا ہے کہ اُن
چانسلر ایک کمزور فلسفی تھا۔ اُس کے نزدیک ایک کمزور فلسفی رہنما سے وہ بہادر امیر جماعت
بہتر ہے، جس کی پشت پر عام لوگوں کی آواز ہو۔ چنانچہ ہٹلر کی یہ زبردست خواہش ہے کہ
دور میں نئے آدمی برسر اقتدار آتے رہیں، جن کی رگوں میں نیا اور تازہ خون ہو۔ یہ انقلاب عمل
کے ماحول میں پیدا ہوگا۔

(باقی آئندہ)

بچّوں کا لباس

از

میرزا مقبول بیگ بدخشانی، بی اے، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

بچوں کو کیا پہننا چاہیے؟ اور کیسے پہننا چاہیے؟ وقتِ حاضر کا ایک نہایت ہی ضروری مسئلہ ہے، جو بچوں کی تربیت کے سلسلے میں بہت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا بچے کی زندگی اور اُس کی آزادی کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ ذیل میں اسے وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جہاں تک میرا خیال ہے، یہ لباس کا مسئلہ بچّے کی اپنی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے ماں باپ کی شخصیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے لباس تیار کرتے وقت بچوں کی اپنی پسند یا ناپسند کو ضرور دخل ہونا چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بچپن میں اس کے لباس کا سارا کام والدین سے متعلق ہوتا ہے اور یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ بچّوں کو اس میں چون و چرا کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ خیال بڑی حد تک غلط ہوتا ہے۔ بچے جب جوان ہوتے ہیں، تو خود اپنے ارادے کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچپن میں بھی ان کی خواہش کو قابلِ اعتنا خیال کیا جائے۔ لیکن برعکس اس کے ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ ان کی کسی خواہش کی پروا نہیں کی جاتی۔ ان کی کسی پسند پر توجہ نہیں دی جاتی۔ اس بے توجہی کا نتیجہ بچّوں کے حق میں مضرت رساں ہوتا ہے۔

آجکل عام طور سے بچوں کے لباس میں بہت کچھ تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ یہ تبدیلی

یقیناً مفید ہے، لیکن ابھی اس میں اصلاح کی اور بھی گنجائش ہے۔ والدین لباس کے معاملے میں آپ ہی آپ ایک نظریہ قائم کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق بچوں کو کپڑے پہناتے ہیں، بچے اُنھیں پسند کریں یا نہ کریں، اس سے وہ بالکل بے نیاز ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے ایک نظریے کی خاطر سے بچوں کی خوشی کو قربان کر دینا کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ بچے خاص خاص رنگوں کو پسند نہیں کرتے اور خاص خاص لباسوں کو بھی اچھا نہیں سمجھتے، لیکن بڑوں کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جو کپڑا اور جس شکل کا کپڑا تیار ہو چکا ہے، وہ اُنھیں پہنا دیا جائے۔ ایک بچہ سر پر پگڑی نہیں پہننا چاہتا۔ اس کی اماں اُسے مجبور کرتی ہے کہ ننگے سر جانا تہذیب کے خلاف ہے۔ لوگ کیا کہیں گے، تمھیں پگڑی ضرور باندھنا چاہیے۔ بعض وقت بچہ سر پر انگریزی ٹوپی پہن لیتا ہے، لیکن پاؤں میں کچھ نہیں پہننا چاہتا۔ اسے پھر تہذیب کی خلاف ورزی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس سے بچے کی فطری آزادی میں بڑا فرق پڑتا ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بچے کی نشو و نما آزادی کے ساتھ ہوتی رہے، تو ہمیں لباس کے معاملے میں اس کی پسند اور ارادے کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

مائیں عام طور سے سردی کے موسم میں بچوں کو کپڑوں سے لاد دیتی ہیں اور خیال کرتی ہیں کہ سردی سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ہوا آنے کے تمام راستے روک دیے جائیں۔ بچے ذاتی طور پر کپڑوں کی اتنی کثرت کو پسند نہیں کرتے۔ روسو لکھتا ہے کہ "ہمیں بچوں کو زیادہ گرم رہنے کا عادی نہیں بنانا چاہیے، بلکہ سردی برداشت کرنے کے لیے آمادہ کرنا چاہیے"۔ اگر بچپن میں اُنھیں اس قسم کی عادت ہو جائے، تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جوانی اور بڑھاپے میں ان کی کیا کیفیت ہو گی اور یوں بھی جو لباس بچوں کی آزادانہ دوڑ بھاگ میں حائل ہو، اس سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ بچوں کے کپڑوں کے متعلق پہلی اور نہایت ضروری بات یہ ہے کہ وہ آرام دہ ہوں۔

آرام دہ بچوں کی نظر میں، ہماری نظر میں نہیں۔ بعض امیر آدمی اپنے بچوں کو چاک چوبند رکھنے کے لیے انھیں ایسے کپڑے پہنا دیتے ہیں، جن میں لچک پائی جاتی ہے۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ جسم کے ساتھ ملے ہوئے کپڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کے کپڑے بچوں کی بیزاری اور جھلاہٹ کا موجب ہوتے ہیں۔ ربڑ والے گیرٹرس بھی بچوں کے لیے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ کپڑے اگر آرام دہ نہ ہوں، تو اس سے بچے کی ذہنی کیفیتوں پر اثر پڑتا ہے اور اس کا مزاج بھی چڑچڑا سا ہو جاتا ہے۔

جس کپڑے سے بچوں کو نفرت ہو، وہ اُنھیں پہننے کے لیے ہرگز مجبور نہ کرنا چاہیے۔ بچّہ ممکن ہے ایسے کپڑے سے نفرت کی وجہ آپ کو نہ بتا سکے، لیکن اسی وجہ کو کافی سمجھ لینا چاہیے کہ اس سے اُسے نفرت ہے۔ ایک بچہ تنگ پاجامے کو پسند نہیں کرتا، کھلی شلوار پہننا چاہتا ہے آپ اگر اسے اس لیے پاجامہ پہننے پر مجبور کریں کہ آپ خود تنگ پاجامہ پہنتے ہیں یا پسند کرتے ہیں، تو یہ درست نہیں۔ اپنی پسند کو دوسروں پر اور بالخصوص بچّوں پر ٹھونس دینا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر کپڑے بچوں کے منشا کے موافق ہوں، تو وہ کپڑوں کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو رہتے ہیں۔ اُنھیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوتی اور اگر کپڑے ان کے منشا کے موافق نہ ہوں تو ہر وقت ان کی ناموافقت ہی اُنھیں زچ کرتی رہتی ہے۔ مثال کے طور سے آپ کا بچہ نکرّ پہن کر خوش ہوتا ہے آپ اُسے پتلون دے دیتے ہیں۔ جبر واکراہ سے وہ اسے پہن لیتا ہے۔ آپ اُسے کہہ دیتے ہیں، یہ پتلون ہے، دیکھنا اس میں شکن نہ آئے۔ سامنے کی بڑی شکن خراب نہ ہونے پائے۔ بچہ آپ کی ہدایت اور احتیاط کو نظر میں رکھتے ہوئے، کبھی آزادی کے ساتھ اپنا کام نہیں کر سکیگا۔ اگر وہ کھیل میں مصروف ہے، تو وہ پتلون کی کھینچا تانی میں لگا رہے گا اور اگر پڑھنے بیٹھا ہے، تو اس وقت بھی پتلون کا احساس اسے پریشان رکھیگا۔ بچّے لباس کے متعلق پسند اور ناپسندی کے

احساس رکھتے ہیں۔ اگر ہم اپنی پسند کے موافق کوئی لباس ان پر ٹھونس دیں، تو اس سے ان کی انفرادیت کو بہت صدمہ پہنچتا ہے۔

اگر ماں باپ کی مالی حالت کمزور ہو، تو انھیں بچوں کے لباس کے سلسلے میں بڑی پریشانی کا سامنا ہوتا ہے۔ بعض اوقات مائیں بڑے بچوں کے کپڑے چھوٹے بچوں کو پہننے کے لیے دے دیتی ہیں یا بڑے کپڑوں کو کاٹ کر چھوٹے بچوں کی پوشاک تیار کر لیتی ہیں۔ اس قسم کے لباس کو نہ لڑکے ہی پسند کرتے ہیں اور نہ لڑکیاں ہی اچھا سمجھتی ہیں۔ کپڑوں کا نیا ہونا بچوں کے لیے بڑی خوشی کا موجب ہوتا ہے۔ بچے کپڑے کی خوبی یا وصف پر دھیان نہیں دیتے۔ انھیں تو شوق اس بات کا ہوتا ہے کہ کپڑا نیا ہو۔ عید یا کسی اور خوشی کی تقریب پر آپ دیکھتے ہیں کہ بچے خوشی میں پھولے نہیں سماتے۔ ایسی تقریبوں کو وہ کیا سمجھتے ہیں؟ بس یہی کہ نئے نئے کپڑے پہنیں گے اور اِدھر اُدھر آزادی کے ساتھ اپنے دوستوں سے ملیں گے اور سیر و تفریح کریں گے۔ ایسے موقعے پر اگر آپ انھیں نہایت بڑھیا قسم کا کپڑا پہنا دیں، جو نیا نہیں پرانا ہے، تو اُن کی عید کی ساری خوشی جاتی رہیگی۔ اگر ہو سکے تو بچوں کو بڑے بھائی بہن کا کپڑا نہیں پہنانا چاہیے۔ اس سے انھیں فروتری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ احساس بچے کی نشوونما کے لیے بہت مضر ہوتا ہے۔ اس کی بہت سی صلاحیتیں اسی کے سبب سے فنا ہو جاتی ہیں۔ اگر آپ بچے کو کوٹ نہیں پہنا سکتے، تو بغیر کوٹ ہی کے رہنے دیں۔ بہ نسبت اس کے کہ اُسے کسی بڑے کا کوٹ پہنا دیں۔ اگر آپ اُسے اعلیٰ درجے کا قمیض نہیں پہنا سکتے، تو معمولی کھدر کا صاف ستھرا قمیض پہنا دیں۔ یہ درست نہیں کہ کسی دوسرے کا اچھا قمیض پہنائیں۔ بعض غریب گھرانوں میں اس کے سوائے چارہ ہی نہیں ہوتا، لیکن ان حالات میں بھی یہ مناسب نہیں کہ انھیں پرانے کپڑے پہننے پر آپ مجبور کر دیں۔ سردیوں کے کڑکڑاتے جاڑے میں اگر کسی بچے کا اپنا گرم کوٹ نہ ہو، لیکن گھر میں اس سے بڑے

بھائی کا کوٹ موجود ہو، تو وُہ سردی سے بچنے کے لیے خود بخود اسے پہن لیگا۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ فروتری کا احساس بھی نہ ہو یا کم ہو اور ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ اگر ہمیں بچوں کے مستقبل اور اُن کی بہبودی کا پاس ہو، تو یہاں ایک نہایت ہی نازک مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور وُہ یہ ہے کہ انسان ایسے حالات میں ضبط تولید سے کام لے۔ ضبطِ تولید کا مسئلہ بالکل اضافی مسئلہ ہے۔ اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن یہاں مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اگر ہم اس قابل ہوں کہ صرف ایک بچے کی پوری پوری تربیت کر سکیں، تو ہمیں ضبط تولید کے قدرتی قاعدوں سے کام لینے میں تامل نہ کرنا چاہیے۔ قدرت کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ بہت سے بچے پیدا کر دیے جائیں، قطع نظر اس بات کے کہ ان کی پرورش اور تربیت خاطرخواہ طور سے ہو سکے گی، یا نہیں۔ قدرت نے ہمیں تمیز دی ہے اور اس کا مدعا صرف یہی ہے کہ ہم اپنے ذاتی اور سماجی واقعات کو ہر وقت نظر میں رکھیں۔

بعض لوگ محض بچت اور کفایت شعاری کے خیال سے بڑے کوٹوں کو کاٹ چھانٹ کر چھوٹے بچوں کے کوٹ تیار کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی کفایت شعاری سے ممکن ہے، بچت ہو جائے، لیکن اس کا نتیجہ سخت مہلک ہوتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو بچت ہو گی بھی کتنی! بچے کی انفرادیت کو تباہ کر کے تھوڑی سی بچت کر لینا دانشمندی نہیں۔ انفرادیت اگر تباہ ہو جائے، تو کسی مول پر بھی واپس نہیں مل سکتی۔ اس کے علاوہ یہ کہ فروتری کا احساس جنم لیتا ہے۔ یہ احساس بڑھتا ہی بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ اس سے بچے کی ساری زندگی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے دو نتیجے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہی کہ فروتری کے احساس کی وجہ سے بچے کی اکثر صلاحیتیں فنا ہو جائیں گی۔ دوسرے یہ کہ اگر اسے اتفاق سے ایسا موقع ہاتھ آ جائے کہ وہ جمع کی ہوئی ساری پونجی کو خود خرچ کرے تو اس کفایت شعاری کا ردِ عمل پورے زور سے شروع ہوگا۔ وہ سخت

فضول خرچ ہو جائے گا۔ یہ ردِ عمل بالکل قدرتی بات ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ محنتِ شاقہ سے روپیہ کماتے ہیں اور کفایت شعاری سے جمع کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کفایت شعاری بعض صورتوں میں بخل کی حد تک پہنچ جاتی ہے لیکن ان کے بچے جنھوں نے عسرت اور بخل کے علاوہ کوئی دوسری حالت نہیں دیکھی ہوتی، بے دریغ اس اندوختہ کو لٹاتے ہیں۔

بچوں کی پوشاک کے سلسلے میں ہم ان افادہ گاہوں کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے، جہاں لاوارث بچے پرورش پاتے ہیں۔ ایسی افادہ گاہوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کو ایک خاص قسم کی پوشاک پہنائی جاتی ہے۔ ان افادہ گاہوں کی خدمات کا اگر اعتراف نہ کریں، تو سخت ناشکری ہوگی لیکن ہم ان کی دی ہوئی پوشاک پر ایک نظر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہاں جو بچے تعلیم پاتے ہیں، انھیں ایک لمحے کے لیے بھی احساس نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مادری اور پدری شفقتوں سے محروم ہیں اور دوسروں کی خیرات پر پل رہے ہیں۔ یہاں انھیں لانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اس جگہ کو اپنے گھر کا بدل سمجھیں اور یہاں کے درس دینے والوں کو اپنا بزرگ جانیں لیکن یہ پوشاک انھیں ہر وقت احساس دلاتی رہتی ہے کہ تم عام گھروں کے بچوں سے مختلف ہو۔ تم دوسروں کے سہارے جیتے ہو۔ یہ پوشاک ان کی یتیمی کا اعلان کرتی ہے اور اس سے ان کے دلوں میں فروتری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور راسخ ہوتا جاتا ہے اور آخر کار ان کی نشو و نما میں رکاوٹ ڈالنے کا موجب ہوتا ہے۔ اگر قوم ان کی پرورش کا ذمہ لیتی ہے، تو لباس کے معاملے میں ان کی پسند اور ناپسندی کو ضرور دخل ہونا چاہیے۔ وہ سادہ اور کم قیمت لباس پہنیں، لیکن اپنے لیے آپ تجویز کریں، تاکہ انھیں کسی مجبوری یا محتاجی کا احساس نہ رہے۔

بچوں کے لباس کی تیاری میں یہ خاص بات بھی نظر میں رہنا چاہیے کہ بچوں کو پہننے میں سہولت ہو۔ وہ خود پہن سکیں اور خود ہی اتار سکیں۔ بعض بچوں کو نہایت چست اچکن پہنا دی جاتی ہے۔

اس پر متعدد بٹن لگے ہوتے ہیں اور تسمے بھی اندر کی طرف لگے ہوتے ہیں، جو اچکن پہننے کے وقت باندھنا پڑتے ہیں۔ چوڑی دار تنگ پاجاموں کو آپ دیکھیے۔ کتنی مشکل سے پہنائے جاتے ہیں اور کتنی مشکل سے اُتارے جاتے ہیں۔ بچّے ایسے لباسوں سے بہت گھبراتے ہیں۔ بچوں کے لیے بہترین لباس وُہ ہے، جس میں کسی بٹن یا تسمے کی ضرورت نہ ہو، آسانی سے پہن لیا جائے اور آسانی سے اُتر جا سکے۔ اس قسم کے چست لباس پہنانے والے والدین بچوں کی سہولت اور خوشی سے یقیناً بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ظاہراً ٹیپ ٹاپ ہوتی ہے۔ لیکن اس ٹیپ ٹاپ کے خیال سے بچوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اُنھیں سہولت اور آزادی والی باتوں سے دلچسپی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بچّے کپڑوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔

بچّے عام طور سے کھیلتے کھیلتے کپڑوں کو گندہ کر دیتے ہیں۔ اس پر بچوں کو تنبیہ کرنا اور اُنھیں کپڑوں کو گندہ کرنے سے باز رکھنا ان پر ظلم کرنا ہے۔ ہماری مہذب دُنیا میں کپڑوں اور کپڑوں کی صفائی کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن بچّے کھیل کود کو کپڑوں کی نسبت زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ بچوں کو بڑی سے بڑی صفائی کا خیال کھیل سے باز نہیں رکھ سکتا۔ وُہ دوڑنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پکڑنے کے لیے بھاگنا چاہتے ہیں۔ ننگے پاؤں کھیلنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے پر غبار اُڑانا چاہتے ہیں۔ کون ہے، جو بچوں کو ان باتوں سے باز رکھ سکے۔ مائیں اکثر بچوں کو تنبیہ کرتی ہیں، اکثر سمجھاتی ہیں کہ کپڑوں کو گندہ نہ کیا کرو، وحشی معلوم ہوتے ہو۔ گلی کے بھنگی سے اس وقت تم کیا کم ہوگے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت میں اُنھیں بچوں کے گندہ ہونے کا خیال نہیں ہوتا ہے، بلکہ کپڑوں کے گندہ ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ گویا وہ کپڑوں کو بچوں کی خوشی کی نسبت زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ بچے بالکل ہماری طرح کے انسان ہیں۔ وہ ہماری کھیل و تفریح کی چیزیں نہیں کہ اُنھیں صفا کیا اور جہاں چاہا اُٹھا کر رکھ دیا۔ بچوں سے توقع رکھنا کہ

وہ اپنے کپڑوں کو آلودگی سے محفوظ رکھیں، بیجا اور کچھ زیادتی بھی ہے۔ مائیں جو ہر وقت بچوں کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتی ہیں، وہ حقیقت میں خود غرض ہوتی ہیں وہ بچوں کو صفا رکھ کر دوسری عورتوں سے اپنی صفائی کی داد حاصل کرنا چاہتی ہیں اور اس طرح اپنے خود نمائی کے شوق کو قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ اگر کوئی بچہ دن بھر کھیلتا بھی ہے اور کپڑوں کو بھی صاف رکھتا ہے، تو سمجھ لیجیے کہ اس کا جسم بچپن کی بے نیاز اور آزاد روح سے محروم ہے۔ اس کے عصبی نظام میں کوئی خرابی ہے۔ بچوں کے کپڑوں کی آلودگی اس کی حسنِ مشغولیت کی دلیل ہے۔ ایک مضبوط بچہ جب کھیل سے واپس آتا ہے، تو ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ اس کے گھٹنے، اس کا چہرہ، اس کے ہاتھ گرد و غبار میں اٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ بات اس کے گندہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، بلکہ اس کی مضبوطی کی دلیل ہوتی ہے۔ کپڑوں کی آلودگی سے بھی بالکل یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ ایتھل مینن اپنی ایک تصنیف میں کہتی ہیں کہ "ایک صاف ستھرا بچہ قدرتی نہیں ہوتا، بلکہ مصنوعی ہوتا ہے۔" بچہ شگفتہ اور آزاد بھی ہو اور صاف ستھرا بھی رہے۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ پہلی بات زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے ہمیں دوسری بات کو اس کے لیے قربان کر دینا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بچوں کو ایسے کپڑے پہنائیں، جن میں ہر طرح کی سہولت کا خیال رکھا گیا ہو اور اس کی کھیل و تفریح کو نظر میں رکھ کر تیار کیے جائیں۔ یہ کپڑے کچھ اس وضع کے ہونے چاہییں کہ ان کے ساتھ بچے درختوں پر بھی چڑھ سکیں۔ پوری قوت کے ساتھ بھاگ بھی سکیں۔ ایک دوسرے کے اوپر سے کود بھی سکیں۔ مٹی میں لیٹ بھی سکیں۔ بچے صرف اسی قسم کے لباسوں کو پسند کرتے ہیں۔ خوبصورت اور چست پوشاک بچوں کے کام کی نہیں ہوتی۔ یہ تو محض اس لیے ہوتی ہے کہ اس کے ماں باپ دیکھ دیکھ کر خوش ہوں اور دوسرے لوگوں سے اپنی صفائی کی داد تحسین لے سکیں۔ بچوں کو خوش پوش

بنا کر مائیں بہت فخر کرتی ہیں، لیکن یہ فخر خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے اور فخر ہی فخر میں بچے کی انفرادی ہستی کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسے نمود اور نمائش کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں پلا ہوا بچہ بڑا ہو کر عمر بھر نمائش ہی کا غلام اور رسم ہی کا پرستار بنا رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس بات کو کسی خاص طبقے میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو، لیکن یہ وضع زیادہ دیر تک اچھے نتیجے نہیں پیدا کر سکتی۔

مرد اور عورتیں بعض سماجی ضرورتوں اور فیشن کی رسموں کے پیش نظر خاص خاص لباس پہنتے ہیں اور انھیں اپنی کامیاب زندگی کے لیے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ فیشن پرستی اور تہذیب نوازی کے نشے میں سرشار ہو کر بچوں کو بھی اپنے خیالات کا غلام بنا لیں۔ یہ فیشن کی زرّین قبائیں انھیں راس نہیں آتیں۔ ان کی دنیا ہماری دنیا سے مختلف ہے۔ ان کی سماج ہماری سماج سے الگ ہے۔ وہاں نظر کے فریب کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ وہاں بناوٹ اور تصنّع کی کوئی جگہ نہیں۔

جوں جوں ہم پوشاک کے مسئلے پر غور کرتے ہیں، ہمیں خوش پوشی کا نظریہ زیادہ عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ خوش پوشی ایک امر اضافی ہے۔ اس کے متعلق نظریے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ آج سے ایک ہزار برس کی خوش پوشی کا نظریہ آج سے بہت مختلف تھا۔ اس سے کئی ہزار برس پہلے اچھی اچھی کھالیں پہننا خوش پوشی میں داخل ہوتا تھا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص سخت سا کالر زیب گلو کیے ہے۔ یہ ڈر ہے کہ اس میں شکن نہ آنے پائے۔ اس لیے گردن پوری طرح سے تنی ہوئی ہے، جسم پر نہایت چست قسم کا سُوٹ ہے، جو ہوا کی موج کو جسم سے نہیں چھونے دیتا۔ سر پر ٹیڑھی سی کالے رنگ کی انگریزی ٹوپی ہے اور اُسے دیکھ کر ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ کیسا خوش پوش آدمی ہے، لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص ڈھیلے

ڈھالے کپڑوں میں ملبوس ہے اور اس کے کپڑے کسی فیشن کے پیشِ نظر نہیں، بلکہ آرام اور سہولت کے خیال سے تیار کیے گئے ہیں، تو اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں کی جاتی ہیں؛ قسم قسم کے آوازے کسے جاتے ہیں۔ فیشن باختہ انسان محض لباس کی وجہ سے اس انسان سے بھی نفرت کرنے لگتے ہیں۔

لڑکیوں کے لباس کا مسئلہ اور بھی زیادہ اُلجھا ہوا ہے۔ موجودہ تہذیب نے ان کی پوشاک کو بہت نازک اور پیچیدہ بنا رکھا ہے۔ اس کی سلوار یا ساری وقت کے فیشن کے بالکل مطابق ہونا چاہیے۔ قمیض کا آستین اتنا تنگ کہ پہننا بھی مشکل اور اُتارنا بھی مصیبت۔ اگر کوئی لڑکی اپنی سہولت کا خیال کرکے اپنا کپڑا آپ تیار کرتی ہے، جو موجودہ فیشن سے کسی قدر مختلف ہے، تو کہا جاتا ہے، یہ لڑکی بڑی پھوہڑ ہے، گنوار ہے۔ پہننے کا سلیقہ تو اُسے آتا ہی نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ جدید تہذیب میں رنگی ہوئی لڑکیاں اُسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں۔ یہ نوبت کیسے آئی؟ کبھی آپ نے بھی غور کیا؟ یہ سب کچھ ہمارا اپنا کیا ہوا ہے۔ ہم اپنے جمالیاتی ذوق کی خاطر بچوں کو بنانے اور سنوارنے میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھتے۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ پڑوسی اور پڑوسنیں اور دوسری ملنے والی عورتیں ہمارے بچوں کی، گویا ہماری صفائی اور سنگار کی داد دیں اور اس طرح سے ہم بچوں کو ایک خاص ڈھب پر لے آتے ہیں۔ ان میں ایک نہایت لطیف اور نازک جذبہ پیدا کر دیتے ہیں، جو ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ بات پرورش کے اصول کے سخت خلاف ہے۔ اس سے ہم نہ صرف یہ کہ لڑکیوں کے مستقبل کے لیے ایک بڑی مشکل پیدا کر دیتے ہیں، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی جن کی مالی حالت کچھ کمزور ہوتی ہے، اس پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بچپن میں اُنھیں سادہ، کم قیمت کپڑے پہنانا چاہییں، جو ان کی سہولت کو پیشِ نظر رکھ کر تیار کیے گئے ہوں۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری زندگی

اب قدیم زمانے کی طرح تنہا آدمی کی سی زندگی نہیں ہے۔ اب ہماری زندگی ایک نہایت وسیع سماج کے فرد کی زندگی ہے۔ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارا دوسروں پر بھی اثر پڑتا ہے۔ ہمیں اس بات کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ ہم پر دوسروں کا اثر پڑتا ہے۔

ہماری بعض بہنوں کا اچھا پہننے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ ہم اگر اپنے ملک کی گھریلو زندگی پر غور کریں، تو معلوم ہوگا کہ نوّے فی صدی عورتیں آمدنی کے کم ہونے کی وجہ سے اپنے منشا یا سماج کے منشا کے موافق کپڑا نہیں پہن سکتیں اور ان کی زندگی مسلسل پریشانی ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی خود ساختہ پریشانیوں کو دُور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بچوں کے لباس کو فیشن کی غرض سے نہیں، بلکہ سہولت اور عافیت کے خیال سے تیار کرائیں۔ ہماری بہنوں کو بہت سے کام انجام دینا ہیں اور یہ کام لباس سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ انھیں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ اگر بچے صحت مند اور توانا ہیں، تو کوئی سا لباس پہن لیں، انھیں خوبصورت معلوم ہوگا۔ لیکن اگر توانائی ایسی نعمت سے محروم ہیں، تو گویا ہر چیز سے محروم ہیں۔ چست سے چست اور حسین سے حسین لباس بھی اُنھیں خوش وضع نہیں بنا سکتا۔ لباس کی چستی اور بات ہے اور خوبصورتی اور بات۔ خوبصورتی توانائی کا نام ہے اور چستیِ لباس، فیشن پرستی کا نام اور ان دونوں میں فرق بڑا ہے۔

بچوں کو مجبور کرنا کہ رسموں کی پابندی کریں اور اُنھیں اس ڈھب پر لانا کہ نمود و نمائش پر فخر کریں، بڑی ہی مضحکہ خیز بات ہے۔ ہمیں فیشن کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں لباس کے معاملے میں بچوں کی خوشی، آرام اور سہولت کا خیال رکھنا چاہیے۔ بچوں کی سہولت کو فیشن کی بڑی سے بڑی قیمت پر بھی نہیں دینا چاہیے۔ نمائش کا خیال رکھنا بچوں کے لیے کبھی

آرام وہ نہیں ہوتا۔ بچے کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی سادگی ہوتی ہے۔ اس کے دماغ میں ایک خاص قسم کا شعور ہوتا ہے، ان کا ہمیں احترام کرنا چاہیے۔ بچوں کو ہر حالت میں فیشن پرستی کے تصنع سے آزاد رہنا چاہیے۔ آزاد روحوں کی نشو و نما کے لیے ہر ممکن اور بے ضرر آزادی بہم پہنچانا جدید تعلیم کا منشا ہے۔ لباس اور اس قسم کی اور باتوں میں جو خالصۃً بچوں کی انفرادیت سے تعلق رکھتی ہیں، بچوں کو پابند کر دینا ان پر ظلم کرنا ہے اور ان کی نشو و نما میں رکاوٹ پیدا کرنا ہے۔

ریفریشر کورس کاہنہ نو

حضور وزیر تعلیم کی تشریف آوری

[تعلیمی کانفرنسوں کی رپورٹیں ہم ذیل میں شائع کر رہے ہیں۔ اس قسم کی کارروائیاں
ہم بصد شوق قبول کریں گے، لیکن یہ خیال رہے کہ اگر قارئین انھیں قریبی اشاعت
میں دینا چاہیں، تو یہ مہینے کے پہلے ہفتے میں ہمیں پہنچ جانا چاہییں۔ ایڈیٹر]

تحصیل لاہور حلقہ وسطی کے مدرسین کا ریفریشر کورس مورخہ ۱۵ر جولائی تا ۱۹ر جولائی ۱۹۳۹ء زیر نگرانی بخشی سنسار چند صاحب اے ڈی آئی فار پی ٹی منعقد ہوا جس میں مدرسین ڈسٹرکٹ بورڈ مدارس اور اس کے علاوہ دوسرے امدادی اسکولوں کے مدرسین کو بھی بلایا گیا تھا چنانچہ مغلپورہ اور اچھرہ کے پرائیویٹ اسکولوں کے اساتذہ بھی شریک ہوئے۔ ریفریشر کورس کے دوران میں بخشی صاحب نے نہایت محنت اور قابلیت سے شرکائے کورس کو تعلیم جسمانی کی ضرورت، اہمیت اور مقاصد ذہن نشین کرائے۔ ورزش جسمانی کے اصول و قواعد اور طریق کار کے متعلق مدلل، مفید اور دلچسپ لیکچر ارشاد فرمائے اور عملی تربیت کے لیے تمام مدارج کی مشقوں اور کھیلوں کی اس صفائی سے مشق کرائی کہ بوڑھے بوڑھے مدرسین نے بھی اُن میں نہایت دلچسپی ظاہر کی۔ اس کے علاوہ بخشی صاحب نے تعلیم بالغاں کے افادی پہلو پر بھی لیکچر دیے۔ ٹریننگ کے دوران میں پنڈت رام جی لال صاحب اے ڈی آئی، علاقہ بھی وہیں مقیم رہے اور مدرسین کے ساتھ روزانہ اُن کی تعلیمی مشکلات اور اُن کا حل سوچنے میں رہنمائی فرماتے رہے۔ جناب بیدی صاحب ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول کاہنہ نو نے بھی ہمیں کافی حد تک اپنے تجربات سے مستفید فرمایا ـــــــ مگر جس امر نے اس کورس کو

امتیازی شان عطا کرکے دوسرے کورسوں سے ممتاز کیا۔ علاوہ حضور وزیرِ تعلیم کی تشریف آوری تھی۔ آپ نے مورخہ ۱۸ر جولائی ۱۹۳۹ء کو قدم رنجہ فرمایا۔ اس تقریب کی اہمیت، جلالت اور افسران تعلیم کی مستعدی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس تقریب میں شمولیت کے لیے تین سو سے زائد مدرسین اور دو سو خواندہ بالغ جمع ہو گئے اور حضور ممدوح کا استقبال کیا۔ آپ ٹھیک آٹھ بجے بمعیت مسٹر ایس ایم شریف انسپکٹر لاہور ڈویژن تشریف آور ہوئے اور خواندہ بالغوں کا معائنہ فرمایا۔ اس موقع پر آپ کے فوٹو لیے گئے۔ بعد ازاں آپ اسٹیج پر رونق افروز ہوئے۔ جس پر آپ کی خدمت میں متعدد سپاس نامے پیش کیے گئے۔ میر خورشید حسن ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع لاہور نے مختصر رپورٹ بابت ترقی تعلیم بالغان ضلع لاہور پر پڑھی۔ اس کے بعد آپ نے حاضرین کو بالعموم اور کیمپرز کو بالخصوص تعلیم بالغاں کے موضوع پر مخاطب فرمایا اور حاضرین سے اپیل کی کہ اس سال ضلع لاہور میں کم از کم دس ہزار بالغوں کو خواندہ بنایا جائے۔ آپ نے ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب ضلع لاہور کی رپورٹ پر اظہارِ خوشنودی فرمایا اور ان کو اور ان کے عملہ کو مبارک باد دی۔ اس موقع پر مدرسین کے علاوہ ہر دو ڈپٹی انسپکٹر صاحبان، ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب اور ضلع کے تمام اے ڈی آئی صاحبان اور گرد و نواح کے معززین بھی موجود تھے۔

مورخہ ۱۹ر جولائی ۱۹۳۹ء کو پھر جناب باوا برکت سنگھ صاحب ڈپٹی انسپکٹر اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب تشریف لائے اور ڈرل کی نمائش کا ملاحظہ فرمانے کے بعد اور مختصر سی تقریر ارشاد فرما کر کورس کو ختم کیا۔ آخر میں اپنے تمام ساتھیوں کی طرف سے بخشی صاحب کا ان کی مروت، حسنِ سلوک اور خوش اخلاقی کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ والسلام

خاکسار عبدالسلام قریشی

سکرٹری ریفریشر کورس کاہنہ نو ضلع لاہور

کوٹ ادّو میں تعلیمی کانفرنس

مورخہ ۲، ۳، ۴، اگست ۱۹۳۹ء کو بمقام کوٹ ادّو ضلع مظفرگڑھ میں سب ڈویژن کوٹ ادّو کے مدرسین کا جو ریفریشر کورس زیرِ اہتمام شیخ رب نواز صاحب انصاری بی اے ، اے، ڈی، آئی علاقہ منعقد ہُوا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہر روز دو اجلاسوں میں لیکچرز ہوتے رہے اور رات کے وقت کا بیشتر حصّہ مشاعرے، ڈرامے اور گانے میں صرف ہوتا رہا۔

۲، ۳، اگست کی صدارت پنڈت ہریش چندر صاحب بالی ڈپٹی انسپکٹر صاحب بہادر فرماتے رہے اور اپنے خیالات زریں ارشاد فرما کر مدرسین کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیا۔ صاحب موصوف کے لیکچرز مدرسہ میں ضرورت دعا، خدائے قدوس کی وحدانیت، معلم کے علاوہ اخلاق و فرض شناسیٔ مدرس اور ہر آن مستعدی و خدمتِ خلق پر مشتمل تھے۔ مدرسین بہت محظوظ اور مستفیض ہُوئے اور صاحب موصوف کے خیالات نے مدرسین کی رہنمائی کا کام کیا۔

جناب اے ڈی آئی صاحب علاقہ کی مختلف ہدایات مدرسین کے لیے نہایت فائدہ مند ثابت ہوئیں۔ خاص کر مضمون نگاری کا اچھوتا اور نرالا طریقہ جو بچوں کو آسانی سے سکھایا جا سکتا ہے، قابلِ ستائش تھا۔

دیگر اصحاب نے بھی مختلف موضوعات پر اپنی اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان مدارس کے طریقہ ہائے تعلیمی وغیرہ کے متعلق لیکچرز بھی ہوتے رہے، جو بہت ہی کارآمد تھے۔

ڈرامہ: علم اور جہالت کا ڈرامہ مڈل اسکول دائرہ دین پناہ کے طلبہ نے ادا کر کے پبلک اور مدرسین سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

مشاعرہ : اگرچہ کافی احباب نے مشاعرہ میں حصہ لے کر پبلک اور مدرسین کو مسرور
اور محظوظ کیا۔ مگر کشفی صاحب کی نظم مدرسین کے لیے سبق آموز تھی اور شعریت و موسیقیت
سے لبریز تھی۔

ڈرل و میچز : پرائمری اسکول کوٹ ادو کے کمسن بچوں نے ڈرل دکھا کر اپنی چستی
اور چالاکی کا اسقدر مظاہرہ کیا کہ سب لوگ انگشت بدندان تھے۔ مدرسین اور گورنمنٹ ہائی اسکول
کے طلبہ کے درمیان فٹ بال و والی بال کے مقابلے ہوئے۔ مدرسین کامیاب ہوئے۔

اس تمام کامیابی کا سہرا دیوان دھرم چند صاحب ڈی آئی اور اُن کے رفیق کار شیخ
رب نواز صاحب انصاری اے ڈی آئی علاقہ کے سر ہے۔ ہر دو اصحاب مستحق مبارک باد ہیں

دتہ رام ہیڈ ماسٹر پرائمری اسکول کوٹ ادو
سکرٹری ریفریشر کورس

اشتہار

تخت طاؤس

مصنّفہ

مولوی محمد عبداللطیف خان کشتہ قادری

یہ کتاب مولانا کشتہ قادری کی ہفت سالہ تخلیقی و تفتیشی مساعی کا نتیجہ ہے۔ تختِ طاؤس عہدِ مغلیہ کی زرگری، جواہر تراشی و خوش مذاقی کا مرقع تھا اور اس کی صنعت، صنعتِ ایران و ہندوستان کا ایک دلآویز سنگم تھی جس کی زیارت کے لیے دُور دُور کے ملکوں کے لوگ صعوباتِ سفر ہنسی خوشی برداشت کر کے آتے اور تازگیِ نظر و تفریحِ قلب و تحیر کا پرشاد لے کر جاتے اور یہ تبرک مدتِ دراز تک ان کو تر زبان و خوش بیان رکھتا تھا۔ کتاب ہذا اسی بے مثل تخت کے وقائع تاریخی پر مشتمل ہے۔ حقیقتاً اس تخت کے پردے میں ایشیائی دماغی لطافتوں کے سینکڑوں مرقعے چھپے ہوئے تھے، جن کو منظرِ عام پر لا کر مولانائے موصوف نے ملک و قوم پر ایک زبردست احسان کیا ہے اور اُن کی یہ کد و کاوش قابلِ شکر گزاری ہے۔

ہمارے یہاں کی بہت کم تاریخی کتب ایسی ہیں، جن میں وسعتِ مطالعہ، غور و تحقیق، تفتیش، تنقید، علمی و منطقی استدلال و آزادہ خیالی سے کام لیا گیا ہو اور اُن کے مولفین و مصنفین نے روایت و درایت کی علمی جانچ پڑتال کی ہو۔ اپنی طبیعت سے کسی نتیجے پر پہنچے ہوں۔ پیچیدہ مسائل کو تقسیم و تحلیل کرتے ہوئے کوئی انکشاف کیا ہو اور اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھا کر اس طرح ترتیب دیا ہو کہ اُن کی اصلی حالت نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مگر پیشِ نظر کتاب تاریخ "تختِ طاؤس" ان تمام اوصاف سے متصف ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

دیہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لئے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس کا مضمون حال ہی میں ورنیکلر فائنل کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لیے مخصوص ہوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر کوئی جامع کتاب نہ تھی۔ طلبہ کی اس دقت کا احساس کرتے ہوئے زرِ کثیر صرف کر کے مجوزہ سکیم کے عین مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ بہ سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب، برائے جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے، جس کی عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے اور ہر امر کو روزمرہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ تصاویر سے واضح کیا گیا ہے اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے۔ سلسلہ ہذا طلبہ کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔ اس کے مطالعے سے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان و دیگر سائنس کے مدرسین اصحاب اپنے مدارس میں جاری کرا کے جہاں ہمیں ممنون و مشکور فرمائیں گے وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبودی میں بھی خوشی محسوس کریں گے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت ۵ آنے ۴ پائی
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	〃 ۵ 〃 ۲ 〃
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	〃 ۷ 〃 ۱۰ 〃
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	〃 ۱۴ 〃 ۲ 〃

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۶ر
۲	״ ״ دوسری ״ ״	۷ر۴ پائی
۳	״ ״ تیسری ״ ״	۹ر۹ ״
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر
۵	״ ״ دوم	۳ر۷ ״
۶	״ ״ سوم	۷ر
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر
۸	״ ״ دوم	۳ر۷ ״
۹	״ ״ سوم	۷ر
۱۰	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲ر۹ ״
۱۱	״ ״ نمبر ۲	۳ر۱۰ ״
۱۲	״ ״ نمبر ۳	۲ر۵ ״
۱۳	انوار سہیلی کے انمول موتی ״ ״ حصہ ۱ ״ ״	۲ر۸ ״
۱۴	״ ״ حصہ ۲ ״ ״	۳ر۱۰ ״
۱۵	״ ״ حصہ ۳ ״ ״	۲ر۵ ״
۱۶	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ اوّل ״	[illegible]ر۷ ״
۱۷	״ حصہ دوم ״	۸ر۱۱ ״
۱۸	״ حصہ سوم ״	۷ر

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۹	کام کی باتیں حصہ اوّل	۳ر۹ پائی
۲۰	״ ״ حصہ دوم	۲ر۳ ״
۲۱	قصص ہند حصہ اوّل	۳ر۲ ״
۲۲	״ حصہ دوم	۳ر۸ ״
۲۳	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۲۴	حسینہ اور وحشی . . .	۱ر۵ ״
۲۵	شہزادہ مہربان	۶ر۲ ״
۲۶	راما سیتا	۱ر۱۰ ״
۲۷	جادو کا مٹکا مسٹر رلیا رام	۳ر
۲۸	دروپدی	۱ر۸ ״
۲۹	مہاراجہ رنجیت سنگھ . .	۶ر۴ ״
۳۰	خلیفہ ہارون الرشید .	۴ر
۳۱	راجہ اشوک	۵ر
۳۲	مہارانا پرتاپ	۲ر۱ پائی
۳۳	شہاب الدین شاہجہان .	۱۰ر۲ ״
۳۴	شیر شاہ سوری . . .	۱۱ر۲ ״
۳۵	نصیر الدین ہمایوں . . .	۱۰ر۲ ״
۳۶	اورنگ زیب عالمگیر .	۹ر۲ ״
۳۷	شہاب الدین غوری . . .	۸ر۲ ״
۳۸	سلطان علاؤ الدین خلجی . .	۱۱ر۲ ״
۳۹	فیروز الدین تغلق	۳ر

اشتہار

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۰	نورالدین جہانگیر . . .	۲ر۳ پائی
۴۱	امیر تیمور	۲ر۷ 〃
۴۲	پرتھوی راج	۲ر۷ 〃
۴۳	محمودِ غزنوی	۲ر۶ 〃
۴۴	مصر کی داستان . .	۴ر
۴۵	جاپان کی کہانی . .	۳ر۶ 〃
۴۶	چین کی کہانی . .	۳ر۶ 〃
۴۷	مستورات چین وجاپان .	۴ر
۴۸	ایران کی کہانی . . .	۳ر۶ 〃
۴۹	ایشیائی روم	۲ر۷ 〃
۵۰	ٹرکی (یورپی روم) . . .	۲ر۷ 〃
۵۱	لنکا	۱ر۱۱ 〃
۵۲	بصرہ وبغداد	۵ر
۵۳	یونان	۲ر
۵۴	تین سوال	۲ر۷ 〃
۵۵	امرت ورشا	۳ر۱۰ 〃
۵۶	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبرا داؤد بادشاہ	۳ر۹ 〃
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں حصۂ اول	۳ر۹ 〃
۵۸	〃 〃 دوم	۴ر۵ 〃
۵۹	خوفناک خواب	۲ر
۶۰	ہیرالال	۲ر۶ 〃
۶۱	دولت کی پٹاری . . .	۲ر۱ 〃
۶۲	سادھو کی چکی . . .	۲ر
۶۳	نیلا باز	۲ر۱۱ پائی
۶۴	بہادر شہزادہ	۲ر۱ 〃

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۶۵	جوتی موتی	۲ر۱۰
۶۶	جواہرات کا خزانہ	۳ر۷
۶۷	پھوا اور سونا ہُوا (باتصویر)	۲ر
۶۸	علی بابا چالیس چور	۴ر
۶۹	علاؤالدین وعجیب و غریب لیمپ	۴ر۶
۷۰	ملا دو پیازے کا سفر . . .	۳ر
۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۷۲	نیشاپور کا سوداگر	۲ر۱۱
۷۳	پرستان کا موچی	۳ر
۷۴	سندر پیاری	۳ر
۷۵	چاندی کی کنجی	۳ر
۷۶	سلکِ جواہر نمبرا (حکمرانی کا گر)	۲ر۶
۷۷	〃 〃 نمبر۲ (اوج وپستی)	۱ر۶
۷۸	〃 〃 نمبر۳ (شہیدِ الفت)	۱ر۶
۷۹	سلکِ جواہر۔ مردِ میدان	۱ر۶
۸۰	〃 〃 نیک وبد	۱ر۹
۸۱	〃 〃 عیب وہنر	۱ر۴
۸۲	〃 〃 جہاں گرد	۱ر۶
۸۳	〃 〃 جواب باصواب	۱ر۱۰
۸۴	〃 〃 سخاوت کی انتہا	۱ر۲
۸۵	〃 〃 حسنِ تدبیر	۱ر۶
۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہریت	۱ر۳
۸۷	ڈرامہ غم خوار عالم . . .	۱ر[illegible]
۸۸	مہاراجہ بکراماجیت اور اس کا تخت	۱ر۱

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

NATIONAL MUSLIM ... جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ... DELHI

نمبر (۸)	نومبر ۱۹۳۶ء	جلد (۶)

فہرستِ مضامین

۱	ایڈیٹوریل		۱
۲	ضروری اعلان		۴
۳	مضمون نویسی بذریعہ افسانچہ	شیخ خادم محی الدین	۶
۴	واردھا کی تعلیمی اسکیم پر ایک نظر	سیّد محمد عبداللہ، ایم اے	۱۴
۵	ذخیرۂ الفاظ	نذیر احمد، ایم اے	۲۲
۶	ہٹلر کا نظریہ اور جرمن نصابِ تعلیم	محمد انور قریشی	۲۳
۷	کھیل کی اہمیت	جگن ناتھ آزاد، بی اے	۴۱
۸	ڈالٹن پلین	محمد عبدالغفور خاں	۴۵
۹	پنجاب کی تعلیمی خبریں	ـــــــــــ	۵۴

ایڈیٹوریل

رسالہ ہذا اپنی عمر کے قریبًا چار سال پورے کرچکا ہے اور اس اشاعت کے ساتھ اس کا نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس عرصے میں صوبے کی جو علمی اور تعلیمی خدمات اس رسالے نے انجام دی ہیں، وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن ہمارے پیشِ نظر ابھی اور مرحلے بھی ہیں جنھیں سر کرنے کی غرض سے ہمیں اپنے قارئینِ کرام کی امداد درکار ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی چیز تکمیل کی حد تک نہیں پہنچ سکتی۔ اگر آج آپ کسی کام کے انجام دینے میں بلندی کی ایک منزل پر پہنچتے ہیں، تو اس کے فورًا بعد دوسری بلندی سامنے آتی ہے۔ اسی طرح تیسری اور پھر چوتھی۔ غرض کوششوں کے سلسلے کا نام ہی زندگی ہے ؎:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی

باوجودیکہ رسالے کے کارپردازوں نے اس کی ہستی کو قائم رکھنے اور اُس کے علمی اور ادبی معیار کو بلند کرنے میں ہر ممکن کوشش کی لیکن پھر بھی بعض اصحاب یہ شکایت کر رہے ہیں کہ اس کی زبان سلیس نہیں۔ اس کے خیالات ٹھوس ہیں اور یہ کہ چونکہ عام طور پر رسالہ اُردو دان اصحاب، بالخصوص ورنیکلر مڈل اور پرائمری کے مدرسین کے لئے مخصوص ہے، اس لیے اُسے زبان اور خیالات کے لحاظ سے عام فہم ہونا چاہیے۔ اسی کے ساتھ بعض حضرات کا مطالبہ ہے کہ رسالے کی زبان اُردو نہیں، بلکہ "ہندوستانی" ہونی چاہیے۔ جیسے کہ آجکل ریڈیو میں سنائی دیتی ہے۔ زبان کے متنازعہ فیہ مسئلے کو برطرف رکھتے ہوئے کہ اس بحث کی یہاں گنجائش نہیں، ہم صرف اتنا کہیں گے کہ وصول شدہ مضامین میں سے جو بھی رد کیے جاتے ہیں، وہ زیادہ تر اسی

بنا پر قبول نہیں کیے جاتے کہ وہ یا تو نامکمل ہوتے ہیں یا ان کے خیالات میں کسی قسم کی کمی ہوتی ہے اور وہ پختگی کی حد تک نہیں پہنچے ہوتے۔ ورنہ عام طور پر مضمون لکھنے والے اصحاب زیادہ تر وہی ہیں، جنھیں درس و تدریس یا تعلیم سے سروکار ہے۔ زبان کے اعتبار سے اکثر مضامین ایسے وصول اور درج ہوتے رہے ہیں۔ جن کی زبان عالمانہ نہیں، تو علمی ضرور ہے۔ یہی اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ اس معیار کی زبان عام طور پر تحریر میں استعمال ہو کر قبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور اُسے پڑھنے والوں کا بیشتر حصّہ سمجھتا ہے۔ اب اگر آپ اس معیار سے ہٹ کر عام بول چال کی زبان کو ترجیح دیتے ہیں، تو ہمیں نمونے کے طور پر ایسے مضامین لکھ بھیجیے ہم بخوشی اُنھیں رسالے میں جگہ دینے کو تیار ہیں۔ یہ لحاظ رہے کہ مروّجہ الفاظ اور اصطلاحات کے بجائے، جنھیں عام طور پر قبول اور استعمال کیا جا رہا ہے، اپنے مضامین میں خواہ مخواہ ایسے غیر مانوس الفاظ کی بھرتی نہ کیجیے، جنھیں نہ تو ملک کا ایک طبقہ سمجھ سکے اور نہ دوسرا۔

یہ تو تھا رسالہ کی ظاہرا صورت کا معاملہ۔ رہا اس کی باطنی ہیئت کا مسئلہ۔ تو اس کے لیے ضرورت ہے کہ رسالے میں بعض پسندیدہ اور دلچسپ خدوخال کو داخل کیا جائے۔ مثلاً تعلیمی خبروں اور مدارس کی سرگرمیوں اور اُن کے خاص جلسوں اور کانفرنسوں کے حالات جن کے متعلق گزشتہ ماہ یعنی اکتوبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ ہم ایسی رپورٹوں کو خوشی کے ساتھ درج کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ وہ ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں ہمیں پہنچ جائیں۔ ہم اس پر اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ اُنھیں اختصار کے ساتھ لکھا جائے۔ ان چیزوں کے علاوہ اگر مدرّس صاحبان اپنے متعلقہ درسی مضامین کے طریقِ تعلیم پر مقالات اور اسباق کے اشارے بھی لکھ کر بھیجنا چاہیں، تو ادارہ کی طرف سے پسند کیے جانے پر اُنھیں رسالے میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اگر بعض موزوں طبع معلّم اور دیگر حضرات جو شاعری کے

میدان میں قدم رکھتے ہیں چاہیں تو کوئی اخلاقی اور ادبی لحاظ سے بلند پایہ نظم بھیج سکتے ہیں۔ دلچسپ معلومات، سائنس کے کرشموں کا حال، بعض تازہ کتب پر تبصرہ اور ان کے علاوہ جدید تعلیمی اور ملکی تحریکوں مثلاً تعلیمِ بالغاں، جدید نفسیاتی معلومات، نئی تعلیم، موجودہ جنگ وغیرہ پر آپ اظہارِ خیالات کر سکتے ہیں۔

کُل جدیدٌ لذیذٌ (ہر نئی چیز لذیذ ہوتی ہے) کا مضمون ہمیشہ سے درست تسلیم کیا گیا ہے۔ دنیا ہمیشہ نئی اور دلچسپ چیز کو ڈھونڈتی ہے۔ اس سے یہ مدعا نہیں کہ قدیم تعلیمی مسائل اور تعلیمی طریقوں پہ جرح و تنقید کے موضوع کو یکسر حذف کر دیا اور مٹا دیا جائے۔ ایسے موضوع ہمیشہ تکرار کے متحمل رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ آپ مدرس یا اوّل مدرّس ہیں، تو بعض تعلیمی مسائل پر ہمیں خطوط لکھا کیجیے جنھیں ہم جنسہ رسالے میں درج کر دینگے۔ اس کے بعد اگر آپ کا مراسلہ ایسا ہے کہ اس پر ردّ و قدح اور تنقید کی گنجائش ہو سکے، تو دوسرے حضرات اسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرینگے۔ اس بحث و مباحثہ کے لیے ایک دروازہ کھل جائیگا اور خیالات کی کانٹ چھانٹ کے بعد ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔ اگر آپ کا جی چاہے، تو ہمیں بعض ایسے واقعات اور مشاہدات لکھ بھیجیے، جن کا پس منظر تعلیمی ہو، یا اگر آپ اپنی ڈائری (روزنامچہ) لکھنے کے عادی ہیں، تو اُسے مزاحیہ رنگ میں پیش کیجیے۔ خود ہنسیے اور دوسروں کو ہنسائیے۔ مدرّس کی زندگی کے دلچسپ اور روکھے پھیکے پہلوؤں پر خوش مزاجی کے ساتھ روشنی ڈالیے۔ یہ اس لیے کہ مدرس ایک خشک روکھی پھیکی زندگی بسر کرنے کا عادی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی روزمرّہ کولھو کے بیل کی سی گردش میں ایک خوش گوار تبدیلی پیدا کی جائے خواہ وہ تھوڑے ہی عرصے کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ قصّہ مختصر، مضامین کی فراوانی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی اصل ضرورت ہے۔ وہ ہے، آپ کی جدّتِ طبع اور کسی موضوع پر آپ کے ذاتی اور انفرادی خیالات کا عکس۔ ورنہ یوں کتابوں میں سے معلومات کا پیمانہ بھر کر پیش کر دینا تو ہر شخص جانتا ہے۔ آئیے، ہم اور آپ مل کر ملک کی علمی خدمت کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

ع۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

ضروری اعلان

موجودہ جنگ } ہمیں آفیسر صاحب اون سپیشل رورل ریکنسٹرکشن پنجاب کی طرف سے ایک پمفلٹ موسومہ بہ "موجودہ جنگ" کا ایک نسخہ موصول ہوا ہے۔ جس میں برطانیہ کے جرمنی کے ساتھ شریکِ جنگ ہونے کی وجوہ بتلائی گئی ہیں اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ پنجاب کا اس جنگ میں حصّہ لینا کیوں ضروری ہے۔ پہلے صفحے پر سر سکندر حیات خاں صاحب وزیرِ اعظم پنجاب کا پیغام ان الفاظ میں درج ہے :-

"ایک خوددار اور خدا ترس قوم کی حیثیت سے صاف صاف اعلان کر دینا ہمارا فرض ہے کہ ہم ان قوموں کے ساتھ ہونگے۔ جن کا مدّعا یہ ہے کہ ملک کے لئے عدل وانصاف اور آزادی کو یکساں طور پر حاصل کریں۔ خواہ کمزور ہوں، خواہ طاقتور"۔ اسی کے ساتھ حضور ملکِ معظم کا پیام درج ہے۔ جس میں ہندوستان کی اس مقصد میں پوری پوری ہمدردی پر اظہارِ مسرّت فرمایا گیا ہے۔ آگے چل کر پولینڈ کے تاریخی اور جغرافیائی حالات اور ہر ہٹلر کے اس پر قبضہ کر لینے کے منصوبوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فرانس اور انگلستان کے اشتراکِ عمل کا ذکر کیا گیا ہے اور بعض ناموران ملک مثلاً ہز ہائینس سر آغاخاں، حضور نظام حیدر آباد دکن، مسٹر گاندھی، مسٹر جناح، ڈاکٹر ٹیگور، پنڈت نہرو کے پیامات اسی مقصد کی حمایت میں درج ہیں۔ وزیرِ اعظم برطانیہ نے ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جو پیغام نشر کیا تھا۔ اس کا ترجمہ بجنسہٖ درج ہے :-

ہمارا ضمیر صاف ہے۔ ہم نے صلح اور امن کے لیے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ جرمنی

کے حکمران کے کسی لفظ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور نہ کوئی قوم اور ملک اس سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے۔اب . . . . . ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس کا خاتمہ کر ڈالیں۔مجھے یقین ہے کہ آپ سب ہمت اور سکون سے کام لے کر اس میں اپنا فرض ادا کریں گے۔"

ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے بھی اسی تاریخ کو جو اپیل نشر کی تھی۔اس کے سلسلے میں اُنھوں نے فرمایا ہے:۔

"ملک معظم کی حکومت اگر اس جنگ میں شریک ہے، تو کسی خود غرضانہ مقصد کے لیے نہیں، بلکہ اُن اصولوں کو برقرار رکھنے کے لیے، جن کا تعلق ساری دنیا کی انسانیت سے ہے اور جن پر تہذیب و تمدّن کی باقاعدہ ترقی کا دارومدار ہے . . . . برطانیہ نے پوری کوشش کی کہ جس مصیبت کا آج دنیا بھر کو خطرہ ہے۔اسے کسی نہ کسی طرح ٹال دے۔مگر بے سُود . . . . ہندوستان قوت اور طاقت کے خلاف آزادی کا ساتھ دے گا اور اس میں وہی حصّہ لیگا، جو دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور قدیم ترین تہذیبوں کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کے شایانِ شان ہے۔"

آخر میں پولینڈ اور اس کے ملحقہ ممالک کا نقشہ بھی شامل کیا گیا ہے۔اگر کسی صاحب کو اس پمفلٹ کی کاپیاں درکار ہوں، تو وہ دفتر کمشنر صاحب اصلاح دیہات لاہور سے مفت مل سکتی ہیں۔

(ادارہ)

مضمون نویسی بذریعہ افسانچہ

از

شیخ خادم محی الدین، لیکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور

(گزشتہ سے پیوستہ)

کردار نگاری

افسانہ نویسی کے لوازمات میں کردار نگاری ایک نہایت اہم چیز ہے۔ مؤثر کردار کے بغیر افسانچہ روکھا پھیکا رہ جاتا ہے اور اس سے تیقن پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ تمام پلاٹ سرتاسر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ انگریزی افسانچہ نگاروں کے بہترین شاہکار وہی ہوتے ہیں جن میں خاص افراد یا کردار کا سراپا اور ان کی نقل و حرکت، افعال و اعمال، ایک زندہ صورت میں نظر آئیں۔ ایسے افسانچے جواہرات کے مول بکتے ہیں۔

سرشتِ انسانی کے علم کے بغیر، آپ کردار نگاری کا حق ادا نہیں کر سکیں گے۔ یہ علم ناول وغیرہ پڑھ کر حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ مردوں اور عورتوں سے میل ملاپ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ پس اگر آپ ایک کامیاب افسانچہ نویس بننا چاہتے ہیں، تو ان جگہوں میں جایا کیجیے، جہاں مرد عورتیں جمع ہوتی ہیں۔ مثلاً بازار، باغات، تھیٹر، سینما، ریل کا مسافر خانہ، موٹر اور لاری کا اڈا، ہوٹل وغیرہ۔ اس کے علاوہ موجودہ مشہور آدمیوں کے حالات کو اخبار، رسالوں میں پڑھا کیجیے۔ عدالت کے کمرے میں یا تھانے میں گشت لگائیے۔ شراب خانہ کی سیر اسی نیت سے کیجیے کہ وہاں شرابیوں کی گفتگو سنی جائے۔ کسی سرائے میں چلے جائیے

اور بھٹیاروں یا بھٹیاریوں کی بات چیت کی طرف توجہ کیجیے۔ خود اپنے ہی قریبی رشتہ داروں کو بغور دیکھیے اور ان سے ملیے۔ غرض انسانی میل جول کے مختلف مواقع تلاش کر کے، لوگوں سے مل کر فقط یہی معلوم نہ کیجیے کہ ان کا طرزِ عمل کیا ہے، بلکہ یہ بھی کہ خاص یا عام حالات میں وہ کیوں ایسا عمل کرتے ہیں۔ لوگوں کے چلن کے متعلق اپنی ڈائری میں نوٹ لکھیے اور اپنی ایک دو یادداشت کا باہم مقابلہ کیجیے۔ مثلاً شادی غمی کی حالت میں عوام کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے اور خواص کا کیا۔ سینما میں جاٹ گنوار اور بازاری لوگ کیا حرکات کرتے ہیں اور شہر کے شائستہ لوگ کیا روش اختیار کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اشارات سے کام لو۔ زمانہ حال کا مصنّف، اپنے افرادِ افسانہ کو اس تفصیل سے پیش نہیں کرتا۔ جیسے اُنیسویں صدی کا افسانہ نگار کرتا تھا۔ شررؔ اور نذیر احمد مرحوم کے ناولوں میں افراد کا حال، (لباس، وضع قطع وغیرہ) جس صراحت کے ساتھ درج ہے، آج کل کے افسانوں میں اتنی وسعت کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔ ناظرین آجکل زیادہ خود رائے واقع ہُوے ہیں اور افسانے کے ہر پہلو کے متعلق خود اپنی آزادانہ رائے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پس مصنّف کی حیثیت سے آپ بھی اپنے ناظرین کے ساتھ فقط اشاروں سے کام لیں۔ مثلاً فرض کیا کہ آپ کے افرادِ قصّہ میں سے ایک پست قد آدمی ہے۔ ہلکی مونچھ رکھتا ہے اور بے چینی اس کے بشرے اور رویے سے عیاں ہے۔ پنس نیز قسم کی عینک لگاتا ہے، جو کمانی کے ذریعے ناک پر سے آسانی سے اُتاری اور چڑھائی جا سکتی ہے۔ ایسے فرد کو قصّے میں پیش کرنا ہو، تو پہلے اس کا مناسب نام رکھیں۔ پھر اُسے کچھ ایسے الفاظ میں بیان کریں:۔

"ت۔ تم میرا م۔ مطلب نہیں سمجھیں،" مرزا منّے ذرا ہکلاتے ہُوے اور عینک اُتار کر صاف کرتے ہُوے بولے۔ "یعنی مجھے یہ کہنا ہے کہ ل۔ ل۔ لوہاری دروازے سے ت۔ ت

تانگہ نہیں، توٹ۔ٹ ٹیکسی تو مل ہی جائیگی۔سوار ہو کر دریا کی ـــــ س۔س سیر کر آیئے
بیگم مٹنے اپنی آستین چڑھا کر کہنے لگیں۔"تم تو سدا ایسی باتیں کیا کرتے ہو جنھیں
تن بدن میں آگ ہی تو لگ جائے۔نوج میں کیا اس عمر میں بے پردہ دریا کی سیر کو نکلونگی
وہاں جا کر شرم سے ڈوب نہ مرونگی؟ سیر کو جائیں نئی نویلی لگائیاں، جو ساڑھی پہنے، پوڈر
لگائے، تیتریاں بنی اُڑتی پھرتی ہیں۔لو صاحب! شریف بہوؤں کی اچھی مٹی پلید کرنے
(بیگم مٹنے کے جواب سے اس کے کیرکٹر کا اندازہ کر لیجیے)۔

مرزا مٹنے نے کھانس کر عینک لگائی اور لگے ایک ہاتھ سے اپنا سر کھجانے۔
ہاتھ کی اُنگلیاں اچکن سے آویزاں گھڑی کی زنجیر سے دست و گریباں ہو رہی تھیں۔

اس مکالمے کے ذریعے میاں بیوی کی تصویر صاف دکھائی دے رہی ہے لیکن
براہِ راست دونوں کے خصائص مطلق بیان نہیں کیے گئے۔اس بالواسطہ طریق سے آپ
کی کسی چیز کا حال بیان کر سکتے ہیں۔مثلاً رنگ روپ، لباس، عمر، ڈیل ڈول، بال وغیرہ
آپ تصویر کشی جانتے ہوں تو مرزا مٹنے کا سراپا تصویر کے ذریعے دکھا سکتے ہیں، لیکن ال
نے بھی دونوں میاں بیوی کی سرشت کو واضح کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض افسانوی ا
زندہ صورت میں ہمارے سامنے پر مسلّط ہو جاتے ہیں۔کیونکہ ان کی تصویر میں ایک سر
سے دوسرے سرے تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔یہاں تک کہ جب آپ کتاب ختم کر لیتے
تو آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے، گویا آپ خود بھی اسی زمانے اور حالات میں سے گذرے ہیں
میں افرادِ قصّہ کو گزارا گیا ہے۔آپ نے شاید ایسی کتابیں مثلاً ابن الوقت، فسانۂ مبتلا، و
کئی سال گزرے کہ پڑھی ہونگی۔لیکن کیا اب آپ ان افسانوں کے افراد کا تصوّر کر سکتے ہیں
یقیناً ان کا خیال کرتے ہی آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہوگا کہ گویا مبتلا، ابن الوقت، نصوح وغیرہ

آپ کے دوست رہ چکے ہیں۔ اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شاید مصنّف نے ان افراد کو اصل زندگی میں سے منتخب کر کے اُنھیں واقعیت کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ یا شاید اس لیے کہ ان افراد میں بعض صفات ایسی موجود ہیں، جنھیں خود آپ اپنی ذات میں پیدا کرنا چاہتے ہونگے۔

مکالمے کے ذریعے کردار نگاری

کسی کردار کو واضح کرنے کا سب سے آسان اور مؤثر ذریعہ مکالمے کا طریق ہے۔ ایک سادہ سا جملہ "میں نہیں جانتا" الگ الگ طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے، جس سے بولنے والے کی ذہنی حالت کا پتہ چل سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کہیگا۔ "میں کیا جانوں؟" دوسرا کہتا ہے۔ "خدا جانے"۔ تیسرا کہتا ہے۔ "میری بلا جانے" وغیرہ۔ کردار نگاری، حرکات وسکنات اور اعمال وافعال کے ذریعے بھی کی جا سکتی ہے۔ دو آدمیوں کو سڑک عبور کرتے دیکھو۔ دونوں الگ الگ طریقوں سے کرینگے۔ چار اجنبی آدمیوں کے قریب جا کر اُنہیں ایک دوست کی طرح مخاطب کر کے دیکھو۔ چاروں کا جواب جداگانہ پاؤ گے۔ اسی طرح اپنے قریب بیٹھے ہُوئے چار آدمیوں کا رویّہ غور سے دیکھو، جبکہ اچانک بارش ہونے لگے۔ چاروں کا طریقِ عمل الگ الگ ہوگا۔ کسی وعظ یا کتھا کے دوران میں مختلف لوگوں کی حالت جُدا جُدا دکھائی دے گی۔ ہر ایک کے چہرے کا اظہار ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔

اس قسم کے اظہار کی جانچ کا جداگانہ طریق اور زیادہ سمجھنا چاہو، تو چار دوستوں کو ایک ہی مضمون کا خط الگ الگ لکھو۔ جس سے یہ ظاہر ہو کہ تم کوئی خاص کام انجام دینا چاہتے ہو۔ خط کے ذریعے اپنی اس مہم یا مجوزہ پروگرام کے متعلق ان کی رائے طلب کرو۔ ہر ایک کا جواب ان کے دماغی تفاوت کا آئنہ دار ہوگا۔ ہر آدمی اپنے خیالات کا اظہار کئی طریقوں سے کرتا ہے۔ مثلاً گفتگو، ذاتی مشاغل، تفریح کی مختلف صورتوں، کتب اور رنگوں کے انتخاب،

موسیقی وغیرہ کے ذریعے۔ ان میں کا ہر طریق، گویا کسی ہیرے کے مختلف چمکدار پہلو ہیں، جن سے کسی شخص کی ذات مرکب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ دو آدمی اپنے تمام خصائص و اطوار وغیرہ کے لحاظ سے شاذ و نادر ہی یکساں ہوتے ہیں۔

کردار نگاری میں اطوار کا انکشاف۔ ہر شخص بعض اطوار کا مالک ہوتا ہے اور ان کا اظہار کرتا ہے۔ خواہ وہ قدرتی ہوں یا مصنوعی۔ بعض اطوار موروثی ہوتے ہیں۔ بعض اس شخص کی سابقہ یا موجودہ کمزوریوں کا پتہ دیتے ہیں۔ بعض غیر ارادی طور پر ظاہر ہوتے ہیں اور بعض پیدا کی ہوئی عادات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بعض آدمی بار بار اپنی زبان کے سرے سے لبوں کو صاف کرتے رہتے ہیں۔ بعض اپنے سر پہ ہاتھ پھیرتے رہتے ہیں۔ بعض اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے رہتے ہیں۔ کوئی عورت کلام کرتے وقت اپنی بھنوؤں کو تنتی ہے۔ کوئی یونہی مسکراتی یا ہنستی رہتی ہے۔ کوئی کندھوں کو اُوپر کی طرف جنبش دیتی ہے۔ اسی قسم کی حرکات بعض بچوں سے سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ خواہ وہ قدرتی ہوں یا تقلیدی۔

جب کسی کہانی میں بہت سے افراد جمع ہو جائیں، تو پڑھنے والا بوکھلا جاتا ہے اور خود مصنّف بھی اُنھیں سنبھال نہیں سکتا۔ تاوقتیکہ ہر فرد کی ایک نہ ایک نمایاں خصوصیت نہ ہو، جو اُس کی گفتگو، حرکات، تراش، خراش وغیرہ کے ذریعے واضح کی جائے۔ جو مصنّف اس میدان میں چلنے کا ماہر ہو، اس کے افراد ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں ہوتے۔

مکالمے کا قدرتی رنگ۔ مبتدی کے لیے مکالمہ نگاری، ایک خاص مشکل کی حامل ہُوا کرتی ہے، لیکن سوچا جائے، تو یہ مشکل بہت جلد آسان ہو جا سکتی ہے۔ مکالمے کو سادگی اور قدرتی طریق سے لکھو۔ یعنی بعینہٖ جس طرح اور جو کچھ لوگ مُنہ سے بولیں۔ اُنھیں الفاظ کو مکالمے میں دہرا دینا چاہیے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مکالمے سے کردار کے افعال صاف عیاں ہوں غیر ضروری

باتیں درج نہ کی جائیں۔ ہر گفتگو قدرتی رنگ میں ہونی چاہیے جس سے کسی فرد کا کیرکٹر یا اس کی سرشت بخوبی واضح ہو سکے۔ اس میں محاوروں وغیرہ کو کھلے طور پر بیدریغ استعمال کرتے جاؤ۔ لمبے لمبے جملوں کے بجائے چھوٹے چھوٹے فقرے استعمال کرو۔ مبتدی افسانہ نویس عموماً اس قسم کے جملے استعمال کرتے ہیں، مثلاً

"ناممکن ہے کہ میں اپنا کام ختم کیے بغیر تمہارے ساتھ جا سکوں"۔ اس طرح کوئی گفتگو نہیں کرتا۔ اس کے بجائے یوں لکھنا چاہیے۔ "میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ مجھے پہلے اپنا کام ختم کرنا ہے"۔ جب تم ایک افسانچہ لکھ کر ختم کر دو، تو اس کے مکالمہ کو بلند آواز سے پڑھو، تاکہ تمہیں افراد کی گفتگو کے لب و لہجے، تلفظ، آواز کے زیر و بم وغیرہ کا اندازہ ہو۔ یہ بھول نہ جانا چاہیے کہ کردار نگاری کا ایک زبردست آلہ، مکالمہ ہے۔

کبھی کسی شخص کا حال بلاواسطہ طریق سے مت لکھو۔ کیونکہ فن کے اعتبار سے یہ معیوب قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ "کمرے میں ایک مکار شخص داخل ہوا" اتنا مؤثر نہیں، جتنا اس شخص کی مکاری کو اس کے عمل یا گفتگو کے ذریعے ظاہر کرنا، یا اس کے بشرہ، خد و خال، حرکات وغیرہ کا بیان کرنا۔

مصنّف کو افسانچہ کے دوران اپنی جنس (مذکر یا مؤنث) کسی جملے سے ظاہر نہ کرنی چاہیے۔ جیسے کہ بعض ناتجربہ کار مصنّف کیا کرتے ہیں۔ بعض الفاظ یا جملے طبقۂ نسواں سے مخصوص ہُوا کرتے ہیں۔ مثلاً نوج، مؤا، قربان گئی، مونڈی کاٹا وغیرہ، خواہ مخواہ بلا ضرورت مصنّف کی طرف سے ان کا اظہار نہ ہونا چاہیے۔ البتہ دو عورتوں کے درمیان مکالمے میں ایسے الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ پہلی صورت میں بہت ممکن ہے کہ تاوقتیکہ تم ایک چابک دست مصنّف یا مصنّفہ نہ ہو، کوئی عورت پڑھنے والی یا مرد پڑھنے والا تم سے چڑ

جائے اور تمہارے افسانچہ کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔ چنانچہ راقم کو اسی قسم کا تجربہ ایک مرتبہ ہو چکا ہے، جبکہ کسی مصنفہ کے ایک اُردو افسانچہ کی ہیئت سے چڑ کر نہ صرف یہ ہوا کہ وہ افسانچہ کتاب میں سے پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا گیا، بلکہ اُس کے باقی ماندہ افسانچوں کو بھی حقارت کے باعث نہیں پڑھا گیا اور کتاب کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا۔

اپنے افراد کا علم مصنّف کو بخوبی ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں ان کے ساتھ ہمدردی ہے۔ ممکن ہے کہ پڑھنے والا مرد یا ناظرات میں سے کوئی عورت تمہارے ہیرو یا ہیروان کی ذات کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنا چاہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ خود تم ایک مصنّف کی حیثیت سے یہ واضح نہ کرو کہ گویا تم ان افراد کے ساتھ ایک زمانہ بسر کر چکے ہو۔ مثلاً افسانچہ کے کسی فرد کو تصوّر میں سیر کرانے لے جاؤ۔ اس سے گفتگو کرو یا بحث کرو، تاکہ تم اُس کے طریقِ عمل کا پورا پورا اندازہ کر سکو۔ اس کے بعد تم اس قابل ہو کہ اس مکمل علم کی مدد سے اپنی اس مخلوق کی نفسیات بخوبی سمجھ سکو۔

افسانچہ کو کسی ایک شخص کے زاویۂ نگاہ سے لکھو اور ناظرین کو مختلف واقعات اور اُن کے اثرات سے آگاہ کرتے جاؤ، جو افراد پر پڑتے ہوں۔

افسانچہ میں ایک اور ضروری چیز اس کی فضا ہے۔ مصنّف کو خود کسی خاص فضا کا تجربہ ہونا ضروری ہے۔ اُسے یا تو کسی خاص مقام کی سیر کرنی چاہیے تاکہ وہاں کے حالات سے پوری واقفیت ہو یا کم از کم اس کا تصوّر اتنا مکمل ہو کہ پڑھنے والا یہی سمجھے گویا مصنف اس فضا کا رہنے والا ہے۔ اس کے بعد اپنے بیان میں واقعیت کا رنگ پیدا کرو جس کے ذریعے قصّے کا پس منظر، کسی خاص مقام کا درجۂ حرارت، وہاں کے رنگ، خوشبوئیں، وقت وغیرہ ظاہر ہوں۔ ان سب چیزوں کا مجموعہ افسانچہ کی فضا ہے۔ مثلاً رومانِ مشرق،

ــدار مشرق، بے لطف مشرق، سرعت مآب مغرب وغیرہ ایسے مرکبات ہیں، جو
فسانچہ کی فضا کا پتہ دیتے ہیں۔

مشقیں

(۱) کسی شخص کے کیرکٹر پر بلاواسطہ طریق پر عبارت لکھو، جو دوسو الفاظ سے
نہ ہو۔

(۲) اسی شخص (مرد یا عورت) کا حال بالواسطہ طریق پر، عمل اور گفتگو کے
یے لکھو۔

(باقی آئندہ)

واردھا کی تعلیمی اسکیم پر ایک نظر

از

سید محمد عبداللہ ایم اے، ڈی لٹ اورینٹل کالج، لاہور

(گزشتہ سے پیوستہ)

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہ اسکیم جن بلند مقاصد کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ ان میں دو یہ ہیں۔ "عام جبری تعلیم کا نفاذ" اور "دستکاری کی بنیادی اہمیت"۔ اب اس کی تیسری خصو[صیت] کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو اِن دو پہلی خصوصیتوں سے بھی زیادہ ضروری اور اہم ہے۔

زمانہ جس روش پر چل رہا ہے۔ اس میں قومی اور معاشرتی ضرورتوں کو ذاتی اور انفرا[دی] ضرورتوں پر ترجیح ہونی چاہیے۔ تعلیم کا تعلق اگرچہ بظاہر افراد سے ہے، لیکن درحقیقت موجو[دہ] معاشرتی نظام میں یہ محض اشخاص کی انفرادی دلچسپی کا معاملہ ہی نہیں۔ بلکہ اس کو قوم، مجموعی معاشرت اور حکومت سے بھی ایک لاینفک ربط ہے۔ یہ اصول آج ہی سے نہیں، بلکہ یونانی فلسفی افلاطون کی کتاب "جمہوریت" کے وقت سے معلوم شدہ ہے اور جیسا کہ ایک مغربی مصنف جیکس[1] نے ظاہر کیا ہے۔ انسان کی حیاتِ اجتماعی کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے ایک ایسا اجتماعی تصورِ شہریت کا اور تہذیب کا پیدا کریں جو دنیا میں محبت، امن، یگانگت اور باہمی ہمدردی کے خیالات کو تقویت دے۔

جہاں تک محکوم ہندوستان کا تعلق ہے۔ اس کے افراد کا فرض یہاں ہی نہیں ختم ہو جاتا کہ ایک قومی نظام تعلیم کے ذریعے عام انسانی ہمدردی اور محبت کا احساس پید[ا]

---

[1] EDUCATION AS A SOCIAL FACTOR.

کیا جائے، بلکہ اس بلند نصب العین تک پہنچنے سے پہلے ہمیں ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو یہ بھی سمجھانا ہے کہ جب تک ہم اپنے حقوق کو بطور انسان اور بطور ایک آزاد مخلوق کے نہ پہچان سکیں گے، اشرف المخلوقات میں ہونے کا دعوٰے نہیں کر سکتے۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے عوام، بلکہ خواص تک بھی آزادی کے اس تصوّر سے بیگانہ ہیں، جو انسان کے شرف اور فضیلت سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہم اپنے ملک کی تاریخ سے ناواقف ہیں۔ ہمیں اپنی موجودہ مشکلات اور ذمّے داریوں کا احساس تک نہیں۔ ملک کی آزادانہ ترقی کی تدابیر و وسائل پر غور و فکر کرنا، تو بجائے خود ہمیں ایک آزاد شہری کے بنیادی حقوق تک سے ناواقفیت ہے اور اگر کہیں تھوڑا بہت خیال اور جذبہ پیدا بھی ہوا ہے، تو وہ اکثر اوقات ذاتیات اور گروپ کے مفاد میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

ہماری موجودہ تعلیم جیسا کہ پروفیسر سیّدین صاحب نے لکھا ہے۔ "ملک کے معاشی حالات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ نہ صرف یہی بلکہ یہ بھی کہ اس کے سامنے کوئی تخلیقی نصب العین نہیں۔ جو قوم کو ابھارے اور آگے بڑھائے" پھر فرماتے ہیں۔ "صورت حال یہ نہیں ہے کہ ہم ایک اچھے خاصے نظامِ تعلیم کی جگہ خواہ مخواہ ایک بالکل نیا نظام جاری کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اصل میں ہم ایک فرسودہ اور بے جان تعلیم کو جو قومی زندگی کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، بدلنا چاہتے ہیں۔"

واردھا اسکیم کے سامنے شہریت کا جو عظیم الشان تصوّر ہے، اس کو واضح کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ خود رپورٹ کے اصل الفاظ یہاں درج کر دیں۔ رپورٹ میں لکھا ہے کہ :

"یہ ہونے والی بات ہے کہ نئے ہندوستان کی سماجی زندگی، سیاست،

معیشت اور تہذیب میں جمہوریت کا رنگ دن بدن چڑھتا جائیگا۔ نئی پود کو کم سے کم یہ موقع ملنا چاہیے کہ اپنے ملک کے مسئلوں کو، اپنے حق کو اور اپنی ذمّے داریوں کو سمجھے۔ ایک بالکل نئے نظام کی ضرورت ہے، جس سے لوگوں کو کم از کم اتنی تعلیم مل جائے کہ وہ شہریوں کے حق اور فرض کو کام میں لاسکیں۔ پھر آجکل ہر سمجھدار شہری کو سماج کا کام کرنے والا رکن ہونا چاہیے۔ یعنی کسی مفید سیوا کے ذریعے سے وہ حق ادا کرنا چاہیے، جو سماج کا اس پر ہے۔ وہ تعلیم جو نکمّے آدمی پیدا کرتی ہے، (چاہے وہ امیر ہوں یا غریب) ہر طرح سے بُری ہے۔

جس مغربی مصنّف جیکس کا سطور بالا میں حوالہ دیا جاچکا ہے۔ وہی مصنّف لکھتا ہے کہ تعلیم کا مقصد اصلی کچھ بھی ہو۔ اس کا تعلق تین عناصر سے ہے اور ہر ایک عنصر اِس کو اپنے اپنے خیال کی رُو سے جانچتا ہے۔ لڑکے کو تعلیم سے اسی قدر دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعے کچھ کمانے کے قابل ہوسکے۔ اس سے بلند تر مقصد اس کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تعلیم حد درجہ دلچسپ، نفع آور اور اعلےٰ خیالات پیدا کرنے والی ہو۔ اس کے بعد لڑکے کے والدین آتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کا لڑکا قابل ترین اور بہت بڑا آدمی بنے۔ اُنھیں بچے کی مندرجہ بالا خواہش کا بھی احترام ہوتا ہے۔ لیکن بقائے نام اور شہرت باقی کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا تقاضا ہے، جو عام حالات میں پورا نہیں ہوتا۔ لیکن اُستاد کا یہی فرض ہے کہ ہر طالب علم کی قابلیتوں کی تکمیل والدین کی اسی خواہش کی روشنی میں کرے۔ آخری عنصر قوم اور سوسائٹی کا ہے، جو بجا طور پر توقع رکھتی ہے کہ ہر بچہ ایسی شہرت کے خیال سے سرشار ہو کر نکلے، جس کی وجہ سے اس کے دل میں سوسائٹی

بت ہو اور دوسرے انسانوں کے لیے مفید ہو سکے۔

ان خیالات کی رُو سے واردھا تعلیم جس قسم کی شہریت پیدا کرنے کا دعویٰ کرتی ہے
یت باہمی کا جو خیال اس کے پیشِ نظر ہے، وہ یقیناً اس نادار، بے دست و پا اور اجہلس
کے لیے ازبس ضروری ہے۔ جہاں کی مخلوق ابھی تک انفرادیت اور ذاتیت کے چکر میں
ہاں اگر کوئی اجتماعی اور قومی خیال پیدا کیا جا سکتا ہو، تو بسا غنیمت ہے۔

شہریت کے تصور میں ایک شق ایسی ہے۔ جس پر ہمارے ملک کے اکثر حضرات نے
اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ یعنی ہر بچے کے دل میں یہ بٹھا دینا کہ عدم تشدد، تشدد سے
ہے یا رپورٹ کے اپنے الفاظ میں "انسانوں کو زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہییں،
ے اہمسا اور اس کی ساتھ کی خوبیوں کا ہمسا، دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو"
حقیقت میں واردھا اسکیم کا یہ وہ سبق ہے۔ جس میں مہاتما گاندھی کے ایک ذاتی
لی تعلیم ہے۔ غالباً اس بات کے ماننے سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ تشدد بُرا ہے
ن کے مقابلے میں محبت کے ذریعے تسخیر کا خیال بہت بلند ہے۔ لیکن فطرت انسانی کے
ہ اور موجودہ تجربات یہی بتاتے ہیں کہ محبت اور فائدہ انسانوں کے تسخیر قلب کے لیے کوئی
مدف نسخہ نہیں۔ بطور ایک ذاتی اصول کے ہر شخص جس قسم کا تصور اور فلسفہ اپنے لیے چاہے
رسکتا ہے، لیکن قومی حیثیت سے ایک غیر یقینی اصول کی عام تبلیغ معلوم نہیں کہاں
ح ثابت ہو سکتی ہے۔ یہاں تک تو درست ہے کہ ہمیں کسی کے خلاف جارحانہ اقدام کرنے
نند کا استعمال نہیں کرنا چاہیے، لیکن "مدافعت" کا حق تو یقیناً قدرتی اور کامل طور پر منصفانہ
ہے۔ جہاں تک مہاتما گاندھی کے "عدم تشدد" کا تعلق ہے، وہ "مدافعت" میں بھی عدم تشدد
ا خیال کرتے ہیں، جس سے ضروری نہیں کہ ہر شخص کو اتفاق ہو سکے۔

جبری تعلیم کے سلسلے میں عدم تشدد کے اس اختلافی اصول کو بچوں کے دماغ میں جبر ٹھونسنا بھی تو ایک طرح کا تشدد ہے اور بالکل اس بات سے مشابہ ہے کہ جرمنی میں یا بعض دوسرے ممالک میں قومیت اور شہریت کا ایک خاص تصور بہ زور پیدا کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں صحیح پوزیشن یہ معلوم ہوتی ہے کہ ذہنیت کے بنانے میں، بچوں کے دل میں یہ اصول راسخ کیا جائے کہ دنیا میں راحت و مسرت کا معیار حکومت اور زبردستی نہیں، بلکہ خدمت ہے اور نیا سماجی نظام ایک طبقے کو دوسرے طبقے پر زبردستی حکومت کے بجائے باہمی امداد اور ہمدردی پر قائم ہوگا۔ آج دنیا میں سیاست، معیشت اور تہذیب جن قوتوں سے مقابلہ کر رہی ہے، اس میں ساری قوم کو تارک الدنیا اور راہب بنا دینا کسی طرح قرین مصلحت نہیں۔ بلکہ جیسا کہ پروفیسر کرپلا (سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور) نے اپنے ایک فاضلانہ مضمون میں واضح کیا ہے۔ فوجی تعلیم یا فوجی تربیت بھی ہماری بنیادی تعلیم کا ایک جزو ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں مجھے پروفیسر کرپلا کی گہری حقیقت شناسی کا اعتراف کرنا ہے کہ انھوں نے بعض عمدہ تجاویز اس اسکیم کے ضمن میں پیش کی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان کے رجحان اور ذہنی تصورات کو عمدہ شاہراہوں کی طرف پھیرا جائے۔ اس لیے ہندوستان کی تعلیمی مشکلات کے حل کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانیوں کے رجحان زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ نفسیاتی طور پر ہندوستانی کم ہمت، عافیت پسند اور عزلت گزیں ہوتے ہیں اور ان میں مہمات کی طرف توجہ کرنے کا رجحان بالکل مفقود ہوتا ہے۔ "شخصیت" اور کیرکٹر اس قدر کھوکھلا ہوتا ہے کہ معمولی سا کام بھی اپنے اعتماد پر نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ بوٹ یا جوتا بھی خریدنا ہوا تو اس کے لیے دوستوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ اسی طرح جذبات کے ضبط و انضباط کے معاملے میں بھی بچار

ہندوستانی بے اختیار سا ہوتا ہے، جو اس کی سیرت (کیرکٹر) کی خامی کی دلیل ہے۔ حبّ وطن کا وہ جذبہ بھی مفقود ہے، جو محض وطن کی محبّت سے پیدا ہوتا ہے۔ انگریزوں کی دشمنی سے متاثر ہونا اور حبّ وطن دو متضاد چیزیں ہیں۔ بہرکیف ہندوستانیوں کی عمدہ تعلیم کے سلسلے میں ان نفسیاتی عناصر کا بھی پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔"

میں نے پروفیسر کرپلانی صاحب کے خیالات کا ایک خلاصہ پیش کیا ہے۔ جس کو پڑھ کر ان ارشادات کی صحت کی داد دینا پڑتی ہے۔ تاہم اس میں صرف اس قدر ترمیم کرنا ضروری معلوم دیتا ہے کہ ہندوستان کے لیے سب سے پہلا اور اہم مسئلہ آزادی کا حصول ہے۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس وقت تک اتنے نازک اور بعد کے مسائل کی طرف توجہ کرنا ممکن نہیں۔ جب قوموں میں خود اختیاری پیدا ہو جاتی ہے، تو یہ لطیف پہلو خود بخود ترقی پاتے جاتے ہیں۔

میں نے واردھا اسکیم کی بنیادی خصوصیات پر کافی بحث کی ہے۔ اب ختم کرنے سے پہلے بعض ایسے اعتراضات کی طرف مجملاً توجہ کرتا ہوں، جو میرے نزدیک جزئیات کا درجہ رکھتے ہیں۔

جبری تعلیم کے سلسلے میں اسکول جانے کی جو عمر مقرر کی گئی ہے۔ اس کا آغاز بہت کچھ محلّ اعتراض ہے۔ رپورٹ نے ۷ سال سے ۱۴ سال تک کی عمر کو تعلیم کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ سات سال تک بچہ کیا کرے گا؟ آج کل ۴ سال سے بچوں میں اخذ کرنے کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے اور پانچ سال کا بچہ تو اچھا خاصہ سیانا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ وقت بچّے کی تربیت میں صرف ہوتا، تو اچھا تھا۔ رپورٹ کے واضعین کو اصرار ہے کہ ۱۲ سال سے ۱۴ سال تک کا زمانہ زندگی کا نازک ترین دَور ہوتا ہے۔ اس میں لڑکے کی نگرانی کی شدید ضرورت

ہے۔ یہ خیال درست ہے، لیکن ۵ سال سے ۷ سال تک کی عمر بھی بے حد تربیت کی محتاج ہے، اس لیے اس کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس سے بچے کی ذہانت کے سرچشمے کے رُکنے کا اندیشہ ہے۔

پس اس کے تدارک کی سبیل یہی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان حضرات کی تائید کی جائے، جو جبری تعلیم کے دَور مقرر کرنے کے حق میں ہیں اور اُن میں ۵ سے ۷ سال تک کے زمانے کو پہلا دَور قرار دیتے ہیں۔

بعض لوگوں نے واردھا اسکیم پر اس بنا پر اعتراض کیا ہے کہ اس میں مذہبی تعلیم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ موجودہ نظامِ تعلیم میں بھی مذہبی تعلیم کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ تاہم اگر انصاف سے غور کیا جائے، تو ۵ سال سے ۷ سال تک کا زمانہ ابتدائی مذہبی تعلیم کے لیے بہت غنیمت ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ اُن کے نصاب سے اس وقت قرآن مجید بالکل خارج ہو گیا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ بچہ پانچ سال کی عمر میں اسکول بھیج دیا جاتا ہے اور پھر اس تعلیمی گورکھ دھندے سے اس وقت فارغ ہوتا ہے، جب طبیعت مذہبی تعلیم کی طرف مائل ہی نہیں ہو سکتی۔ اگر ۷ سال تک کے زمانے سے مسلمان فائدہ اُٹھانا چاہیں، تو یہ فرصت ان کے لیے غنیمت ہے۔

واردھا اسکیم کے بعض اور پہلو بھی مزید غور و فکر کے محتاج ہیں۔ مثلاً (۱) نصاب کا طویل ہونا۔ (۲) مادری زبانوں اور ملک کی مشترکہ زبان ہندوستانی کا آپس میں تصادم۔ (۳) دیہاتی اور شہری نظامِ تعلیم میں فرق نہ کرنا۔ (۴) اساتذہ کی ٹریننگ کی مشکلات۔ (۵) تعلیم کے اخراجات کا اندازہ۔ (۶) ہندوستانی تعلیم کا ناکافی انتظام اور (۷) اعلیٰ تعلیم کے مغربی نظامِ تعلیم کی ضرورت سے بے خبری۔ یہ سب اُمور ایسے ہیں، جن پر رپورٹ کے بیانات سے

شبہات دُور نہیں ہوتے۔ ممکن ہے تدریجی تجربہ خود بخود ان اعتراضات کو رفع کر دے یا اسکیم کے نقائص کو نمایاں شکل میں واضح کر دے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اسکیم کو "اندھی اور بہری" عقیدت سے الگ رکھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ ورنہ اس بات کا احتمال ہے کہ تعلیمی اور تہذیبی فائدہ ہونے کے بجائے ملک کی تعلیم کو شدید نقصان پہنچ جائے۔

آخر میں مجھے پھر یہ کہنا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز مکمل نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان میں کسی مشترکہ کام کو نبھانے کے سلسلے میں جو گوناگوں مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس ملک میں کسی اسکیم پر اتفاق رائے ممکن ہو سکتا ہے۔ اگر ایک طرف حد سے بڑھی ہوئی خوش اعتقادی ہے، جو عیوب و نقائص کو دیکھنے اور جانچنے سے انکاری ہے، تو دوسری طرف بے جا، بے کار بلکہ ناتجربہ کارانہ جوش تعصب ہے، جو حسن و قبح کے معیار پر نہیں، بلکہ اوّل الذکر کے ردِّ عمل کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ دونوں فریق معاملات کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اعتدال کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے۔ جس کو محض خوبیوں سے غرض ہے اور بس۔ رپورٹ جہاں تک اصلاح طلب ہے، اس کی اصلاح ضروری ہے اور اس کے جو عمدہ پہلو ہیں، ان کی تائید فرض اوّلیں۔ خود بقول پروفیسر سیدین صاحب: "کمیٹی کی رپورٹ میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اس کے ضمن میں بہت سے تعلیمی مسائل حل طلب ہیں، جنھیں مخلصانہ اور منصفانہ تحقیق اور تجربے کے ذریعے حل کرنا ہوگا۔" یقین ہے کہ اگر تجربہ، ہمدردانہ تنقید اور معاملات کی بصیرت کی روشنی میں اصلاح و ترمیم کی گئی، تو ملک کے لیے اس کے اصول مفید ثابت ہوں گے۔

ذخیرۂ الفاظ

از

نذیر احمد، ایم اے، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

جس طرح ایک مصور کو اپنے شاہکار کے لیے عمدہ مُوقلم اور اعلیٰ قسم کے رنگوں کی ضرورت ہوتی ہے یا ایک بُت تراش کو کسی اعلیٰ نمونے کے تراشنے کے لیے اعلیٰ قسم کے آلاتِ سنگ تراشی کی حاجت ہوتی ہے۔ بعینہٖ ایک شاعر یا بلند پایہ مضمون نگار کے لیے اعلیٰ قسم کے موزوں، مناسب اور برمحل الفاظ ضروری ہیں۔

ایک یونانی ادیب کا قول ہے کہ شاعری اور مصوری ایک ہی چیز ہیں۔ مصوّر مختلف رنگوں کے امتزاج سے ایک تصویر پیش کرتا ہے اور شاعر مختلف الفاظ کی مدد سے تصویر کھینچتا ہے۔ تصویر ایک ہی ہے البتہ ذرائع مختلف۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو شاعر یا ادیب کا فن مصور کے فن سے برتر سمجھا جاتا ہے۔ مصور ہمارے حواسِ ظاہری سے خطاب کرتا ہے اور شاعر حواسِ باطنی سے۔ شاعر ہر وہ تصویر الفاظ کے ذریعے کھینچ سکتا ہے، جو ایک مصوّر کے لیے باعثِ فخر ہو۔ مگر مصور کسی شاہکار کو تصویر کا جامہ پہنانے میں بسا اوقات ناکام رہتا ہے۔ برسات، بادل، چاندنی رات، قوسِ قزح اور شبنم وغیرہ کی تصویر مصوّر بھی بناتا ہے اور شاعر بھی۔ مگر شاعر الفاظ کی مدد سے ہمارے خفتہ احساسات کو بیدار کرتا ہے اور دل کی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے اور ہمیں ایسی غیر مرئی اشیا کی تصاویر بھی دکھا سکتا ہے۔ جن کے وجود کا ہم صرف تصوّر ہی کر سکتے ہیں۔ مثلاً شبنم کی یہ تصویر کھینچنا صرف شاعر کا

ہی کام تھا۔

بروئے گل نہ شبنم ساختہ جا
گسستہ چرخ تسبیح ملک را

یا

ژالہ بر لالہ فرود آمدہ ہنگامِ سحر
راست چوں عارضِ گلگونِ عرق کردۂ یار

پس جس طرح ایک مصور اپنے مو قلم اور رنگوں کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیتا ہے، اُسی طرح ایک شاعر یا ادیب مقرر کو بھی الفاظ کے انتخاب میں محتاط ہونا چاہیے اور الفاظ کا عمدہ انتخاب اُسی صورت میں ہو سکتا ہے، جبکہ شاعر، ادیب یا مقرر کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت زیادہ ہو۔

دنیا میں معلم ہی وہ ہستی ہے، جو شاعر، ادیب، مضمون نگار یا مقرر پیدا کرتی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ذخیرۂ الفاظ کی معلم کو ہی ضرورت ہے۔ اگر معلم کے پاس ذخیرۂ الفاظ کافی ہے، تو وہ اپنے ہر سبق کو بے حد دلچسپ بنا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اعادے کے اسباق جو طلبہ کے لیے بالکل روکھے پھیکے ہوتے ہیں، معلم اپنے ذخیرۂ الفاظ کی مدد سے ایسے دلچسپ بنا سکتا ہے کہ وہ فی الحقیقت قندِ مکرر کا مزہ دینے لگتے ہیں۔ اگر معلم کافی ذخیرۂ الفاظ کا مالک ہے، تو اُس کے ہونہار طالب علم ــــ وہ طالب علم، جو آئندہ زمانے میں بہترین شاعر، جادو رقم مضمون نگار، یا سحر بیان لیکچرار ہونے والے ہیں ــــ بقدر استعداد اُس کی قابلیت سے خوب مستفیض ہو سکتے ہیں اور وہ معلم، جس کا اپنا ذخیرہ الفاظ محدود ہو، انشاء و ادب کی طرف طلبہ کی رہنمائی کس طرح کر سکیگا۔ ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

معلّم اپنے ذخیرۂ الفاظ کو کثرتِ مطالعہ سے بڑھا سکتا ہے۔ فنِ تعلیم کے ایک ماہر کا مقولہ ہے کہ معلّم کو ہمیشہ طالب علم بنا رہنا چاہیے جس کا مطلب یہ ہے کہ معلّم کو بھی ایک طالب علم کی طرح باقاعدہ مطالعے کی ضرورت ہے۔ اُسے اپنے فن کے متعلق نئے نئے تجربات کا علم ہونا چاہیے۔ اُسے نئے اور برجستہ الفاظ کی تلاش میں محو رہنا چاہیے۔ اُسے اپنے مضامین کے متعلق تازہ تحقیقات سے باخبر رہنا چاہیے۔ اگر وہ اس پر عمل پیرا نہیں ہے، تو اُس کا جوہر تھوڑے ہی عرصے میں زنگ آلود ہو جائیگا اور وہ ہونہار طلبہ کی رہبری کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔

اچھی تقاریر کو سُن سُن کر بھی معلّم اپنا ذخیرۂ الفاظ زیادہ کر سکتا ہے اور اعلیٰ تقریروں کے سُننے سے معلّم کو ایک اَور فائدہ بھی ہو سکتا ہے، یعنی وہ سیکھ سکتا ہے کہ ایک ہی مضمون مختلف دلکش پیرایوں میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے اور یہی بات اُس کے اسباق کو دلکش بنانے میں معاون ہو سکتی ہے۔

الفاظ ایسی چیز نہیں ہیں کہ جن کا کافی ذخیرہ یک لخت طلبہ کے دماغ میں ٹھونس دیا جائے۔ ذخیرۂ الفاظ قدرتی طور پر عمر اور درجے کی تعلیم کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ چھوٹی عمر اور ادنیٰ جماعتوں میں ذخیرۂ الفاظ بہت تھوڑا ہوتا ہے اور اعلیٰ جماعتوں تک پہنچتے پہنچتے زیادہ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ بہت سے ایسے الفاظ کے معانی بھی جانتے ہیں، جنھیں وہ بالکل استعمال نہیں کر سکتے اور بہت سے الفاظ ہوتے ہیں، جنھیں وہ شاذ و نادر مواقع پر جھجکتے جھجکتے استعمال کرتے ہیں، یعنی اُن کے حافظے میں الفاظ کافی مستحفظ ہوتے ہیں، مگر وہ پوری طرح سے ذہن نشین نہیں کیے گئے ہوتے۔ اس لیے وہ تحریر یا تقریر میں اُن کو استعمال نہیں کر سکتے۔

معلّم کو کوشش کرنا چاہیے کہ طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ کو اس طرح زیادہ کرے کہ وہ تقریباً تمام الفاظ کو تحریر و تقریر میں استعمال کرنے کے قابل ہوں۔ طلبہ میں یہ اہلیت پیدا کرنے کے لیے معلّم کا مندرجۂ ذیل تجاویز پر عمل کرنا نہایت سود مند ثابت ہوگا۔

(۱) کتاب کے اسباق

محکمۂ تعلیم کی طرف سے ہر جماعت میں زبان کی تعلیم کے لیے کتابیں منظور کی گئی ہوتی ہیں۔ معلّم کو ان کتابوں میں سے عمدہ کتابوں کا انتخاب کرنا چاہیے، یعنی معلّم کو چاہیے کہ پہلے وہ تمام کتابوں کو اچھی طرح خود دیکھ لے اور اندازہ لگائے کہ کتابوں کا کون سا سلسلہ ایسا ہے، جو دلکش ہونے کے علاوہ ذخیرۂ الفاظ کو بھی بتدریج بڑھاتا جائیگا۔

یہاں بطور جملہ معترضہ یہ تعجب اور افسوس ظاہر کیا جاتا ہے کہ زبان اُردو کی تعلیم کے لیے جس قدر سلسلۂ کتب بھی اس وقت تک شائع اور منظور ہوئی ہیں، اُن میں سے بہت ہی کم ایسی ہیں، جو ذخیرۂ الفاظ کو بتدریج بڑھائیں یا الفاظ کی تقسیم میں آسان سے مشکل کی طرف چلیں۔ بلکہ بعض حالتوں میں تو معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے، یعنی جماعت پنجم میں وہ الفاظ دیے گئے ہیں، جو دسویں جماعت کے لیے یا اُس سے بھی کسی اعلیٰ درجے کے طلبہ کے لیے ہونے چاہییں۔ پھر کتابوں کے بعض سلسلوں میں ابتدائی اسباق بہت مشکل ہیں اور آخری آسان۔ حالانکہ ابتدائی اسباق نسبتہً آسان ہونے چاہییں۔ باوجود ان حالات کے ایک لائق اور تجربہ کار معلّم اچھی کتابوں کو چُن سکتا ہے، کیونکہ کتابوں کے سلسلوں کی تعداد کافی ہے۔

کتاب سے سبق پڑھاتے وقت معلّم اس بات کا خیال رکھے کہ طلبہ ہر نئے لفظ کو علیحدہ کاپی پر لکھتے جائیں اور اس طرح سے سال کے اختتام پر طلبہ خود محسوس کرنے لگیں گے

کہ اُنھوں نے کتنے الفاظ نئے سیکھے ہیں۔ مدرّس بھی نئے الفاظ کا چارٹ تیار کرے اور گاہے گاہے طلبہ کو بتادیا کرے کہ فلاں لفظ وہ پڑھ چکے ہیں اور اُس کے معانی اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔

الفاظ کے معانی اچھی طرح سے دل نشین کر دینے چاہییں۔ ہم معنی الفاظ پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ ایک ادیب کا خیال ہے کہ کوئی دو لفظ بھی دراصل ہم معنی نہیں ہوتے، بلکہ ہر لفظ کے خاص معنی ہوتے ہیں اور بعض خاص مواقع پر خاص الفاظ ہی کام دیتے ہیں۔ مثلاً تمنا، آرزو اور خواہش بظاہر ہم معنی الفاظ ہیں، مگر خاص محل اور خاص موقع پر تمنا کے بجائے خواہش کا استعمال کرو، تو عبارت کی ساری خوبی جاتی رہیگی۔ اسی طرح بعض اشعار میں خاص الفاظ ہی اُن اشعار کی جان ہوتے ہیں اور اگر اُن الفاظ کے بجائے کوئی اور الفاظ وہاں چسپاں کر دیے جائیں، تو اشعار کی کیفیت ہی بدل جائیگی اور دل پر وہ اثر نہیں ہوگا، جو پہلے الفاظ کی موجودگی میں ہوتا تھا۔ نقادانِ سخن نے بعض سخنوروں کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ "وہ ایسے نپے تُلے الفاظ استعمال کرتے تھے کہ اُن کے کلام میں نہ کوئی لفظ بڑھایا جاسکتا ہے، نہ ہی کم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بدلا جاسکتا ہے۔" اسی صنعت کو فنِ ادب کی اصطلاح میں ایجاز کہتے ہیں اور اِسی صنعت کے مالک اعجاز رقم یا معجز نگار کہلاتے ہیں۔

پس معلّم کے لیے ضروری ہے کہ زبان کے کتابی اسباق پڑھاتے ہوئے الفاظ کے صحیح صحیح معانی طلبہ کے ذہن نشین کرتا جائے اور واضح کرتا جائے کہ مختلف مواقع پر مختلف الفاظ (جو بظاہر ہم معنی ہیں) کیا کیا کیفیتیں پیدا کر دیتے ہیں۔ نیز یہ بھی ذہن نشین کرتا جائے کہ اساتذہ نے مختلف الفاظ اپنے کلام میں کس کس محل پر کونسی کیفیات کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں۔

(۲) تقریری مشقیں

نظامی عروضی جیسے اُستادانِ فن کا خیال ہے کہ شاعری یا خطابت میں پایۂ کمال

تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ نوآموز اساتذۂ قدیم کے کلام کے عمدہ ترین نمونے حفظ کرے اور اپنے کلام کا دل ہی دل میں اُن سے موازنہ اور مقابلہ کرتا رہے۔ آہستہ آہستہ اس کے کلام میں اساتذہ کا سا رنگ آنے لگیگا۔ الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے کے لیے اور الفاظ کا مناسب استعمال سیکھنے کے لیے بھی یہی ترکیب مفید ہے۔ معلم کو چاہیے کہ نثر اور نظم کے بہترین نمونے طلبہ کو حفظ یاد کرائے۔ ایک تو اُن کا ذخیرۂ الفاظ بڑھیگا، دوسرے وہ الفاظ کا بجا استعمال بھی سیکھ سکیں گے۔ اور تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جب کبھی وہ خود مضمون نگاری یا خطابت کی طرف مائل ہونگے، تو حفظ کردہ نمونوں کی مدد سے جلد ہی قادر الکلام ہو جائیں گے۔

الفاظ کا ذخیرہ اس طرح بھی زیادہ کیا جا سکتا ہے کہ کبھی کبھی طلبہ سے کسی واقعہ کے متعلق تقریریں کرائی جائیں اور بعد میں معلم بتائے کہ فلاں بات فلاں الفاظ میں بھی ادا کی جا سکتی تھی۔ طلبہ کا تقریر میں مقابلہ کرایا جائے اور الفاظ کی برجستگی اور موزونی کے لحاظ سے اُن کو نمبر دیے جائیں۔

کبھی کبھی طلبہ سے ہم معنی الفاظ بھی پوچھنے چاہییں اور طلبہ سے ہم معنی الفاظ کا چارٹ تیار کروانا چاہیے۔ تاکہ طلبہ میں یہ اہلیت پیدا ہو جائے کہ وہ ایک مفہوم کو کئی الفاظ میں ادا کر سکیں۔

کبھی کبھی لڑکے آپس میں الفاظ کا مقابلہ کریں۔ وہ اس طرح پر کہ پہلے ایک فریق کا ایک طالب علم کوئی لفظ بولے۔ مثلاً وہ کہے، تنظیم۔ فریق مقابل کا کوئی لڑکا ایسا لفظ کہے، جو میم سے شروع ہوتا ہو اور اسم ہو۔ مثلاً وہ کہے، محبّت۔ اب فریق اوّل کا کوئی طالب علم پھر ایک ایسا اسم بتائے، جو 'ت' سے شروع ہوتا ہو۔ اسی طرح افعال اور حروف کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور ذخیرۂ الفاظ بڑھایا جا سکتا ہے اور آموختہ الفاظ کو ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔

(۳) تحریری مشقیں

مندرجۂ ذیل تحریری مشقیں الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے اور اُن کے صحیح استعمال کو سمجھنے کے لیے ازحد مفید ثابت ہونگی :۔

(ا) کبھی کبھی معلّم تختۂ سیاہ پر سہ حرفی، چہار حرفی یا پنج حرفی ایک لفظ لکھ دے اور طلبہ کو کہے کہ وُہ اپنی اپنی کاپیوں پر وہ تمام بامعنی الفاظ لکھیں، جو اس لفظ کے حروف کے اُلٹ پھیر سے بن سکتے ہیں۔ مثلاً معلّم نے تختۂ سیاہ پر ”اکرم“ لکھا، تو طلبہ اپنی اپنی کاپیوں پر راک، رم، رام، مار، مکر، کرم، کام، کار وغیرہ الفاظ لکھیں۔ پھر معلّم اُن الفاظ کے معانی بھی طلبہ سے لکھوائے، جو اُنھوں نے حروف کو اُلٹ پھیر کر بنائے ہیں۔ اس طرح سے طلبہ کو بہت سے الفاظ اور معانی یاد ہو جائیں گے اور یہ کام کھیل کا کھیل ہوگا اور تعلیم کی تعلیم۔

(ب) اسی طرح کبھی کبھی ایک مادّہ یا مصدر سے مشتق الفاظ بنوائے جائیں اور اُن کے معانی لکھوائے جائیں اور اُن کو فقرات میں استعمال کرا کے ان کے فرق کو ذہن نشین کیا جائے۔ مثلاً معلّم نے ”حمد“ سے الفاظ بنانے کے لیے کہا ہے۔ طلبہ حامد، محمود، محمّد، حمید، تحمید وغیرہ کے تمام مشتقات لکھیں اور ان کا فقرات میں استعمال کریں۔

(ج) کبھی کبھی مشکل الفاظ کو فقرات میں استعمال کرنے کی مشق کرانی چاہیے۔ معلّم طلبہ کو ہدایت کرے کہ وہ اپنی کاپیوں پر درجِ ذیل طریقے سے لکیریں کھینچیں اور پھر الفاظ کے معانی لکھ کر وہ الفاظ فقرات میں استعمال کر کے دکھائیں۔

الفاظ	معانی	فقرات میں استعمال
مبتدی	ابتدا کرنے والا۔ کسی کام کو شروع کرنے والا۔ نوآموز	صرف و نحو کے پیچیدہ قواعد سے ایک مبتدی فوراً گھبرا جاتا ہے۔

الفاظ	معانی	فقرات میں استعمال
مبتذل	ذلیل۔ خراب۔ کثرت سے استعمال کیا ہوا۔	مبتذل الفاظ اشعار کی قدر و قیمت گرا دیتے ہیں۔
متدیّن	دین دار۔ مذہبی۔ شرع کا پابند	اورنگ زیب ایک متدیّن بادشاہ ہو گزرا ہے۔
وغیرہ	وغیرہ	

(د) آسان سے مشکل اور مشکل سے آسان عبارت بنانا۔ معلم کبھی کبھی طلبہ کو مشکل عبارات لکھوائے اور کہے کہ ان عبارات کو آسان زبان میں لکھو یا مشکل فقرات کو آسان فقرات میں تبدیل کروائیے اور اسی طرح کبھی آسان عبارت یا فقرات کو مشکل عبارت یا فقرات میں تبدیل کروائیے۔ مثلاً

مشکل فقرات	آسان فقرات
۱۔ مَیں نمودِ سحر سے لے کر غروب آفتاب تک مصروفِ کار رہا۔	۱۔ میں صبح سے شام تک کام میں لگا رہا۔
۲۔ اُن کے وقائع حیات کو ضبطِ تحریر میں لانے سے ایک ضخیم کتاب بن جائے۔	۲۔ اُن کی زندگی کے سارے حالات لکھنے سے ایک بڑی کتاب بن جائے۔
۳۔ ۱۸۵۷ء میں جب خاندانِ مغلیہ کا چراغ گُل ہوا، تو اس پر بھی ادبار کی تاریکی چھا گئی۔	۳۔ ۱۸۵۷ء میں جب مغل حکومت کا بالکل خاتمہ ہو گیا، تو اس پر بھی مصیبتیں شروع ہو گئیں۔
۴۔ آخر شام کے وقت اس کا طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ وغیرہ	۴۔ آخر شام کے وقت وہ فوت ہو گیا۔ وغیرہ

(س) مشکل الفاظ کو بطورِ املا لکھوانے سے بھی ذخیرۂ الفاظ بڑھتا ہے۔ معلّم کبھی کبھی آموختہ الفاظ میں سے مشکل الفاظ کا انتخاب کر کے طلبہ کو بطورِ املا لکھوائے اور غلطیوں کی اصلاح مکمل طور پر کرے، تاکہ الفاظ کی صحیح صورتیں طلبہ کے ذہن نشین ہو جائیں۔

(س) مضمون نویسی بھی ذخیرۂ الفاظ کے استعمال کرنے اور دلنشین کرنے کے لیے مفید ہوتی ہے۔ کبھی کبھی معلّم طلبہ کو پانچ سات الفاظ خود لکھوا دے اور کہے کہ فلاں موضوع پر ایک مضمون لکھو اور اُس میں یہ الفاظ بھی استعمال کرو۔ مثلاً "باغ کی سیر" پر مضمون لکھوائے اور اُس میں مندرجۂ ذیل الفاظ استعمال کرنے کے لیے دے:۔

اشجار	خوش نوا	طائر
انواع واقسام	سرور	خنکی
مشامِ جان	معطّر	زینت

وغیرہ

(۴) زائد مطالعہ

طلبہ کو زائد مطالعہ کرنے کی عادت ڈالنا بھی نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ وسعتِ مطالعہ سے ذخیرۂ الفاظ بڑھتا ہے اور وسعتِ نظر حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح سے طلبہ میں کبھی کبھی عالم و فاضل لوگوں کی تقریریں سُننے کا شوق بھی پیدا کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے بھی ذخیرۂ الفاظ بڑھتا ہے اور الفاظ کا استعمال سمجھ میں آتا ہے۔

(۵) لُغت

طلبہ کو خود بخود مشکل الفاظ لغات میں سے تلاش کرنے کی عادت ڈالنا ذخیرۂ الفاظ کے بڑھانے کے لیے بے حد مفید ہوتا ہے۔ بہت سے طالب علم ایسے دیکھنے میں آئے ہیں

کہ اُونچی جماعتوں میں پہنچ جاتے ہیں، مگر لغات میں سے کسی لفظ کو تلاش نہیں کر سکتے۔ اُردو زبان کے لیے اگر ایسی لغات دستیاب ہو سکے جس میں الفاظ کے اعراب بھی دیے ہُوئے ہوں، تو وہ نہایت ہی قیمتی چیز ہو گی۔ کیونکہ بہت سے فارسی اور عربی الفاظ ایسے ہیں کہ جن کے اعراب نہ ہونے سے تلفّظ کے بگڑنے کا سخت اندیشہ ہے۔ طلبہ کو ہدایت کرنی چاہیے کہ وہ تلفّظ کے معاملے میں بڑے محتاط رہیں اور جہاں کہیں شک پڑے، فوراً اُستاد سے پوچھیں۔ کیونکہ ذخیرۂ الفاظ اُسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے، جبکہ الفاظ کے معانی پر بھی پُورا پُورا عبور ہو اور اُن کے صحیح تلفّظ پر بھی پُورا پُورا قابو ہو۔

ہٹلر کا نظریہ اور جرمن نصاب تعلیم

از
محمد انور قریشی، اے ڈی، آف سکولز ہوشیار پور

(گزشتہ سے پیوستہ)

اب ہم ذیل میں جرمن اسکول اور اُن کے نصاب کا ذکر کرتے ہیں۔

جرمنی میں پرائمری تعلیم لازمی اور بلا معاوضہ ہے۔ چھے یا سات سال کی عمر میں ہر بچے کو خواہ وہ کسی جماعت سے ہو، مقامی پرائمری اسکول میں جانا پڑتا ہے، جسے وولک (Volk Schule) اسکول کہتے ہیں۔ ریاست نے ان پرائمری مدرسوں کی عمارات پر جو کہ ہوادار اور خوشنما ہوتی ہیں، بے شمار روپیہ خرچ کیا ہے۔ پرائمری اسکولوں کا عرصہ چار سال پر مشتمل ہے۔

سال اوّل میں معمولی قسم کے مختلف موضوع پر دس دس منٹ کے سبق دیے جاتے ہیں۔ باقی تین سال میں طالب علم جرمن زبان، حساب، جغرافیہ، تاریخ، علم نباتات، حیوانات، گانا، ڈرائنگ، دستکاری، مذہب اور جسمانی ورزش کے کھیل سیکھتا ہے۔ لیکن یہ مضامین ادنیٰ معیار پر پڑھائے جاتے ہیں۔ وولک اسکول میں چار سال ختم کرنے کے بعد طلبہ ثانوی تعلیم کے لیے ہائی اسکول میں چلے جاتے ہیں۔ ہائی اسکول کو جرمن زبان میں آبیچر (Abitur) اسکول کہتے ہیں۔ اور اسی طرح اس کے سالانہ امتحان کو آبیچر کہتے ہیں۔ وولک اسکول سے آبیچر اسکول میں ہر ایک طالب علم کو نہیں بھیج دیا جاتا، بلکہ پرائمری اسکول کی مدت کے اختتام پر ایک امتحان ہوتا ہے، جو

بچہ اس امتحان میں کامیاب ہو جائے، صرف اُسے ہی ثانوی تعلیم کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ جو طلبہ اس امتحان میں کامیاب نہ ہو سکیں یا امتحان دینا ہی نہ چاہیں، وہ مندرجہ ذیل دو طریقوں پر تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں:۔

(۱) یا تو وہ وولک اسکول ہی کی تعلیم کو چار سال مزید جاری رکھیں اور وولک اسکول کے مضامین کو ذرا وسعت سے مطالعہ کریں۔ ان مضامین کے علاوہ تھوڑی سی انگریزی یا معمولی فزکس اور کیمیا کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر چاہے تو اس عرصے کے بعد دو سال اور تعلیم جاری رکھ سکتا ہے۔ جن کا نام آوبریا (Aubria) جماعتیں ہیں۔ اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد اگر طالب علم آبیچر اسکول میں جانا چاہے، تو اُسے ایک قسم کے ٹریننگ اسکول میں جانا پڑتا ہے، جسے آوفبا (Aufba) اسکول کہتے ہیں۔ اس اسکول میں تین سال رہنے کے بعد وہ آبیچر کا امتحان دے سکتا ہے۔

(۲) اگر طالب علم وولک اسکول کے بعد مضامین سائنس کا وسیع مطالعہ کرتا ہے، تو اُسے رئیل اسکول (Real Schule) میں جانا پڑیگا، جہاں وولک اسکول کے مضامین کو زیادہ وسعت سے پڑھایا جاتا ہے اور اس کے بعد عملی سائنس کے مضامین پر زور دیا جاتا ہے۔ ان مدرسوں میں انگریزی اور فرانسیسی بھی لازمی ہے۔ اس قسم کے زنانہ اسکولوں کو لیزم کہتے ہیں۔ رئیل اسکول یا لیزم اسکول میں چھے سال صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد اگر طالب علم آبیچر کا امتحان دینا چاہے، تو اُسے اسی قسم کے اعلیٰ مدرسوں میں جانا پڑیگا جنھیں اوبر رئیل Auber Real اسکول اور لڑکیوں کے لیے اوبر لیزم Auber Lyzeum اسکول کہا جاتا ہے۔ ان اسکولوں میں تین سال مزید صرف کرنے پڑتے ہیں۔

وولک اسکول کے بعد آبیچر کی قابلیت پیدا کرنے کے لیے نو سال صرف ہوتے ہیں۔

اس امتحان کا معیار ہمارے ایف۔ اے کے معیار کے مطابق ہے یا اس سے بھی کچھ زیادہ۔ یہ کورس فقط اُن بچوں کے لیے ہے، جو وولک اسکول کا امتحان پاس نہ کر سکیں۔ اس کے برعکس جو طلبہ امتحان ہٰذا میں کامیابی حاصل کر سکیں، اُن کے لیے آبیٹر اسکول کے دروازے کھلے ہیں۔ وہاں بھی نو سالہ کورس ہے۔ یہ نو سال مختلف جماعتوں پر مشتمل ہیں۔ تمام اقسام کے مدرسوں میں مضامین ایک ہی ہیں۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ بعض مدرسوں میں بعض مضامین پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ طلبہ اپنے دماغی رُجحان اور طبعی ذوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن میں داخل ہوتے ہیں۔

آبیٹر اسکول مندرجۂ ذیل اقسام کے ہیں:۔

(۱) جمنیزم

اس اسکول میں زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ یونانی اور لاطینی زبانوں پر زور دیا جاتا ہے۔ ان کا سیکھنا لازمی ہے۔ انگریزی، فرانسیسی اور ہسپانوی میں سے کوئی ایک لازمی ہے اور باقی دو میں سے ایک اختیاری۔ تاریخ، ریاضی اور جرمن زبان کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ اور سب سے آخر قدرتی سائنس کا شمار ہوتا ہے۔

(۲) ریئل جمنیزم

یہاں جمنیزم کے مضامین کے علاوہ عملی سائنس بھی پڑھائی جاتی ہے۔ ان میں انگریزی اور فرانسیسی لازمی ہے۔ یونانی زبان کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ قدرتی سائنس کو دوسرا درجہ حاصل ہے اور دیگر مضامین آخر میں سکھائے جاتے ہیں۔

(۳) ریفارم ریئل جمنیزم

ان کا نصاب [illegible] ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لاطینی کو انگریزی اور فرانسیسی کے مقابلے میں [illegible]

(۴) ڈوٹ شے اوبر اسکول Deutsche Auber Schule اور فران اوبر اسکول Fran Auber Schule اِن میں سے پہلا لڑکوں کے لیے اور دوسرا لڑکیوں کے لیے ہے۔ یہاں تاریخ اور جرمن زبان کو خصوصیت حاصل ہے اور لڑکیوں کو کھانا پکانا اور سینا پرونا لازمی طور پر سکھایا جاتا ہے۔

(۵) اوبر رئیل اسکول و اوبر لیزم

ان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہاں زیادہ تر قدرتی سائنسوں کے مضامین سکھائے جاتے ہیں۔

(۶) اوف با اسکول

ان کے متعلق بھی اس سے پیشتر لکھا جا چکا ہے۔

مدرسوں کی عمارات اور مختلف انواع و اقسام کے سامان پر بے شمار روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ ہر قسم کی سائنس تجربہ گاہ، ہندوستان کے بڑے سے بڑے کالج کی تجربہ گاہ سے بہتر ہے۔ طریقہ تعلیم میں سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اُستاد سبق کے آغاز ہی میں لڑکوں کی تمام تر توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔ لڑکوں پر خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے اور اُستاد کی آواز کے علاوہ بچوں کے ذہن میں کوئی چیز نہیں رہتی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُستاد کے لیکچر میں ایک خاص قسم کا جذب ہے، جو طلبہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ کتاب سے ایک فقرہ یا پیراگراف پڑھنے کے بعد بچوں کے سامنے چند ایک سوالات پیش کر دیے جاتے ہیں۔ سوالات کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ جواب خود بخود ذہن میں آ جائے۔ چنانچہ بے شمار ہاتھ دکھائی دیتے ہیں اور ہر ایک بچہ جواب دینے کے لیے بے تاب نظر آتا ہے۔ جواب دینے میں اگر ایک طالب علم غلطی کرے۔ تو اُس کی اصلاح کے لیے پھر بہت سے ہاتھ اُٹھتے ہیں۔ چنانچہ اسی طریق پر تمام کے تمام سوال بڑی خوش اسلوبی

سے ہر ایک بچے کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ سوال کا جواب اُستاد کی طرف سے وارد نہیں کیا جاتا، بلکہ بچے بذاتِ خود بحث کرنے کے بعد صحیح حل تلاش کر لیتے ہیں۔ اس بحث میں ہم اُستاد اور شاگرد کی ہرگز پہچان نہیں کر سکتے۔ کیونکہ دلائل اور جھگڑے کا انداز نہایت رفیقانہ ہوتا ہے۔ دُنیا یہ سمجھتی ہے کہ جرمن طریقۂ تعلیم سخت اور ظالمانہ ہے۔ یہ خیال قطعی طور پر غلط ہے۔ جماعت کے اندر اور باہر غرضیکہ مدرسے کے تمام ماحول میں شاگرد اور اُستاد کا رشتہ دوستانہ ہوتا ہے۔ اُستاد کی حیثیت ایک مشیر کی ہے۔ جس کا اوّلین فرض یہ ہے کہ بچے کے دل و دماغ کو صحیح رستے پر لگائے۔ جماعتوں کے اندر طرزِ تعلیم دیکھ کر انسان حیران ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی عادات اعلیٰ تعلیم کے لیے یہیں سے پختہ ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یونیورسٹی میں پہنچ کر طلبہ خود کام کرتے ہیں۔ اساتذہ گاہے گاہے تھوڑی سی مدد دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی تحقیقات میں لگے رہیں اور اُن کا دل بڑھا رہے۔

اسکول کا وقت صبح ۸½ سے لیکر ۱¾ بجے تک معین کیا گیا ہے۔ ہر ایک گھنٹے کے اختتام پر تھوڑا سا وقفہ چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ بچے کھیل کود لیں۔ اس دوران میں کمروں کے روشندان کھول دیے جاتے ہیں تاکہ تازہ ہوا کمروں میں بھر جائے۔ ان وقفوں کے ختم ہونے پر اعلیٰ جماعت کے طلبہ کا فرض ہے کہ وہ ادنیٰ جماعتوں کے بچوں کو کمروں میں واپس لے آئیں۔

تعداد کے لحاظ سے اُستاد اور شاگردوں کا تناسب ایک اور پندرہ کا ہے۔ مستقل اُستادوں کے علاوہ ایسے اُستاد بھی ہیں، جو نصف یوم کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ ٹریننگ کالجوں کے طلبہ ہوتے ہیں۔ جن سے ملازمت سے پیشتر مفت کام لیا جاتا ہے۔

دورانِ ہفتہ میں اساتذہ کے اوقات حسبِ ذیل ہیں:۔

(ا) اساتذہ علوم

پچاس سال تک کی عمر کے لیے	مرد ۲۶ گھنٹے۔ عورت ۲۳ گھنٹے	
پچاس سال سے اوپر کے لیے	مرد ۲۴ "	عورت ۲۳ "

(ب) اساتذہ ہُنر کے لیے مثلاً راگ، ڈرائنگ، سینا پرونا وغیرہ

پچاس سال تک کی عمر کے لیے	مرد ۲۸ گھنٹے۔ عورت ۲۵ گھنٹے	
پچاس سال کے اوپر کے لیے	مرد ۲۶ "	عورت ۲۴ "

امتحانات کا دستور ہمارے طریق سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں نہ تو امتحانی پرچہ جات ہی ہوتے ہیں اور نہ نمبر وغیرہ دیے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ یونیورسٹی کے اُس رواج کا پیش خیمہ ہے، جہاں طلبہ ذاتی تحقیق کے بعد فاضلانہ کتابیں اور جواب مضمون لکھتے ہیں اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں۔

چنانچہ بر موقع امتحان طلبہ سے ہر ایک مضمون کے کسی نہ کسی پہلو پر مختصر جواب مضمون لکھوائے جاتے ہیں۔ بہت سی سرخیاں اُن کے سامنے رکھ دی جاتی ہیں۔ وہ اُن میں سے ایک کو منتخب کر کے اُس پر جواب مضمون لکھ دیتے ہیں۔ اُستاد ہر ایک موضوع کے نیچے اُس کے اچھے اور بُرے نقاط لکھ دیتا ہے۔ جواب مضمون پر نمبر نہیں لگائے جاتے۔ بلکہ اُستاد یہ جانچتا ہے کہ آیا یہ چیز معیار کے مطابق ہے۔ اگر ہے، تو کس درجے تک۔ اس تحریری امتحان کے بعد زبانی امتحان بھی ہوتا ہے۔

ناظرین کی دلچسپی کی خاطر ہم ایک ماہرِ تعلیم پروفیسر کے ذاتی تجربے کا ذکر لکھتے ہیں۔ جس نے کچھ عرصہ ہُوا، جرمن اسکولوں کا معائنہ کیا۔ سب سے پہلے وہ ڈٹ شے اوبر اسکول میں گیا۔ استاد نے اپنا سبق چھوڑ کر اُسے ہندوستان پر بولنے کی دعوت دی۔ اتنا کہنے کی دیر تھی کہ لڑکے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور لیکچر کا انتظار اتنی گرم جوشی سے کرنے لگے کہ مہمان کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور

ہو گیا۔ چنانچہ فیصلہ یہ ٹھہرا کہ طلبہ سوال پوچھیں اور وہ ان کا جواب دے۔ ان سوالات کو دیکھ کر ہم حیران ہوتے ہیں کہ ہمارے اپنے ملک کے بچے ہندوستان کے متعلق اس قدر علم نہیں رکھتے جس قدر کہ جرمن طلبہ۔

چنانچہ بچوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ گاندھی جی آجکل کیا کر رہے ہیں۔

دوسرا سوال۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ انگریز تھوڑی سی قوت سے ہندوستانیوں کو دبائے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ یہ کہ ہندوستانی سپاہی انگریزوں کی کیوں مدد کرتے ہیں۔

تیسرا سوال۔ ذات پات کی تمیز کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ ہندو اور مسلمان آپس میں کیوں لڑتے ہیں۔

چوتھا سوال۔ اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں، تو کیا ہندوستانی اپنے ملک کو جاپانی تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ کیا ہندوستانی انگریزوں کو واقعی پسند کرتے ہیں۔ کیا جواہرلال نہرو صحیح معنوں میں ہندوستان کا رہنما ہے۔ ٹیگور کی کتنی عمر ہے۔ مہاراجے کیسے ہوتے ہیں۔ کیا تم نے جنگلات، شیر، ہاتھی اور سانپ دیکھے ہیں۔ فقیروں اور سادھوؤں کے متعلق تم کیا جانتے ہو۔

حال ہی میں ہٹلر نے اپنے ملک میں ایک نئی قسم کے اسکول جاری کیے ہیں۔ ان درسگاہوں کے تعلیم یافتہ نوجوان نوآبادیات میں بھیجے جائیں گے۔

جنوبی جرمنی میں آج سے چالیس سال قبل اسی قسم کا ایک اسکول کھولا گیا تھا جس کا نام ڈٹ شے کولونیل اسکول ہے۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں اسکول ہذا کو از سرِ نو منظم اور مستحکم کیا گیا۔ آجکل اس مدرسے کے ناظم کارل ڈبلیو کوپے ہیں۔ اس وقت یہاں دو سو طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ طلبہ کی مزید تعداد یہاں سما بھی نہیں سکتی۔ لہٰذا اسکول کی عمارت کو وسعت دینے کی کوشش

کی جا رہی ہے۔ اس درس گاہ میں درمیانے درجے کے خاندانوں کے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ کیونکہ اُن کے والدین بچوں کو باہر بھیجنے کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں۔ دیگر اسکول کی تعلیم ختم ہونے کے بعد طلبہ یہاں آتے ہیں اور پہلے دو سال میں زراعت سیکھتے ہیں خصوصاً کھیتی باڑی کا ہنر۔ اس عرصے کے اختتام پر اُنھیں معمولی قسم کا طب، زراعت، کیمیا، جغرافیہ اور کم از کم ایک دیسی زبان بھی سکھائی جاتی ہے۔ اسکول کی عمارت نہایت کشادہ ہے۔ سازو سامان اور فرنیچر وغیرہ بہت ہے۔ تمام تعلیم کچھ اس قسم کی ہے کہ طلبہ نو آبادیات میں جا کر آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔

اسی قسم کا ایک اسکول لڑکیوں کے لیے بھی کھولا گیا ہے، جسے کولونیل فران سکول کہتے ہیں۔ یہ درس گاہ شیلزوگ ہول سٹین (Schleswig Holstien) کے علاقے میں ہے۔ یہاں دو سو کے قریب طالبات داخل ہیں۔ اُنھیں نو آبادیات میں جا کر مائیں بن کر رہنا ہے۔ نصابِ تعلیم صرف خانگی سائنس ہے۔ لیکن یہ کورس دوسرے زنانہ مدرسوں کے کورس کی نسبت مختصر ہے۔ زیادہ تر توجہ عملی اور جسمانی کاموں پر دی جاتی ہے۔ مثلاً مکانات کی مرمت، نقش و نگار، حفظانِ صحت، فرنیچر بنانا اور مرمت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کا زراعتی کورس بھی عملی کاموں تک محدود ہے۔ مثلاً باغیچے لگانا، وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا درس گاہیں جرمنی میں جنگ عظیم سے پہلے بھی موجود تھیں۔ صرف ہٹلر اُنھیں ازسرِ نو منظم کر رہا ہے۔ اس کے اپنے عہد میں اس قسم کے اور اسکول بھی کھل گئے ہیں۔ حال ہی میں برلن کے نزدیک لیٹن برگ میں کولونیل پولیٹک اسکول Kolonial Politik Schule کھولا گیا ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ نوجوان نو آبادیات میں جا کر سیاسی پروپیگنڈا کریں گے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہٹلر نے اپنے عہد میں پروپیگنڈے کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس وقت نازی پروپیگنڈا تمام دنیا میں بڑی شد و مد سے جاری ہے۔ لہٰذا اس اسکول کی

غرض وغایت بھی یہی ہے کہ نوآبادیوں میں جاکر بھادہ لوح دیسی باشندوں کو نازی اصول بتائے جائیں اور اُنھیں نازی پارٹی کی حمایت کے لیے آمادہ کیا جائے۔ یہ تعلیم یافتہ نوجوان باہر جاکر زیادہ تر ان جرمنوں کو بیدار کرینگے، جو نوآبادیات میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ جرمن جو اپنے ملک میں آباد ہیں، ہٹلر کے اس پروپیگنڈے سے پیشتر ہی مرعوب ہو چکے ہیں۔ جو پریڈ لیکچر اور رات کے جلوسوں کے ذریعے کیا جارہا ہے۔ لیکن نوآبادیات کے جرمن باشندوں کو بیدار کرنا آسان کام نہیں، کیونکہ وہ ابھی نفسیاتِ گروہ (Group Crowd Psychology) سے واقف نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ جرمنی میں عنقریب ایک اور اسکول کھولا جائیگا۔ اس کا نام کولونیل ور والٹنگ اسکول (Kolonial Verwalting Schule) ہے۔ یہاں نوآبادیات کے ہونے والے اُستادوں اور سرکاری ملازموں کو تعلیم دی جائے گی۔ نصابِ تعلیم صرف تین مضامین پر مشتمل ہے۔ فنِ تعلیم، سیاسیات اور نظمِ مدرسہ۔ علاوہ ازیں جرمنی کے ہر ایک محکمہ کے زیرِ نگرانی ایک ایک ٹریننگ اسکول کھول دیا گیا ہے۔ مثلاً محکمہ جنگلات کے زیرِ تحت مدرسہ میں سکھایا جاتا ہے کہ نوآبادیات کی لکڑی کو کس طرح استعمال کرنا ہے۔ اسی سلسلے میں ہاتھی کی سواری کی بھی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اگر جرمنی کو کوئی بھی نوآبادی نصیب نہ ہوئی، تو یہ لاکھوں روپیہ بالکل رائیگاں جائیگا۔ اس کا ردِ عمل فی الوقت یوں کیا گیا ہے کہ ان تمام درس گاہوں کے گریجویٹ ان علاقوں میں بھیجے جارہے ہیں، جو کسی زمانے میں جرمنی کے قبضے میں تھے۔ یہ لوگ وہاں تعداد بڑھانے کے علاوہ نازی اصولوں کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔

کھیل کی اہمیّت

از

جگن ناتھ آزاد، بی اے، دیال سنگھ ہائی اسکول، لاہور

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ہم درس و تدریس کے طریقوں میں جس برق رفتاری سے ترقی کر رہے ہیں، کھیل کود اور جسمانی صحت کے معاملے میں اسی نسبت سے تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ آنے والی نسل گزشتہ نسل سے زیادہ زندہ دل، خوش باش، تندرست اور تنومند ہو لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہر نیا آفتاب ہمارے لیے پژمردگی اور افسردہ دلی کا پیغام بر ثابت ہوتا ہے۔

اسکول اور کالجوں میں دیکھیے، تو طلبہ کی ایک محدود جماعت کو چھوڑ کر باقی کے چہرے بے رونق، آنکھیں بے نور اور جسم نحیف و نزار دکھائی دیتے ہیں اور وہ مختصر سی جماعت بھی عام طور پر اُن طلبہ پر مشتمل ہوتی ہے، جو کھیل کے میدان کو اس قدر اہمیّت دیتے ہیں کہ تعلیم کا کمرہ اُن کے لیے سراسر بے وقعت ہو جاتا ہے اور اس پہلو میں وہ باقی طلبہ سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک نقص ہے، جس کا رفع کرنا اُتنا ہی ضروری ہے، جتنا کتاب کے کیڑوں اور افسردہ دل طلبہ کا کھیل کود کے سامان سے دلچسپی پیدا کرنا۔

ان اسباب کو رفع کرنے کے لیے کہاں تک کوشش کی گئی ہے اور اُسے کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی ہے، اس کا اندازہ ذیل کی سطور سے ہو سکیگا۔

عرصۂ دراز سے ماہرینِ تعلیم اس مسئلے پر پوری توجہ سے غور کر رہے ہیں اور کہا جا

سکتا ہے کہ اُنھیں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ گویا یہ کامیابی اتنی زیادہ نہیں کہ اس پر فخر کیا جا سکے۔ بعض ماہرین نے ڈرل کو روزانہ ٹائم ٹیبل کا ضروری جزو قرار دیا ہے اور بعض نے کھیل کے میدان کو اہمیت دی ہے۔ لیکن ہمارے طلبہ اپنی روایتی بے نظم زندگی اور ذوق و شوق کے فقدان کی وجہ سے ان سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکے۔

روزانہ تجربے کی بنا پر ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہر روز طلبہ کی ایک کافی تعداد ڈرل کے پیریڈ میں اپنے اپنے کمروں میں بیٹھی رہتی ہے اور بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ڈرل ماسٹر صاحب چھڑی ہاتھ میں لیے پیریڈ کے شروع میں کم از کم پانچ یا سات منٹ تک ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گشت لگا کر طلبہ کو باہر نکلنے کی سعیِ ناکام میں مصروف رہتے ہیں۔ کسی طالب علم کے "سر میں درد" ہوتا ہے اور کسی کے "پاؤں" میں۔ کوئی گھٹنے پر پٹی باندھ لیتا ہے، تو کوئی ٹخنے پر۔ طلبہ کے والدین تو اپنے بچوں کی جسمانی ورزش میں کوئی دلچسپی لیتے ہی نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے طلبہ کی لڑکپن میں "ضعیفی" کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

کالجوں میں بھی بعینہٖ اسی صورتِ حال کا سامنا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں سیکنڈ ایر کلاس میں تعلیم پاتا تھا، تو ہاکی کے کپتان کو ایک بار ایسے کھلاڑی کی تلاش میں سارا کالج چھاننا پڑا، جو ایک میچ کے دوران میں منتظر رکن کا کام دے سکے۔

اس صورتِ حال سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اپنی توجہ عملی کام کی طرف مبذول کریں۔ طلبہ کے والدین سے زیادہ توقع رکھنا فضول ہے۔ کیونکہ پچھتر فیصدی والدین کو دنیا کے دھندوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ اُن کے دل میں اس خیال کا کبھی گزر ہی نہیں ہوتا کہ قومی ترقی کا دارومدار بچوں کی جسمانی اور دماغی تربیت پر ہے۔ آج جو ننھے ننھے زرد چہرے ہمیں کھیل کے میدان سے بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کل انھیں کے کمزور کندھوں پر

ملکی نظم ونسق کا بوجھ پڑنے والا ہے۔ ضرورت ہے کہ محکمانہ پابندیوں کو پہلے کی نسبت زیادہ سخت کر دیا جائے۔ کارپردازانِ محکمۂ تعلیم کے لیے اب موزوں وقت ہے کہ وہ نرمی کو چھوڑ کر سختی سے اپنے قوانین اسکولوں پر عاید کرنے کی کوشش کریں۔ اسکولوں پر اور خاص کر مضافات کے اسکولوں پر تو اس قدر جمود طاری ہے کہ اُن میں ایک انقلاب کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ہر اسکول میں روزانہ کھیل اور ورزش کے لیے کم از کم دو گھنٹے وقف ہونے چاہییں اور ان دو گھنٹوں میں طلبہ کو اپنی مرضی پر نہ چھوڑ دیا جائے، بلکہ ایک مکمل طور پر تربیت یافتہ اُستاد کو ان کی نگرانی کے لیے مقرر کیا جائے، جو طلبہ کے باقاعدہ اصولوں کے مطابق کھیل میں حصہ لینے پر راغب کر سکے۔ وہ اُنھیں موزوں طریق پر کھیلنا سکھائے اور ان کے دل میں مقابلے کا ایک خوشگوار جذبہ پیدا کرے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ مقابلے کا یہ جذبہ حسد کی صورت اختیار نہ کرنے پائے۔ اس کے علاوہ بچّوں کے والدین کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ بچوں کی صحیح جسمانی اور دماغی تربیت کرنا ہی اپنے ملک کی، بلکہ بنی نوع انسان کی بہت بڑی خدمت ہے۔ ہر ہفتے اسکولوں کا معائنہ ہونا چاہیے۔ معائنے میں طلبہ کو بتایا جائے کہ صحت کو برقرار رکھنے اور جسم کو سڈول اور خوبصورت بنانے کے لیے کون کون سے اصول پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اُنھیں فرداً فرداً ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے پیش کیا جائے۔ اگر ہیڈ ماسٹر صاحبان اس امر کی جانب توجہ کرنے لگیں، تو وہ اپنے اہم فرائض سے بہت کچھ سبکدوش ہو جائیں گے۔

جب ہم اپنے مدارس کا یورپ کے اسکولوں سے مقابلہ کرتے ہیں، تو یہ دیکھ کر ایک نہایت ہی غمناک احساس ہوتا ہے کہ ہمارے طلبہ صحیح "بچپن" اور "لڑکپن" سے کس طرح محروم کیے جا رہے ہیں۔ کیا ہم اسی نسل کے بل بوتے پر آئندہ کشمکش میں کامیاب ہونگے؟

اس سلسلے میں آب و ہوا اور خوراک وغیرہ کی کمی کے متعلق تمام عذر غلط اور بے بنیاد

ہیں۔ ہمارے پیش رُو اسی سرزمین پر رہتے تھے۔ اسی آب و ہوا میں پلتے تھے اور تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ انھوں نے شجاعت اور جوانمردی کے وہ کارنامے دکھائے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ مفید خوراک کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ کیونکہ یہ مبحث ایک مستقل مضمون چاہتا ہے۔ فی الحال اسی پر اکتفا کی جاتی ہے کہ خوراک سادہ اور ہلکی ہونی چاہیے۔ اچھا دودھ اور گھی ایسی چیزیں ہیں۔ جن کا نعم البدل نہیں مل سکتا۔ جہاں تک ممکن ہو، ثقیل، چٹپٹی اور مرغّن غذا سے بچوں کو پرہیز لازمی ہے۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ ہمارے طلبہ کی جسمانی حالت یا دوسرے الفاظ میں قوم کی صحیح بہبودی بھی ترقی پذیر ہو سکتی ہے۔ جب اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر، کالجوں کے پرنسپل اور محکمہ تعلیم و صحت کے دیگر افسر کھیل کے میدان کو اُتنی ہی اہمیت دینے پر مصر ہو جائیں، جتنی آج درس و تدریس کے کمرے کو دی جا رہی ہے۔ ڈیوک آف ولنگٹن نے ایک بار کہا تھا کہ "واٹرلو کی جنگ ایٹن کے کھیل کے میدان میں جیتی گئی تھی"۔ اب وقت ہے کہ ہم آئرن ڈیوک کی اس بات پر دم بھر کے لیے غور کریں اور سوچیں کہ اگر کھیل کے میدان کی جانب سے ہم اسی طرح بے پروا رہے، تو زندگی اور دنیا کے میدانِ جنگ میں "واٹرلو" کی کتنی لڑائیاں جیت سکیں گے؟

ڈالٹن پلین

تجویز تعلیم انفرادی

از

محمد عبدالغفور خاں خلیق بسوی، ادیب فاضل، منشی فاضل

(گزشتہ سے پیوستہ)

ڈالٹن پلین کا طلبہ کی مجلسی زندگی پر اثر

انسان کی زندگی کا بہترین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اور اپنے ہم عصر لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ راحت و آسائش کے مواقع بہم پہنچا سکے۔ اس کا وجود اپنے جلیس و ہم پیشہ لوگوں کے لیے مسرت بخش و حوصلہ افزا ہو۔ اُسے ایک خوشنما پھول کی مثال ہونا چاہیے، جو شگفتگی و تازگی کی ہوا میں لہرا رہا ہو اور اُمنگوں کے سمندر میں طوفان پیدا کر کے ہر پاس سے گزرنے والے کی آنکھوں کو اپنی خوبصورتی و شگفتگی سے تازگی، روح کو مسرت اور دلآویز مہک سے مشامِ جان کو معطر کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

یہ بات نوجوانوں میں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے، جبکہ ہم مدرسے کی چار دیواری کے اندر کچھ ایسا ماحول تیار کر دیں۔ جس میں رہ کر بچہ آزادی کی ہوا میں اطمینان کا سانس لینا سیکھے اور مسرت و شادمانی کا احساس کرنے لگے۔ اس کے گرد و پیش کی تمام فضا علمی شادابیوں کا مرکز اُس کے آس پاس کی تمام ہستیوں کا شجرِ حیات شگفتگیوں کا متحرک مجسمہ اور اُس کی زمین و آسمان

انعاماتِ قدرت کا سچا نمونہ ہو، تاکہ وہ آزادی و مسرت کی بے پایاں راحت آفرینیوں کی آغوش میں مدارج ترقی طے کر سکے اور وہ جوہر جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے، باحسن وجوہ نشوونما پا سکے۔

آجکل ہندوستان پولیٹیکل اصلاحات کی نسبت مجلسی اصلاح کا بہت زیادہ محتاج ہے اور یہی طالب علم جو آج کم عمر بچے یا ناتجربہ کار نوجوان ہیں۔ کل کے آدمی ہیں، جو ہندوستان آئندہ کے مالک، لیڈر اور ریفارمر، جو بھی کہو بننے والے ہیں۔ اس لیے اگر مطلوب ہے کہ آئندہ ہندوستان مجلسی حیثیت سے کہیں زیادہ محتاج وارفع ہو، تو ضرورت ہے کہ آج ہم مدارس میں بغرض حصولِ تعلیم آنے والے بچوں کی مجلسی زندگی کی اصلاح و ترقی کی طرف پہلی فرصت میں متوجہ ہوں اور اس باب میں سرگرمی و دلچسپی کا اظہار کریں۔

حاصل کلام یہ کہ ہم مدرّس ہوں یا ریفارمر، لیڈر ہوں یا بیرسٹر جو بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں، طالب علموں میں ناقابلِ متزلزل کیرکٹر (سیرت) پیدا کرنے کے لیے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں، کریں اور نہایت سرگرمی و جوش دلی کے ساتھ کریں۔ دماغی و جسمانی قوت اور ناقابلِ تسخیر سیرت ہی ایک ایسا سرمایہ ہے، جو انسان کی آئندہ زندگی کو کامیاب و شاندار بنا سکتا ہے اور یہی وہ مستقل و پائدار ترکہ ہے، جو انسان کو اپنے پیش رَو انسانوں سے میسر آسکتا ہے۔ اس قسم کے سرمایے کے حصول کا بہترین زمانہ اگر ہو سکتا ہے، تو وہ یہی زمانہ ہے، جسے ہم مدرسے کی چاردیواری کے اندر اپنے ہمدرد رہنماؤں (اُستادوں) کی زیرِ نگرانی گزارتے ہیں۔ ایسے قیمتی سرمایہ اور ترکہ سے اپنے شاگردوں کو کسی حد تک محروم رکھنا اور اس کے بہترین وسائل و مواقع کو ہاتھ سے دے دینا ایک معلّم کی شان کے خلاف ہی نہیں، بلکہ اس کی اعلیٰ شخصیت اور وہم و گمان سے بھی بالاتر شرافت کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہوگا، جو تاریخی اعتبار سے

آنے والی نسلوں کے سامنے تادیر قائم رہیگا۔ اگر ایک نوجوان کسی وجہ سے اپنے باپ دادا کی جائداد، جو اُسے وراثتاً ملنی چاہیے، نہیں پا سکتا یا اگر پا لینے پر اپنی نادانی سے عیاشی و آوارگی کی نذر کر دیتا ہے، تو سخت صدمہ محسوس کرتا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ اگر صدمہ نہیں ہوتا، تو اُس سے بھی کہیں بیش قیمت سرمایے کے کھونے سے نہیں ہوتا یعنی جب ہم نیند کی نعمت سے اپنے آپ کو محروم کرتے ہیں، جس پر ہمارے تمام جسمانی اور دماغی قویٰ کی بحالی اور تازگی کا انحصار ہے، تو ہم مطلق محسوس نہیں کرتے کہ ہم نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلائی ہے اور ایسے قیمتی سرمایے کو ضائع کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے نقصان کی تلافی کسی دوسری شے سے ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسے ہی ہم نہایت بے دردی سے اپنے وقت کے انمول سرمایے کو ضائع کرتے اور ٹس سے مس ہوئے بغیر نہایت سنہری موقعوں کو ہاتھ سے نکل جانے دیتے ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر قابلِ افسوس وہ حالت ہے، جبکہ ہم سیرت جیسے بیش بہا سرمایے کو ضائع کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ جس پر کہ ہماری انسانیت کی عمارت کھڑی ہوتی اور ہماری زندگی کی آئندہ کامیابیوں کی شاندار فضائیں قائم ہوتی ہیں۔

خیر! اگر اس کا تعلق ہماری اپنی ہی ذات تک محدود رہتا اور ہمیں اپنی اس جماعت پروری کا احساس و صدمہ بھی نہ ہوتا، تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن جس صورت میں اس کا دور رس اثر اُن تمام ارد گرد کی شخصیتوں پر پڑنا ممکن ہے، جو اس ماحول میں رہتی اور زندگی کے اعلیٰ وارفع لطف سے بہرہ اندوز ہونا چاہتی ہیں تو یہ فروگزاشت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ دانستہ یا نادانستہ حماقت و بے پروائی سے یا مالی کفایت و شخصی تن آسانی کے خیال سے زندگی و کامیابی کے اس قیمتی عنصر کو ضائع کر دیا جائے، جو روحِ انسانی کا سب سے بیش بہا جوہر ہے۔

اعلیٰ شخصیت کے اس معیار کو بلند کرنے اور اس کے ذریعے مجلسی زندگی کو راحت آفریں

بنانے کے لیے "ڈالٹن پلین" کے نظامِ عمل میں بہترین مواقع حاصل ہیں، جبکہ مروجہ جماعتی طرزِ تعلیم میں اس کا سرتاپا فقدان ہے۔

جماعت بندی میں معمولی سی غلطی، جس کا بے حد امکان ہے۔ اُستاد و شاگرد دونوں کو افسردہ دل و مایوس بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ بقول شخصے ؏

"افسردہ دلے افسردہ کند انجمنے را"

اس ناگواریت کا ادنیٰ نمونہ شدہ شدہ تمام اسکول کو احاطہ کر لیتا اور تا حدِ امکان ایسے افراد کو کم کرتا چلا جاتا ہے۔ جن کے وجود سے طبیعت کو راحت و مسرّت حاصل ہو، مگر اس کے برعکس "ڈالٹن پلین" کے زیرِ نظام مدرسے کے در و دیوار سے آزادی و مسرّت، خود اعتمادی و دیانت، اطمینان و راحت اور استقلال و جرأت کی شعاعیں اُچٹ اُچٹ کر دائیں بائیں پھیلتی اور دوسرے کے دل و دماغ اور جسم و روح کو منوّر کرتی ہیں۔

مجوزہ طرزِ تعلیم (طریق انفرادی) نوجوانوں کو ذاتی اوصاف کی اس دولت کی قدر و قیمت سے آشنا و آگاہ کر دیتا ہے، جو ہمیشہ ان کے پاس رہتی ہے۔

ذاتی اوصاف کی دولت ہی وہ دولت ہے، جس کی افزونی میں ہمیں حریصانہ ہر چہار طرف دستِ طلب پھیلانا چاہیے اور اُس کے حصول کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ اگر ہم سچے معنوں میں ملک کی مجلسی خدمات سرانجام دینا اور نوجوانوں میں ذاتی اوصاف پیدا کر کے اُنھیں مجلسی زندگی کا اہل بنانا چاہتے ہیں، تو ہم کو ضرور اس طرزِ تعلیم کو اپنانا ہوگا اور اس مقصدِ اعلیٰ کے حصول کی خاطر روپیہ یا وقت بے دریغ صرف کرنا پڑیگا۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے، جس سے ہم ان لوگوں کی سیرت میں جو ہمارے ارد گرد ہیں، دل فریبی اور حسن کی شان پیدا کر سکتے ہیں۔

اب ہم انسانی سیرت کے اُن ضروری اوصاف کا ذکر فرداً فرداً کرینگے، جو براہِ راست

مجوزہ تجویز کے زیرِ عمل طلبہ کی فطرت میں نشوونما پاتے اور اُن کی مجلسی زندگی کو گہوارۂ راحت و مسرت بنا دیتے ہیں۔

۱۔ احتسابِ نفس اور اپنی کمزوری کا احساس

چونکہ اس طرزِ تعلیم کے دائرۂ عمل میں آتے ہی طالب علم کی روزانہ ترقّی و تنزّل کا دارومدار خود اس کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے اور وہ دوسرے ہوشیار و ذہین، رفقائے کار (یعنی جماعت طلبہ) کی اوٹ میں اُستاد کی نگاہ سے بچ نہیں سکتا، اس لیے وہ اپنے مجوزہ کام پر جس کی تکمیل کا اُس نے تحریری عہد کیا ہوتا ہے، سامنے رکھتا اور ایک طائرانہ نگاہ اس پر ڈالتا ہے، تو یک نظر اس پر اپنی منزلِ مقصود کا باب کھل جاتا ہے اور وہ قدرتاً کیا؟ اور کس طرح؟ کے ذہنی سوالات اپنے آپ سے کرکے اور اُن کی دلچسپ گہرائیوں میں پھنس کر مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی واقفیت کا جائزہ لے اور اپنی طاقت کو آزمائے۔ اس تمام غور و فکر کا قدرتی اور لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں اس کی علمی واقفیت سے متعلق کمزوریوں کا نقشہ کھنچ جاتا ہے اور اگر وہ زیادہ غور و فکر کرتا ہے، تو خود بخود، ورنہ اُستاد کے معمولی اشارے پر اس کو اپنی گزشتہ کوتاہیوں اور بے پروائیوں کی مضرت رساں تصویر آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتی ہے اور پشیمانی و ندامت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اب اگر یہ عمل جیسی کہ توقع ہے، تھوڑے وقفے سے بار بار ہوتا ہے، تو وہ ضمیر کی آواز سننے اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگتا ہے۔ اس کو اپنی تعلیمی خامیاں اور اُس کے ساتھ دوسری اخلاقی کمیاں محسوس کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغیر کسی بیرونی کوشش کے وہ اپنی اندرونی تحریک کے ذریعے اپنی سیرت کو بناتا اور عام مجلسی زندگی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

۲۔ دوستانہ و ہمدردانہ تعلّقات ۔ اس نظامِ عمل میں طلبہ کو اپنی اپنی ذمے داری

کا احساس ہوجاتا ہے اور وہ اپنی کشتی کو خود کھینے کی کوشش میں اپنے رفقائے کار سے تعاون کرنے اور ایک دوسرے کی جائز امداد کرنے لگتے ہیں اور اس طرح اُن کے دوستانہ تعلقات میں پختگی پیدا ہو کر جذباتِ ہمدردی کی نشوونما شروع ہوجاتی ہے، جو شدہ شدہ حسد کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا کر صلح و آشتی کی تسکین بخش برکات سے لذت آشنا ہوجاتے ہیں۔

گراف کارڈ (تختہ احتساب) کے ذریعے جونہی یہ معلوم کرتے ہیں کہ اُن کے ساتھی کی رفتار کسی خاص مضمون میں سست ہے یا اُن کا کوئی ساتھی بیماری وغیرہ کی چھٹی کے باعث پیچھے رہ گیا ہے، تو اُن کی رگِ ہمدردی پھڑک اُٹھتی ہے اور اُس کو ساتھ ملانے کی غرض سے مناسب و جائز مدد کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ الغرض ساتھ رہنے اور رکھنے کا خیال طلبہ کو ہمدردی، اخوت کا عملی سبق پڑھاتا اور اُن کی مجلسی زندگی کو خوش گوار بناتا رہتا ہے۔

تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اگر جذباتِ ہمدردی کی نشوونما پختگی کے ساتھ ہوجائے، تو اُنھیں اپنے گرد و پیش اس کو عمل میں لانے اور اپنے گاؤں، قصبہ، شہر یا ملک میں سوشل سروس (مجلسی خدمات) کے سینکڑوں مواقع آنے لگیں گے۔ وہ غریب و نادار ہونے پر بھی بنی نوع انسان میں سے ہزاروں کو اپنی امداد و ہمدردی کا محتاج پائیں گے۔

ہندوستان کی آبادی کا نسبتہً بہت کم حصہ تعلیم یافتہ ہے اور ایک بڑی تعداد ایسے نوجوانوں کی ہے، جن کو اسکول یا کالج میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر نہیں۔ اندریں صورت بہت سے نوجوان جو اعلیٰ تعلیم یافتہ یا ہنوز طالب علم ہی ہیں۔ اس جذبے کی بدولت ملک و قوم کی اس خدمت کو سرانجام دے سکتے اور اپنے ہم عمر ہمسایہ غریبوں کو دولتِ علم سے مالامال کر سکتے ہیں۔ ایسے غریب طبقات کے لوگ جو اپنے اور اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے نہ تو مدرسہ کھول سکتے ہیں اور نہ ہی اُستاد ملازم رکھ سکتے ہیں، وہ ہر ایسے مدارس شبینہ

(night school) کو خوش آمدید کہیں گے، جو رضا کارانہ کارکن نوجوانوں کی طرف سے کھولے جائیں۔

۳۔ اشتراکِ عمل و امدادِ باہمی

اِس تجویز کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو ضبطِ نفس کا پابند بنایا جائے اور اشتراکِ عمل اور امدادِ باہمی کے جذبے کی نشوونما کی جائے۔ کیونکہ وہ اپنی مختصر سی دنیا میں (جہاں اُسے آزاد مگر ذمّے داری کا احساس قوی دلاکر چھوڑ دیا گیا ہے) دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ گویا افادہ و استفادہ کرتا ہے اور اس طرح مجلسی رُوح کو ترقی دیتا ہے۔

اس تجویز میں طالب علم کے سال بھر کے کام کو مقرر کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے سامنے ایک منزلِ مقصود اور ایک نصب العین رکھتا ہے، جسے اُس کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے کام کو اپنی مرضی کے مطابق ترتیب و تنظیم دیتا ہے اور وہ ذاتی سعی کو کام میں لاکر اپنی ذہنی قابلیت اور دماغی اہلیت سے کرتا ہے۔ چونکہ اُس کے رُفقائے کار بھی بطور ہم سفر اُسی منزل کی طرف جا رہے ہیں، اس لیے وہ اپنے ہم سفروں سے تعاون کرتا ہے۔ گو اُس کی آخری کامیابی و کامرانی تمام تر خود اُس کی اپنی ذات پر منحصر ہوتی ہے، لیکن پھر بھی بہت کچھ وُہ اپنے ساتھیوں کے تعاون اور باہمی اشتراکِ عمل کی بدولت سیکھتا ہے۔ اس طرح جو کچھ بھی وُہ حاصل کرتا ہے، حقیقی معنوں میں ایجوکیشن (تعلیم) ہے، یعنی قوامی داخلہ کو عروج دے کر بیرونی دنیا میں ظاہر ہوتا ہے۔

تعلیمِ انفرادی میں اُستاد کا واسطہ ہر طالب علم سے ہو جاتا ہے اور وہ طلبہ کو مشورہ دیتا اور بوقتِ ضرورت طلبہ کو مدد بھی دیتا ہے، جبکہ کوئی خاص اور مشکل مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ اِس لیے طلبہ میں قدرتی طور پر اُستاد کی بروقت امداد سے امداد کی ضرورت و طریقے کا صحیح مفہوم،

موقع سمجھنے کا احساس پیدا ہوتا ہے، جو بڑھتے ہوتے اپنے ہم جماعت و رفقائے کار بچوں کی امداد کی صورت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور جلسۂ مشاورت میں کسی خاص مشکل مسئلہ کو باہمی ارتباط واتحاد سے جب حل کیا جاتا ہے، تو اشتراکِ عمل اور امدادِ باہمی کی قدر و قیمت اُنھیں معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ ایک دوسرے کی مشکلات میں ہاتھ بٹانے کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔

۴۔ اخلاقی جُرأت

اخلاقی جُرأت ایک ایسی چیز ہے، جو فی زمانہ طلبہ ہی نہیں، بلکہ بڑی بڑی مسلّمہ ہستیوں میں بھی مفقود ہے اور اس کی ایک بڑی وجہ خود اعتمادی کی کمی اور ضرورت شرم و حیا کی زیادتی ہے۔ سوسائٹی کا خوف اکثر ضمیر کی آواز کو دباتے دباتے انسان کو بزدل بنا دیتا ہے۔ انسان جو فطرتاً خود اپنا خوشامدی ہے، اپنی ذہنی اور اخلاقی کمزوریوں کو چھپاتا اور اور نشۂ پندار میں سرشار ہو کر اپنے آپ کو ایسا سمجھنے لگتا ہے، جیسا کہ دراصل وہ نہیں ہے۔ یہ ایسی مکروہ بیماری ہے کہ جس کا علاج اگر شروع ہی میں نہ کیا جائے، تو تپِ دِق کی طرح انسان کو انسانیت کے مرتبۂ اعلیٰ سے گرائے بغیر نہیں چھوڑتی اور جماعتی تعلیم کا طریقہ اس مرض کا ملجا و ماویٰ ہے۔ اس لیے اس تجویز انفرادی میں جہاں اور خوبیاں ہیں وہاں ایک یہ بھی خوبی ہے کہ طالب علم اُستاد کی فخر خوری کرنے کے بجائے کام کا بہت زیادہ اور ضروری حصّہ خود کرتے ہیں۔ جو طلبا جماعتی تعلیم کے دوران میں اپنا وقت ادھر اُدھر دیکھ کر یا پھر کر ضائع کر دیا کرتے تھے، اُن کو اب ذمّے دارانہ احساس کے ساتھ بہ سنجیدگی تمام کام کرنا پڑتا ہے نیز چونکہ اب اُنھیں تعلیمی سوالات کے جوابات نہ دے سکنے کی وجہ سے اپنے ہمسروں میں خفّت برداشت کرنی بھی نہیں پڑتی۔ اس لیے وہ اس نظام کے ماتحت نہایت شوق سے کام کرتے ہیں اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ ان کا

دماغ اُن کو حیلے حوالے سوچنے کے بجائے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی تدابیر سمجھاتا ہے اور وہ اخلاقی جرأت سے کام لینے کے قابل بننے لگتے ہیں۔

شرمیلے طالب علم جو جماعت میں اُستاد کی نظر بچا کر بیٹھتے اور اس سے کوئی بات پوچھتے ہوئے جھجکتے تھے، اب وہ بلا تامل تنہا اُستاد کے پاس جا کر اپنی مشکلات رفع کرا لیتے ہیں۔ اس سے اُستاد اور شاگرد کے تعلقات گہرے ہو جاتے ہیں اور اُستاد اپنے شاگردوں کی اخلاقی کمزوریوں کو سمجھ کر مناسب تدابیر عمل میں لاسکتا ہے۔ طلبہ کتب کے باقاعدہ استعمال، ضمیروں اور اشاروں کی تلاش میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے اور اُستاد کے بروقت ضرورت راہ پر ڈال دینے کے مفاد سے متاثر ہو کر اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا اظہار کرنے لگ جاتے ہیں اور اپنی غلطی کو چھپانے کے بجائے مردانہ طور پر اُستاد کے سامنے رکھتے اور اصلاح چاہتے ہیں۔ آئے دن کی یہی ہلکی ہلکی مشقیں عملی دنیا میں قابلِ تعریف اخلاقی جرأت کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں اور وہ کسی غلطی کا اعتراف کرنے میں اخلاقی جرأت سے کام لینا سیکھ جاتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

پنجاب کی خبریں

حضور گورنر پنجاب اس امر کا اختیار دیتے ہیں کہ ضابطۂ تعلیم پنجاب کی گیارھویں ایڈیشن میں، جسے ۳۲ سنہء، ۳۴ سنہء اور ۳۹ سنہء میں دوبارہ طبع کیا گیا، مندرجہ ذیل ترمیم کی جائے۔

دفعہ ۱۹۱۔ جسمانی سزا | موجودہ دفعہ کے بجائے، دفعہ ۱۹۱ کو یوں پڑھا جائے۔ لڑکوں کے مسلمہ مدارس میں بدچلنی کی سزا صرف ہیڈ ماسٹر ہی دے سکتا ہے۔ یہ سزا ہاتھ کی ہتھیلی پر بید سے ضربات کی شکل میں دی جائیگی۔ ایسی ہر سزا کو درج رجسٹر کرنا ہوگا اور ہر حالت میں سزا یافتہ لڑکے کے والد یا سرپرست کو اطلاع دینی ہوگی۔ کسی گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج میں یا کسی ایسے ہی پرائیویٹ طور پر منظم کالج میں جس کی میٹریکولیشن کی جماعتیں سررشتۂ تعلیم پنجاب نے منظور کر لی ہوں، جسمانی سزا نہیں دی جائیگی۔"

مندرجہ ذیل سطور کو دفعہ ۱۹۱ (الف) کے طور پر پڑھا جائے۔

ضبط مدرسہ کی قانون شکنی کے لیے سزائے جرمانہ | دفعہ ۱۹۱ (الف) کسی گورنمنٹ یا بورڈ اسکول کا ہیڈ ماسٹر سزائے جرمانہ دے سکتا ہے، جو ایک روپے سے زیادہ فی ضبط شکنی نہ ہو۔"

امرتسر میں تعلیم بالغاں | ۲۰ جولائی ۳۹ سنہء کو آنریبل میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم نے امرتسر میں اس خواندگی کے مرکز کا معائنہ فرمایا، جسے ایم، بی اسکول کے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے جاری کر رکھا ہے۔ جناب وزیر تعلیم کا استقبال شیخ احمد صادق سینیئر وائس پریزیڈنٹ ایگزیکٹو افسر اور کمیٹی کے دوسرے ممبر صاحبان نے کیا۔ میونسپل کمیٹی کے مختلف شعبوں کے قریباً دو سو ملازمین

اور وہ بالغان جنھیں حال ہی میں خواندہ بنایا جا چکا تھا، وزیر صاحب کے حضور میں پیش کیے گئے۔ جناب میاں صاحب ہر بالغ سے ملے اور اس سے خوش کلامی سے گفتگو کی اور علم کی مبادیات حاصل کرنے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ بعد ازاں آپ نے تعلیم بالغاں کے ان مرکزوں کا معائنہ کیا، جنھیں انجمن عثمانیہ اور مقامی ریفارمیٹری نے جاری کر رکھا ہے۔ وزیر صاحب نے کمیٹی کے محکمۂ تعلیم کی اس توجہ پر اظہار خوشنودی فرمایا، جو اس تحریک اور اس کی ترقی کی طرف کی جا رہی ہے۔ آپ نے بیس روپے بالغاں میں شیرینی تقسیم کرنے کے لیے عنایت فرمائے۔ آپ نے میونسپل کمشنر صاحبان اور مدرسین کی تعداد کے سامنے لازمی تعلیم اور بالغاں کی خواندگی پر اسی روز ایک خطبہ دیا۔

ضلع کانگڑہ میں خواندگی کی تحریک

پنجاب کی سرکار کی اس پالیسی کی پیروی کرتے ہوئے اور ساتھ ہی آنریبل وزیر تعلیم کے اپیل کرنے پر سردار دیوا سنگھ صاحب ایم اے، پی ای ایس انسپکٹر مدارس حلقہ جالندھر، ضلع کانگڑہ میں ایک زبردست تحریک خواندگی کرتے رہے ہیں۔ ہائی اسکولوں اور اینگلو ورنیکلر مڈل اسکولوں کا معائنہ کرتے وقت اُنھوں نے مدرسین اور طلبہ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے گاؤں میں، موسم گرما کی تعطیل کے دوران میں خواندگی کا پُرزور پروپیگنڈا کریں۔

یکم اگست ۳۹ء کو دھرم سالہ میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔ جس میں ۱۵۰ آدمیوں سے زیادہ لوگ حاضر تھے۔ ان میں کچھ سرکاری و غیر سرکاری آدمی تھے۔ کچھ ضلع کے ہیڈ ماسٹر اور کچھ شہر کے معززین شامل ہوئے۔ مسٹر پی، آر، ٹانڈن، آئی ای ایس، ڈپٹی کمشنر نے جلسے کی صدارت لی۔ ایک دلچسپ اور مفید پروگرام پیش کیا گیا۔ اسکولوں کے ڈی، آئی صاحبان نے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے، ان تمام تدابیر کا بالتفصیل ذکر کیا، جو ضلع میں اس تحریک کے چلانے میں

اختیار کی گئی تھیں اور ساتھ ہی اس ترقی کی طرف اشارہ کیا، جو تعلیم بالغاں کے معاملے میں کی گئی تھی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے تمام سرکاری اور غیر سرکاری اصحاب کو مشورہ دیا کہ وہ محکمۂ تعلیم کو ضلع سے بے علمی دور کرنے کی غرض سے مدد دیں اور ضلع اور تحصیل کی انجمنوں میں شامل ہوں، جو اس تحریک کے سلسلے میں مرتّب کی جائیں گی۔

انسپکٹر صاحب مدارس نے دوسرے ملکوں اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے خواندہ لوگوں کی فیصدی تعداد بتا کر افسوس ظاہر کیا کہ پنجاب اور ضلع کانگڑہ میں خواندہ لوگوں کی اوسط فی صدی بہت ہی کم ہے۔ اُنھوں نے دوسرے محکموں کے افسر اور تمام ہیڈ ماسٹر صاحبان سے درخواست کی کہ وہ کام کو تن دہی کے ساتھ چلائیں اور اس مقصد کے لیے مقامی انجمنیں قائم کریں۔

لالہ نگین چند صاحب وکیل دھرم سالہ نے تعلیم بالغاں کے متعلق تفصیل کے ساتھ لوگوں کو ان کی ذمّے داریوں اور فرائض سے آگاہ کیا۔

شیخ غلام حسین صاحب پی ای ایس، ڈپٹی انسپکٹر مدارس نے خواندگی کے معرکے کو دیہات میں کامیاب بنانے کے لیے مختلف تدابیر کا ذکر کیا۔

چالیس آدمیوں کی انجمن ضلع مرتب کی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ اس انجمن کا پہلا اجلاس ۱۴/ اگست سنہ ۳۹ء کو منعقد کیا جائے۔

ضلع گوجرانوالہ کی انجمن مخالف بے علمی

ضلع گوجرانوالہ میں بے علمی کی مخالف انجمن کے افتتاح کے سلسلے میں آنریبل میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم نے شیخ محمد شریف صاحب انسپکٹر مدارس لاہور کے ہمراہ ۱۹/ جولائی سنہ ۳۹ء کو گوجرانوالہ کا معائنہ کیا۔ جناب میاں صاحب کا استقبال سردار قبال سنگھ صاحب ڈپٹی کمشنر اور ضلع کے دوسرے افسروں نے کیا۔ تمام نے مل کر وہ مراکز خواندگی

کا معائنہ کیا۔ ایک مرکز کھوکھرکے میں ہے، جہاں ۴۵ بالغاں کو ایک مسجد میں مقامی امام مسجد صاحب تعلیم دیتے تھے۔ دوسرا مرکز ضلع ڈھلا میں ہے۔ یہاں ۲۵ بالغاں تعلیم پا رہے تھے۔ وزیر تعلیم نے خواندگی کی اس کوشش پر جسے مسٹر میمنی ڈسٹرکٹ انسپکٹر ضلع ہذا نے شروع کر رکھا ہے، اظہار مسرت فرمایا۔ کھوکھرکے میں بالغاں کی تعلیم کے لیے ایک کتب خانے کے اجرا کی غرض سے مبلغ پچاس روپے چندہ جمع کیا گیا اور آنریبل وزیر تعلیم نے اپنی جیب خاص سے مبلغ دس روپے بالغان کو شیرینی تقسیم کرنے کے لیے عنایت فرمائے۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ بورڈ ہال گوجرانوالہ ضلع کے نمائندوں کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس کی غرض و غایت انجمن مخالف بے علمی کا قائم کرنا تھی۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس اعلان کی طرف اشارہ کیا، جو ۱۹۳۷ء میں خواندگی پھیلانے کے متعلق کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی لاہور ڈویژن میں ان بار آور نتائج اور کوششوں کا ذکر بھی کیا۔ جو اس کام میں اس ڈویژن کے اندر کی گئی تھیں۔

اس کے بعد وزیر تعلیم نے کانفرنس کو اس مضمون پر مخاطب کرتے ہوئے کچھ عرصے تک بچے اور بالغ کی نفسانی حالتوں اور ان کے نفس پر اثر ڈالنے کے مختلف طریقوں کا ذکر کیا اور فرمایا "میں تعلیم کی بھیک مانگنے کے لیے آپ کے سامنے کاسۂ گدا گری لے کر آیا ہوں اور میں ہر جگہ یہی بھیک مانگتا ہوں۔ میں آپ سے بالغاں کی تعلیم کا سوال کرتا ہوں۔ یہ ایک قومی سوال ہے اور مجھے اس کی حمایت کرنا ہے۔" اس کے بعد انھوں نے حاضرین سے پرزور خواہش ظاہر کی کہ ملک کی محبت کی خاطر اس کام کا بیڑا اٹھایا جائے۔ چنانچہ انھوں نے بعض مثالیں دے کر بتایا کہ اس مرحلے کو پنجاب کے بعض حصوں میں کیونکر کامیاب بنایا جا چکا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ انھوں نے اس شریفانہ کام کے انجام دینے میں دن رات ایک کر دیا اور مختلف ضلعوں کے سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں اور ہر قسم کے ذرائع حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت

نہیں کیا۔ تاکہ اس کوشش میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ چنانچہ گزشتہ سال سے تعلیم بالغاں کے سلسلے میں لوگوں کی عام بیداری اور نتائج موجب اطمینان ہُوئے ہیں۔

اس کے بعد انجمن مذکور کو رسمی طور پر منظم کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اس کے صدر اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر اس کے ناظم یعنی سیکرٹری مقرر کیے گئے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے اُن مختلف عہدہ داروں اور ممبران انجمن کے نام پڑھ کر سُنائے، جو ضلع بھر کے نمائندے تھے اور آنریبل وزیر تعلیم کا جنھوں نے کانفرنس میں تقریر فرمائی تھی، شکریہ ادا کیا گیا۔

انبالہ کے ورنیکلر کب ماسٹروں کا ٹریننگ کورس ضلع انبالہ کی بوائے اسکاؤٹ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ورنیکلر کب ماسٹروں کے پہلے ٹریننگ کورس کا مسلم ہائی اسکول انبالہ شہر میں یکم تا ۶ راگست ۳۹ء انتظام کیا گیا۔ اس کورس کو ضلع کے نائب اسکاؤٹ کمشنر اور دو ماتحتوں نے چلایا۔ ۴۶ آدمیوں کو ٹریننگ دی گئی، جو ضلع کے مختلف مقامات سے منتخب کیے گئے تھے۔ سردار ہردیال سنگھ بی اے، بی ٹی، ڈی سی سی، اے کے ایل، قائم مقام پراونشل سکرٹری پنجاب بوائے اسکاؤٹ ایسوسی ایشن ۴ راگست کو تشریف لائے اور یہ معلوم کرکے محظوظ ہُوئے کہ ٹریننگ صحیح طریق پر دی جا رہی ہے۔ اُنھوں نے مقامی کیمپ کے سردار کی سفارش کے مطابق، صوبے کی طرف سے ٹریننگ کی اسناد کا جاری کرنا منظور کیا۔ ۵ راگست کی سہ پہر کو کب اسکاؤٹوں کے ہنر کا ایک عام مظاہرہ کیا گیا اور بعد ازاں انبالہ ڈویژن کے ضلع کے اسکاؤٹ کمشنر نے انعامات تقسیم کیے اور اُنھوں نے سردار ہردیال سے خطبہ دینے کی درخواست کی۔ اس خطبے کو محویت کے ساتھ سنا گیا۔ کورس ہذا کو ضلع کے نائب اسکاؤٹ کمشنر نے رسمی طور پر ختم کیا اور ساتھ ہی ایک مختصر سی مؤثر رسم ادا کی گئی۔

برانچ اسکول ساکوہ کا معائنہ لالہ جگجیت سنگھ، سردار نرنجن سنگھ بیدی، ہیڈ ماسٹر

ظفروال گورنمنٹ ہائی اسکول

مسٹر ڈبلیو ایچ ایف آرمسٹرانگ صاحب ایم اے، آئی ای ایس اور شیخ محمد شریف صاحب ایم اے، انسپکٹر مدارس لاہور ۲۸ نومبر ۱۹۳۹ء کو ۱۲½ بجے ظفروال گورنمنٹ ہائی اسکول میں تشریف فرما ہوئے تاکہ مدرسہ ہٰذا کی عمارت کی رسم افتتاح ادا کریں۔ سکاوٹ طلبہ نے آپ کا استقبال کیا۔ مدرسے کے دروازے کا قفل کھولنے کے بعد آپ نے اسکول کی سجی سجائی عمارت میں گشت لگائی۔ مہمانِ محترم نے ماس ڈرل کو ملاحظہ فرمایا۔ شہر اور مضافات کے لوگ اس مبارک رسم کو دیکھنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ لالہ دیو کی نندن صاحب ہیڈ ماسٹر نے اسکول کی کارگزاری کے متعلق مختصر رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ صاحب موصوف نے بحیثیت صدر حاضرین کے سامنے تقریر دلپذیر فرمائی۔ مقامی طلبہ پرائمری مدارس کو مٹھائی تقسیم کی گئی اور جلسہ کامیاب رہا۔

گورنمنٹ ہائی اسکول پھلور

اسکول یونین کے زیر اہتمام مدرسہ ہٰذا کے ہال میں پنڈت امرناتھ صاحب نے ۲۵ نومبر ۱۹۳۹ء کو ایک لیکچر ہوابازی کے موضوع پر جادو کی لالٹین کے ذریعے دیا۔ لیکچرار صاحب نے ہوابازی کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ موجودہ ہوائی سفر میں اب خطرہ نہیں رہا۔ دشمن پر مشین گن کے ذریعے بم برسانے اور ہوائی چھتری کے ذریعے زمین پر اترنے کی تصاویر بہت دلچسپ تھیں۔ حاضرین کی موجودگی سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

تعلیم جدید کی کانفرنس اور نمائش

نیو ایجوکیشن فیلوشپ (جمعیتِ تعلیم جدید) نے ۲۳ تا ۲۵ فروری ۱۹۴۰ء کو سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور میں ایک تعلیمی کانفرنس اور بچوں کی تیار کی ہوئی مصنوعات کی نمائش کے انعقاد کا اہتمام کیا ہے۔ یہ نمائش تین حصوں پر مشتمل ہوگی۔ ہر حصے کے بہترین تخلیقی کام کے لیے طلبہ کو انعامات اور مدارس کو اسناد تقسیم کی جائیں گی۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان اور ہیڈ مسٹرس صاحبات مدارس سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ

اور انتہائی دلچسپی کا جو وہ اس کارِ خیر میں لے رہے ہیں اور لالہ ہری چند صاحب کا اس موقع پر مٹھائی تقسیم کرنے کے متعلق اور گورنمنٹ ہائی اسکول کے عملے کا اس نائد تعلیمی کام کرنے کا شکریہ ادا کیا اور اس سنٹر کی کامیابی کے ساتھ چلنے کی دعا کی شیخ سخاوت حسین صاحب اسٹیشن ماسٹر نے ایک مؤثر تقریر میں بالغاں کو نصیحت کی کہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں اور اُستاد صاحبان اور بالغاں کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچانے کی رضامندی کا اظہار فرمایا اور اس کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے گورنمنٹ ہائی اسکول کے عملہ کی ضیافت طبع کے لیے ریفرش منٹ پیش کی اور جلسہ برخاست ہوا۔

اشتہار

تختِ طاؤس

مصنفہ

مولوی محمد عبداللطیف خان کشتہ قادری

یہ کتاب مولانا کشتہ قادری کی ہفت سالہ تخلیقی و تفتیشی مساعی کا نتیجہ ہے۔ تختِ طاؤس عہدِ مغلیہ کی زرگری، جواہر تراشی و خوش مذاقی کا مرقع تھا اور اس کی صنعت، صنعتِ ایران و ہندوستان کا ایک دلآویز سنگم تھی۔ جس کی زیارت کے لیے دُور دُور کے ملکوں کے لوگ صعوباتِ سفر ہنسی خوشی برداشت کرکے آتے اور تازگیٔ نظر و تفریحِ قلب و تحیر کا پرشاد لے کر جاتے اور یہ تبرک مدتِ دراز تک ان کو تر زبان و خوش بیان رکھتا تھا۔ کتاب ہٰذا اسی بے مثل تخت کے وقائعِ تاریخی پر مشتمل ہے۔ حقیقتاً اس تخت کے پردے میں ایشیائی دماغی لطافتوں کے سینکڑوں مرقعے چھپے ہوئے تھے، جن کو منظرِ عام پر لا کر مولانائے موصوف نے ملک و قوم پر ایک زبردست احسان کیا ہے اور ان کی یہ کدوکاوش قابلِ شکر گزاری ہے۔

ہمارے یہاں کی بہت کم تاریخی کتب ایسی ہیں، جن میں وسعتِ مطالعہ، غور و تحقیق، تفتیش، تنقید، علمی و منطقی استدلال و آزادہ خیالی سے کام لیا گیا ہو اور اُن کے مؤلفین و مصنفین نے روایت و درایت کی علمی جانچ پڑتال کی ہو۔ اپنی طبیعت سے کسی نتیجے پر پہنچے ہوں۔ پیچیدہ مسائل کو تقسیم و تحلیل کرتے ہوئے کوئی انکشاف کیا ہو اور اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھا کر اس طرح ترتیب دیا ہو کہ اُن کی اصلی حالت نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مگر پیشِ نظر کتاب تاریخ "تختِ طاؤس" ان تمام اوصاف سے متصف ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

اشتہار

دیہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لیے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس مضمون حال ہی میں ورنیکلر فائنل کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لیے مخصوص ہوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر کوئی جامع کتاب نہ تھی۔ طلبہ کی اس دقت کا احساس کرتے ہوئے زرِ کثیر صرف کر کے مجوزہ سکیم کے عین مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ بہ سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب، برائے جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے۔ جس کی عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے اور ہر امر کو روزمرّہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ تصاویر سے واضح کیا گیا ہے اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے۔ سلسلہ ہذا طلبہ کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔ اس کے مطالعے سے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان و دیگر سائنس کے مدرسین اصحاب اپنے مدارس میں جاری کرا کے جہاں ہمیں ممنون و مشکور فرمائیں گے وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبودی میں بھی خوشی محسوس کریں گے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت ۵ آنے ۴ پائی
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	〃 ۵ 〃 ۲ 〃
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	〃 ۷ 〃 ۱۰ 〃
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	〃 ۱۴ 〃 ۲ 〃

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۶ر
۲	〃 〃 دوسری 〃 〃	۷ر۴ پائی
۳	〃 〃 تیسری 〃 〃	۹ر۹ 〃
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر
۵	〃 〃 دوم	۳ر۷ 〃
۶	〃 〃 سوم	۷ر
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر
۸	〃 〃 دوم	۳ر۷ 〃
۹	〃 〃 سوم	۷ر
۱۰	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲ر۹ 〃
۱۱	〃 〃 نمبر ۲	۳ر۱۰ 〃
۱۲	〃 〃 نمبر ۳	۵ر۲ 〃
۱۳	انوار سہیلی کے انمول موتی 〃 〃 حصہ ۱ 〃 〃	۲ر۸ 〃
۱۴	〃 〃 حصہ ۲ 〃 〃	۳ر۱۰ 〃
۱۵	〃 〃 حصہ ۳ 〃 〃	۵ر۲ 〃
۱۶	دلچسپ تاریخی کہانیاں 〃 حصہ اوّل 〃	۷ر۷ 〃
۱۷	〃 حصہ دوم 〃	۸ر۱۱ 〃
۱۸	〃 حصہ سوم 〃	۷ر

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۹	کام کی باتیں حصہ اوّل	۳ر۹ پائی
۲۰	〃 〃 〃 دوم	۳ر۲ 〃
۲۱	قصص ہند حصہ اوّل	۲ر۳ 〃
۲۲	〃 〃 حصہ دوم	۸ر۳ 〃
۲۳	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۲۴	حسینہ اور وحشی . . .	۱ر۵ 〃
۲۵	شہزادہ مہربان	۲ر۶ 〃
۲۶	راما سیتا	۱ر۱۰ 〃
۲۷	جادو کا مٹکا مسٹر رلیا رام	۳ر
۲۸	درو پدی	۱ر۸ 〃
۲۹	مہاراجہ رنجیت سنگھ . .	۴ر۶ 〃
۳۰	خلیفہ ہارون الرشید .	۴ر
۳۱	راجہ اشوک	۵ر
۳۲	مہارانا پرتاپ	۲ر۱ 〃
۳۳	شہاب الدین شاہجہان .	۲ر۱۰ 〃
۳۴	شیر شاہ سوری . . .	۲ر۱۱ 〃
۳۵	نصیر الدین ہمایوں . . .	۲ر۱۰ 〃
۳۶	اورنگ زیب عالمگیر .	۲ر۹ 〃
۳۷	سلطان علاؤ الدین خلجی .	۲ر۱۱ 〃
۳۸	شہاب الدین غوری . . .	۲ر۸ 〃
۳۹	فیروز الدین تغلق	۳ر

اشتہار

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۰	نورالدین جہانگیر	۲ر۳ پائی
۴۱	امیر تیمور	۲ر۷ 〃
۴۲	پرتھوی راج	۲ر۷ 〃
۴۳	محمود غزنوی	۲ر۶ 〃
۴۴	مصر کی داستان	۳ر
۴۵	جاپان کی کہانی	۴ر
۴۶	چین کی کہانی	۳ر۶ 〃
۴۷	مستورات چین و جاپان	۴ر
۴۸	ایران کی کہانی	۳ر۶ 〃
۴۹	ایشیائی روم	۲ر۷ 〃
۵۰	ٹرکی (یورپی روم)	۲ر۷ 〃
۵۱	لنکا	۱ر۱۱ 〃
۵۲	بصرا و بغداد	۵ر
۵۳	یونان	۲ر
۵۴	تین سوال	۲ر۷ 〃
۵۵	امرت ورشا	۳ر۱۰ 〃
۵۶	زمانۂ سلف کے قصے کہانیاں نمبر۱ داؤد بادشاہ	۳ر۹ 〃
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں حصۂ اول	۳ر۹ 〃
۵۸	〃 〃 دوم 〃	۴ر۵ 〃
۵۹	خوفناک خواب	۲ر
۶۰	ہیرالال	۲ر۶ 〃
۶۱	دولت کی پٹاری	۲ر۱ 〃
۶۲	سادھو کی چکی	۲ر
۶۳	نیلا باز	۲ر۱۱ 〃
۶۴	بہادر شہزادہ	۲ر۱ 〃
۶۵	جوتی موتی	۲ر۱۰ پائی
۶۶	جواہرات کا خزانہ	۳ر۷ 〃
۶۷	مچھوا اور سوناہوا (باتصویر)	۲ر
۶۸	علی بابا چالیس چور	۴ر
۶۹	علاؤالدین و عجیب و غریب لیمپ	۴ر۶ پائی
۷۰	ملا دو پیازے کا سفر	۳ر
۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۷۲	نیشاپور کا سوداگر	۲ر۱۱ 〃
۷۳	پرستان کا موچی	۳ر
۷۴	سندر پیاری	۳ر
۷۵	چاندی کی کنجی	۳ر
۷۶	سلکِ جواہر نمبر۱ (حکمرانی کا گر)	۲ر۶ پائی
۷۷	〃 〃 نمبر۲ (اوج و پستی)	۱ر۶ 〃
۷۸	〃 〃 نمبر۳ (شہیدِ الفت)	۱ر۶ 〃
۷۹	سلکِ جواہر - مردِ میدان	۱ر۶ 〃
۸۰	〃 〃 نیک و بد	۱ر۹ 〃
۸۱	〃 〃 عیب و ہنر	۱ر۴ 〃
۸۲	〃 〃 جہاں گرد	۱ر۶ 〃
۸۳	〃 〃 جواب باصواب	۱ر۱۰ 〃
۸۴	〃 〃 سخاوت کی انتہا	۱ر۲ 〃
۸۵	〃 〃 حسن تدبیر	۱ر۶ 〃
۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہریت	۱ر۳ 〃
۸۷	ڈرامہ غم خوار عالم	۱ر۷ 〃
۸۸	مہاراجہ بکرماجیت اور اس کا تخت	۱ر۶ 〃

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

جلد (۶) دسمبر ۱۹۳۹ء نمبر (۹)

فہرست مضامین

۱	اداریہ		۱
۲	ہندوستان کی بیٹیوں سے خطاب (نظم)	کیفی دہلوی	۵
۳	معذور بچے	پروفیسر محمد اسلم ایم اے	۹
۴	مدرسے کا ضبط	پروفیسر غلام محی الدین خلوت، ایم اے	۱۶
۵	پنجاب کے اسکولوں میں ابتدائی تعلیم	لالہ بشن داس ایم اے، بی ٹی	۲۰
۶	سلیبس	محمد مظفر الدین بی ایس سی، بی ٹی	۳۴
۷	پنجاب کی تعلیمی خبریں		۴۱

اداریہ

تاریخ شاہد ہے کہ ہر قوم کے چھوٹے بڑے افراد کی ذہنیت، اعمال و افعال اور کارنامے اس قوم کے تعلیمی مقصد کے زیرِ اثر رہے ہیں۔ جیسے قوم کے بزرگ افراد نے نئی پود کے سامنے پیش کیا ہو۔ اس وقت جرمنی کے موجودہ آمر ہر ہٹلر کے تعلیمی مقصد پر نظر ڈالیے۔ یہ مقصد ہے بچوں کی فوجی تربیت یا قوم کی جسمانی قابلیت۔ مقصد بجائے خود بُرا نہیں۔ ہر قوم کو جسمانی لحاظ سے چاق چوبند ہونا چاہیے۔ کیونکہ اسی پر انسان کے تمام مشاغل کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ لیکن جب اس فوجی قابلیت کے ذریعے کمزور قوموں پر ظلم کیا جائے۔ دہشت انگیزی سے ایک گروہ کو جلاوطن اور دوسرے کو موت کے گھاٹ اُتارا جائے۔ بے گناہ شہریوں پر بم برسائے جائیں۔ عورتوں اور بچوں کے خون سے تلواریں رنگی جائیں، تو اس مقصد کے بھیانک خدوخال نمایاں ہوتے ہیں اور اُس کی بربریت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ اسی تعلیمی مقصد کا کرشمہ ہے کہ جرمنی نے موجودہ جنگ کی ابتدا کی ہے۔

جن حالات نے ترقی پا کر ہٹلر کے مقصد کی انتہائی صورت اختیار کی ہے۔ وہ اس تعلیم سے عیاں ہوتے ہیں۔ جو جرمنی میں اس آمر کے فرمان سے جاری رہی ہے۔ حکم ہوتا ہے۔ چونکہ دماغی اور علمی ترقی بے معنی شے ہے اور ہماری قوم کے حق میں اصل مفید چیز ہے، فوجیت یا رِیجی مینٹیشن (Regimentation)۔ اس لیے فوجی تربیت اُسی وقت سے شروع جائے۔ جب کہ بچہ تین سال کی عمر کا ہو۔ اس بچے کے ہاتھ میں قومی جھنڈا دے دو۔ وہ اُسے لہرائے۔ یہی اس کا جھنجھنا ہے۔ یہی کھلونا ہے۔ اس کے بعد جب وہ

سیانا ہوکر مدرسے کو جائے، تو "ہٹلر جوان" کہلائے، یعنی نوجوانوں کے گروہ میں فوجی قواعد سیکھنا شروع کرے۔ پھر سنِ بلوغ کو پہنچکر قوم کے لیے مشقت اُٹھائے اور ان فوجی دستوں میں شامل ہو جائے جنھیں "ہلا بولنے والے دستے" یا (Storm Troops) کہا جاتا ہے۔

ہر ہٹلر کی تصنیف "میری کشمکش" کو نازیوں (Nazis) کی انجیل کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں مصنّف لکھتا ہے کہ تعلیم کا مقصد ہمارے ہاں اس کے سوا کچھ نہیں کہ طلبہ کو آنے والی فوجی خدمت کے لیے تیار کیا جائے اور جسمانی لحاظ سے نوجوانوں کو مکمل سپاہی بنایا جائے۔ سلطنت کا فرض ہے کہ اپنی تعلیمی مشین کا تمام زور قطعی طور پر تندرست انسانی جسموں کے تیار کرنے پر صرف کرے۔ نہ کہ ایک پمپ کی طرح بچوں میں وہ فضول مواد بھر دے۔ جسے علم کہا جاتا ہے۔ دماغی قابلیت کا پیدا کرنا ہمارا ثانوی مقصد ہونا چاہیے"۔ پس حکم ہوا کہ تمام اسکولوں کو "نازی مدارس" کے نام سے پکارا جائے۔ ان مدارس میں جرمن اساتذہ کو یہ ارشاد ہوا کہ اسی نصب العین کو بچوں کے پیشِ نظر رکھیں۔ چنانچہ بویریا کے وزیرِ تعلیم ہر ہانس شیونم نے مدرسین کو یہی وظیفہ از بر کرایا اور ان سے ان الفاظ میں ہٹلر کی بیعت کا اقرار کرایا:۔

"ہم بچوں میں یہ بیداری پیدا کرینگے کہ خدا نے ایڈلف ہٹلر کو ہماری قوم کا سردار بنا کر بھیجا ہے۔ اے ہٹلر! ہم جرمن نوجوانوں کی تربیت ایسے طریق سے کرینگے کہ بڑے ہوکر وہ تیرے ہی خیالات اور تیرے ہی مقاصد کی دنیا میں چکر لگایا کریں اور اسی سمت میں چلیں جس میں تیری رضا ہے"۔

اس اقرار کے بعد مدرس کام شروع کرتا ہے۔ نوشت وخواند کے قابل ہو جانے کے بعد بچوں کو سب سے پہلا سبق دنیاوی معاملات سے باخبر کرنے کے متعلق پڑھایا جاتا ہے اس

غرض کے لیے ہر طالب علم کے ہاتھ میں پڑھنے کی کتاب کے بجائے اخبار دیا جاتا ہے۔ بچے علم سے بے بہرہ ہوں، تو ہوں۔ لیکن شکایت کرنے والے والدین کو مدرس یہ بتاتا ہے کہ میں بچوں میں قومی رُوح پھونکنے کا اقرار کر چکا ہوں۔ اس لیے ایسا ہی ہوگا۔ اسی طرح لڑکیوں کو یہ سکھایا جاتا کہ وہ ایک ناقابلِ تسخیر فوج کی مائیں بنیں۔

نازی اسکول میں دوسرا سبق نقشہ خوانی کا ہے۔ نقشے پر ملک کی سڑکیں بنی ہیں۔ نئی سڑکوں کی فوجی اہمیت اور سیاسی حکمت عملی سے طلبہ کو آگاہ کیا جاتا ہے۔ یہی اُن کا جغرافیہ ہے۔ تاریخِ جرمنی کے بجائے اُستاد اور شاگرد ہٹلر کی تقریروں کو پڑھتے پڑھاتے ہیں اور اُن کی مدد سے دُنیا کے نظامِ ترتیبی میں جرمنی کی موجودہ حیثیت کو معلوم کرتے ہیں۔

درسی کتب کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ جرمنی کے ایک پرائمری اسکول کی ریڈر میں ذیل کے الفاظ درج ہیں:۔

"جنگ عظیم سے پہلے ہمارا خیال تھا کہ جرمن قوم کی حدود وُہی ہیں جنھیں جرمن پارلیمنٹ نے مقرر کر رکھا تھا۔ آج ہم سمجھے کہ کسی قوم کی ترقی میں حکومت کی قائم کی ہوئی حدود کے کوئی معنی نہیں"۔ ایک اَور جگہ یہ الفاظ لکھے ہیں:۔ "السَاس لورین کا علاقہ ہرگز فرانسیسیوں کا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو جرمنی کا علاقہ ہے۔ جسے رُوسیاہ فرانسیسی دبائے بیٹھے ہیں"۔ حساب کے سوالات اس قسم کے نکلوائے جاتے ہیں۔ مثلاً بتاؤ کہ ایک بم گرانے والا طیارہ ۲۸۰ کلومیٹر کی رفتار سے برسیلا سے پراگ تک کتنے عرصے میں پہنچے گا؟

اس قسم کی تعلیم کا اثر بچّوں کے اُن خیالات سے ظاہر ہوتا ہے، جنھیں وہ اپنی مضمون نویسی کے دَوران میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ "ہٹلر نوجوان" کے نام سے جو اخبار شائع ہوتا رہا ہے۔ اس میں ۱۴ سال سے کم عمر کے ایک طالب علم کے مضمون کے ایک جزو کو ان الفاظ

میں تحریر کیا گیا ہے: "سیٹی بجی۔ میں اُٹھا۔ ہم سب نے قطار باندھ لی۔ ہمارے رُوبرُو دو آدمی عاجزی کے ساتھ رینگتے ہُوئے گزرے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہم سے بچ کر نکل بھاگنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم نے اُنھیں گھیر لیا اُور آن کی آن میں ان کی تکا بوٹی کر ڈالی۔"

ایسی ترغیب اُور اسی قسم کے سیاسی پرچار کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ مبادیات میں بچوں کی تعلیم اُور تربیت ادھوری رہے۔ چنانچہ نازیوں کے تجارتی اور اقتصادی رسالوں میں یہ شکایت کی گئی کہ امتحانات کے نتائج غیر تسلی بخش ہیں۔ نئی پود کو جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ بیوپاری لوگوں کے نزدیک نہایت غیر مکمل ہے۔ چنانچہ پکچر پوسٹ کی اشاعت جولائی ۳۹ء میں جرمن تعلیم کے متعلق چند بصیرت افروز اعداد و شمار صاف بتا رہے ہیں کہ نتائج نہایت خراب ہیں۔ مثلاً ایک پیشہ ور جرمن مدرسے میں امتحانِ داخلہ ہُوا۔ تجارتی تعلیم کے اُمیدواروں میں سے ۸۵ فیصدی حساب میں اُور ۷۳ فی صدی زباندانی میں فیل ہُوئے۔ ۱۲ سادہ جملوں میں ۸ جملے غلط لکھے گئے اور ۸ سوالات میں سے ۶ سوالات غلط نکالے گئے۔ اس پر بھی ممتحن نے ان نتائج کو تسلی بخش بتایا۔ اس لیے کہ اس کی ذہنیت فوجی ترقی کی حامی ہے، نہ کہ علمی ترقی کی۔ جولائی ۳۹ء کی تازہ تعلیمی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ جو بچے پرائمری مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ان میں چالیس فیصدی اور ٹکنیکل مدارس میں سے تیس فیصدی علم سے بے بہرہ رہے۔ مدارس اُور جماعتوں کی تعداد گزشتہ سات سال سے لگاتار کم ہوتی گئی۔ ساتھ ہی جرمن معلمین کی تعداد میں ۵ء۷ فی صدی کمی ہوئی۔ بویریا اور پرشیا کے علاقوں میں تین ہزار معلّمین کی اسامیاں خالی پڑی رہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ جرمنی کو ہر سال ۸ ہزار معلّمین درکار ہوتے تھے، جولائی گزشتہ تک بمشکل ۲½ ہزار اساتذہ موجود تھے۔ یہ اس لیے کہ مدارس کی اقتصادی اُور سماجی حیثیت گر چکی تھی اور معلّمی کے پیشے

سے آزادی بالکل مفقود ہوگئی۔

لازم آیا کہ ایسی تعلیم، جس کی بنیاد دہشت اور پروپگنڈا کے نظام پر رکھی گئی ہو، ناکام اور ناقابلِ برداشت ثابت ہو۔ یہ اس لیے کہ جرمنی کے موجودہ نظام کے ماتحت، مردوں کی تمام قوت کو فوجی مشینوں اور ہتھیار بنانے کی صنعت میں صرف کیا جا رہا ہے۔ مسٹر ٹامس مین (Mr Thomas Mann) اپنی صاحبزادی کی ایک تصنیف کے دیباچے میں یوں لکھتے ہیں۔

"یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ جرمن سائنس روز بروز تنزل پر ہے اور دماغی ترقی میں جرمنی بہت پیچھے رہ گیا ہے۔"

ہندوستان کی بیٹیوں سے خطاب

[ہمیں علامہ پنڈت برج موہن دتا تریہ صاحب کیفی دہلوی کی طرف سے مندرجہ ذیل تازہ نظم "ہندوستان کی بیٹیوں سے خطاب" موصول ہوئی ہے۔ جسے ہم بصد شکریہ رسالہ میں درج کرتے ہیں۔ ادارہ]۔

اے بناتِ ہند تم سے آج میرا ہے خطاب — ختم کو پہنچی تمھیں پر خلق و تکویں کی کتاب
خلق عالم کے مدارج میں ہوے تمثیل تم — ارتقا کی عالم تکویں میں ہو تکمیل تم
تم کو پیدا کر کے خالق نے نہ کچھ پیدا کیا — ہو گیا تخلیق عالم کا تمھیں پر خاتمہ
نقشِ اول کیا تھا یہ تو درکِ انساں سے ہے دور — نقش ثانی ہو تمھیں نقاش قدرت کا ضرور
تم نہ ہوتیں، تو نہ ہوتے رستم، ارجن اور بھیم — تم نہ ہوتیں، تو ازل سے تھی جوانمردی یتیم
ہو عروسِ عالمِ ہستی تمھیں اے بیبیو — شمع ہو اس بزمِ ہستی کی تمھیں اے بیبیو
گھر تمھیں سے ہے، نہ ہوتیں تم تو گھر کچھ بھی نہیں — تم نہ ہو تو وہ بجز دیوار و در کچھ بھی نہیں
پیر، پیغمبر تھے وُہ، وشنو کا یا اوتار تھے — تھے وہ جو کچھ بھی، تمھاری ہی تو گودوں میں پلے
دُھن میں اپنی بات یہ یاد اُن کو رہتی ہی نہیں — یعنی کوشلیا، جسودا، فاطمہؓ تم میں سے تھیں
وُہ منُو جی جو بہت ہی آجکل بدنام ہیں — بھول بیٹھا ہے زمانہ اُن کے جو احکام ہیں
یہ منُو کا حکم ہے، سُن رکھیں اس کو خاص و عام — "ہو گا اس گھر میں کبھی آنند اور سکھ کا نہ نام
جس میں عورت خوش نہیں، باعزت و حرمت نہیں" — اس سے بڑھ کر ہم ہدایت پا نہیں سکتے کہیں

کیا طلب ہے یہ مساوی حق کی سوچو تو ذرا — حقِ فائق تم کو تہذیب اور فطرت نے دیا

مرد کیا دینگے تمھیں۔ وہ آپ ہی محتاج ہیں — دیکھتی ہو رات دن جوان کے کام اور کاج ہیں

مطلع بننے کی یہ کیا خواہش تمھارے جی میں ہے — انفرادیت تمھاری حسن مطلع ہی میں ہے

غاصبانہ مرد کی طینت ہے۔ یہ تسلیم ہے — بھول جاتا ہے کہ عورت واجب التعظیم ہے

مرد کی نیچر میں سختی ہے، اسے نرماؤ تم — سرد مہری اس میں جو کچھ ہے اسے گرماؤ تم

آئی ہو تم اس جہانِ اُنس و تسکیں کے لیے — گلشن تکویں کی زینت اور تزئیں کے لیے

ہے تو ہی اے عورت اس ساری سرشٹی کا سہاگ — اپسرائیں سُرگ کی گائیں تری عصمت کے راگ

پھول اتراتا ہے اپنے رنگ و بُو پر اس قدر — وہ کلی ہی ہے۔ کیا جس نے اُسے خلد نظر

زن کی فطرت میں جو سندرپن ہے اور ہے پریم بھاؤ — مرد کو اس سے اگر ہے۔ تو ذرا سا ہے لگاؤ

بربطِ ہستیٔ عالم کی تو ہی مدرمات ہے — ساز، سوزِ حُب کے نغمہ کا۔ یہ تیری ذات ہے

ہست ترا ایثار کی اور نیکیوں کی جان ہے — سو تصوّف ضبط و تمکیں پر ترے قربان ہے

جوش تیری مامتا کا اک سمندر کا ہے جوش — دیکھ کر ست تیرا ستونتی۔ اُڑیں جوگی کے ہوش

ناتوانی تیری طاقت ہے توانا کے لیے — رہبری میں خضر ہے تُو مرد دانا کے لیے

روح کی طاقت سے بل۔ نربل کو دے سکتی ہے تُو — ظاہرا کمزور ہے دراصل اک شکتی ہے تُو

دم سے تیرے ہو گیا یہ باغِ ہستی پُر بہار — لوحِ محفوظ اک تجھی سے پا گئی نقش و نگار

روشن اخلاقِ حسن میں نام عفت تجھ سے ہے — شان ہے انسانیت کی اس کی حرمت تجھ سے ہے

ہے تُو ہی عفت کی دیوی اور تُو ہی سیتا ستی — جنگ میں اس زندگی کی ہے تُو ہی سینا پتی

سب کو یہ کہتے سُنا ہے گھر کی بستی تجھ سے ہے — مَیں تو کہتا ہوں کہ اس ہستی کی ہستی تجھ سے ہے

تیرا درجہ مرد کے درجہ سے ہے اُونچا بہت — ماں کا رتبہ باپ کے رتبہ سے ہے اعلیٰ بہت

مرد بازو ہے اگر دنیا کا اس کا دل ہے تُو — جادۂ ہست و بقا کی آخری منزل ہے تُو

تجھ کو بیٹوں سے ہے آدم کے گلہ شکوہ بہت — ہے ہوس کوشی کا ان کی خلق میں چرچا
کیا سلوک ان کا ہے ہمجنسوں سے اپنے دیکھو تو — ان کی جنگ آپس میں اور ان کی تیر
ظلم و خونریزی کی جو قابیل نے کی ابتدا — اب تک آدم کے خلف اس کی بھگتتے ہیں

پیاری بہنو، بیٹیو مانا کہ جابر ہے سماج — اور خودغرضی پہ مبنی اس کے ہیں سب کام
ذہنیت اس کی غلامانہ غلامی سے ہوئی — تلخیٔ طینت زیادہ تلخکامی سے ہو
نفس کا بندہ رہا ہے مدتوں صدیوں سے مرد — دردِ دل والوں کا اس کو ہو سکے کیا خاک
مرد کا جب دور ہو جائیگا یہ بحرانِ نفس — تو خدا دیگا اسے تسکین و اطمینان نف
خلق سے لیگا تمہارے رنگ وہ اخلاق کا — ہوگا اک زندہ نمونہ لطف اور اشفاق
کون کہتا ہے کہ تم ناچیز و بے مقدور ہو — گر بدی ہو دور نیکی سے تمہاری دور
بات یہ سننے میں یوں تو ایک سادھارن سی ہے — غور سے دیکھو تو گھر کی اور لاکھوں من کی
تم سے سدھرے گھر، وطن، عقبیٰ بھی یا پرلوک بھی — کیونکہ تم ہو سرستی اور ہو تمہیں تو لکشم
تم کو قدرت نے جگہ جو دی تھی وہ لے لوگی تم — دھیان حق کے ساتھ اپنے فرض پر گر دوگی
مرد میں نیکی جو ہے، یوں ہے کہ عورت نیک ہے — مرد موتی کا بیج تو عورت اس کی ہر یک سیپ
"باپ پر گھوڑا ہو ماں پر پوت"۔ یہ جو ہے مثل — ہے صداقت اور حقیقت میں یقیناً بے بدل
ہے یہی دنیا میں عورت کی بڑائی کا ثبوت — عورتیں گنونتی ہوں تو ہونگے لڑکے بھی سپوت
ماننے میں اس کے ہو سکتا ہے کس دانا کو عار — ہے ترقی قوم کی عورت سے اور اس کا سدھار
دیس سدھرا ہے نہ سدھرے لاکھ ہم کرلیں جتن — متفق جب تک نہ ہوں علم و عمل میں مرد و زن

عورتیں جب اپنے جائز مرتبہ کو پائیں گی
شامتیں جو ہیں وطن کے سر پہ سب ٹل جائیں گی

معذور بچّے

از
پروفیسر محمد اسلم ایم اے، گورنمنٹ کالج، لاہور

اُستادوں کو اکثر ایسے بچوں سے واسطہ پڑتا ہے، جو اسکول میں اچھی طرح نہیں چلتے یا نہیں چل سکتے یا پڑھنے میں سُست ہوتے ہیں، یا وہ ہر کام ایسے بے ڈھب سے کرتے ہیں کہ اُن سے یہ اُمید کرنا کہ وہ کوئی کام سیکھ لینگے، بے سود معلوم ہوتا ہے۔ اُن کا وقت یا تو شرارتوں میں اُور یا اُستادوں کے لیے مشکلات پیدا کرنے میں گزرتا ہے۔ ایسے بچّے اپنے لیے تو وبال ہوتے ہی ہیں۔ اُستادوں اُور اسکول کے لیے بھی وبال جان بن جاتے ہیں اور اچھے بچوں کی ترقی میں بھی رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔

اُستاد ایسے بچّوں کے لیے کئی قسم کی تدبیریں کرتے ہیں۔ کبھی اُن کو سزا دیتے ہیں۔ کبھی دھمکاتے ہیں۔ کبھی پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی دوسروں سے اُن کا مقابلہ کر کے اُن کو غیرت دلاتے ہیں۔ کبھی ان کو انعام کا لالچ دیتے ہیں۔ باوجود ان سب تدبیروں کے، ان بچوں کی اصلاح نہیں ہوتی اُور ان کا وجود بدستور اُستادوں اُور والدین دونوں کے لیے پریشانی کا موجب بنا رہتا ہے۔ کیا نئے علوم اُور نئے تجربوں کی بنا پر اس بارے میں کچھ کہنے اُور روشنی ڈالنے کی گنجائش ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اُن بچّوں کے لیے کچھ تدبیر کی جائے، جو بظاہر اسکول کے کام کے لیے نااہل معلوم ہوتے ہیں؟

ان سوالوں کے جواب میں کوئی لمبا چوڑا دعویٰ کرنا تو مناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن

اتنا ضرور کہنا پڑتا ہے کہ پہلے کی نسبت ان مشکلات کے بارے میں ہمارا علم اور ہما
بہت ترقی کر چکا ہے اور اب اس علم اور اس تجربے کی روشنی میں بہت سی مفید
بیان کی جا سکتی ہیں۔

سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو بچے معمولی فہمائش یا نصیحت یا
سے اپنی اصلاح نہ کریں۔ اُن کے متعلق یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ جان بوجھ کر اسکول
کام سے فائدہ نہیں اُٹھاتے، بلکہ اُن کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ خود اُن کی طبیعت
یا اُن کی گھر کی تربیت میں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسکول کے اپنے انتظام میں یا اُستادو
سلوک میں یا بچوں کے حالات میں کوئی نہ کوئی نقص ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بچے اپنی
کے مطابق پڑھائی پوری نہیں کرتے۔ گویا ایسے بچوں کو قصوروار نہ سمجھنا چاہیے، بلکہ یہ
چاہیے کہ وہ معذور ہیں اور جب تک اُن کی معذوریاں دُور نہ کی جائیں گی، یا اُن
حالات میں تبدیلی نہ کی جائیگی، اُس وقت تک اُن کی اصلاح نہ ہو سکیگی۔ پس ہمیں پہلی
یہ یاد رکھنی چاہیے کہ بعض بچے معذور ہوتے ہیں۔ اُن کا علاج اور اُن کی اصلاح غور و
سے اور مناسب تشخیص کے بعد ہونی چاہیے۔

اُستادوں کو شکایت ہے (اور بجا شکایت ہے) کہ ہمیں سبق دینے والے
میں بہت ہیں۔ لیکن میں کوئی سبق دینے کا دعویٰ نہیں کرتا، بلکہ ایک ایسی بات پیش
کرتا ہوں، جس کو اگر وہ قبول کریں، تو وہ اپنے ذہنوں میں ایک انقلاب برپا کر سکتے ہیں
یہ انقلاب نہ صرف اُستادوں کے کام میں چمک اور اُن کی طبیعتوں میں بشاشت پیدا
کر دے گا، بلکہ ہزارہا بچوں کی خوشی اُن کے والدین کے لیے باعثِ تسکین اور ملک کے
لیے ہر لحاظ سے سُود مند ثابت ہوگی۔

وہ بات کیا ہے؟ یہی کہ کئی بچے ایسے ہوتے ہیں، جو ناجائز طور پر قصور وار ٹھیرائے جاتے ہیں اور اُن کی اصلاح اُلٹے سیدھے طریقوں سے کی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ قصور وار نہیں بلکہ معذور ہوتے ہیں اور علاج چاہتے ہیں۔ ایسا علاج جو پوری تشخیص اور توجہ سے ہونا چاہیے، چنداں آسان کام نہیں۔ لیکن معذور بچوں کی معذوری کو سمجھنا اور اُس کا اعتراف کرنا اُن کے علاج کے لیے پہلا اور ضروری زینہ ہے۔

معذور بچے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن تین قسمیں اُن کی ایسی ہیں کہ اُن کے اندر قریباً ہر قسم کے معذور بچے آجاتے ہیں۔ اوّل قسم اُن بچوں کی ہے، جو کلاس کے کام میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور اسکول کے روزمرہ کے کام میں سست ہوتے ہیں۔ نہ پڑھائی ہی پوری، نہ لکھائی ہی، نہ حساب ہی۔ نہ سبق پوری طرح سمجھتے ہیں، نہ پوری طرح یاد رکھتے ہیں۔ ایسے بچوں کو سُست بچے کہہ سکتے ہیں۔ دوسری قسم اُن بچوں کی ہے، جن کا نقص کلاس کے کام میں اتنا ظاہر نہیں ہوتا، جتنا کہ کلاس سے باہر کھیلوں میں یا دوسرے کاموں میں جنھیں چل پھر کر یا بول چال کر کام نکالنا پڑتا ہے۔ یہ نقص جسمانی طاقت یا صحت کا نقص نہیں ہوتا، بلکہ سلیقے اور ڈھب کا نقص ہوتا ہے۔ ایسے بچے کلاس کے کام میں پورے ہوں تو ہوں لیکن اگر کو معمولی کام، کلاس سے باہر کا اُن کے سپرد کیا جائے، تو اُس کو خراب کر دینگے۔ یا ذرا لکھائی پڑھائی سے جدا کام ہُوا، تو وہ ڈرنے لگیں گے۔ یا اگر اُسے کریں گے، تو خراب کر دیں گے۔ کبھی باغیچے کی صفائی یا کلاس روم کی آرائش کا کام ہوتا ہے۔ کبھی کھیل کا سوال ہوتا ہے۔ کبھی ضرورت ہوتی ہے کہ بچے معمولی ہُنرمندی (مثلاً سائیکل کی سواری سے) اپنے کاموں میں پھرتی پیدا کریں، یا جیسا کہ اب اسکولوں میں دستکاری کے کام کو ترقی دی جا رہی ہے۔ ایسی کسی صورت میں ضرورت ہوگی کہ بچے کچھ دستکاری بھی سیکھیں۔ کئی بچے ایسے ہونگے، جو

بچّوں کے لیے چھوٹے چھوٹے خطرات کا مزہ چکھنا خود اُن کی تربیت کے لیے ضروری ہے۔ اُور کھیل کُود، خوش طبعی، اگر د و پیش کی کھوج نکالنا تو اُن کی طبیعت کا حصّہ ہے۔ ان طبعی جذبات کے لیے بچوں کو موقع دینا، اُن کے اخلاق اُور اُن کی ذہنی صحت کے لیے ضروری ہے۔

دوسری بڑی وجہ خود اسکول کے اندر پیدا ہوتی ہے اُور وہ اس طرح کہ اسکول میں بعض اُستاد یہ بھُول جاتے ہیں کہ بچّے آخر بچّے ہیں۔ وُہ اُن سے بڑوں جیسے کمالات کی توقّع رکھتے ہیں یا کم از کم اُن سے اُن کی عمر سے زیادہ لیاقت چاہتے ہیں۔ جب اُن کی توقع پُوری نہیں ہوتی، تو وہ اُن کو سخت سُست کہہ کر اُن کے حوصلوں کو پست کرتے ہیں اور ان میں ایسا خطرناک احساس پیدا کر دیتے ہیں۔ جس سے وُہ خود اپنے معیار سے بھی نیچے گر جاتے ہیں۔ غالباً اُستادوں کا اپنا دخل اس نقص کے پیدا کرنے میں اتنا نہیں، جتنا موجودہ اسکولوں کے نظم و نسق کا۔ موجودہ حالات میں اسکولوں میں بڑی بڑی کلاسیں ہوتی ہیں اُور اُستادوں کا وقت اس طور پر تقسیم ہوتا ہے کہ اُن کے لیے بچوں کو انفرادی توجہ دینا محال، بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ ان حالات کی اصلاح مالی وسعت چاہتی ہے۔ بہر حال بڑی بڑی کلاسوں میں بچّوں کے انفرادی حالات کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اُستاد کلاس کو اپنی توجہ مجموعی طور پر دیتا ہے۔ زید، بکر، عمر کے مخصوص حالات، اُن کی مخصوص مشکلات اُور مخصوص معذوریوں سے واقف ہوتا ہے اُور نادانستہ طور پر وُہ بعض دفعہ ایسے طریقے اختیار کر لیتا ہے، جس سے معذور بچّوں میں اُور زیادہ نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ سُست اُور کمزور بچّوں کا باقی بچوں سے ایسی طرح مقابلہ کرتا ہے، جو کمزور بچّوں کے لیے دل شکن ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ کلاس کو اپنے جوش میں آگے آگے لیے جاتا ہے اُور نہیں جانتا کہ اس طرح کرنے سے کمزور بچے کمزوری کے احساس میں بڑھے چلے جاتے ہیں اُور اُن کے حوصلے پست ہو رہے ہیں۔ بہر حال اگر

اُستاد کے لیے بچوں کو الگ الگ توجہ دینا ممکن ہو (اور اُستادوں کا یہ فرض ہے کہ جہاں تک مناسب ہو، کلاسوں کے سائز کو کم کرنے کی طرف افسرانِ تعلیم کو توجہ دلاتے رہیں) تو بچوں کے ذاتی حالات اُن کے نوٹس میں آتے رہیں گے اور اُن کی اصلاح کا سامان بھی کچھ نہ کچھ ہوتا رہیگا۔ اگر انفرادی توجہ ممکن نہیں، تو بچوں کے ذاتی حالات لازمی طور پر نظرانداز ہوتے رہیں گے اور اس کے نتیجے میں اُن کے کئی قابل اصلاح نقائص، نہ صرف یہ کہ بغیر علاج کے رہیں گے، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ خطرناک صورت اختیار کرلیں۔

یہ معذور بچوں کے متعلق ایک مجمل نقشہ ہے۔ اس میں معذور بچوں کی ایک موٹی تقسیم پیش کی گئی ہے۔ معذور بچے کیونکر پیدا ہوتے ہیں، اس کا بھی اصولی جواب دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر بچے خصوصاً ہر معذور بچے کے حالات الگ ہوتے ہیں۔ لیکن جب تک مجموعی اور مجمل حالات معلوم نہ ہوں، اُس وقت تک شخصی حالات کا سمجھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اصول کو سامنے رکھتے ہُوے، جب ہم کسی معذور بچے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے، تو نہ صرف اس بچے کو سمجھ رہے ہونگے، بلکہ خود اصول کو بھی روشن کر رہے ہوں گے۔

مدرسے کا ضبط

از

پروفیسر غلام محی الدین خلوت ایم اے، گورنمنٹ کالج، لائل پور

ملک کی تعلیمی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی عادات، اخلاق اور تربیت کی دیکھ بھال ایسا مشکل کام ہے، جس کی طرف جتنی زیادہ توجہ دی جائے، اُتنی ہی کم ہے۔ کوئی تعلیمی ادارہ اُس وقت تک صحیح معنوں میں تعلیمی ادارہ نہیں کہلا سکتا۔ جب تک کہ اُس کی نگرانی ایسے ذمّے دار ہاتھوں میں نہ ہو، جو تعلیمی معاملات میں کما حقہٗ واقفیت رکھتے ہوں۔ اس سے بھی زیادہ ضروری اور اہم چیز جس میں کسی تعلیمی درسگاہ کی کامیابی کا راز مضمر ہے، مدرسے کا کامل ضبط ہے۔ یہی ضبط ہے، جو مدرسے میں تعلیم پانے والوں کو زندگی کی بڑی بڑی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے قابل بناتا ہے۔ کوئی شخص جسے تعلیمی معاملات میں گہری دلچسپی ہو، کسی حالت میں بھی ضبط کے نہ ہونے کو گوارا نہیں کر سکتا۔ ضبط کا نہ ہونا فی نفسہٖ سخت مضر ہے۔

قیامِ ضبط کی مختلف صورتیں ہیں، جن میں سے ایک بدنی سزا ہے۔ اگرچہ یہ ایک بہت پرانا مقولہ ہے کہ ؏ جورِ اُستاد بہ زِ مہرِ پدر۔ مگر یہ باور کرنے کی کوئی وجوہات موجود نہیں کہ بید کے استعمال نہ کرنے سے مدرسے کے ضبط پر مخالفانہ اثر پڑتا ہے۔ درحقیقت اس سلسلے میں جس چیز کی ضرورت ہے، وہ معلّم کی فراست اور حکمتِ عملی ہے۔ معلّم اپنے رعب و وقار کو قائم رکھتے ہوئے متعلّمین کے ساتھ اگر ذرا سی نرمی کا سلوک بھی کرے، تو وہ اُسے بڑی قدردانی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اس حُسنِ سلوک کے نتیجے کے طور پر معلّم اور متعلّمین میں ایک قسم کی مفاہمت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

طلبہ کے زیرِ مطالعہ سبق خواہ کتنا ہی روکھا اَور خشک ہو، وہ اس خوشگوار فضا کے زیرِ اثر جو اُستاد اپنے ہمدردانہ اَور مشفقانہ سلوک سے کلاس میں پیدا کر دیتا ہے، اُس سبق میں بیش از بیش دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ امتحانات میں زیادہ شاندار نتائج دکھاتے ہیں اور اپنے نقطۂ نگاہ کو زیادہ بلند اَور وسیع سطح پر لے آتے ہیں۔

اگر کوئی طالب علم کسی سوال کا احمقانہ اَور بیہودہ جواب دے، تو اُسے فوراً سزا دینے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ پہلے اُن اسباب کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے، جو اس قسم کے جواب کے محرک ہُوئے ہوں ممکن ہے۔ طالب علم کے پاس ایسا جواب دینے کی کوئی معقول توجیہ ہو۔ ایسی صورت میں اُسے سزا کا مستوجب ٹھیرانا قطعی طور پر ایک ناجائز اَور غیر منصفانہ فعل ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر جواب کی ذمے دار اُس طالب علم کی بے توجہی ہے تو اُس کے جرم کی پاداش میں جو سزا اس کے لیے تجویز کی جائے، وہ جرم کی نوعیت کے متناسب ہو۔ اس بات کا خاص خیال ہونا چاہیے کہ سزا غیر ضروری طور پر شدید نہ ہو۔ ہلکی مگر کافی سزا پہلے سے زیادہ توجہ کے ساتھ کام کرنے کے لیے اُس کے حق میں مفید ہوگی۔ اگر کسی ذاتی ناگوار واقعہ کے پیش آنے سے معلّم کی طبیعت میں غصّے کا اثر باقی ہو، تو طالب علم کو اُس کی کم توجّہی کی وجہ سے بید سے نہیں مارنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ تھوڑی دیر پہلے اُسے بھی گھر میں یا باہر کسی دوسری جگہ ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑا ہو، جو اس وقت اُس کی کم توجّہی کا باعث ہُوئے ہوں۔ بدنی سزا کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے طالب علم کے دل میں خوف اَور نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اَور وُہ بدذوقی کا شکار ہو جاتا ہے۔

جس جماعت میں لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ ہو، وہاں معلّم کا فرض ہے کہ وُہ

ہوشیار اور کمزور دونوں قسم کے طلبہ کی ذہنی اور جسمانی استعداد کو مدِنظر رکھے۔ ان میں سے بعض کا میلانِ طبع قدرتی طور پر کھیل کود اور مدرسے کے باہر کی سرگرمیوں کی طرف ہوتا ہے اور بعض کا دماغ نت نئی ایجاد کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں، جنھیں قدرتاً کتب بینی کا ازحد شوق ہوتا ہے۔ جہاں پہلی قسم کے طلبہ جماعت میں اپنے سبق دھیان سے نہ سُننے کے عادی ہوتے ہیں، وہاں دوسری قسم کے طلبہ بیٹھے بیٹھے گھبراہٹ کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں معلم کو چاہیے کہ وُہ مختلف طبائع کا جائزہ لیتے ہُوئے سبق کے دوران میں کوئی کہانی سُنائے یا کسی کھیل کُود کا ذکر کرے۔ اس سے طلبہ کی توجہ پھر اُسی موضوع کی طرف لوٹ آئیگی جس موضوع کی طرف وہ اُنھیں لانا چاہتا ہے۔ اکثر معلّمین جب وُہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ جماعت کے طلبہ پر گھبراہٹ کی سی کیفیت طاری ہو رہی ہے، تو وہ اپنے اصلی سبق سے ہٹ کر دو تین منٹ ایسے موضوع پر بولنا شروع کر دیتے ہیں، جو اصل سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

معمولی قسم کی چوری یا بددیانتی کے معاملے میں پرلے درجے کی ہوشیاری اور دانشمندانہ طریقِ عمل کی ضرورت ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے پہلے جرم کی پاداش میں طالب علم کو اگر بدنی سزا دی جائے، تو بالعموم وُہ اُسے پہلے سے زیادہ مکّار اور حیلہ ساز بنا دیتی ہے۔ اس کے خلاف اگر ارتکابِ جرم کی وجوہات کی پوری پوری تحقیق کی جائے اور طالب علم کے ساتھ اس کے متعلق گفت و شنید کی جائے، تو اس سے اکثر حالتوں میں مفید نتائج مترتّب ہوتے ہیں اور اس قسم کے واقعات کا سدِّباب ہو جاتا ہے۔

ایک سے زیادہ تعلیمی درسگاہیں ایسی ہیں، جو اس بات پر زور دیتی ہیں کہ طالب علم اپنے اوقاتِ فرصت میں کھیل کود میں شامل ہوں۔ اب بعض طلبہ فطرتاً ایسے واقع ہوتے ہیں،

جنھیں جسمانی ورزش سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود جب ایسے طالب علموں کو ورزشِ جسمانی پر مجبور کیا جاتا ہے، تو اس سے بعض کی صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اگر ہمارے طلبہ میں بعض اپنے اوقاتِ فرصت میں دماغی ورزش زیادہ کرتے ہوں اور جسمانی کم، تو ہمیں اُنھیں نہ جسمانی ورزش کرنے پر مجبور کرنا چاہیے اور نہ ہی اُنھیں سزائے بدنی کی دھمکی دینی چاہیے۔ سب سے مناسب بات تو یہ ہے کہ جسمانی سزا کو سرے سے اُڑا ہی دیا جائے۔ ہمیں طلبہ کے ساتھ ان کی انفرادی حیثیت کے مطابق سلوک کرنا چاہیے۔ نہ یہ کہ ہم اُنھیں پوست و استخواں کا ایک ایسا تودہ تصور کریں، جو مقررہ آئین و قواعد کی پابندی میں ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ اس اُصول پر عمل پیرا ہونے سے ہمیں مدرسے میں ایسے طالب علم دکھائی دینگے، جو پہلے سے زیادہ بشاش، زیادہ خوش اور زیادہ تندرست ہونگے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے اُستادوں کو ہوّا سمجھنے کے بجائے اُنھیں ایسے مشفق دوست سمجھنے لگیں گے، جن سے وہ آڑے وقت میں ہر قسم کی امداد اور مشورہ لے سکتے ہیں۔

پنجاب کے اسکولوں میں ابتدائی تعلیم

از

لالہ بشن داس ایم اے، بی ٹی

ابتدائی کلمات بعض لوگ اب بیسویں صدی کو بچوں کی صدی کا نام دینے لگے ہیں، کیونکہ اس صدی میں بچوں کی سرشت کا کافی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم کے نئے نئے طریقوں پر بحث ہوتی ہے اور تعلیم کے امکانات کے متعلق تحقیق اور تجربات کیے جاتے ہیں۔ کئی ممالک میں ابتدائی تعلیم کے لیے خاص مدرسے کھولے گئے ہیں۔ کئی ایک مدارس ایسے بھی جاری کیے گئے ہیں، جہاں بچوں کو تین یا چار برس ہی کی عمر میں کوئی نہ کوئی تربیت دی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں درسی تعلیم پانچ برس کی عمر میں شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہمارے بچے والدین کی، بلکہ ماں کی تحویل میں ہوتے ہیں اور ہماری اَن پڑھ مائیں بچوں کی تربیت کرنے کے اہل نہیں۔ اس لیے ان کی صحیح تربیت نہیں ہو سکتی۔ یا یوں سمجھیے کہ پنجابی بچے کی عمر کے پہلے پانچ سال ضائع ہی جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بچوں کو پانچ چھ سال کی عمر تک درسی تعلیم دینا کوئی مفید نہیں ہوتا۔ لیکن کئی اور طریقوں سے اس کی تربیت کی جا سکتی ہے۔ اب پنجاب کے دیہات بلکہ قصبات میں جا کر دیکھیے، بچوں کی مائیں اکثر یہ کہتی سنائی دیتی ہیں۔ یہ بچہ شرارتی ہو گیا ہے۔ اس کو مدرسے بھیج دو۔ یا یہ بچہ شرارتی ہے۔ اچھا جب مدرسے جائیگا، تو خود بخود درست ہو جائیگا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ کیسے مایوس کن الفاظ ہیں۔ گویا والدین اپنی ذمے داری کا بوجھ بھی غریب اُستادوں پر ہی ڈالتے ہیں۔ وہ یہ امر بالکل بھول جاتے ہیں کہ نیک اطوار اور اچھی عادتیں پانچ برس کی

عمر سے پہلے، پانچ برس کی عمر کے بعد کی نسبت زیادہ آسانی سے سکھائی اور ذہن نشین کی جا سکتی ہیں۔

اُستاد کو بعض دفعہ عجیب وغریب بنیاد پر مختلف قسم کے ماحول میں ایک عالیشان عمارت کھڑا کرنے کی کوشش کرنا ہوتی ہے اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عمر کے ابتدائی سالوں میں بچّے کی ذہانت اور صحت بہت جلدی ترقی کرتی ہے۔ اس کا نقطۂ نگاہ وسیع ہونا شروع ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ ترقی باقاعدہ ترقی نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ یہ ترقی رُک رُک جاتی ہے اور کچھ وقت کے بعد اُس کی رفتار پھر بڑھنے لگتی ہے۔ مدرس کو اس ترقی کی رفتار سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اس موقع کی تلاش میں رہنا پڑتا ہے۔ بچے کی فہم و ادراک کی قوّت سے بڑھ کر اس کو تعلیم دینے کی کوشش کرنا لاحاصل ہے۔ اس سے نہ صرف وقت ہی ضائع ہوتا ہے، بلکہ بچّے پر بے جا دماغی بوجھ بھی پڑتا ہے۔ مجھے کئی دفعہ ایسے والدین سے بھی واسطہ پڑا ہے، جو اپنے بچّے کی دماغی اور جسمانی تربیت کا اندازہ نہیں کرتے اور اُستاد سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس کے دماغ میں بہت سا علم ٹھونس دیں اور بعض اُستاد بھی کم فہمی کی وجہ سے اِن کی ہاں میں ہاں ملانے کی غرض سے بچے کے دماغ میں بہت سا علم ٹھونسنے کی لاحاصل کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ امر بھول جاتے ہیں کہ جب تک بچّہ اچھی طرح چلنا نہ سیکھ لے، اُس کو کُودنا یا اُچھلنا سکھانے کی کوشش کرنا بے فائدہ ہے۔ موقع اور محل کے مطابق بہت سی باتیں آسانی سے سکھائی جا سکتی ہیں۔ تعلیم کے کسی پہلو میں نامناسب تیزی کرنا عقلمندی نہیں۔ اُستاد کے لیے صابر اور موقع شناس ہونا نہایت ضروری ہے۔

بچّوں کا اسکول میں داخلہ ان ابتدائی کلمات کے بعد اب داخلے کا سوال غور طلب ہے۔ امریکہ اور یورپ کے بعض اسکولوں کی ابتدائی جماعت میں داخلے سے پہلے ایک خاص قسم کا

ذہنی امتحان لیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اغلبًا اب تک کسی مدرسے نے ایسا انتظام نہیں کیا۔ ان امتحانوں سے بچے کی ذہانت کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور ذہین اور کند ذہن بچوں کو علیحدہ کرکے ان کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کا مدعا یہ نہیں کہ اس طریقۂ امتحان پر مفصل بحث کی جائے۔ تاہم میں قارئین کرام کی واقفیت کے لیے چند ایک باتیں لکھنی ضروری سمجھتا ہوں۔ ان ذہنی امتحانوں کا موجد ایک فرانسیسی پروفیسر بنٹ (Binnet) ہوا ہے۔ جس نے اپنے وسیع تجربے کی بنا پر چند ایک سوال مقرر کیے۔ جن کے جوابات ایک معمولی ذہانت کے بچے کو خاص عمر میں دینے کے قابل ہونا چاہیے۔ اس کے بعد امریکہ کے ایک پروفیسر ٹرمن (Terman) نے بنٹ کے طریقۂ امتحان میں امریکن ماحول کے مطابق ترمیم کی اور امریکہ میں بھی بچوں کے ذہن کی پیمائش ہونے لگی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں سرل برٹ (Cyril Burt) نے انگریزی ماحول کے مطابق ان کی ترمیم کی اور پھر لاہور کے مشن کالج کے پروفیسر رائس نے ہمارے یہاں کی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر ان میں ترمیم کی لیکن پنجاب میں ان پر عمل نہیں کیا گیا۔

ان امتحانات سے بچے کی ذہنی عمر معلوم کی جاتی ہے اور اگر وہ اس کی اصل عمر کے برابر ہو، تو بچہ اوسط درجے کا ذہین ہے۔ اگر اس کی ذہنی عمر اصلی عمر سے زیادہ ہو، تو وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہے اور اگر اس کی ذہنی عمر اس کی اصلی عمر سے کم ہو، تو اُسے کُند ذہن سمجھنا چاہیے۔ ذہنی عمر ماپنے کے لیے اس عمر کے مقرر کردہ سوالات بچے سے پوچھے جاتے ہیں۔ اگر وہ ان کے جوابات صحیح نہ دے سکے، تو اُس کی ذہنی عمر کم ہے۔ اگر وہ ان سوالات کا جواب تو دے سکے۔ لیکن اگلے سال کی عمر کے سوالات کے جواب نہ دے سکے، تو دونوں عمریں برابر۔ اور اگر وہ اس کے علاوہ اگلے سال کی عمر کے سوالات کے جواب بھی دے دے، تو اُس کی ذہنی عمر اصلی عمر

ہے زیادہ ہوئی۔ مثلاً اگر کوئی تین سال گیارہ ماہ کا بچہ تین سال کی عمر کے کل چھ سوالات کا صحیح جواب دے تو اُس کی ذہنی عمر تین سال ہوئی۔ اس کے علاوہ اگر وہ بچہ چار سال کی عمر کے چھ سوالات میں چار کا صحیح جواب دے۔ تو اُس کی عمر آٹھ ماہ زیادہ ہوئی۔ اسی طرح اگر وہی بچہ پانچ سال کی عمر کے چھ سوالات میں تین کا صحیح جواب دے، تو اُس کی عمر چھ ماہ اَور زیادہ ہوئی۔ س طرح اس کی عمر چار سال دو ماہ ہوئی یعنی اپنی اصلی عمر سے تین ماہ زیادہ۔ اس کے بعد ہنی عمر / صلی عمر کو ۱۰۰ میں ضرب دے کر اس بچے کا ذہن نُما معلوم کیا جاتا ہے۔ اُوپر کی مثال میں اس بچے کا ذہن نما $\frac{4\frac{2}{12}}{3\frac{11}{12}}$ × ۱۰۰ یعنی ۱۰۶ ہے۔ عام طور پر ۹۰ اَور ۱۱۰ کے درمیان ذہن نُما سط ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اُستاد کو اپنے شاگردوں کی ذہنی حدود کا علم ہونا بہت مفید وتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ان کا عدم وجود اُستاد کے رستے میں ایک بھاری رکاوٹ ہے ر بعض دفعہ اُستاد ایک بالکل کند ذہن لڑکے کے ساتھ سر مغزنی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ن ۱۹۲۰ء میں مَیں ایک دیہاتی پرائمری اسکول میں مدرس تھا۔ میرے پاس پہلی جماعت میں ایک چہ داخل ہُوا۔ مَیں نے ڈیڑھ سال تک اس پر لاکھ سر مارا لیکن اس سارے عرصے میں وہ حروف بجد بھی اچھی طرح نہ سیکھ سکا۔ اسی طرح ایک دفعہ میں ضلع منٹگمری کے ایک اسکول ہیڈ پہ ن گیا۔ وہاں میں نے ایک طالب علم کو دیکھا، جو اس اسکول میں آٹھویں سال سے پڑھ رہا تھا، لکن ۸ × ۲ = ۱۲ یا ۱۰ ہی بتلاتا تھا۔ اگر تجربہ کار اُستاد اپنے تجربے اَور وسیع مطالعے سے خود یسے ذہنی معیار مقرر کر کے ان سے فائدہ اُٹھائیں، تو کیا ہی مفید ہو۔ ان کے لیے بھی اَور بچوں لے لیے بھی۔ کند ذہن بچوں کی تعلیم کا خاص انتظام ہو سکتا ہے۔

صتا | اب جب ہم یہ اندازہ لگالیں کہ بچہ تعلیم حاصل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، تو اس کو یا ۶ سال کی عمر میں لفظ شناسی اَور پڑھنا سکھانے کا کام شروع کرنا ہوتا ہے۔ ان اوراق میں

پڑھنا سکھانے کے موٹے موٹے اصولوں پر بحث کی جائیگی۔ ہمارے دیہاتی اسکولوں میں عام طور پر جو طریق برتا جاتا ہے، وہ کسی حد تک ناقص ہے۔ حروف ابجد رٹوا لینے کے بعد زیر، زبر اُور پیش کی بے معنی سی گردانیں رٹوانے کی کوشش کرنا اصولِ تعلیم کے خلاف ہے۔ قارئین کرام خود ہی اندازہ لگائیں کہ اگر ان کے سامنے چینی زبان کے چند حروف یا چند شعر لکھ کر رکھ دیے جائیں اور ان کو پڑھ کر بھی سُنا دیا جائے، تو کیا وہ اس کو یاد رکھ سکیں گے۔ نہیں۔ اسی طرح بے سمجھے سنسکرت زبان کے منتر بھی ہم مشکل سے یاد کر سکتے ہیں۔ اب اگر ایک نوجوان اُور سمجھ دار انسان بے معنی الفاظ کو یاد نہیں رکھ سکتا، تو ایک کمسن بچے سے یہ توقع کرنا کتنی بڑی غلطی ہے۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ بچہ جلد از جلد ایسے الفاظ پڑھنے اُور پہچاننے لگ جائے، جن کو وہ سمجھتا ہے۔ الف زبر اَ، ب زبر بَ یا بہ، بُب۔ لَج، بِج، لُج وغیرہ۔ مہمل حروف والفاظ سے بچے کے دماغ کو خراب کرنے کی کوشش کرنا لاحاصل ہے۔ اگر کسی دقیانوسی مدرس کو یہ سمجھانے کی کوشش کریں کہ آپ کا طریقہ اصلاح طلب ہے، تو وہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ بھئی مدت سے یہی طریقہ چلا آتا ہے۔ اسی طریقے سے پڑھ کر لوگ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے ہیں۔ یہ ایک عجیب منطق ہے۔ ان صاحبان کو مَیں یہ جواب دیا کرتا ہوں کہ بھئی آپ کے بزرگ پیدل چل کر ہی سفر کیا کرتے تھے۔ وہ بھی بڑے کامیاب انسان تھے لیکن آپ تو اب ریل کا سفر کرتے ہیں۔ موٹروں پر چڑھتے ہیں۔ سائیکل اُڑائے پھرتے ہیں۔ یہ تبدیلی کیوں؟ اس پر وُہ کہتے ہیں کہ صاحب سائنس کا زمانہ ہے۔ سائنس کی معلومات سے فائدہ اُٹھانا عقلمندی ہے۔ پھر مَیں ان کو یہ سمجھاتا ہوں کہ تعلیم بھی ایک سائنس ہے۔ اس میں نئی نئی معلومات کو عملی جامہ پہنا کر ان سے استفادہ حاصل کرنا ہی عقلمندی ہے۔ ہم مدرس ہیں۔ اگر ہم ہی نئی باتوں کو معلوم کر کے ان پر عمل کرنے کی کوشش نہ کریں، تو اُور کون کرے گا۔ تعلیم کے کام کو دلچسپ

بنانا چاہیے، نہ کہ خشک اور غیر دلچسپ۔ ایک مدرسے میں جاکر آپ ذرا شست سے بچوں کو بَا، بَب، بَپ وغیرہ کی بے تُری سی دہارنی الاپتے ہوئے دیکھیں، تو یقیناً آپ سخت مایوس ہوں گے۔ کیا یہی بچے بڑے ہوکر قابلِ فخر انسان بنیں گے۔ مَیں حروف ابجد سکھانے کے برخلاف نہیں۔ الفاظ شناسی کے ساتھ حروف شناسی سکھائی جائے، تو عین مناسب ہے، یا اگر بہت ضروری حروف ابجد گیلی مٹّی سے طلبہ سے ہی بنوائے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ ان سے کوئی آسان ساگیت ان حروف کے متعلق ہی کہلوایا جائے، تو وہ بھی بالکل مناسب ہے۔ اصل بات تو دلچسپی ہے، جو دقیانوسی طریقے میں نہیں پائی جاتی۔ ایک نئے بچے کے مدرسے میں آنے پر نیچے لکھے ہوئے طریقے کو تھوڑا سا ادل بدل کر کے برتیں اور دیکھیں کس قدر کامیابی ہوتی ہے۔

جب بچہ نیا نیا داخل ہونے کو آئے، تو اس کو بڑی محبت سے گود میں لیں۔ باتوں میں ہی اس سے اس کا نام دریافت کریں۔ کچھ دیر کے بعد جلی حروف میں ایک گتّے پر اس کا نام لکھ کر اس کو دیں اور اس کو بتا دیں کہ یہ اس کا نام ہے اور کہ جس جگہ یہ گتّہ ہوگا۔ وہ اس جگہ ہی روزانہ آکر بیٹھا کرے گا۔ بچہ اس گتّے کو شوق سے اپنے ہاتھ میں لے گا۔ اس کو غور سے دیکھے گا اور جہاں آپ وہ نام لکھا ہوا کارڈ یا گتّہ رکھیں گے، وہاں بیٹھ جائیگا۔ اس کو کوئی تصویروں والی کتاب دے دیں۔ تاکہ وہ مشغول رہے۔ دس بیس منٹ کے بعد تفریح یا کسی اور سبب سے سب لڑکوں کو اُٹھا دو۔ واپسی پر سب لڑکے اپنی اپنی جگہ پر آکر بیٹھ جائیں گے۔ لیکن آپ نوارد کا گتّہ یا کارڈ ذرا جگہ بدل کر رکھ دیں۔ جب وہ بچہ اپنے گتّے کو اپنی جگہ پر نہ پائے، تو اُس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کریں اور اس کی جگہ تلاش کرنے میں اس کی مدد کریں۔ دو چار بار ایسا کرنے سے وہ بچہ اپنے نام کو اچھی طرح پہچاننے لگ جائے گا۔ گویا کھیل ہی

کھیل میں اُس کو وُہ لفظ پہچاننا آجائیگا جس کے ساتھ اس کو سب سے زیادہ دلچسپی ہے یعنی اس کا اپنا نام۔ اس کمرے میں مختلف اشیا کے نام بھی گتّوں پر لکھ کر ان چیزوں کے ساتھ آویزاں کر دیے جائیں۔ تاکہ بچے چیزوں کے ساتھ ان کی لفظی شکل سے بھی واقف ہو جائیں۔ لیکن ایک دن میں ایک یا دو شکلوں سے زیادہ پر ان کی توجہ کو مرکوز نہ کیا جائے۔ وقتاً فوقتاً ان گتّوں کو تبدیل کر دیا جائے، یعنی ایک جگہ کا گتّہ دوسری جگہ رکھا جائے اُور بچے کو اُسے درست کرنے میں مدد دی جائے۔ بچے کے ساتھیوں کے نام کی شکل بنائی جائے اور اپنے نام کے گتّے اُور اُن کے نام کے گتّوں میں فرق بتایا جائے اُور ساتھ ساتھ وہ حروف بھی پڑھائے جائیں، جن کے ملانے سے یہ الفاظ یا نام بنتے ہیں۔ ہر مدرس کو چاہیے کہ وہ پہلے دو تین ماہ کے لیے ہر بچے کا قاعدہ موٹے حروف میں خود لکھے اور اس میں ہر بچّے کی انفرادی ضروریات کے مطابق الفاظ اُور فقرات خود لکھے۔ یہ قاعدہ بچے کے لیے بھی بے معنی الفاظ کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ پُر معنی ہونا چاہیے۔ کچھ مشق کے بعد اگر قصباتی اسکولوں میں پہلی جماعت کے مدرسین ننھے ننھے بچوں کو بازار میں لے جا کر دوکانوں کے بورڈوں پر لکھے ہوئے الفاظ پڑھانے کی کوشش کریں، تو بہت سا پڑھنا کھیل ہی کھیل میں آجائیگا۔ اسکول کے کمرے، برآمدے یا صحن میں چند ہدایات، مثلاً دیوار پر مت تھوکو۔ فرش پر مت تھوکو۔ بائیں طرف چلو۔ پھول توڑنا منع ہے۔ گالی مت دو وغیرہ، جلی قلم سے لکھوا کر آویزاں کرا دینی چاہییں اُور پھر بچوں سے بار بار اُنھیں پڑھانا چاہیے۔ اس سے بچے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اُنھیں جلدی الفاظ شناسی آجاتی ہے اور اخلاق بھی سیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح سادہ احکام، مثلاً باہر چلے جاؤ۔ کھڑے ہو جاؤ، بیٹھ جاؤ، چُپ رہو، ہنسو، دوڑو وغیرہ، چھوٹے کارڈوں پر جلی حروف میں لکھ کر بچّوں کو دکھائے جائیں اور ان کو زبانی حکم نہ دیا جائے۔ ان سب باتوں سے بچوں کو ایک عجیب خوشی نصیب ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ

ساتھ حروف کے پہچاننے کی مشق بھی کرائی جائے۔ اس کے بعد چند آسان سے چارٹ تیار کر کے بچوں سے پڑھوائے جائیں۔ ان پر بچوں کی پسند کے مطابق تصاویر بھی ہوں۔ مثلاً پھلوں کی تصاویر، جانوروں کی تصاویر، پرندوں کی تصاویر وغیرہ۔ ان تصاویر پر پرندوں وغیرہ کے نام لکھے ہوں، جن سے بچہ فوراً تصویر اور لفظ میں تعلق قائم کر سکے۔ ایسے آسان چارٹ مدرس خود تیار کر سکتا ہے۔ تصویریں یا تو کسی پرانی کتاب سے یا اخبار سے پھاڑ کر لگائی جا سکتی ہیں یا خود بنائی جا سکتی ہیں۔ بعض دفعہ کسی تصویر کو ایک بڑے کاغذ پر چسپاں کر کے اس کا آسان سا حال موٹے الفاظ میں لکھ کر دیوار پر آویزاں کر دینا چاہیے اور اس کے پڑھنے میں بچّے کو مدد دینی چاہیے۔ یہ سب چارٹ ایک فرض شناس مدرس آسانی سے خود تیار کر سکتا ہے اور ایک دو پیسے سے زیادہ ان پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ البتہ محنت ضرور کرنی پڑتی ہے اور طلبہ کی طرف انفرادی توجہ دینی پڑتی ہے۔ اس کے بعد بہت آسان آسان کہانیاں جن میں کم سے کم نئے الفاظ ہوں، گتّوں پر لکھ کر بچوں سے پڑھائی جائیں۔ نئے الفاظ کو جلی قلم سے لکھا جائے، تاکہ بچّے اس کی طرف زیادہ توجہ دیں اور پھر ایسے فقرے بنائے جائیں۔ جن میں وہ الفاظ بار بار آئیں۔ تاکہ بچّہ بار بار ان الفاظ کو دیکھنے سے ان کو سمجھ سکے۔ ہمارے منظور شدہ قاعدوں میں کئی ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جن کی بچے کو مدّت تک ضرورت ہی نہیں پڑتی اور بعد میں جب ان میں سے کوئی لفظ کسی کتاب میں پڑھنا ہوتا ہے، تو اس کو نئے سرے ہی سے پڑھایا جاتا ہے۔ تو پہلے تعلیمی سال میں ان مشکل الفاظ کو پڑھنے سے اور بچے کے دماغ پر بے فائدہ بوجھ ڈالنے سے کیا فائدہ۔ سادہ آسان الفاظ پڑھنے سے بچّے کے دماغ پر بھی بوجھ نہیں پڑتا اور کام بھی جلد ہو جاتا ہے۔ البتّہ انفرادی توجّہ ہر حالت میں ضروری ہے۔ دراصل ابتدائی سال میں جماعتی تعلیم ایک بے معنی سی بات ہے۔

۱۹۲۵ء میں دنیا بھر کی تعلیمی کانفرنس ایڈنبرگ میں ہوئی تھی اور اس میں ڈاکٹر ویٹی (Wattie) نے جو گلاسگو کے انسپکٹر آف سکولز تھے، اپنا خیال ظاہر کیا کہ پانچ برس کی عمر تک بچوں کو رواں پڑھنا سکھایا جا سکتا ہے۔ ہمارے کسی اسکول کا کوئی اُستاد یہ دعویٰ درست تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض بچے گھروں میں تعلیم پاتے ہیں اور چھوٹی عمر میں رواں پڑھنے لگ جاتے ہیں اور پڑھنا سیکھنے کے لیے ان کو زیادہ وقت نہیں لگتا۔ اس کی بڑی وجہ گھروں میں انفرادی طریقۂ تعلیم ہی تو ہے۔ ہمارے مدرسوں میں اوّل تو ہم کوشش کرتے ہیں کہ پانچ پانچ سات سات لڑکوں کو ہم سبق بنایا جائے اور پھر کئی دفعہ سستی کر کے ان کو نیا سبق دینے کی، نئے الفاظ سکھانے کی بھی خود کوشش نہیں کرتے۔ اس میں بھی کسی بڑے لڑکے سے ہی مدد حاصل کر لیتے ہیں۔ ایک لڑکا کھڑا ہو کر کہلوانا شروع کر دیتا ہے اور باقی لڑکے اس کے پیچھے وہ فقرات یا الفاظ دُہراتے ہیں۔ اس سے بعض بچے الفاظ کی اشکال پہچاننے کی پروا ہی نہیں کرتے، بلکہ صرف ہم آواز ہو کر بولنے کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور یہ بڑا بھاری نقص ہے۔

ولایت کے بعض اسکولوں میں ابتدائی تعلیم کا ایک اَور طریقہ استعمال ہوتا ہے اور کچھ ترمیم کے ساتھ وہ ہمارے ملک میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ مدرّس ہر روز بچّے کو اس کی عمر کے مطابق ایک آسان سا فقرہ بنا دیتا ہے اَور مختلف جگہوں پر اس کو لکھ کر اس کو بچے سے پڑھاتا ہے۔ اگلے دن پہلا آموختہ بھی سُنتا ہے اُور ایک اَور فقرہ پڑھاتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس بچے کو بہت سے الفاظ اَور فقرات آسانی سے ہی آجاتے ہیں۔ فقرات ایسے ہونے چاہییں، جن کو بچّہ روزانہ استعمال کرتا ہو۔ الفاظ سادہ اَور آسان ہوں۔ اُستاد وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ جو بچے کے دل میں جذبۂ شوق اُبھار سکے اَور پھر اس کو قائم رکھ سکے۔ مَیں نے اپنے لڑکے کو

پہلے پہل قریباً اسی طریق سے پڑھنا سکھایا تھا۔ مَیں نے اس کو پہلا سبق یہ دیا تھا: یہ آم ہے، آم کھا، یہ آم کھا وغیرہ وغیرہ۔ اس خاص فقرے کی وجہ ان دنوں آموں کا موسم تھی۔ اس طریقے سے ایک آدھ گھنٹہ روزانہ توجہ سے وہ چھ ماہ میں ہی دوسری جماعت کے قابل ہو گیا۔ البتہ لکھنے میں وہ کسی قدر کمزور رہا۔ اس کمزوری کی وجہ میری ناتجربے کاری تھی اور مجھے یقین ہے کہ ذرا احتیاط سے لکھائی کا کام بھی اچھا ہو سکتا ہے۔ میرے لڑکے کی حالت میں مجھے اس کو لکھنا بعد میں کسی اَور طریقے سے سکھانا پڑا۔ ننھے ننھے بچوں کی حالت میں نہ صرف پہلے دن کے سبق کا، بلکہ پہلے سب دنوں کے آموختہ سبق کا دُہرانا نہایت لازمی ہے۔ لیکن دُہرانے میں بھی دلچسپی پیدا کرنی چاہیے۔ اس واسطے میرے خیال میں جب تک بچہ حروف والفاظ، بلکہ آسان فقرات کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا، اس کو قاعدہ لے کر نہیں دینا چاہیے۔ ہمارے اسکولوں میں قریباً سب بچے دس پندرہ قاعدے پہلے سال میں پھاڑ دیتے ہیں۔ تب کہیں جا کر کچھ تحریر سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ایک غریب ملک میں ایسا کرنا بہت بڑی فضول خرچی ہے۔

جب بچہ پڑھنے کے قابل ہو جائے، تو اگلے سالوں میں اس کو خاموش، لیکن تیزی سے پڑھنے کی مشق کرانی چاہیے۔ ہمارے اکثر بچے ایک ایک لفظ کو دیکھ کر اور بڑی کم رفتار سے پڑھتے ہیں اور یہ عادت بڑھاپے تک قائم رہتی ہے۔ بچے کو پڑھے جانے والے لفظ سے آگے جلدی جلدی نظر رکھنے کی مشق کرانی چاہیے اور کبھی کبھی اس کی رفتار کا امتحان بھی لینا چاہیے۔ اَور اس کی کامیابی پر اس کو داد بھی دینا چاہیے۔ اُونچا پڑھنا بھی ایک ہنر ہے۔ اس کو بالکل نظر انداز کرنا بھی غلطی ہے۔ اُونچا پڑھنے والے بچے ہی بڑے ہو کر اچھے مقرر ہُوا کرتے ہیں اَور اس فن کی باقاعدہ ابتدا ہمارے ابتدائی اسکولوں ہی میں کی جا سکتی ہے۔

لکھنا لکھنے سے ہمیں بچے کو گویا ہاتھ سے کچھ کرنا سکھانا ہے۔ لکھتے وقت بچہ کچھ حرکت کرتا ہے۔ جلدی سے لیکن آسانی سے۔ یہ ایک دستی کام ہے، اس لیے اس کو دستی کام کی طرح سکھایا جانا چاہیے۔ لکھنا سکھانے کے لیے ڈاکٹر مونٹی سوری کا طریقہ بہت کامیاب مانا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے دیکھا ہے کہ لکھنے سے بچے کے ہاتھ کو مختلف حرکات کرنا اس طریقہ سے سکھایا جائے، جو لکھنے سے بھی دلچسپ ہو۔ اس طریقے کے مطابق دھات کے بنائے ہوئے مختلف شکلوں کے چوکھٹے یا فریم بنائے جاتے ہیں۔ بچے ان کو ہاتھ میں پکڑتے ہیں۔ ان کے گرد یا اندر کی طرف قلم یا چاک یا رنگ دار پنسل پھیرتے ہیں۔ اس شکل کے اندر کوئی اور چھوٹا سا فریم رکھا جاتا ہے اور اس طرح اس پر بھی قلم یا پنسل پھیری جاتی ہے۔ لائنوں کے درمیان رنگ بھرا جاتا ہے۔ اس تجویز سے چار پانچ سال کے بچے بغیر تکان کے کام کرتے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے پہل رنگ بھرتے وقت وہ حد کی لائن کا ٹھیک خیال نہیں رکھ سکتے اور یا رنگ کہیں شوخ ہو جاتا ہے اور کہیں ہلکا۔ تاہم آہستہ آہستہ وہ قلم کو اچھی طرح پکڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اگر بے معنی الفاظ مثلاً بج، بک، بل، بی وغیرہ سے ان کو لکھنا شروع کرایا جائے، تو ان کو رُوکھا سا کام معلوم ہوتا ہے اور کئی کئی سال تک وہ اچھی طرح قلم پکڑنا بھی نہیں سیکھتے۔ بعض دفعہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جو بچہ اپنے بھائی یا بہن یا باپ کو لکھتے دیکھتا ہے۔ وہ اس کی تقلید میں کچھ بے معنی سی اشکال بنا کر اپنے باپ کے پاس لاتا ہے۔ تاکہ وہ ان کو پڑھے۔ یہ سب ابتدائی منازل ہیں اور ان مواقع پر بچے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ ان ابتدائی مراحل کو طے کر چکنے کے بعد بچے کو حروف ٹریس (trace) کرنا سکھایا جائے اور جب وہ انگلی سے اور پھر چھوٹی سی لکڑی سے حروف ٹریس کر سکے، تو اُس کے ہاتھ میں قلم دے دیا جائے۔ اس طرح بتدریج لکھنا سکھایا جائے۔ آہستہ آہستہ بچہ اپنی ترقی سے واقف ہوتا

جاتا ہے اور اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس خوشی سے وہ جلدی ترقی کرتا ہے اور جلدی ہی آسان فقرات لکھنے لگ جاتا ہے۔ اب مدرس اگر تختۂ سیاہ پر آسان فقرات لکھ دے اور بچہ ان کی نقل کرے اور خود ہی ان کو درست کر کے پھر لکھنے کی کوشش کرے، تو ایک سال کے عرصے میں کافی اچھا خوشخط لکھنا سیکھ سکتا ہے۔

بعض بچے لکھتے وقت بایاں ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر بچہ معمولی طور پر سمجھانے سے دایاں ہاتھ استعمال کرنے لگ جائے، تو بہتر ورنہ اس کو دایاں ہاتھ استعمال کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض بچوں کو جب بائیں ہاتھ کے بجائے دایاں ہاتھ استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا، تو اُن کی زبان پر نمایاں اثر پڑا اور وہ ہکلانے لگ گئے۔

حساب | پہلی جماعت میں گنتی اور حساب پر بہت زور نہیں دینا چاہیے اور اگر کسی بچے کو پہلے سال میں گنتی، پہاڑے اور حساب نہ بھی آئے، تو اُس کی اگلی جماعت کی ترقی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ گنتی سکھانے کے لیے معروف اشیا کا استعمال کیا جائے۔ بالعزیم اس قدر مفید نہیں کیونکہ ان گولیوں کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بجائے کوڑیاں، تیلیاں، گولیاں وغیرہ، بے شمار ایسی چیزیں اکھٹی کر کے رکھی جائیں اور ان کی مدد سے بچے کو گنتی سکھائی جائے۔ گنتی کے متعلق ان گولیوں سے کئی کھیلیں تیار کی جا سکتی ہیں اور پھر کارڈ جن پر ہندسے لکھے ہوئے ہوں، پڑھنے کے لیے استعمال کیے جائیں۔ جب اس کو پچاس تک یا سو تک گننا آجائے، تو جمع شروع کر دی جائے۔

مَیں عام رواج سے ایک اور اختراع کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ میرے خیال میں جمع کے بعد تفریق سکھانے کی ضرورت نہیں۔ پہلے جمع سکھائی جائے اور جمع کے بعد ضرب سکھانا

زیادہ آسان ہے۔ جمع و ضرب کی مشق کے بعد تفریق سکھائی جائے اور پھر تقسیم۔ اگر دوسری جماعت میں بچے ہزار یا دس ہزار تک اعداد نہ لکھ سکیں، تو بھی خاص ہرج نہیں۔ بعض مدرس لمبی لمبی رقوم لکھا کر بچوں کے سوال کو فوراً غلط کر دیتے ہیں۔ اس طرح بچوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر دوسری جماعت کے بچے کو کوئی بھی مشکل سوال نہ آئے، تو بھی اُس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ بہرحال مزید مشق دینے کے لیے جمع، تفریق اور پہاڑوں کے کارڈ بنا کر لڑکوں کو دینے چاہییں، تاکہ وہ ان کو پڑھیں اور یاد کریں اور پھر بچوں کی ٹولیاں بنا کر ان کا مقابلہ کرایا جائے۔ تاکہ ان میں مقابلے کا شوق بڑھے اور وُہ زیادہ شوق سے کام کریں۔ اس بات کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ یادداشت بار بار کہنے سے اچھی ہوتی ہے، اس واسطے پُرانے طریقے کو یعنی شام کے وقت پہاڑوں کی گُھماری کھلانے کے طریقے کو چھوڑ نہیں دینا چاہیے، بلکہ اس کو جاری رکھ کر اس سے مستفید ہونا چاہیے۔

سلیبس

از

محمد مظفر الدین، بی ایس سی، بی ٹی، اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس گجرات

دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی مدرسے میں تو سلیبس ہوتا ہی نہیں۔ کسی میں پچھلے سال کا، کسی میں بہت پرانا اور کسی میں ایسے مدرس کا بنا ہوا، جو اسکول سے بھی تبدیل ہو چکا ہوتا ہے اور بغیر کسی ترمیم کے چلا آرہا ہے۔ بہت تھوڑے مدارس میں اس کا صحیح استعمال ہوتا ہے۔ کئی مدارس میں تو کسی ایسے صندوق، الماری یا رجسٹر میں جس کی شاذ و نادر ہی ضرورت پڑتی ہے، رکھا رہتا ہے۔ بعض مدرسین کے نزدیک اُن کا مدعا صرف کمرے کی آرائش ہی ہے۔ بعض کے نزدیک افسرانِ بالا کے حکم کی تعمیل۔ بعض کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض دفع الوقتی اور دکھاوے کی خاطر بنایا گیا ہے۔ ان حالات سے مترشح ہوتا ہے کہ مدرسین اس کا فائدہ اور اہمیت نہیں سمجھتے اور اُس کے بنانے کے صحیح طریقے سے ناآشنا ہیں۔ لہٰذا اُن کی آگاہی کے لیے ذیل کی چند سطور لکھی جاتی ہیں :-

ہر مدرس کے لیے سوچ سمجھ کر سلیبس کا بنانا بہت ضروری اور مفید ہے کیونکہ اس طرح کرنے سے

(۱) اُستاد کو پتہ چل سکتا ہے کہ اُسے کیا کچھ پڑھانا ہے اور کب پڑھانا ہے۔

(۲) مضمون اور کام کی مناسب تقسیم ہو جاتی ہے اور روز روز ایسا کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

(۳) مضمون میعاد مقررہ کے اندر باقاعدہ طور پر ختم ہو جاتا ہے۔

(۴) اچھے غور و خوض سے بنائے ہوئے سلیبس کے مطابق کام کرنے سے مضمون کو طلبہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ اس کے بناتے وقت طلبہ کی ذہنی قابلیت، اگرد و نواح اور مختلف مضامین کے باہمی تعلق کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایسا حصّہ جسے وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، پہلے مناسب وقت پر رکھا جاتا ہے اور اس کے بعد مشکل حصّہ، جس کے ساتھ اس کا تعلق ہو۔

(۵) اس سے طلبہ کی رفتار ترقی کا اندازہ ہو جاتا ہے اور اس کو مناسب طریقے سے گھٹایا یا بڑھایا جا سکتا ہے۔

(۶) اس کو گاہے بگاہے دیکھنے سے طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔

(۷) ایک سے زیادہ جماعتوں میں مضامین کی ایک ہی باتیں نہیں پڑھائی جائینگی۔ جن مدارس میں سلیبس کالعدم ہوتے ہیں۔ ان میں اگر چوتھی جماعت کے اُستاد سے پوچھا جائے کہ گرامر میں کیا پڑھایا ہے، تو وہ اسم، فعل اور حرف بتاتا ہے۔ پانچویں والے سے پوچھا جائے تو وہ بھی یہی بتاتا ہے۔ اسی طرح چھٹی جماعت والا بھی فاعل، مفعول پڑھا رہا ہوتا ہے، اور آٹھویں والا بھی۔

(۸) وقت کی بچت ہوتی ہے، کیونکہ ایک ہی اصول سے تعلق رکھنے والی باتوں کو ایک ہی دفعہ بتا دیا جاتا ہے اور ہر ایک کو بار بار وقفوں کے بعد بتانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

عام نقائص جو موجودہ سلیبس ہائے میں دیکھنے میں آتے ہیں، وہ مفصلۂ ذیل ہیں:۔

(۱) جماعت اوّل کے سلیبس میں ماہ اپریل، مئی، جون . . . . . وغیرہ لکھ دیے جاتے

ہیں، حالانکہ اس میں داخلہ مختلف اوقات پر سال میں دو دفعہ ہوتا ہے۔ اپریل، مئی، جون اور اکتوبر، نومبر میں۔ اکتوبر میں جو لڑکا داخل ہو، وہ اتنا کورس ہرگز نہیں پڑھ سکتا، جتنا سلیبس میں اس ماہ میں دیا ہوتا ہے۔ اس جماعت کے سلیبس میں گنتی سکھائے بغیر پہاڑے پہلے دن سے ہی سکھ دیے جاتے ہیں، حالانکہ پہلے گنتی رکھنی چاہیے اور پھر جب لڑکوں کو اس کا تصور ہو جائے، تو پہاڑے یاد کرانے شروع کرنے چاہییں۔

(۲) بعض دفعہ مہمل الفاظ مثلاً اکائی، دہائی کا تصور، اصطلاحات، خاکہ اور نقشہ، تحویل نزولی اور صعودی، پندرہ سولہ کا پہاڑہ، تقریری سوالات اور جمع کے قاعدے کے متعلق واقفیت دلانا اور کچھ مشق، اعادہ وغیرہ وغیرہ لکھے ہوتے ہیں۔

اب ان میں سے اگر پہلے کو لیا جائے، تو صرف "اکائی، دہائی کا تصور" لکھ دینے سے پتہ نہیں چلتا کہ اعداد نویسی صرف اکائی دہائی تک سکھائی جائیگی یا کہاں تک۔ صرف تصور تو ایک دو روز میں آسکتا ہے۔

"اصطلاحات" لکھ دینا کافی نہیں، کیونکہ اس سے پتہ نہیں چلتا کہ کون کون سی اصطلاحات پڑھائی جائیں گی۔ جو پڑھانی ہوں، وہ لکھنی چاہییں۔

اسی طرح "خاکے اور نقشے" سے واضح نہیں ہوتا کہ طلبہ کو کیا بتانا ہے۔ کیا ان سے یہ چیزیں بنوانی ہیں، یا صرف ان کا فرق ہی بتانا ہے یا ان کو کیا کرنا ہے۔

"تحویل نزولی اور صعودی" لکھ دینے سے ظاہر نہیں ہوتا کہ کون کون سے سکوں اور پیمانوں کی تحویل کرانی ہے اور پہلے کون سے کی اور بعد میں کون سے کی۔ تحویل روپے، آنے، پیسوں، ادھیلوں، پائیوں، دمڑیوں، پونڈوں، منوں، سیروں، گھنٹوں، منٹوں، سیکنڈوں، رتی، تولوں، ماشوں، گزوں، گرہوں وغیرہ کی ہوسکتی ہے۔

"پندرہ سولہ کا پہاڑہ" لکھ دینے سے پتہ نہیں چلتا کہ ۱۵×۱۰ سکھانا ہے یا ۱۵×
یا ۱۵×۲۰ تک سکھانا ہے۔

اسی طرح "تقریری سوالات" لکھ دینے سے معلوم نہیں ہوتا کہ کس اصول یا قاعدے
کے سوالات کرائے جائیں گے۔

"اعادہ" سے معلوم نہیں ہوتا کہ کس حصے کا۔ کہاں سے لے کر کہاں تک اعادہ کرانا

(۳) حساب میں اکثر، جمع، تفریق، ضرب تقسیم لکھ دیا جاتا ہے۔ قاعدوں کے مختلف مدارج
نوٹ نہیں کیے جاتے جس سے اُستاد کے طریقے کا پتہ نہیں چلتا کہ کس طریقے سے وہ یہ قاعدہ
سکھائے گا۔ پہلے جمع، تفریق بلا حاصل سکھائے گا یا با حاصل یا دونوں کے ملے جلے سوالات
اکٹھے کرانا جائے گا۔ ضرب، تقسیم چھوٹی ہی سکھائیگا یا بڑی بھی۔

(۴) جغرافیہ، تاریخ، جیومیٹری، سائنس، شہریت و حفظانِ صحت میں صفحے نوٹ کر دیے
جاتے ہیں۔

(۵) خطوط نویسی، رسیدات اور عرائض نویسی میں جو جو خطوط، رسیدیں اور عرضیاں لکھائی
جائیں گی، وہ نہیں لکھی جاتیں اور نہ ہی یہ نوٹ کیا جاتا ہے کہ کس مہینے میں کس قدر لکھائی
جائیں گی۔ بعض دفعہ مشکل چیزیں پہلے رکھ دی جاتی ہیں اور آسان بعد میں۔

(۶) سلیبس میں مضامین کی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اگر اردو پڑھانا پہلے رکھا جاتا
ہے، تو گریمر حساب کے بعد۔ اسی طرح املا اگر کسی جگہ لگا جاتا ہے، تو اس کے بعد یا پہلے انشاپردازی
نہیں رکھی جاتی، بلکہ کوئی اور مضمون مثلاً جغرافیہ وغیرہ۔

(۷) تعلیمی دنوں کا جو مختلف مہینوں میں کام کرنے کے لیے ملتے ہیں اور تعطیلات کا کوئی
خیال نہیں رکھا جاتا۔

(۸) طبقۂ پرائمری میں زبانی حساب کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

(۹) ارتباطِ مضامین کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ مثلاً سائنس اور جیومیٹری میں دائرہ کا محیط نکالنا مختلف اوقات میں رکھا جاتا ہے۔ حساب اور سائنس میں رقبہ نکالنا اور اس کے سوالات کرانے میں کافی عرصہ حائل ہونے دیا جاتا ہے۔ حفظانِ صحت میں پانی کی کثافتیں دُور کرنا پہلے بتا دیا جاتا ہے اور سائنس میں بعد میں۔

(۱۰) فارسی سلیبس میں قواعد فارسی، ترجمے کے متعلق کوئی ذکر نہیں ہوتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاخیں پڑھائی نہیں جاتیں۔ اسی طرح اُردو گرامر کا بھی بعض جگہ یہی حشر ہوتا ہے۔

(۱۱) جماعت چہارم کو انگریزی ہندسے سکھائے جاتے ہیں، لیکن سلیبس میں اُن کا ذکر مطلق نہیں ہوتا۔

(۱۲) قدیمی پیمائش نوٹ کر دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے سطح کے پیمانے، اُن کے عملی استعمال کے سوالات، مستطیل اور مربع کا رقبہ نہیں رکھا جاتا۔

سلیبس بناتے وقت مندرجۂ ذیل اُمور کو ملحوظ رکھا جائے:۔

(۱) مدرسہ کے اساتذہ کی جو مختلف جماعتوں کو ایک ہی مضمون پڑھاتے ہیں کمیٹی بنائی جائے اور انھیں ایک جگہ اکٹھے بیٹھ کر مدرسہ بھر میں مضمون مذکور کا جتنا کورس پڑھانا ہے، اس سارے کو لے کر اُس کی مناسب تقسیم ہر ایک جماعت کے لیے باہمی بحث و مباحثہ کے بعد کر لینی چاہیے کہ مضمون کی کون کون سی باتیں کون کون سی جماعت میں پڑھائی جائیں گی۔ ایسا کرنے کا یہ فائدہ ہوگا کہ ایک سے زیادہ جماعت میں بار بار ایک ہی حصّہ پڑھانے کا احتمال نہیں رہے گا۔

(۲) اس فیصلے کے بعد ہر ایک جماعت کے مضمون کا جو انچارج مدرس وہ اپنی اپنی جماعت کے سالانہ سلیبس کو بارہ ماہ میں تقسیم کرے، لیکن تقسیم کرنے سے پہلے تعطیلات کو جو اس سال ہوتی ہیں، پیشِ نظر رکھے۔ جس مہینے میں زیادہ تعطیلات ہوں اُ تھوڑے تعلیمی دن کام کرنے کے لیے ملیں۔ اس میں تھوڑا حصّہ رکھا جائے اور جس میں تھوڑ تعطیلات ہوں، اس میں زیادہ حصّہ رکھا جائے۔

(۳) طلبہ کے دلوں پر مضمون کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے ایک ہی جماعت مختلف مضامین کے مختلف حصّے، جن کا آپس میں تعلق ہو یا جو ملتے جلتے ہوں، اس ترتیب سے رکھے جائیں کہ ایک مضمون کی پڑھائی سے دوسرے کو مدد ملے۔ مثلاً فارسی کے سلیبس میں فعل لازم متعدی اس وقت پڑھانے تجویز کیے جائیں، جب کہ اُردو میں پڑھا لیے جائیں یا پڑھائے ہوں۔ اسی طرح جیومیٹری اور سائنس کا دائرے کا محیط نکالنا ایک ہی ماہ میں رکھا جائے۔ جغرافیہ طبعی اور سائنس میں ہَوا، بارش کا حال ایک ہی ماہ میں رکھے جائیں۔

بہتر ہوگا کہ باہمی ارتباط والے مضامین پڑھانے والے اساتذہ کی بھی ایک کمیٹی بن جائے اور اس کے اجلاس میں ان باتوں کا تصفیہ کیا جائے۔

(۴) ایک ہی مضمون کی مختلف شاخوں کو اس ترتیب سے پڑھایا جائے کہ ایک سے دوسرے کو مدد ملے۔ مثلاً زبانی حساب میں انھی قاعدوں کے سوالات کرائے جائیں، جن کے تحریری کرانے ہیں۔

فارسی گرامر میں جو اصول پڑھائے جائیں، فارسی ترجمہ میں انھیں اُصولوں سے تعلق رکھنے والے فقروں کا ترجمہ کرایا جائے۔

(۵) سلیبس بناتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ اس میں تعلیمی اصولوں

کی ایسی باتیں بھی درج ہوں، جن کی طلبہ کو یا اُن کے والدین کو عام زندگی میں ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً جماعت سوم میں ۔ ر، ر، ش، ر اور رقوم لکھنا۔

مضمون نویسی جماعت چہارم میں، شروع ہی میں درخواست برائے رخصت، پھر درخواست برائے معافی فیس لکھائی جائے۔ سمن کی اطلاع یابی، منی آرڈر پُر کرنا، رسیدات، خطوط، پروانہ راہداری وغیرہ بھی رکھے جائیں۔

روزمرہ زندگی اور عام واقعات سے تعلق رکھنے والی باتیں بھی متعلقہ اصولوں کے ساتھ ساتھ سلیبس میں رکھی جائیں۔

(۷) سلیبس ایسے طریقے سے بنایا جائے کہ اس سے مدرس کے طریقۂ تعلیم بھی پتہ لگ سکے۔ مثلاً صرف جمع لکھ دینا کافی نہیں، بلکہ اس کے مختلف مدارج بھی س ترتیب سے رکھے جائیں، جس سے کہ پڑھائے جائیں گے۔ مثلاً جمع بلا حاصل، مع باحاصل، عبارتی سوالات، تفریق بلا حاصل، تفریق باحاصل، عبارتی سوالات، چھوٹی ضرب، لمبی ضرب، چھوٹی تقسیم، لمبی تقسیم وغیرہ۔

جماعت چہارم میں قدمی پیمائش کے مختلف درجے جو حسب ذیل ہو سکتے ہیں، سلیبس میں دکھائے جائیں۔

سطح کے پیمانے، رقبہ کے انگریزی پیمانے، پنجاب میں زمین کی سطح ماپنے کے پیمانے، مستطیل کا رقبہ اور اُس کے متعلق سوالات، سڑکوں کے متعلق آسان سوالات، مربع کا رقبہ، چوکور کا رقبہ اور اُن کے متعلق سوالات، قدمی پیمائش اور س کے سوالات۔

(۸) سلیبس کو اپنے ذاتی حاصل شدہ تجربے کی بنا پر اور جماعت کی استعداد

کے مطابق ہر سال نیا بنانا چاہیے اور پچھلے سال کے سلیبس میں ضروری ترمیم کرنی چاہیے
اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سال گزرنے سے پہلے اسے تبدیل نہیں کرنا چاہیے۔
ضروری معلوم ہو، تو سال سے پہلے بھی بوقت ضرورت مناسب ترمیم جو تجربے کی رو سے
ضروری معلوم ہو کر کے نیا سلیبس بنالینا چاہیے۔

(۹) انشا پردازی کی ایک فہرستِ مضامین علیحدہ بھی بنالی جائے، تو اچھا ہوگا
اس کے حسبِ ذیل خانے ہوں:۔

نمبر شمار۔ نام موضوع ۔ سرخیاں ۔ موزوں الفاظ و محاورات جو استعمال
کیے جائیں گے (ہر ایک سرخی کے ضمن میں دیے جائیں)۔ تاریخ تحریر۔

پنجاب کی تعلیمی خبریں

سنٹرل ٹریننگ کالج میں تعلیمِ بالغاں کا مرکز

آنریبل وزیرِ تعلیم پنجاب کی اپیل کے بموجب سنٹرل ٹریننگ کالج میں پرنسپل جی، سی چیٹرجی صاحب نے اپنے عہدہ کا چارج لینے پر سب سے پہلے جس کام کی طرف توجہ فرمائی، وہ کالج ہٰذا میں تعلیم بالغاں کا اجرا ہے۔ آپ نے تمام کالج کے رُوبرو اس فرض کی اہمیت پر ایک لیکچر میں زور دیا۔ چنانچہ اکتوبر ۳۹ء میں تعطیلاتِ دسہرہ کے بعد کالج کے طلبہ نے ذوق وشوق کے ساتھ اس کام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سنٹرل ماڈل سکول اور کالج کے ادنیٰ ملازمین، جن میں باورچی، مالی، خاکروب، بیلدار وغیرہ شامل ہیں اور جن کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ جدید مدرسۂ بالغاں میں داخل کیے گئے۔ ان کے علاوہ تیس کے قریب بالغ طلبہ آس پاس سے شامل کیے گئے۔ چنانچہ کل تعداد طلبہ اسّی ہوتی ہے۔ زیرِ آموز معلمین جو کالج کے طلبہ ہیں، دس کی تعداد میں ہر روز شام کو سات بجے دس گروہوں کو انگریزی، اُردو اور ہندی پڑھاتے ہیں۔ بالغ طلبہ تعلیم حاصل کرنے میں شوق سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس وقت پانچ گروہ اُردو پڑھتے ہیں۔ تین انگریزی اور دو ہندی۔ ہر پندرہ روز کے بعد تعلیم دینے والے دس پیوپل ٹیچروں کا دستہ بدل دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ آنجہانی

۲۸ اکتوبر ۳۹ء کو سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور میں زیرِ صدارت پرنسپل جی، سی چیٹرجی صاحب ایک ماتمی جلسہ مشہور ماہرِ تحلیلِ نفس ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ کی وفات پر اظہارِ افسوس کرنے کے لیے منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مرحوم نے نفسیاتِ جدید میں اپنی تحقیق کے ذریعے ذہنِ لاشعور کے متعلق عجیب وغریب انکشافات کیے ہیں۔ ان کو ہٹلر نے ۳۸ء میں جرمنی سے

نکال دیا تھا اور وہ اپنے کنبے سمیت انگلستان میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ پچاسی سال کی عمر میں اُنھوں نے حال ہی میں انتقال کیا ہے۔

جلسہ ہذا میں قاضی محمد اسلم صاحب ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور، ڈاکٹر آئی لطیف صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر ایف سی کالج لاہور اور پروفیسر راجہ رام کرپا صاحب ایم اے نے تقریریں کیں اور فرائیڈ کے علمی اور نفسیاتی کارناموں پر روشنی ڈالی۔

انجمن ترقی جغرافیہ اس انجمن کے زیرِ اہتمام فاضل ڈاکٹر محمد باقر صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں "ہندوستان کی طرف برّی راستہ" پر دو عالمانہ لکچر دیے۔

پہلا لیکچر زیرِ صدارت جناب جی، سی چیٹر جی صاحب ایم اے، آئی ای ایس پرنسپل ٹریننگ کالج، بتاریخ ۲ نومبر ۳۹ء منعقد ہوا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے لنڈن سے استنبول تک اپنے مشاہدات کو نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان فرمایا۔

دوسرا لیکچر زیرِ صدارت جناب خان بہادر میاں افضل حسین صاحب ایم اے، آئی ای ایس، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی بتاریخ ۱۶ نومبر ۳۹ء منعقد ہوا۔ اس شام فاضل ڈاکٹر نے استنبول سے کراچی تک کے سفر کو بیان فرمایا۔ اس طویل سفر کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے اعلیٰ طرزِ بیان سے نہایت دلکش اور پُر لطف بنایا۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حاضرین بھی اُن کے ساتھ شریکِ سفر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے حاضرین کو میجک لالٹین کے ذریعے مختلف ممالک کے قابلِ دید مقامات و عمارات کی تصاویر دکھا کر اس سفر پر اصلیت کا رنگ چڑھایا۔ ہم ڈاکٹر باقر صاحب کے شکر گزار ہیں کہ اُنھوں نے ہمیں دنیا کی سیر کرائی۔

آخر میں ہم جغرافیہ کی سوسائٹی کے صدرِ گرامی قدر، فاضل پروفیسر محمد ناظر صاحب کی

خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں، جن کی کوشش سے یہ سوسائٹی وجود میں آئی اور اُس کی زندگی کی پہلی حرکت ایسے شاندار اور پُراز معلومات لیکچروں سے عمل میں آئی۔

گجرات میں خواندگی اور دیہات سدھار کی تحریک ہیڈ ماسٹر صاحب نارمل اسکول گجرات نے بے علمی کے خلاف ایک پُرزور تحریک کی ابتدا کی ہے۔ یہ تجربہ اپنی قسم کا پہلا تجربہ ہے، کیونکہ بے علمی کو دُور کرنے کے ساتھ ہی ساتھ، اس کا مدعا، عوام میں صحت اور دستکاری کا علم پھیلانا بھی ہے۔ ہر علاقے کو تین مرکزوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر مرکز کا اپنا مدرسۂ بالغاں ہے، جہاں سے دیہات سدھار کے تمام مشاغل بھی جاری ہوتے ہیں۔ نوآموز معلمین کا ایک حصہ علم پڑھانے میں سرگرمی کے ساتھ مصروف رہتا ہے اور گشتی دستے یکے بعد دیگرے ہر ایسے مدرسے کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ پہلا دستہ میجک لالٹین کے ذریعے صحت کے اصول پر لیکچر دیتا ہے۔ دوسرا دیہاتی مضامین پڑھاتا اور عام اقتصادی واقفیت دلاتا ہے۔ تیسرا دستہ برموقع صابون سازی، تیل بنانے اور نواڑ بُننے پر عملی کام کر کے دکھاتا ہے۔ اس تحریک نے شروع ہی میں کافی زور پکڑ لیا ہے اور بالغ لوگ جوق جوق اُن مختلف مشاغل سے بہرہ ور ہونے کے لیے چلے آتے ہیں، جنھیں نوآموز معلمین نے اپنے اسکول کے اسٹاف کی زیرِ نگرانی جاری کر رکھا ہے۔ انسپکٹر صاحب ٹریننگ اسکول نے حال ہی میں گلھڑ کا معائنہ کیا تھا۔ اُنھوں نے وہاں کے نارمل اسکول کی ان کوششوں پر اظہارِ پسندیدگی کیا اور سٹاف اور طلبہ کو اس بات پر مفید ہدایات دیں۔

بھیرہ میں خواندگی کی تحریک آنریبل وزیرِ تعلیم پنجاب کی اپیل کے جواب میں ایک "انجمن تعلیم بالغاں" بھیرہ میں قائم کی گئی ہے۔ اس کے صدر ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ مقرر کیے گئے ہیں۔ اب تک اس انجمن نے شہر کے مختلف مقامات میں تعلیم بالغاں کے تین مراکز جاری رکھے ہیں۔ مقامی گورنمنٹ اسکول اور میونسپل پرائمری اسکولوں کے اساتذہ

ان مراکز میں کام کر رہے ہیں۔ طلبہ اور معلمین میں بہت سرگرمی پائی جاتی ہے۔ شہر کے بعض خلائق دوست اصحاب نے ازراہِ کرم سوسائٹی کی سرپرستی کرنا منظور کر لیا ہے اور ان مراکز میں روشنی اور مفت رہائش کا انتظام اپنے ذمے لیا ہے۔ نتائج شاندار ہیں اور حکام کو سوسائٹی کے کام کی اطلاع ہر ماہ بھیجی جاتی ہے۔

پنجاب کی زراعتی آمدنی اور خرچ

پنجاب کی اقتصادی تفتیش کے بورڈ نے "فارم اکونٹس" (کھیتی باڑی کے حسابات) کی تازہ ترین رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بعض دلچسپ امور یہ ہیں کہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں زراعتی مزدور نے کاشتکار کے مقابلے میں، جس نے اُسے نوکر رکھا تھا، زیادہ آمدنی پیدا کی اور یہ کہ کنوؤں میں سے پانی نکالنے کے لیے بجلی کے پمپ کے بجائے بیلوں سے کام لینا سستا پڑتا ہے۔ یہ رپورٹ اس سلسلے کی تیرھویں کڑی ہے جس کا مقصد یہ دریافت کرنا ہے کہ کسان کو پیداوار کے تمام اخراجات پورا کر لینے کے بعد کیا بچت ہوتی ہے۔ دس ضلعوں میں ۲۵ اجارے (زمین کے پٹے) زیرِ معائنہ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کو گزشتہ پندرہ برس سے جانچا جا رہا ہے۔ یہ اجارے مختلف اقسام کی کاشت کو ظاہر کرتے ہیں، جو پنجاب میں کی جاتی ہے۔ بعض اجاروں کی کاشت مالکان خود کرتے ہیں اور بعض کو مجموعی طور پر یا ان کا ایک جزو مستاجری پر دیا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں جنس کی بٹائی کی گئی۔ ان میں سے زیرِ معائنہ پانچ اجاروں کو مکمل طور پر نہر کے پانی سے سیراب کیا گیا۔ باقی ماندہ کا کچھ حصہ نہر اور کچھ کنوئیں کے پانی سے۔ جو باقی رہے، وہ بارانی تھے۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں ان اجاروں کا کل رقبہ ۱۳۸۰ ایکڑ تھا لیکن فارم ۴۸ ۷ ایکڑ تھی۔ یہ فارم لائل پور کے نزدیک رسالے والا کی سرکاری بیج کی فارم ہے اور چونکہ اس کی ایک خاص نوعیت ہے۔ اس لیے اس کے اعداد و شمار بھی خاص ہیں۔

اس رپورٹ کے سلسلے میں حساب پیش کرنے کا طریق بتدریج ترقی پر رہا ہے۔ رپورٹ کی موجودہ اشاعت میں مقابلے کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر کاشت کار اگر زمین ٹھیکے پر دیتا یا مستعار لیتا یا مزدوروں کو کام پر لگاتا، تو اُسے کیا آمدنی ہوتی۔ اس طریق سے وہ تمام آمدنی اُور خرچ اُس کی جزئیات کے ذریعے (جن سے آمد اُور خرچ مرکب ہے) الگ الگ تحویل میں لائے جا سکتے ہیں۔ آمدنی تین ذرائع سے ہوتی ہے یعنی اوّل مزروعہ زمین سے، دوسرے کاشت کے لیے مطلوبہ مزدوری کی وصول شدہ رقم سے اور تیسرے اُس رقم سے حاصل شدہ سُود سے جو آلات کشاورزی اُور مویشی کے خریدنے کنواں کھودنے اُور اُس کے لوازم پر خرچ کی جاتی ہے۔ معلوم ہُوا کہ زمین مزروعہ سے آمدنی پچاس فیصدی اُور مزدوری کا ۴۵ فیصدی اور اصل زر کا پانچ فیصدی ہُوا۔ جس کسان کے پاس یہ تینوں چیزیں اپنی ملکیت کی تھیں۔ اُس کی خالص آمدنی سیراب شدہ ایکڑ سے تیس روپیہ اُور غیر سیراب شدہ ایکڑ سے بارہ روپیہ تھی۔ اس تمام خرچ کا سب سے زیادہ حصّہ مزدوری پر صرف ہُوا۔ مزدوری سے مراد دستی محنت اُور بیلوں کی محنت ہے جنھیں مِلا جُلا کر کل اخراجات کا ۴۵ فیصدی بیٹھتا ہے۔ باقی اخراجات میں سے ۱۵ فیصدی آبیانہ، مالیانہ اُور بیج پر خرچ ہُوا۔ مزدوروں کو جنھیں ۱۹۲۶-۲۷ء میں کام پر لگایا تھا، چار آنے فی مزدور یومیہ اُجرت دی گئی۔ کاشتکار کے گھر والوں کو جو کھیت پر کام میں مدد دیتے رہے۔ ۳ آنے ۱۰ پائی فی کس مزدوری دی گئی۔ ان لوگوں کو دوسرے مزدوروں کے مقابلے میں یہ فائدہ تھا کہ ان کی رہائش دوسرے مزدوروں کے مقابلے میں معنت اُور سستی تھی۔ ان کو نسبتاً زیادہ خود مختاری اور اچھی حیثیت سے رہنے کا موقع ملا۔ جو زمین بٹائی پر لی گئی، اُس کی جنس میں مالک کا حصّہ ۵۵ فی صدی رہا اُور کاشت کار مزارعان کا ۴۵ فی صدی۔

رپورٹ مذکورہ بالا کے ایک حصے میں کنوئیں کے ذریعے آبپاشی کا مقابلہ بیل اور بجلی کی طاقت کے استعمال سے کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر رہٹ کو بیلوں سے چلایا جائے، تو فی ایکڑ ڈھائی روپے خرچ آتا ہے اور اگر اُسے بجلی سے چلائیں، تو ڈھائی اور تین روپوں کے درمیان خرچ اٹھتا ہے۔ بجلی کے پمپ پر چار روپے سے سوا پانچ روپے تک پانی نکالنے کا خرچ ہوتا ہے۔ گویا آبپاشی کے لیے بیل کی محنت مقابلتاً اب بھی سستی بڑتی ہے۔

"فارم اکونٹ" کے نام سے زیرِ معائنہ اجاروں کے بارے میں جو رپورٹ شائع ہوئی ہے، وہ ہندوستان کی زمینداری کے سلسلے میں بہت مفید معلومات مہیا کر رہی ہے اور س سے پنجاب کے کسان کی آمدنی اور خرچ کے متعلق جو سب سے پہلی تحقیقات کی گئی ہیں ن کے نتائج اوّلیں کا پتہ چلتا ہے۔ ایسی رپورٹوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کاشت کے سابات کو علمی طریق سے کیونکر رکھنا چاہیے اور ان کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ زراعت کے ، پہلو کا ایک مرقع ہیں۔ ان کی اہمیت کا جتنا بھی اندازہ کیا جائے کم ہے۔ بالخصوص ی حالت میں جب کہ ملک کی سب سے اعلیٰ صنعت یعنی زراعت کو آمدنی پیدا کرنے کا ب ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

ٹ ہیروز میموریل ئی اسکول روہتک اس مدرسے کی نئی عمارت کی رسمِ افتتاح اور اُس کی سلور جوبلی منانے کے سلسلے میں، اس جشن کے صدر آنریبل سردار سر ندر حیات خاں صاحب کے بی ای اور ان کے رفقائے کرام آنریبل سر چھوٹو رام اور بل میاں عبدالحی صاحبان ۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ۱۰½ بجے اسکول میں تشریف فرما ہوئے رات تلواروں کی محراب کے تلے گزرے، جسے پنشن یافتہ فوجی افسروں نے بنایا تھا۔

چودھری جگ لال سنگھ صدر مجلس انتظامیہ مدرسہ انھیں بورڈنگ کی عمارت کا معائنہ کرانے لے گئے۔ انھوں نے وزرائے کرام کو بتایا کہ بورڈنگ کے باورچی خانوں کی خستہ حالت کا سبب روپیہ کی کمی ہے۔ آنریبل وزیرِ اعظم نے صاحب صدر موصوف کو یقین دلایا کہ انھوں نے مدرسے کے لیے واقعی ایک شاندار عمارت کھڑی کر دی ہے اور مناسب وقت پر بورڈنگ کی عمارت کو بھی ضروریاتِ حال کے مطابق بنا سکیں گے۔ اس کے بعد وزیرِ اعظم اور دوسرے وزرا کو مدرسۂ بالغاں کا معائنہ کرایا گیا۔ جسے اسکول کے طلبہ چلاتے ہیں۔ انھوں نے مدرسہ کے نوکر چاکر کی خواندگی میں ترقی معلوم کر کے اظہارِ خوشنودی کیا اور پھر معزز مہمانوں کو طلبہ کی ماس ڈرل دکھائی گئی۔

آنریبل وزیرِ اعظم اور دیگر معزز وزرا صاحبان پنڈال میں رونق افروز ہوئے اور جلسے کی کارروائی شروع کی گئی۔ حاضرین کثیر تعداد میں مع ڈپٹی کمشنر صاحب اور تمام سرکردہ افسر صاحبان موجود تھے۔ ایک ہزار سے زیادہ پنشن یافتہ ہندوستانی افسر بھی تھے۔ جاٹ قوم کے فوجی نمائندے بھی دُور اور نزدیک سے آئے ہُوئے تھے۔ سکھ پلٹن کا بینڈ باجہ گاہے گاہے خوشگوار سُروں میں بجتا رہا۔

جلسے کی کارروائی اسکول کے بچوں کے ایک خوش آمدید کے گیت سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد لفٹنٹ کرنیل آر پی ایل رینکنگ صاحب نے جنگی لاٹ صاحب کا مندرجہ ذیل پیغام پڑھ کر سُنایا۔ "مجھے نہایت افسوس ہے کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے مَیں آپ کے ہال کمرہ کی رسم افتتاح میں شریک ہونے سے قاصر ہوں۔ آپ نے کمال مہربانی سے اس ہال کا نام میرے نام پر رکھنا تجویز کیا ہے۔"

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس مدرسے کے طلبہ اور اُستاد صاحبان نے گزشتہ

جنگ میں وفاداری کے ساتھ خدمت کی تھی۔ موجودہ وقت میں جب کہ سلطنت پھر جنگ میں مصروف ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ مدرسہ پھر اپنی وفاداری اور ایثار کا مثلِ سابق ثبوت دے گا اور تمام قوم جنگ کی خدمت کے لیے آگے بڑھیگی، تاکہ ہمیں آخری فتح حاصل ہو۔ مَیں اس مدرسے کے لیے اُس کے قابلِ تعریف کاموں پر ایک طویل اور شاندار زندگی کا آرزومند ہوں۔"

مختلف سول اور فوجی افسران اور سرکردہ ماہرینِ تعلیم کے پیغامات بھی موصول ہُوئے۔ اسکول کے اعزازی ناظم کپتان بھوپ سنگھ صاحب نے مدرسے کی تاریخ اُس کے سنگِ بنیاد رکھنے سے لے کر موجودہ وقت تک پڑھ کر سُنائی۔ چودھری جگ لال سنگھ صاحب صدر مدرسہ نے مدرسے کی طرف سے آنریبل وزیرِ اعظم کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پڑھ کر استدعا کی کہ مدرسہ کو ڈگری کالج کی حیثیت عطا کی جائے اور ایک علیحدہ سائیفن کھڑی کی جائے جس سے نہر کا پانی مدرسہ کو بہم پہنچایا جائے اور ساتھ ہی پنجاب کی سرکاری درسگاہ کے لیے ایک خاص گرانٹ عطا فرمائے۔ کیونکہ مجلس منتظمہ مزید فنڈ جمع کرنے سے اس لیے معذور ہے کہ علاقے کے اطراف وجوانب میں قحط پھیل رہا ہے۔

اس کے بعد ڈسٹرکٹ بورڈ، ضلع کے سپاہیوں کی انجمن، زمیندارہ لیگ، مسلم لیگ اور میونسپل کمیٹی رہتک کی طرف سے وزیرِ اعظم کی خدمت میں سپاسنامے پیش کیے گئے۔ آپ نے ان سب کا جواب ایک ساتھ دیا۔ اوّل آپ نے اسکول والوں کا شکریہ ادا کیا کہ اُنھوں نے کیسل ہال اور چھوٹو رام سجن کمار جیسی شاندار بلڈنگ قائم کی۔ آپ نے اس امر پر اظہارِ اطمینان فرمایا کہ اسکول کے ۲۵۰ طلبہ اور ۱۶ اساتذہ نے موجودہ جنگ میں اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ آپ نے اس امر کا یقین دلایا کہ ہم مدرسے

کے لیے نہر کا پانی مہیا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرینگے۔ آپ نے ضلع کے زمینداروں کو مطلع فرمایا کہ جب تک بھکڑ ڈیم بند کی تجویز پختگی کو پہنچ جائے، اگلے سال سے اُنھیں چارہ بونے کے لیے پانی کی زیادہ مقدار بہم پہنچائی جائیگی۔ اس کے بعد سر چھوٹو رام صاحب نے ایک طویل تقریر کے دوران میں فرمایا کہ یونینسٹ گورنمنٹ نے رفاہ عامہ کے مختلف کام کیے ہیں۔ آنریبل میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم نے مجلس انتظامیہ کو مطلع فرمایا کہ ہم اس امر پر غور کریں گے کہ مدرسہ ہذا کو ڈگری کالج بنانے کے لیے ایک معتدبہ مالی امداد دی جائے یا یہ کہ موجودہ انٹرمیڈیٹ کالج کو ڈگری کالج تک ترقی دی جائے۔ آپ نے شری مان سوامی پورن ناتھ صاحب کا شکریہ ادا فرمایا کہ سوامی جی نے مبلغ ۷ ہزار روپے کی لاگت سے ایک شاندار ہسپتال مدرسے کے لیے تعمیر کرایا ہے۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ ہم نے مدرسہ ہذا کی جوبلی منائے جانے کی غرض سے مبلغ ایک ہزار روپیہ منظور فرمایا ہے۔ سوامی پورن ناتھ جی نے وزیر ممدوح کے مدرسے میں تشریف فرما ہونے کا شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ مدرسے کو ڈگری کالج کی حیثیت تک ترقی دی جائے۔ تاکہ اس سے جاٹ قوم تعلیم کی ترقی ہو۔

اس کے بعد آنریبل وزیر اعظم نے ہر دو عمارات یعنی کیسل ہال اور چھجو رام سجن کمار بلڈنگ کی رسم افتتاح ادا فرمائی اور آنریبل وزیر تعلیم نے سوامی پورن ناتھ ہسپتال کی رسم افتتاح ادا فرمائی۔

سہ پہر کو والی بال، فٹ بال اور ہاکی کے میچ ہوئے۔ جن میں اسکول کے موجودہ اور پرانے طلبہ شریک تھے۔ رات کو مدرسے کی تمام عمارات بورڈنگ اور اسٹاف کی اقامت گاہوں میں شاندار چراغاں کیا گیا اور آتش بازی ہوئی۔ اسکول کے موجودہ اور پرانے طلبہ

کا ایک جلسہ ہُوا اُور اس میں تقریریں ہوئیں۔

مسٹر ہاروے کا لیکچر مورخہ ۹ نومبر ۱۹۳۹ء کو سنٹرل ٹریننگ کالج کی سائنس گیلری میں بوقت ۶½ بجے شام زیرِ صدارت مس ٹامس ڈپٹی ڈائرکٹرس سررشتۂ تعلیم، مسٹر ہاروے پرنسپل گورنمنٹ کالج، لدھیانہ نے ایک لیکچر دیا۔ آپ کا مضمون تھا "بچوں کا فن"۔ آپ نے فرمایا کہ انگلستان میں بچے اس قسم کے ماحول میں تعلیم پاتے ہیں۔ جس میں کہ اُن کے قدرتی میلانات کو اظہار کا موقع ملتا ہے۔ لیکچر کے دوران میں آپ نے فرمایا کہ آپ ایک نمائش دیکھنے گئے، جو ضلع لندن کی کونسل کی طرف سے منعقد ہوئی تھی۔ اس نمائش میں آپ نے بہت سی تصاویر اُور نمونے دیکھے، جو بچوں کے بنائے ہُوے تھے۔ گو یہ تصاویر اُور ماڈل خوبصورت نہیں تھے، بلکہ بھدے تھے، تاہم یہ اس لیے قابلِ قدر تھے کہ بچوں کو ان کے ذریعے موقع ملا کہ وہ اپنی جمالیاتی حس کا اظہار کریں۔ بعض وقت بچہ قلم دوات سے یا پنسل سے کاغذ پر پنسل سے لکیریں کھینچتا ہے، جو ہمارے نزدیک سوائے کاغذ خراب کرنے کے اور کچھ مطلب نہیں رکھتیں۔ اس لیے ہم بچے کو روک دیتے ہیں کہ کاغذ خراب مت کرے لیکن ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ گو ہمارے نزدیک وہ گول ترچھی یا سیدھی لکیریں فضول ہیں، لیکن اُن لکیروں کے ذریعے بچہ اپنی جمالیاتی حس کا اظہار کرتا ہے۔ ہمیں اس کام میں بچے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

اوّل اوّل بچہ مختلف چیزیں یا تصویریں دیکھتا ہے۔ پھر اپنے آپ کاغذ پر اُن چیزوں کی تصویر بناتا ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی بات جو اُسے زیادہ پسند آئی ہو۔ اُسے اپنی تصویر میں نمایاں طور پر ظاہر کرتا ہے اُور کچھ اپنی طرف سے بھی اُس چیز کی تصویر میں کمی بیشی کرتا ہے۔ بعد میں وہ کہانیاں سُنتا ہے اُور اپنے تصور کی قوت سے اُن کہانیوں کو تصویروں کے ذریعے بیان کرتا ہے۔

تختِ طاؤس

مصنفۂ

مولوی محمد عبداللطیف خان کشتہ قادری

یہ کتاب مولانا کشتہ قادری کی ہفت سالہ تخلیقی و تفتیشی مساعی کا نتیجہ ہے۔ تختِ طاؤس عہدِ مغلیہ کی زرگری، جواہر تراشی و خوش مذاقی کا مرقع تھا اور اُس کی صنعت صنعتِ ایران و ہندوستان کا دلآویز سنگم تھی جس کی زیارت کے لیے دُور دُور کے ملکوں کے لوگ صعوباتِ سفر ہنسی خوشی برداشت کر کے آتے اور تازگیٔ نظر و تفریحِ قلب و تحیر کا پرشاد لے کر جاتے اور یہ تبرک مدتِ دراز تک ان کو تر زبان و خوش بیان رکھتا تھا۔ کتاب ہذا اسی شاہی تخت کے وقائع تاریخی پر مشتمل ہے۔ حقیقتاً اس تخت کے پردے میں ایشیائی دماغی لطافتوں کے سینکڑوں مرقعے چھپے ہوئے، جن کو منظرِ عام پر لا کر مولائے موصوف نے ملک و قوم پر ایک زبردست احسان کیا ہے اور اُن کی یہ کد و کاوش قابلِ شکر گزاری ہے۔

ہمارے یہاں کی بہت کم تاریخی کتب ایسی ہیں، جن میں وسعتِ مطالعہ، غور و تحقیق، تفتیش، تنقید، علمی و منطقی استدلال و آزادہ خیالی سے کام لیا گیا ہو اور اُن کے مؤلفین و مصنفین نے روایت و درایت کی علمی جانچ پڑتال کی ہو۔ اپنی طبیعت سے کسی نتیجے پر پہنچے ہوں پیچیدہ مسائل کو تقسیم و تحلیل کرتے ہوئے کوئی انکشاف کیا ہو اور اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھا کر اس طرح ترتیب دیا ہو کہ اُن کی اصلی حالت نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مگر پیشِ نظر کتاب تاریخ "تختِ طاؤس" ان تمام اوصاف سے متصف ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز۔ لاہور

دیہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لئے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس کا مضمون حال ہی میں ورنیکلر فائنل کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لئے مخصوص ہوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر کوئی جامع کتاب نہ تھی۔ طلبہ کی اس دقت کا احساس کرتے ہوئے زرکثیر صرف کرکے مجوزہ سکیم کے عین مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ بہ سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب، برائے جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے، جس کی عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ ہر امر کو روزمرہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ تصاویر سے واضح کیا گیا ہے اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے۔ سلسلہ ہذا طلبہ کے لئے ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔ اس کے مطالعے سے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان و دیگر سائنس کے مدرسین اصحاب اپنے مدارس میں جاری کرا کے جہاں ہمیں ممنون و مشکور فرمائیں گے وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبودی میں بھی خوشی محسوس کریں گے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت ۵ آنے ۴ پائی		
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	〃	۵ 〃	۲ 〃
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	〃	۷ 〃	۱۰ 〃
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	〃	۱۴ 〃	۲ 〃

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

کتب لائبریری

برائے: پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۶ر	۱۹	کام کی باتیں حصۂ اوّل	۳ر۹ پائی
			۲۰	〃 〃 〃 حصۂ دوم	۲ر۳ 〃
۲	〃 〃 دوسری 〃 〃	۷ر۴ پائی	۲۱	قصصِ ہند حصۂ اوّل	۳ر۲ 〃
۳	〃 〃 تیسری 〃	۹ر۹ 〃	۲۲	〃 〃 حصۂ دوم	۳ر۸ 〃
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر	۲۳	قصصِ ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۵	〃 〃 دوم	۷ر۳ 〃	۲۴	حسینہ اور وحشی	۵ر۱ 〃
۶	〃 〃 سوم	۷ر	۲۵	شہزادہ مہربان	۶ر۲ 〃
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر	۲۶	راماسیتا	۱ر۱۰ 〃
۸	〃 〃 دوم	۷ر۳ 〃	۲۷	جادو کا مٹکا مسٹر لیارام	۳ر
۹	〃 〃 سوم	۷ر	۲۸	مہاراجہ رنجیت سنگھ	۶ر۴ 〃
۱۰	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲ر۹ پائی	۲۹	درروپدی	۱ر۸ 〃
۱۱	〃 〃 نمبر ۲	۱۰ر۳ 〃	۳۰	خلیفہ ہارون الرشید . . .	۴ر
۱۲	〃 〃 نمبر ۳	۲ر۵ 〃	۳۱	راجہ اشوک	۵ر
۱۳	الف لیلیٰ کے انمول موتی		۳۲	مہارانا پرتاپ	۲ر۱ پائی
	〃 〃 حصہ ۱ 〃 〃	۸ر۲ 〃	۳۳	شہاب الدین شاہجہان . . .	۱۰ر۲ 〃
۱۴	〃 〃 حصہ ۲ 〃 〃	۱۰ر۳ 〃	۳۴	شیر شاہ سوری	۱۱ر۲ 〃
۱۵	〃 〃 حصہ ۳ 〃 〃	۲ر۵ 〃	۳۵	نصیر الدین ہمایوں	۱۰ر۲ 〃
۱۶	دلچسپ تاریخی کہانیاں		۳۶	اورنگ زیب عالمگیر . . .	۹ر۲ 〃
	〃 حصۂ اوّل 〃	۷ر۷ 〃	۳۷	شہاب الدین غوری	۸ر۲ 〃
۱۷	〃 حصۂ دوم 〃	۱۱ر۸ 〃	۳۸	سلطان علاؤ الدین خلجی . . .	۱۱ر۲ 〃
۱۸	〃 حصۂ سوم 〃	۷ر	۳۹	فیروز الدین تغلق	۳ر

اشتہار

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۰	نورالدین جہانگیر . . .	۲/۳ پائی
۴۱	امیر تیمور	۲/۷ //
۴۲	پرتھوی راج	۲/۷ //
۴۳	محمودِ غزنوی	۲/۶ //
۴۴	مصر کی داستان	/۴
۴۵	جاپان کی کہانی	۳/۶ پائی
۴۶	چین کی کہانی	۳/۶ //
۴۷	مستورات چین وجاپان . .	/۴
۴۸	ایران کی کہانی	۳/۶ //
۴۹	ایشیائی روم	۲/۷ //
۵۰	ٹرکی (یورپی روم)	۲/۷ //
۵۱	لنکا	۱/۱۱ //
۵۲	بصرہ وبغداد	/۵
۵۳	یونان	/۲
۵۴	تین سوال	۲/۷ پائی
۵۵	امرت ورشا	۳/۱۰ //
۵۶	زمانۂ سلف کے قصے کہانیاں نمبر۱ داؤد بادشاہ	۳/۹ //
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں // حصۂ اوّل	۳/۹ //
۵۸	// // دوم //	۴/۵ //
۵۹	خوفناک خواب	/۲
۶۰	ہیرا لال	۲/۶ //
۶۱	دولت کی بیشادی	۲/۱ //
۶۲	سادھو کی چکی	/۲
۶۳	نیلا بانہ	۲/۱۱ //
۶۴	بہادر شہزادہ	۲/۱ //

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۶۵	جوتی موتی	۲/۱۰ پائی
۶۶	جواہرات کا خزانہ . .	۳/۷ //
۶۷	چھوا اور سونا ہوا (باتصویر)	/۲
۶۸	علی بابا چالیس چور . . .	/۴
۶۹	علاؤالدین و عجیب و غریب لیمپ	۴/۶ پائی
۷۰	ملّا دو پیازے کا سفر . . .	/۳
۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	/۳
۷۲	نیشاپور کا سوداگر	۲/۱۱ پائی
۷۳	پرستان کا موچی	/۳
۷۴	سندر پیاری	/۳
۷۵	چاندی کی کنجی	/۳
۷۶	سلکِ جواہر نمبر۱ (حکمرانی کا گر)	۲/۶ پائی
۷۷	// // نمبر۲ (اوج وپستی)	۱/۶ //
۷۸	// // نمبر۳ (شہیدالفت)	۱/۶ //
۷۹	سلکِ جواہر۔ مردِ میدان	۱/۶ //
۸۰	// // نیک وبد	۱/۹ //
۸۱	// // عیب وہنر	۱/۴ //
۸۲	// // جہاں گرد	۱/۶ //
۸۳	// // جواب باصواب	۱/۱۰ //
۸۴	// // سخاوت کی انتہا	۱/۲ //
۸۵	// // حسنِ تدبیر	۱/۶ //
۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی فہرست . .	۲/۳ //
۸۷	ڈرامہ غم خوار عالم	۲/۷ //
۸۸	مہاراجہ بکرماجیت اور اُس کا تخت	۱/۶ //

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
DELHI.

جلد (۶) | جنوری سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر (۱۰)

فہرست مضامین

۱	اداریہ		۱
۲	بچوں کی ذہنیت	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی	۶
۳	ہکلاپن	مسز آر، اے گسائیں	۱۳
۴	ایک خط	محمد شریف قریشی	۲۰
۵	جغرافیہ (نظم)	جگن ناتھ آزاد	۲۱
۶	لڑکیوں کی جسمانی تعلیم	جگن ناتھ آزاد	۲۲
۷	شوخ اور گستاخ بچے	سیّد نذر محمد	۳۱
۸	تعلیم بالغان پر ایک تنقیدی نظر	شیخ انوار نبی قریشی	۴۲
۹	پنجاب کی تعلیمی خبریں	خواجہ عبدالمجید	۵۲

اداریہ

گو آجکل ہندوستان میں ہر طرف تعلیم کا بہت چرچا ہو رہا ہے لیکن جہاں تک تعلیمِ نسواں کا تعلق ہے۔ اس مسئلے پر شاید اس قدر غور و خوض نہیں ہُوا، جتنا کہ ہونا چاہیے۔ یہاں اس بات کے بتلانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ایک تعلیم یافتہ خاتون اپنے گھر کی چاردیواری کو ہی منور نہیں کرتی، بلکہ اپنے ماحول کی سماجی و سیاسی زندگی کو سدھارنے میں بھی نمایاں حصّہ لیتی ہے۔ اس واسطے خواہ ہم اس مسئلے کو قومی اور خواہ خانگی زندگی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیں، بہر حال اس کی اہمیت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن جہاں تک اصلی حالات کا تعلق ہے۔ وہ بہت مایوس کن ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں چار کروڑ سے کچھ زائد بچے ایسے ہیں۔ جن کی عمریں چھے اور گیارہ سال کے درمیان ہیں۔ یعنی وہ اسکول جا کر تعلیم پانے کے قابل ہیں۔ لیکن ان تمام بچوں میں جتنے لڑکے ہیں، اُن میں سے ۵۰٫۳ فی صدی اور لڑکیوں میں سے صرف ۱۶٫۵ فی صدی حصولِ تعلیم میں مصروف ہیں اور وہ بھی زیادہ تر بڑے بڑے شہروں میں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جہاں دوسرے ممالک تعلیمِ نسواں کو اس قدر فروغ دے رہے ہیں، ہم اس مسئلے کو حل کرنے میں کیوں کامیاب نہیں ہوتے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس قدر جہالت ہے کہ والدین اپنی لڑکیوں کے لیے تعلیم کی اہمیت کو ابھی تک سمجھے ہی نہیں اور سمجھ بھی کیسے سکتے ہیں؟ جب ایک شخص علم کی برکات سے خود بے بہرہ ہو، تو وہ کیسے یقین کر سکتا ہے کہ اس سے اس کی اولاد مستفید ہوگی اور ہمارے بدقسمت ملک میں تو بے علم انسان ہزاروں نہیں، بلکہ کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ انگلستان میں ۹۹ فیصدی،

فرانس میں ۹۵ فیصدی، جرمنی میں ۹۹ فیصدی، اٹلی میں ۹۲ فیصدی اور روس میں ۹۸ فیصدی انسان لکھے پڑھے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں صرف ۸٫۵ فیصدی اشخاص ایسے ملیں گے جو نوشت وخواند میں دسترس رکھتے ہوں۔ اس لیے اس ملک میں اکثر تعداد کے والدین لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب یا کم ازکم فضول خیال کریں، تو کوئی اچنبا نہیں جس شخص کا دماغ علم کی روشنی سے منوّر نہیں ہُوا۔ وہ اُس کی اہمیت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔

ہماری ناکامیابی کی دوسری وجہ ہماری مفلسی ہے جہاں جرمنی میں اوسطاً سالانہ آمدنی ۶۳۴ روپے، فرانس میں ۶۳۶ روپے، انگلستان میں ۱۰۹۲ روپے اور ممالک متحدہ امریکہ میں ۲۰۵۳ روپے ہے، وہاں ہندوستان میں صرف ۸۲ روپے ہے۔ اس ملک میں لاکھوں انسان ایسے ہیں، جن کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا میسر نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۸ء میں بنگال کے ڈائرکٹر زراعت نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا کہ جس خوراک پر اس صوبے کا ایک غریب دیہاتی گزارہ کرتا ہے، اُس کی خوراکی حیثیت اس قدر کم ہے کہ اگر اسی خوراک پر چوہے پالے جائیں، تو وہ پانچ ہفتوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ پنجاب کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ جو خوراک اس صوبے کے غریب انسانوں کے حصے میں آتی ہے، اس سے بہتر خوراک پنجاب کے جیلوں میں قیدیوں کو دی جاتی ہے۔ اگر ہمارے افلاس کی سچ مچ یہی حالت ہے، تو ہماری تعلیمی پستی پر کسی کو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے کم ازکم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی مسائل ہماری اقتصادی حالت سے بہت کچھ وابستہ ہیں۔ اس واسطے جہاں اس بات کی کوشش ہو کہ ملک میں تعلیم روز بہ ترقی ہو، وہاں ان ذرائع پر غور وخوض کرنا بھی لازمی ہے، جن سے ملک کی مالی حالت بہتر ہو سکے۔ لیکن یہ کام حکومت کا ہے اور اسے ایک ایسے ڈھانچے کے مطابق انجام دینا چاہیے، جو دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں کامیاب ثابت ہُوا ہو۔

اس کے علاوہ ہماری کئی ایک رسومات بھی تعلیمِ نسواں کے راستے میں حارج ہوتی ہیں۔ ان میں بچپن کی شادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں تو یہ رسم اب آہستہ آہستہ اٹھتی جارہی ہے، لیکن دیہات میں ابھی تک اس کے قبیح اثرات دیکھنے میں آتے ہیں۔ جہاں لڑکی کا تھوڑا سا قد ابھرا، اُسے بجائے مدرسے بھیجنے کے سُسرال بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں اس بات پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ بچپن کی شادی کے اور کیا کیا بُرے نتائج ہوتے ہیں۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، اس سے جو ملک کی بیٹیوں کو نقصان ہوتا ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔

ہماری تعلیمی پستی کی سب سے زبردست وجہ یہ ہے کہ ملک میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے نہ تو کافی اسکول ہیں اور نہ اُستانیاں۔ ہندوستان کے کروڑوں انسان زیادہ تر دیہات میں رہتے ہیں۔ جو لاکھوں کی تعداد میں ملک کے مختلف حصّوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی سوشل زندگی کو کسی نظام کے ماتحت لانے کے لیے ضروری ہے کہ کم ازکم ایک بڑے گاؤں میں ایک عدد اسکول ایسا ضرور ہو، جہاں لڑکیاں تعلیم پاسکیں۔ اس کے علاوہ ایسی اُستانیوں کی ضرورت ہے، جو تعلیم کا کام بخوبی کرسکیں۔ ۱۹۳۵ء میں تمام ہندوستان میں ٹرینڈ اُستانیوں کی کل تعداد صرف ۲۵۰۰ تھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جتنی لڑکیاں تعلیم حاصل کرسکتی ہیں، ان میں سے اگر آدھی بھی اسکول جائیں، تو ڈیڑھ لاکھ اُستانیوں کی ضرورت ہوگی۔ اب آپ خیال کرسکتے ہیں کہ ہم اپنی منزلِ مقصود سے کتنی دُور ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مشکلات کا حل کیا ہے؟ مندرجۂ بالا سطور کا مطالعہ کرنے سے یہ تصور ثابت ہوگیا ہوگا کہ تعلیمِ نسواں کا مسئلہ باقی تعلیم کے مسئلوں سے اس قدر وابستہ ہے کہ اُس کا علیحدہ حل سوچنا بیکار ہے اور نہ ہی یہ اس قدر سہل ہے کہ "کن" کہنے سے حل ہوجائے۔ ہمارے خیال میں اُسے تعلیمِ عامہ کا ایک ضروری جزو سمجھنا چاہیے اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حکومت کو ایک تین یا پچیس سالہ منصوبہ باندھنا چاہیے۔ جہاں تک ملک کی مفلسی کا تعلق ہے، یہ

ایک ایسا مسئلہ ہے، جسے گورنمنٹ یا اُس کے اقتصادی ماہروں کے سوائے اَور کوئی حل نہیں کر سکتا۔ یہ خیال کرنا کہ تعلیم حاصل کرنے سے ہماری اقتصادی مشکلات بھی خود بخود دُور ہو جائیں گی، سراسر غلط ہے۔ کیونکہ سرمایہ تو صنعت و حرفت یا اسی قسم کے اَور ذرائع سے پیدا ہوتا ہے اَور ان ذرائع کو پیدا کرنا اَور فروغ دینا ایک ملک کی گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ تعلیم کا کام تو انسان کے دماغ کو روشن کرنا ہے، تاکہ وہ اپنی سیاسی، سماجی، اقتصادی اَور اخلاقی زندگی میں سوچ سمجھ سے کام لے۔

باقی رہا اسکولوں اَور اُستانیوں کا سوال۔ جہاں تک پرائمری تعلیم کا تعلق ہے، اس کا حل اِس طرح تجویز کیا گیا ہے کہ جن دیہات میں لڑکیوں کے اسکول موجود نہ ہوں، وہاں لڑکے اَور لڑکیوں کو اکھٹی تعلیم دی جائے۔ ایسا کرنے سے ایک تو نئی عمارات اور اسکول کے لیے نیا سامان خریدنے کا خرچ بچ جائے گا اَور دوسرے لڑکے لڑکیوں کے باہم میل جول سے اُن کے اخلاق پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ چونکہ ہندوستان میں مشترکہ درسگاہوں کا خیال ابھی بالکل نیا ہے اَور ملک کے لوگ زیادہ تر جہالت میں پھنسے ہُوئے ہیں، اس لیے ہمارے خیال میں اس تجربے کو کامیاب بنانے کے لیے چند ایک شرائط پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اوّل۔ جہاں مشترکہ درس گاہیں کھولی جائیں، وہاں اُستادوں کے بجائے اُستانیاں تعلیم دینے کا کام کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بڑے بڑے گاؤں میں نارمل اسکول کھولے جائیں، جہاں گاؤں کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ٹریننگ دے کر اس کام کے لیے تیار کیا جائے۔ یہ بات عام تجربے میں آئی ہے کہ جو لڑکیاں شہروں میں ٹریننگ حاصل کرتی ہیں، وہ دیہات میں جا کر کام کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کی سوشل زندگی کا معیار دیہاتی زندگی سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے اگر نارمل اسکولوں میں دیہاتی لڑکیوں کو ہی ٹرینڈ کیا جائے، تو یہ مشکل مسئلہ کسی حد تک ضرور

حل ہوجائے گا۔

دوم۔ مشترکہ اسکولوں میں اگر اسٹاف خواتین سے پُر نہ ہو سکے، تو کم ازکم ملا جُلا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے برین صاحب، کمشنر رورل ری کنسٹرکشن پنجاب کی تجویز کہ اگر میاں بیوی دونوں تعلیم یافتہ ہوں، تو دونوں کو ایک ہی اسکول میں تعینات کر دینا چاہیے قابلِ غور ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

سوم۔ ہر ایک مشترکہ اسکول میں کم ازکم دو اُستانیوں کو لگانا چاہیے۔ تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کر سکیں۔

چہارم۔ جس علاقے میں چھوٹے چھوٹے گاؤں ہوں، وہاں تعلیم نسواں کے لیے ایک مرکزی پرائمری اسکول قائم کرنا چاہیے۔ جس کے ساتھ اُستانیوں کی رہائش کے لیے اور طالبات کو اسکول لانے اور اسکول سے اپنے گھروں تک پہنچانے کے لیے باقاعدہ انتظام ہو۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر مندرجہ بالا شرائط پر عمل کیا گیا اور صوبجاتی حکومتوں نے اس اہم مسئلے پر غور کیا، تو مستقبل میں تعلیم نسواں کی تاریخ سنہرے حروف میں لکھی جائے گی۔

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
DELHI

بچوں کی ذہنیت

از

پنڈت برج موہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی

ہر انسان مرد ہو یا عورت، پہلے بچہ ہی ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ جوان اور بوڑھا ہوتا ہے۔ قوم کا بزرگ بنتا ہے اور قومی و ملکی معاملوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ یہ مدارج تو سب جانتے ہیں، ان سے بحث کی ضرورت نہیں۔ زندگی کے اس سفر میں اس وقت ہم صرف پہلی منزل کا کچھ ذکر کرینگے اور وہ ہے بچپن اور بچوں کی ذہنیت۔ بچے سے ہمارا مطلب وہ لڑکے اور لڑکیاں ہیں جو ابتدائی تعلیمی مدرسوں میں پڑھتے ہیں، یعنی اپر پرائمری تک یا اس سے کچھ آگے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ بچے کا ذہن ایک نئی دھلی دھلائی سلیٹ کی مانند سادہ، تیز اور جبلّی جو ہموار ہوتا ہے۔ اب جو نقش اس سلیٹ پر کھینچا جائیگا، جو لفظ اس پر لکھا جائیگا، وہ خوب نمایاں ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر سلیٹ میں پتھر کی کچھ رگیں ابھری ہوئی ہیں، تو اس جگہ حرف اور خط پھٹے پھٹے سے ہو جائیں گے اور دھونے کے بعد پونچھنے میں اگر کوتاہی ہوئی ہے، تو کہیں کہیں نمی رہ جانے کی وجہ سے حرف پھیل کر بھونڈی شکل اختیار کر لیں گے۔ اب سلیٹ کے نقصوں کو بچے کے ذہن پر عاید کیجیے۔ یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ رگیں جن کا ابھی ذکر ہوا لکڑی کے کوئلے سے دو چار دفعہ رگڑنے سے گھس کر غائب ہو جائینگی اور سلیٹ کی سطح ایک کٹورے کے پانی کی سطح کی سی ہموار ہو جائے گی۔ دوسری خرابی سوکھے کپڑے سے جو بالکل صاف ہو، پونچھنے سے رفع ہو جائیگی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اگر کوئلہ پورا کوئلہ نہیں، یعنی اس کا کوئی حصہ پوری طرح جلا نہیں تھا،

جب اُسے ایک برتن میں بند کیا گیا، یا مٹی میں دبایا گیا۔ یا اگر وہ کپڑے کا ٹکڑا اپنے تانے بانے میں گرد کے ذرّے رکھتا ہے، تو اُلٹا نقصان کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں یعنی کچے کوئلے اور گرد بھرے کپڑے سے سلیٹ کی سطح اور بھی خراب ہو جائیگی اور اس پر طرح طرح کے گہرے اور کم گہرے نقش اور لکیریں پڑ جائیں گی۔ جیسے بڈھے آدمی کے چہرے پر جھرّیاں پڑ جاتی ہیں۔ یہ سلیٹ کی تمثیل بچے کے ذہن سے اور مفصّل کی جا سکتی ہے۔ مگر ہمارے مطلب کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ اب دیکھیے۔

تین دن کی چھٹیاں آئیں۔ آپ نے چھے سوال جماعت کو دیے کہ چھٹیوں میں نکالیں۔ مدرسہ کھلا اور بچوں کی حساب کی کاپیاں پیش ہوئیں۔ ایک لڑکے نے نکالے تو چھوں سوال تھے، مگر صحیح صرف دو ہی تھے۔ ان میں بھی نظر ثانی کے آثار موجود تھے، یعنی کئی رقمیں کاٹ کر بنائی ہوئی تھیں۔ اب اُستاد کا کیا فرض ہے؟ بنچ پر کھڑا کرنا، جرمانہ، بیت، اُلٹے کان پکڑوانا؟ یہ سب فضول۔ جس لڑکے کے چھوں سوال صحیح تھے، اُس کی کاپی سے مستفید کرانا یا بورڈ کو کام میں لانا یہ سب کچھ بے سُود ہے۔ اُستاد کا فرض ہے کہ یہ دیکھے لڑکے کا ذہن کس بات میں قاصر ہے، جو سوال غلط ہوتا ہے قاعدے سے لاعلمی کا جھمیلا تو ہے ہی نہیں، کیونکہ کوئی سوال عملی نہ تھا۔ بچے کی طرف سے بے توجہی کی شکایت بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ محنت اس نے ضرور کی اور حل کے مراتب قاعدے کے مطابق طے کیے۔ اگر آپ اس بچے کا حل غور سے دیکھیں گے، تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک جگہ ۲۷ کی جگہ ۷۲ لکھ گیا ہے۔ اسی سے جواب غلط آیا۔ اُس نے یہ کیوں کیا؟ جان کر نہیں کیا، بلکہ اُسے کچھ عادت سی ہو گئی ہے کہ وہ ہندسوں کی رقم وہ اس طرح لکھ دیتا ہے کہ اکائی کا ہندسہ پہلے لکھتا ہے اور دہائی کا اس کے بعد حالانکہ اس کو اس کے اُلٹ ہونا چاہیے۔ اگر مدرس نے پہلے سے غور کیا ہوتا، تو غلطی کا یہ سبب کبھی کا معلوم ہو گیا ہوتا۔ اب جو اصلی سبب معلوم ہو گیا، تو اُس کا تدارک آسان ہے۔ اُستاد کا فرض ہے

اس بچے سے اپنے سامنے سوال نکلوائے اُور اُس کے عمل کو پورے غور سے دیکھتا جائے۔ اس طرح بچے کے ذہن کے وہم کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

اُور دیکھیے ایک لڑکا تاریخ میں حالات تو صحیح صحیح اُور پورے بتا دیتا ہے، مگر سنوں میں غلطی کر جاتا ہے۔ دوسرا لڑکا جو محمود غزنوی کے سارے حملوں کی تاریخیں تو سب کی سب ٹھیک بتاتا ہے۔ مگر جب پوچھا جاتا ہے کہ فلاں حملہ کہاں ہوا اور فلاں کس پر۔ تو کانگڑے کی جگہ قنوج اور کالنجر کی جگہ سومنات کہہ جاتا ہے۔ محنت بچے نے ضرور کی۔ پڑھا اُور یاد بھی کیا پھر یہ نقص کیوں ہے؟ اس "کیوں؟" کا جواب مہیا کرنا اُستاد کا فرض ہے۔

جغرافیہ طبعی کی بہت سی باتیں ایسی ہیں، جو جماعت کے کمرے کے علاوہ کھلی فضا میں خوب سمجھائی جا سکتی ہیں۔ قدرت کے مختلف مظاہر، جو مختلف وقتوں اُور مختلف موسموں میں نمایاں ہوتے ہیں، اگر ان کو بھی اشیا کا سبق بنایا جائے، تو نیچر کے حقائق زیادہ آسانی اور استواری سے بچے کے ذہن نشین ہو جائیں گے۔

ریڈر کا ایک سبق فرض کیجیے، "وہ شہد کی مکھی ہے" یا "قاضی کا انصاف"۔ کل آپ نے پڑھایا تھا۔ آج آپ اس سبق کے اہم کوائف بچوں سے اُنھیں کے الفاظ میں سُنتے ہیں۔ ایک بچہ واقعات کو آگے پیچھے کر دیتا ہے۔ دوسرا نہایت اہم مدارج کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ تیسرے کا غضب کا حافظہ ہے۔ اُس نے گھوٹا لگا لیا ہے اُور اس طرح سُنائے چلا جاتا ہے۔ گویا کتاب اس کے سامنے کھلی ہے۔ ایک اُور لڑکا مدارج تو سب بیان کر دیتا ہے اُور سمجھ سے کام لیتا ہے۔ لیکن اس کے ذہن میں لفظی افلاس ہے۔ کوائف اس کے ذہن میں تسلسل کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن لفظوں کے لیے اس کے حافظے میں جگہ نہیں۔ یہ صورتیں کس طرح پیدا ہوا کرتی ہیں؟ ذہن کے نفسیاتی تجزیہ سے اس کا سُراغ مل سکتا ہے۔ یہ بھی ہو گیا، تو پھر سوال اصلاح یا دفع مرض کا ہے۔ یعنی یہ نقص بچے کے ذہن کا کیونکر

رفع کیا جائے؟

ایک لڑکا پڑھتا، تو بالکل صحیح مشکل لفظوں کے ہجے بھی ٹھیک بتا دیتا ہے۔ مگر املا میں غلطیاں کر جاتا ہے اور خاص کر نقطے بہت ہی غلط لگاتا ہے۔ یہ کیوں ہوتا ہے۔ املا میں اس کی غلطی برائے نام ہونی چاہیے۔

ایک لڑکے کو پولٹیکل جغرافیہ خوب ازبر ہے۔ ایک ملک کے حدود اربعہ سے لیکر آبادی، پیداوار اور طرزِ حکومت سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیتا ہے۔ لیکن نقشے پر اٹک کے مخرج کا اُسے پتا نہیں چلتا اور گوداوری کے لیے کرشنا پر چھڑی پھیر دیتا ہے۔ جاپان کے مشہور شہروں کو چین میں ٹٹولتا ہے اور سنگاپور کو آسٹریلیا کے ساحل پر تلاش کرتا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا، یہ کہاں تک صحیح ہے کہ ابتدائی مدرسوں میں اُستاد شاگردوں کو صرف رٹا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں، نہ کہ بچوں کے ذہن نشین کرانا۔ ذہن نشین یہاں علم نفسیات کی رُو سے استعمال کیا گیا ہے۔ معمولی معنی میں نہیں۔

یہ اور ایسے بہت سے بچوں کی ذہنیت اور اُن کی تعلیم سے متعلق ایسے ہیں، جو بچوں کے سمجھدار والدین اور اپنا اصلی فرض پہچاننے والے اُستادوں کے خیال میں آتے ہوں گے۔ لیکن اس خیال سے عملی فائدہ بچے کو پہنچے۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ ماں باپ نے کیا، تو یہ کیا کہ اگر آسودہ حال ہیں، تو جس مضمون میں بچے کو کمزور پایا۔ اس مضمون کے لیے ایک اُوپر کا اُستاد گھنٹے دو گھنٹے روز کو رکھ دیا اور سمجھے کہ وہ اپنے فرض سے ادا ہو گئے۔ اگر آسودہ حال نہیں، تو یہ کرنے لگے کہ لکڑی لے کر بچے کو مع کتابوں کے سامنے بٹھا لیا۔ اس ارادے سے کہ یہ بات، یہ مضمون اس کے دماغ میں بٹھا کر اُٹھیں گے۔ ہم بھی دیکھیں کیوں نہیں آتا۔ یا کھیل کود اس معصوم کی بالکل بند کر دی۔ اُستاد صاحب نے کیا، تو یہ کیا کہ جس مضمون میں بچے کو کمزور پایا، اُسی مضمون کا اُور

لڑکوں سے زیادہ کام اس بیچارے کو دینے لگے۔ یہ سوچ ران کی بلا کہ جب پڑھے سبق کی نقل ایک صفحے میں ایک بچّہ چار غلطیاں کرتا ہے، تو چار صفحوں کی نقل میں سولہ غلطیاں کریگا۔ اس کے مزید کام دینے کا اور کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ باپ کا بچّے کو کھیلنے سے محروم کرنا، جس طرح لایعنی تھا، اُ طرح بچّے کو زیادہ کام دینا فضول ہے۔ جو بچّے ڈھیٹ اور کام چور ہیں، ان کا یہاں ذکر نہیں ہو رہا ہے۔ جو مضمون بچوں کو ابتدائی یا اُونچی ابتدائی جماعتوں میں پڑھائے جاتے ہیں، وہ یا مجرد ہوتے ہیں یا معروف۔ یعنی ایبسٹریکٹ بھی ہیں اور کانکریٹ بھی۔ سادہ لفظوں میں کہیے، آسان اور سادہ بھی اُ دقیق اور پیچیدہ بھی۔ ایک میں حافظہ اور دوسرے میں سوچنے کی مدد درکار ہوتی ہے۔ کسی بچّے کی قوتِ متخیلہ خوب بڑھی ہوتی ہے اور کسی کی قوتِ حافظہ۔ ان دونوں کو اس طرح منظم کرنا چاہیے کہ کسی کی ترقی مسدود نہ کرتے ہوئے ایک استخراجی ارتقا کے راستے پر ڈال دیا جائے۔ یہ کام اُستاد کا ہے۔ مگر اُستاد بچّے کے گھر والوں کی امداد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔

دیکھیے، فرض کیجیے کہ بچّہ دو مضمونوں میں اوسط سے بڑھ کر اور دو میں بالکل پھسڈی ہے، تو معلوم کرنا چاہیے کہ وہ گھر پر روز یا زیادہ صحت سے کہیے، چھٹّی کے دن کس ترتیب سے پڑھائی وغیرہ کا کام کرتا ہے۔ یعنی یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کس مضمون کو سب سے پہلے لیتا ہے اور کس کو اس کے بعد الخ۔ اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ کس مضمون کو کتنا وقت دیتا ہے۔ اس سے بچّے کے نفسیاتی رجحان کا پتہ چلے گا اور اُس کی پسند و ناپسند کا حال معلوم ہوگا۔ اکثر ایسا نہیں ہوتا کہ جو مضمون بچّے کو بھلا چنگا آتا ہے اور جس میں وہ آدھے سے زیادہ نمبر پاتا ہے، گھر پر وہ اسی سے پڑھائی کی پہل کرے گا اور بے ضرورت اس کو زیادہ وقت دے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس مضمون میں وہ اب کمزور ہے تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اس میں کمزور رہے گا۔

اُوپر کہا گیا ہے کہ اسکول کا ماسٹر بچّے کے گھر والوں کی امداد کے بغیر بچّے کے ذہنی سدھار

میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اب دیکھیے گھر والے کون ہیں ؟ ماں اور باپ ۔ بڑے بھائی بہنوں کو اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے ۔ اس لیے ان کا ذکر ہی فضول ہے ۔ اب رہے ، باوا جان یا بابو جی ۔ اُنھوں نے اتوار کے لیے پہلے سے ایجنڈا یا پروگرام تیار کیا ہوتا ہے ۔ گریجویٹ ٹیلرنگ ہوس جا کر سوٹ کا تقاضا کرنا ہے ۔ کھولیا سے بال کٹوانے ہیں ۔ انار کلی سے متفرق خرید کرنی ہے ۔ کچھ دوست برج کھیلنے آئیں گے اور چائے بھی یہیں گھر پر ہوگی ۔ شام کو لٹریری لیگ میں کانسرٹ دیکھنا ہے ۔ شہر کے اندر ایک ساتویں رشتے بھائی کی بیوی مرگئی تھی ، وہاں "افسوس کرنے" جانا ہے ، وغیرہ ۔ فرمائیے ، ایک دن کے چند گھنٹے ۔ ان کے لیے اتنی لمبی فہرست کاموں کی پہلے سے موجود ہے ۔ وہ بھلا آدمی کہاں سے وقت نکالے گا کہ برخوردار نونہال کی پڑھائی کو دیکھے اور اس کے ذہن کی رفتار کا نفسیاتی تبصرہ کرے ۔ مگر مایوسی کا ابھی موقع نہیں ۔ کیونکہ گھر میں ایک اور ہستی موجود ہے ، جس نے اپنے آرام اور چاؤ کو گھر کے لوگوں کے لیے ابھی تک وقف کیا ہوا ہے ۔ میرا مطلب ہے ، بچے کی ماں ۔ اس سے اس بارے میں پوری مدد مل سکتی ہے ۔ وہ اب بھی دیکھ بھال رکھتی ہے کہ بچہ کیا لکھتا پڑھتا ہے اور کبھی کبھی گلہ آمیز لہجے میں یہ بھی کہہ اُٹھتی ہے کہ تو سوال کبھی نہیں کرتا ۔ اس میں تیرا جی جو نہیں لگتا ۔ اس سے زیادہ وہ دیوی اور کچھ نہیں کر سکتی ۔ وہ سب کچھ کر سکتی ہے ؟ مگر کس صورت میں ؟ اس کا ذکر آتا ہے ۔

ہمارا خیال ہے ، بلکہ یقین ہے کہ جو باتیں آگے لکھ چکے ہیں ، وہ حقائق ہیں ۔ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا ۔ اب سوال آتا ہے تدارک کا ۔ اس ضمن میں راقم کی رائے میں یہ باتیں آتی ہیں :-

ا ۔ لڑکیوں کے لیے جو زنانہ مڈل کا امتحان پنجاب میں مقرر ہوا ہے ۔ اس کے نصاب میں "بچوں کی تعلیم و تربیت کے اصول" بہ طور ایک لازمی مضمون پڑھایا جائے ۔

۲۔میٹریکولیشن میں صرف زنانہ طلبہ کے لیے یہ مضمون اختیاری قرار دیا جائے۔ "بچوں کی ذہنیت کی ترقی نفسیاتی نقطۂ نظر سے۔"

۳۔لوئر پرائمری جماعتوں کے ایک سکشن میں پندرہ سے زیادہ اور اپر پرائمری جماعتوں کے ایک سکشن میں بیس سے زیادہ اور پھر آٹھویں جماعت تک ایک سکشن میں پچیس سے زیادہ اور دو ہائی کلاسوں کے ایک سکشن میں تیس طالب علموں سے زیادہ نہ ہونے چاہییں۔یہ اس وجہ سے کہ آج کل سکشن اتنے بڑے بڑے ہوتے ہیں کہ اُستاد کے لیے اپنے شاگردوں کی روشناسی مشکل، بلکہ ناممکن ہے۔اس کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ اپنے شاگردوں کا نفسیاتی جائزہ لے سکے۔

ہکلاپن

از

مسز آر۔ اے گوسائیں، بی اے (آنرز)

ہکلے پن کی ابتدا اکثر بچپن سے ہوتی ہے۔ بچوں میں جہاں اور کئی قسم کی کمزوریاں اور بیماریاں ہوتی ہیں، اُن میں ہکلاپن بھی شامل ہے۔ اگر چھٹپن میں ہی اس کی روک تھام نہ کی جائے، تو یہ شکایت کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ ہم ہکلوں کی باتوں پر بے اختیار ہنس دیتے ہیں، لیکن وہ بیچارے والدین کی بے پروائی یا لاعلمی کے سبب بچپن میں اس کمزوری کو دُور نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ یہ شکایت کیونکر شروع ہوتی ہے اور اس کی وجوہ کیا ہیں۔

بچوں میں ہکلاپن کا آغاز اور اُس کا تدریجی انکشاف

ہکلاپن ایک قسم کی اعصابی کمزوری ہے۔ اس کی مختلف اقسام ہیں۔ مثلاً بعض اوقات بچہ بات کرتے وقت کچھ لمحوں کے لیے خاص خاص حروف یا الفاظ پر رُک جاتا ہے اور بعض دفعہ بولتے وقت اس کی گفتگو میں ایک لرزہ اور معذوری پائی جاتی ہے، جو اس کے تمام جسم پر اثر ڈالتی ہے۔ اس کی وجہ زیادہ تر اعصابی کمزوری ہے جو فطری طور پر بچوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ وجہ اس کا حقیقی سبب نہیں ہے۔ تاہم ہر وُہ سبب جو بچے کی قوتِ ضابطہ کو کمزور کر دے، اہمیت ضرور رکھتا ہے۔

وُہ وجوہ جن سے بچوں کے ہکلے ہو جانے کا اندیشہ ہے، یہ ہیں:۔

(۱) لاغر بچے اور خصوصاً وہ بچے، جو کسی طویل مرض میں مبتلا رہے ہوں، ہکلے پن کا شکار ہو

جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی جسمانی نقاہت اُنھیں کھیلوں وغیرہ میں حصّہ لینے سے روکتی ہے اور وہ اپنے آپ کو دیگر ہم عمروں سے کمزور اور ناقابل سمجھ کر ہکلانے لگتے ہیں۔

(۲) وہ بچّہ، جس کے ساتھ بے جا سختی اور ظلم روا رکھا جائے۔ مثلاً جب بھی وہ بولنا چاہے، اُسے ٹوک دیا جائے اور خاموش رہنے کی تاکید کی جائے۔ یا وہ بچّے جن کے بڑے بھائی بہن ان سے مقابلۃً ہوشیار اور قبول صورت ہوں۔ اُنھیں ہر وقت گھرکیاں دیتے رہیں۔ یہ بات عموماً اتا کی بے جا حمایت اور نکتہ چینی کے زیرِ اثر ہی ظہور پذیر ہوتی ہے، جو بڑے بچّوں کو چھوٹوں پر ترجیح دے کر اُنھیں شرمندہ کر دیتی ہے۔ جو خطا بھی بچے سے سرزد ہو، ہم اُسے اُس کے ہکلے پن کے ساتھ منسوب کر دیتے ہیں چونکہ وہ ہکلا ہے، اس لیے اُس کا کوئی قصور نہیں۔ رفتہ رفتہ یہ بات بچے کے دل و دماغ میں گھر کر جاتی ہے اور وہ بجائے شرمندگی کے ہکلے پن کو اپنے عیوب سے بچاؤ کا ذریعہ خیال کرنے لگتا ہے حالانکہ وہ ذاتی کمزوری کے باعث کاموں کو بگاڑتا ہے۔

(۳) وہ بچے جو ناز و نعمت میں پلے ہوں، یا جنھیں بے جا لاڈ پیار نے بگاڑ دیا ہو۔ اکثر ہکلے ہوتے ہیں۔ ماں باپ کی ضرورت سے زیادہ ناز برداری اور دلجوئی اُنھیں نافرماں بردار بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات بُوالہوس ماں ہر اجنبی کے سامنے بچّے کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہر کوئی بچے کی تعریف کرے۔ چنانچہ بچّے کی یہ بیجا ترکیب اور ناز برداری اُسے بے کس اور معذور بنا دیتی ہے اور وہ اپنی زبان پر تمام قابو کھو بیٹھتا ہے۔ اس حالت میں بچوں کو بار بار صحیح تلفظ کی تاکید کرنا ایک سعیِ لاحاصل ہے، جو اُس کی زبان کو درست کرنے کے بجائے اور بھی بگاڑ دیتی ہے۔ یہاں پر ایک بچے کی مثال اس بات کو واضح تر کر دے گی، جو ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت یہ تھی کہ بچّے کو جہاں تک ہو سکے، چیخنے اور چلّانے سے روکا جائے۔ ڈاکٹر کا مدعا بچے میں ضبطِ نفس کی صلاحیت پیدا کرنا تھا۔ ماں اس نصیحت کو غلط سمجھی۔ جب بچّے کو کسی بات سے منع کیا

جاتا، تو وہ فوراً ناراضگی کا اظہار کرتا۔ چنانچہ اُس کی ضد فوراً پوری کر دی جاتی۔ جب اُس کی عمر چار سال کی ہوئی، تو وہ بچہ کھیلنے سے بھی لاچار تھا۔ جب اُسے خوف معلوم ہوتا، تو وہ ایک وحشی جانور کی طرح چنگھاڑتا اور مُنہ سے جھاگ جاری ہو جاتی۔ دراصل اُسے اپنے ہکلے پن پر غصہ آتا تھا اور وُہ ہر قسم کی اصلاح کو رد کر دیتا۔

ہکلے پن کے آغاز کا صحیح سبب بیان کرنا تو بہت مشکل ہے۔ کم و بیش تمام چھوٹے بچے بات کرتے وقت ہچکچاتے ہیں۔ کیونکہ اُنھیں ابھی صحیح طور پر بات کرنے کا شعور نہیں ہوتا۔ بچے عموماً بولنے کے بہت شوقین ہوتے ہیں، مگر اُنھیں الفاظ نہیں ملتے۔ جیسے ایک ناتجربہ کار مقرر پہلی مرتبہ تقریر کرتے ہُوئے اکثر الفاظ پر جھجکتا ہے، بعینہٖ بچہ بھی ناتجربہ کاری کے سبب ہچکچاتا ہے۔ جس وقت بچے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ فلاں آواز یا حرف کے ادا کرنے میں اُسے مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اُس وقت اُس کے ہکلے پن کا آغاز ہوتا ہے۔ بہت سے بچوں میں یہ مشکل چند ہفتوں یا مہینوں کے بعد رفع ہو جاتی ہے۔ مگر عموماً کچھ نہ کچھ ایسے سبب پیدا ہو جاتے ہیں، جو اس مشکل کو بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً "خوف"۔

بچے کی دنیا میں سب سے زیادہ ہیبت ناک اور خلل انداز شے کسی چیز کا خوف یا ڈر ہے۔ خوف کی مختلف اقسام ہیں۔ مثلاً ایسا خوف جو بچوں کے کام کرنے میں حائل ہو۔ اس قسم کا ڈر بچے کے جسم اور دماغ پر قابو پا لیتا ہے۔ بعض اوقات صدمہ یا اچانک حادثہ بھی ہکلا پن کی بنا ہوتا ہے۔ ہم یکدم بے حس یا نہایت خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ حادثہ جسم سے متعلق ہو، تو کچھ لمحوں تک نہ تو ہمیں درد ہی محسوس ہوتا ہے اور نہ ہی خوف، مگر ہمارا جسم ہر قسم کی طاقت سے محروم معلوم ہوتا ہے۔ بڑی عمر کے بچے اور عمر رسیدہ اشخاص جانکاہ صدموں کی تاب لا سکتے ہیں۔ مگر چھوٹے بچے بعض اوقات قوتِ گویائی کھو بیٹھتے ہیں اور اُنھیں دوبارہ از سرِ نو بولنا سکھایا جاتا ہے۔ لیکن جب تک اس میں نہایت

اُوپر اُٹھاؤ اُور بچے کو ہدایت کرو کہ اُسے بالکل ڈھیلا چھوڑ دے، تاکہ جونہی تم اُس کی گرفت ڈھیلی کرو، ہاتھ خود بخود نیچے آجائے۔ بعد ازاں اُس کے گھٹنوں کو چھوؤ، یہاں تک کہ وُہ ڈھیلے ہو کر ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہو جائیں۔ یہی عمل دہراتے چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ بچے کو تسکین حاصل ہو۔ اس عمل کے دَوران میں بچے کو کوئی آسان سی کہانی سُنانا مفید ہے۔ جونہی اُس کے بدن میں ڈھیلا پن ظاہر ہو، ایک منٹ کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ اس کے بعد اُس کی چھاتی کو انگلیوں سے دباؤ اُور بچے کو سانس باہر نکالنے کی تاکید کرو۔ جب وہ سانس باہر نکالے، تو چھاتی پر ہلکا دباؤ ڈالو اور جب سانس اندر لے جائے، تو ہاتھ ہٹالو۔ دو تین منٹ تک یہ عمل جاری رکھو۔ پھر بچے کو بٹھادو اُور اُسے کہو کہ اپنے بازو گھٹنوں پر رکھ کر تین سیکنڈ کے لیے سر کو اُن پر جھکا دے۔ بعد ازاں ایک ہاتھ زمین پر ٹیک دے اور اُچھل کر اُٹھ کھڑا ہو۔

اس تدبیر کو عمل میں لانے کا بہترین وقت شام کو چار بجے کے قریب ہے۔ اگر بچہ چھوٹا ہے، تو مشق کا پہلا حصّہ بعد میں اُور پچھلا حصّہ پہلے کروانا چاہیے۔

بعض اوقات بچے کو کسی خاص آواز کے نکالنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے دور کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ بچے کو سیدھا کھڑا کر کے سر کو ذرا آگے جھکانے کی تاکید کی جائے اُور اُسے کہا جائے کہ اپنی اُنگلیوں سے چھاتی کو چھوئے اور ان آوازوں پر مثلاً "اُون" کی "اُو"، "نوک" کے "او"، اور "جُو" کے "اُو" پر سانس باہر نکالے اُور ان آوازوں کو ادا کرے۔ اسی طرح دیگر آوازیں مثلاً "آ"، "اے"، "ای" وغیرہ کی مشق کرائی جائے، حتّٰی کہ بچہ بغیر کسی تکلیف کے یہ آوازیں یکے بعد دیگرے نکال سکے۔ یہ مشق کم و بیش دو ماہ تک جاری رکھنی چاہیے۔

الفاظ کی ترتیب، بندش اُور ربط سکھانے کے لیے یہ طریقہ بہت مفید ہے کہ بچے کو ایک کلاک کے سامنے بٹھادیا جائے اُور اُسے کہا جائے کہ ایک سے لے کر بارہ تک جلدی جلدی ہندسا بولتا

ہو جاتی ہے اور ہم گفتگو کر سکتے ہیں۔

غرضیکہ عام طور پر قوتِ گویائی میں کچھ نقص بھی ہکلے پن کا باعث ہوتا ہے۔ بچوں کو کسی خاص آواز یا لفظ کو ادا کرنے میں مشکل درپیش آتی ہے۔ یعنی یہ تمام مندرجہ بالا طاقتیں باہم کام نہیں کر سکتیں اور بچہ بات کے ادا کرنے میں تکلف محسوس کرتا ہے۔ یہ نقص اکثر خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ اور اس کی اصلاح اُلٹا نقصان پہنچاتی ہے۔

ایک لڑکی جو نہایت ذہین اور عقل مند تھی۔ مگر کئی الفاظ کے سیکھنے اور ادا کرنے میں اُسے دقت پیش آتی تھی۔ خاصی عمر تک وہ بچوں کی طرح بولتی رہی۔ گنتی سیکھتے وقت کئی ہندسوں پر اُس کی زبان ہکلا جاتی اور بجائے ہندسہ "چار" کہنے کے "چا، چا" کرنے لگتی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ عام بول چال میں وہ مطلق نہ جھجکتی تھی اور ہر وقت کچھ بے معنی سی باتیں کرتی رہتی۔ جن کا نصف مفہوم بھی سننے والے کی سمجھ میں نہ آتا۔ اُس کی بڑی بہن اُسے جھڑکیاں دیتی کہ تم بڑی نالائق ہو۔ علاوہ ازیں اس کی ماں کچھ بہری تھی اور وہ لڑکی کی اس بے معنی سی گفتگو پر بہت ناراض رہتی۔ چونکہ وہ لڑکی ہر وقت بڑوں کی طرح صفائی سے بولنے کی کوشش کرتی، لہٰذا جلدی ہی ہکلے پن کا شکار ہو گئی۔ اُسے ہر لحظہ تنبیہ کی جاتی کہ وہ دھیان سے بولے اور زیادہ محتاط رہنے کی وجہ سے وہ ہچکچا جاتی۔ لہٰذا اگر بچوں کے ساتھ سختی کے ساتھ برتاؤ کیا جائے، تو یقیناً وہ ہر لمحہ اپنی کمزوری کو محسوس کریں گے اور یہ عادت بڑھتی چلی جائے گی۔ الغرض یہی لڑکی جب جوان ہو کر ماں بنی، تو اُس کی بچی بھی یوں ہی بے معنی الفاظ بولا کرتی تھی۔ مگر ڈاکٹر کی نصیحت کے مطابق اُسے ہر قسم کی اصلاح سے مکمل پرہیز کرایا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ لڑکی خود بخود صحیح طور پر بولنے لگی۔

ان اہم وجوہ کے علاوہ دیگر معمولی اسباب بھی ہکلے پن کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً "بدصورتی" بات کو درست طور پر ادا کرنے سے روکتی ہے۔ اگر اُوپر والا جبڑا بات کرتے وقت نچلے

جبڑے کو چھپالے، تو یہ جملہ یقیناً یُوں ادا ہوگا۔ "مَیں نے فریا کو فلائی کرنے فے منع کیا۔" (مَیں
کو سلائی کرنے سے منع کیا)۔ چھوٹے بچے عموماً تُتلاتے ہیں اور اگر بہت چھوٹی عمر میں اُن کی تُتلا
اصلاح شروع کر دی جائے، تب بھی بچّہ ہکلا ہو جائے گا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بچہ بغیر ک
کسی خاص لفظ کو پڑھنے سے جھجکتا ہے اور وُہ ڈرتا ہے کہ کہیں ماسٹر جھڑک نہ دے۔ ڈاکٹر وِل
اپنی اصطلاح میں اس قسم کے ہکلے پن کو "غلبۂ خوف" کہا ہے۔ کبھی کبھار اچانک اور پریشان کُن وارِ
اس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک دن ایک لڑکا نہر کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ اچانک اُس نے ایک
بچّے کو نہر میں گرتے دیکھا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ تیر کر بچّے کو باہر نکال لیا۔ اتنے میں لو
بھی جمع ہو گئے اور اُنھوں نے لڑکے کو فوراً گھر جا کر لباس تبدیل کرنے کی ہدایت کی۔
جھپاٹے سے اپنے مکان کی طرف دوڑا، پیشتر اس کے کہ اس سے گیلا ہونے کا سبب پوچھا جا
اُس کے والدین نے اُسے کپڑے خراب کرنے کے جرم میں خوب ہی پیٹا اور بعد ازاں کپڑے تبد
کروائے۔ اس بدحواسی اور بے جا رعب کا یہ اثر ہُوا کہ اُس نے ڈرتے ڈرتے وجہ بیان کی اور
والدین کو بچّے کی بہادری کا علم ہُوا، تو اُسے خوب شاباش دی۔ بچّہ ٹھنڈ لگ جانے کی وجہ سے
ہفتوں تک بیمار رہا۔ اس دوران میں جب بھی کبھی وہ اس واقعہ کو بیان کرنا چاہتا، ایک قسم
خوف اور جھجک اُس کے دماغ پر طاری رہتی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بچّہ بڑا ہو کر ایک مکمل ہکلا بن گ

جب بچے ہکلا پن کا شکار ہو جاتے ہیں، تو اُن کی گفتگو کی روانی مفقود ہو جاتی ہے۔ سب
سے بڑی مشکل جو ہکلے کو پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ وُہ اُن حرکات پر جو سانس کو الفاظ کے سا
وابستہ کرتی ہیں، قابو کھو بیٹھتا۔ دراصل اُن کے پھیپھڑے کمزور ہوتے ہیں اور وُہ لمبی سانس
لینے سے قاصر ہوتا ہے۔ آپ نے اکثر محسوس کیا ہوگا کہ ہم لفظ یا جملہ بولتے وقت سانس باہر
نکالتے ہیں۔ مثلاً لفظ "مضبوط" کو لیجیے۔ اس کے ادا کرنے میں ہماری سانس باہر آتی ہے اسی طرح

دیگر الفاظ اَور کلمات بولے جاتے ہیں اور چونکہ ہکلے بچّوں کی چھاتی کمزور ہوتی ہے، وہ بکدم کلمات کو سانس توڑے بغیر نہیں بول سکتے۔ چنانچہ بچّوں کو اِس قسم کی ورزش کرانی چاہیے۔ جس میں اُنھیں لمبے لمبے سانس لینے کی عادت پڑ جائے۔ ورنہ وہ ہر جملے میں سانس کو توڑ دینگے اَور دوبارہ سانس لیکر بولنا شروع کرینگے۔ اگر بغور اس بات کا مطالعہ کیا جائے، تو ہکلے پن کا حقیقی سبب سانس کی بےقاعدگی ہی ہوگا۔

ہکلے پن کا ایک اَور سبب بھی ہے۔ مثلاً کوئی بچہ دائیں ہاتھ کے بجائے بائیں ہاتھ سے کام لیتا ہے اَور وہ اس میں خوب ماہر ہے۔ مگر اُس کی ماں اُسے فوراً ٹوک دیتی ہے کہ "اُوں ہوں بیٹا! بائیں ہاتھ سے کنگھی مت کرو۔ ہمیشہ دایاں ہاتھ استعمال کرو"

یا اگر بچّہ روٹی مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلائے، تو فوراً یہ کہا جائے۔ "یہ ہاتھ نہیں، دوسرا ہاتھ کرو" بچّہ دائیں یا بائیں ہاتھ کے استعمال میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ مگر جب زبردستی اُس کی یہ عادت ہٹانے کی کوشش کی جائے، تو یہ عادت کسی اور حرکت میں نمودار ہوگی۔ لہٰذا اپنی اس عادت کو ہٹانے کے لیے بچّہ قدرتی طور پر ہکلانے لگے گا۔ وجہ یہ ہے کہ بچے کو بائیں ہاتھ سے کام کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اَور وہ بے اختیار ہر کام اسی ہاتھ سے کرتا ہے۔ جب اُسے اُس کی غلطی کا احساس دلایا جاتا ہے، تو اُس کے ہر کام میں کچھ نہ کچھ نقص رہ جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے وہ چمچے کو بائیں ہاتھ میں پکڑتا ہے، لیکن فوراً ہی اُسے دوسروں کی تنبیہ یاد آتی ہے اَور پیشتر اس کے کہ کوئی اُسے دیکھے، وہ جلدی سے چمچے کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لینا چاہتا ہے۔ ایسے فعل میں اکثر اوقات چمچہ ہاتھ سے گر جاتا ہے۔ ایسی حرکت کرتے وقت عموماً اُس کی قوتِ گویائی پر بھی اثر ہوتا ہے اَور وہ بات بات میں جھجکنے لگتا ہے۔

(باقی آئندہ)

ایک خط

[ہم ذیل میں ایک ہیڈ ماسٹر صاحب کا خط بغرضِ استفسار درج کرتے ہیں۔ دیہاتی اور شہری مدرس صاحبان جنھیں تعلیمِ بالغان سے عملی طور پر سابقہ پڑ رہا ہے، دریافت کردہ امور کے متعلق رسالے میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ادارہ]

۲۰ نومبر ۱۹۳۹ء

مخدومِ عظیم و جلیل! تسلیم و نیاز۔ مزاجِ گرامی!

تعلیمِ بالغان کی ترویج اشاعت میں دیہاتی معلمین کو ایک بڑی دقت پیش آتی ہے کہ دیہاتی اور دیگر پیشہ ور لوگ برضا و رغبت تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ انھیں اپنے کاروبار ہی سے بہت ملتی ہے۔ دوسرے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مدرسین کو ذاتی غرض ہے۔ یہ حکام کی طرف سے مجبور ہیں اور لکھا پڑھا کر کوئی اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں۔ بنابریں معلمین کی مساعی حسبِ منشا بارآور نہیں ہوتیں۔

شہروں میں چونکہ پبلک کی اکثریت تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔ اس لیے غیر تعلیم یافتہ لوگ تعلیم ضرورت کا احساس رکھتے ہیں۔ لیکن دیہات میں یہ "احساس زیاں" مفقود ہے۔

معلمین کو خارج از اسکول ٹائم تعلیم دینے میں کوئی عذر نہیں۔ اگر بالغ طالب علم وقتِ مقرر ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ اس کے لیے اگر گورنمنٹ تحصیلدار یا ذیلدار اصحاب کے ذریعے کوئی مؤثر طریقہ استعمال کر سکے، تو جہاں دیہاتی مدرسین کی یہ مشکل رفع ہو جائیگی، وہاں تعلیم بالغاں کی معقول ترقی بھی یقینی ہے۔

براہِ کرم میری یہ سطور رسالے میں درج فرما کر دیہاتی مدرسین سے استصواب فرمائیں کہ آیا یہ دقت ان تمام کو پیش آتی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو، تو اس کا کیا حل انھوں نے نکالا ہے۔

جواب میں ایسی تجاویز قابلِ اعتنا نہ ہونگی، جو امتحانی سوالات کے جواب لکھتے وقت درج کی جاتی ہیں۔ (پروپیگنڈا، ترغیب، تحریک، وضاحت، ضرورتِ تعلیم وغیرہ) کیونکہ ہمارے دیہاتی بھائی فائدے کی کسی بات کو سمعِ قبول سے سننے کے عادی نہیں ہیں۔ اگرچہ کسی اُفتادہ شخصیت کی زبان سے نکل رہی ہو اور سماج میں معلمین (خصوصاً دیہاتی معلمین) کی اُفتادگی محتاجِ صراحت نہیں ہے۔ والسلام

خادم:۔ محمد شریف ہیڈ ماسٹر، مڈل اسکول، بلھڑوال، ضلع امرتسر

جغرافیہ

از

جگن ناتھ آزاد

ہے یہ خاکی کرہ کیا حیرت افزا — فضا میں ہے جو صبح و شام گرداں
معلق چاند سورج کی طرح ہے — خود ہے قدرتِ خالق پہ حیراں
مناظر کا عجائب خانہ ہے یہ — کوئی دیکھے تو اُس کے ساز و ساماں!
کہیں دریا، کہیں چشمہ، کہیں جھیل — کہیں جنگل، کہیں چٹیل بیاباں
سمندر دُور تک پھیلا ہُوا ہے — نظر آتا ہے جو بے حد و پایاں
ابھر آئے ہیں اس میں کچھ جزیرے — جزیروں پر ہُوا ہے قابض انساں
کہیں صحرا، کہیں ایسی زمیں ہے — جو گُل بوٹوں سے ہے رشکِ گلستاں
کہیں چھ چھ مہینے سے بڑا دن — بھیانک اَور لمبی رات سنساں
کہیں سردی، کہیں گرمی کی شدّت — کہیں فصلِ بہاری ہے گل افشاں
ہوائیں خاک اُڑاتی ہیں کہیں پر — فضاؤں میں کہیں ہے برف باراں
ممالک مختلف ہیں اَور اُن میں — کہیں گورے کہیں کالے ہیں انساں
ہزاروں قسم کی جاندار مخلوق — تری میں اَور خشکی پر نمایاں
کہیں انسان کی صُورت کے بندر — کہیں ہیں آدمی صورت میں حیواں
کہیں تہذیب کا ہے دَور دَورہ — جہالت کا کہیں جاری ہے فرماں

حقیقت جاننا چاہیں جو اس کی

[illegible]

لڑکیوں کی جسمانی تعلیم

از

جگن ناتھ آزاد

آج یہ امر ایک طے شدہ مسئلے کی صورت اختیار کر چکا ہے کہ جسمانی تربیت تعلیم کا ایک ایسا جزو ہے، جسے کسی حالت میں سلسلۂ درس و تدریس سے کم اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ اگر ہمارے اسکولوں میں جسمانی تربیت صحت کے اصولوں کے عین مطابق دی جائے، تو اس سے تعلیم صحیح معنوں میں تعلیم بن سکتی ہے اور تندرستی، مسرت، بلند اخلاقی اور اسی طرح کے بے شمار فوائد ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے تعلیم کا مقصد یہی سمجھا جاتا تھا کہ پانچ گھنٹوں میں بچّے کے دماغ میں جتنا "علم" بھرا جا سکے، بھر دیا جائے۔ بچوں کی جسمانی نشو و نما کو جس بُری طرح نظر انداز کیا جاتا تھا، وہ اپنی مثال آپ تھا اور لڑکیوں کے اسکولوں میں تو اس نظر اندازی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

لیکن مقامِ مسرّت ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہم نے اس طرف بھی تھوڑی بہت توجہ کرنا شروع کر دی ہے۔ گو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میدان میں ہم ابھی تک اپنے ہم سفروں سے بہت پیچھے ہیں۔ مغربی ممالک تو جس برق رفتاری سے اپنی منزلِ مقصود کو رواں ہیں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مشرق میں بھی صرف جاپان کی مثال ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔

پروفیسر دیوان چند شرما نے جو حال ہی میں جاپان کے دورے سے واپس آئے ہیں، لاہور میں پچھلے دنوں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ جدید جاپان کی نمایاں خصوصیت اس کے افراد کی جسمانی مضبوطی ہے۔ نیشنل فزیکل فٹنس اسکیم (NATIONAL PHYSICAL FITNESS SCHEME) کے ماتحت ساری قوم

کو صحت اور جوانمردی کے بلند معیار پر لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہر شہر اور گاؤں میں ریلیز (RALLIES) منعقد کی جارہی ہیں، جن میں لڑکوں اور مردوں کے ہمراہ عورتیں اور بچے بھی ورزش کرتے ہیں۔ ہوٹلوں اور جہازوں میں بھی لوگ مقررہ وقت پر ورزش کرتے ہیں۔ اُن کے طریقۂ تعلیم میں کھیل اور پڑھائی کو یکساں اہمیت دی جاتی ہے اور پڑھائی کے ہر پیریڈ کے بعد بچوں کو پندرہ منٹ کا وقفہ آرام اور تفریح کے لیے دیا جاتا ہے۔ پرائمری سٹینڈرڈ سے مڈل سٹینڈرڈ میں جاتے ہوئے ہر طالب علم کو ایک فزیکل فٹنس سرٹیفکیٹ (PHYSICAL FITNESS CERTIFICATE) دیا جاتا ہے۔ ساری قوم کے لیے ایک پروگرام تیار کر دیا گیا ہے اور پینتیس ہزار ڈاکٹر محض اس غرض کے لیے مقرر کیے گئے ہیں کہ وہ ملک بھر میں لوگوں کی صحت کا معائنہ کریں، تاکہ جاپانی مضبوط اور توانا قوم بن سکیں۔

یہ تو ہے غیر قوموں کی حالت جن کے دل پر خدا کے فضل و کرم سے زندگی کے معنی نقش ہو چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے ملک کی حالت پر نظر ڈالیے اور غور کیجیے کہ ہم نے اس وقت تک اس میدان میں کیا کچھ ترقی کی ہے۔ لڑکوں کے اسکول ہیں یا لڑکیوں کے، دونوں پر ایک جمود طاری ہے۔ ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ لڑکوں کے مدارس لڑکیوں کے اسکولوں سے ذرا آگے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں جسمانی اور صحت کے نقطۂ نگاہ سے تنزل پذیر ہیں۔

گزشتہ ماہ فتح چند کالج فار وومن میں جلسۂ تقسیم انعامات کی صدارت کرتے ہوئے خان بہادر میاں افضل حسین صاحب بالقابہ وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے تعلیم کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا، وہ ہر معلم اور ہر خواہ تعلیم کے لیے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ فاضل مقرر نے فرمایا کہ "تعلیم کا مقصد فقط تحصیلِ علم نہ ہونا چاہیے۔ تعلیم اور بالخصوص تعلیم نسواں کے میدان میں زندگی کے بلند تر مقاصد ہمارے پیشِ نظر ہوں۔ ہمیں تعلیم میں ایسا عنصر داخل کرنا چاہیے، جس کی بدولت لڑکیاں اسکول اور کالجوں سے نکل کر اپنے گھروں اور اپنی زندگیوں کو زیادہ بہتر طریقے پر سنوار سکیں۔ جہاں تک لڑکیوں

کی جسمانی ترقی کی کوششوں کا تعلق ہے۔ میں اس عمل کو نہایت قابلِ تعریف سمجھتا ہوں۔"

"تعلیم نسواں کا مقصد یہ ہے کہ عورتیں اچھی مائیں بن سکیں اور بچوں کی نفسیاتی ترقی
بہترین معاون و مددگار کا کام دے سکیں۔ بچہ اس دنیا میں ایک اجنبی کی حیثیت سے وارد ہو
اور اگر اُسے ترغیب دلائی جائے، تو وہ اپنے ماحول کو جاننے اور سمجھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔
تعلیم یافتہ عورت بچے کی تربیت میں جبھی دلچسپی لے سکتی ہے، جب وہ خود اچھی طرح بچے کے زاوی
پہچانتی ہو اور صحیح طور پر تعلیم یافتہ ہو۔ اس مقصد کے لیے قوانینِ قدرت، مشاہداتِ فطرت، انسانی
اور تحریکات کی تعلیم نہایت ضروری ہے اور یہ تعلیم طلبہ اور طالبات دونوں کے لیے یکساں طور پر
فاضل مقرر نے اس بات کی تلقین کی کہ لڑکیوں کو گھر کے کاروبار کی مناسب تعلیم دی جا
جینوا کی ایک مثال دیتے ہوئے، آپ نے کہا کہ لڑکیوں کو کسی یتیم خانے کے بچوں کی ذمے دار
عملی طور پر یہاں کے فرائض کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔

تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے، آپ نے فرمایا کہ اخلاقی تعلیم ہمارے نصاب
اہم جزو ہونا چاہیے۔ اخلاق کے عملی اصول کی تعریف میں آپ نے جاپان کے امپیریل ریسکرپ
(IMPERIAL RESCRIPT) (مطبوعہ ۱۸۹۰ء) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: "والدین کی جانب
برتاؤ فرزندانہ ہونا لازمی ہے۔ بھائی بہن سے شفقت کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ پاکدامنی اور سنجیدگی
دامن کبھی ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ ہمارا شعار ہر ایک کے لیے نیک اندیشی ہو۔ دل میں ذوقِ تحصیل
موجزن ہو اور اُسے ذہنی قوے اور قوتِ اخلاق کی ترقی کے لیے ایک زبردست آلہ کا تصور کیا جا
رفاہِ عام کا خیال ہر وقت ہمارے پیشِ نظر رہے۔ فوری ضرورت کے وقت فی الفور اپنی ذاتی جرأت
اظہار کرنا چاہیے اور جونہی مادرِ وطن مطالبہ کرے، ہمیں اپنی تمام تر خدمات اس کے لیے وقف کر دینی چاہ
ان چند فقرات کے بعد صاحب موصوف نے فرمایا کہ پنجاب میں ہر بچے کی تعلیم کا یہی مقصد ہونا چاہیے

لیکن میں کہوں گا کہ کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور بلوچستان سے لے کر برما تک ہمیں تعلیم کا یہی معیار مقرر کرنا چاہیے۔ اب وقت ہے کہ ہندوستان کا ہر معلم ان گراں بہا الفاظ کی اہمیت کا احساس کرے اور انھیں اپنے دل و دماغ میں جگہ دے۔ میاں صاحب کے یہ الفاظ کس قدر حقیقت پر مبنی ہیں کہ زمین دوز خزانے اور جواہرات کی کانیں کسی ملک کا سرمایہ نہیں ہو سکتیں۔ حقیقی سرمایہ تو یہ ننھے ننھے بچے ہیں اور مقامِ افسوس ہے کہ ان کی صحیح حفاظت اور نگہداشت سے غافل ہو کر ہم ایک ناقابلِ معافی گناہ کا مرتکب ہو رہے ہیں۔

ہندوستان ہر لحاظ سے بدنصیب ہے اور قومی ترقی کی بنیاد یعنی تعلیم کے معاملے میں تو اس کی حالت ناگفتنی ہے۔ دنیا ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں جا پہنچی اور ہم ابھی تک ان الجھنوں سے باہر نہیں آسکے کہ "ہماری زبان کیا ہونی چاہیے؟" "کیا ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک قوم ہو سکتی ہے یا نہیں؟" "صوبجات اور مرکز میں ہندوؤں کو زیادہ حقوق ملیں یا مسلمانوں کو؟" "ٹیگور بڑا شاعر ہے کہ اقبال؟" ——— وائے بر حالِ عزیزانِ وطن!

ہندوستان اس وقت جس نازک دور سے گزر رہا ہے، وہ کسی نگاہ سے مخفی نہیں لیکن ہماری کم نصیبی کہ ایسے وقت میں ایک بھی رہنما قوم و وطن کو ایسا میسر نہیں، جو دونوں قوموں کے تفرقات کو مٹا کر افراد کی توجہ ٹھوس اور تعمیری کاموں کی جانب مبذول کر سکے ؎

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے (اقبال)

سیاسی حقوق تو جب ملیں گے، دیکھا جائیگا، لیکن یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک ہماری نئی قوم اس قابل نہ ہوگی کہ حقوق کا بوجھ اپنے کمزور کندھوں پر اُٹھا سکے۔ بچے قوم کا مشترک سرمایہ ہوتے ہیں۔ یہ "ہندو" ہیں، نہ "مسلمان"۔ نہ "سکھ" اور نہ "عیسائی"۔ کاش کہ رہنمایانِ وطن

اس حقیقت پر غور کرتے اور دیکھتے کہ ہم اس قومی سرمایئے کو کس بیدردی سے تباہ و برباد کر رہے ہیں۔
چنانچہ محروم کی ایک رباعی ہے ؎

بچے ہیں قوم کا اہم سرمایہ　　　یہ کم ہوں، تو قوم بھی ہے کم سرمایہ
لاکھوں معصوم مرتے ہیں یاں ہر سال　　　صدیوں سے کھو رہے ہیں ہم سرمایہ

اب وقت ہے کہ برادرانِ وطن ان اشعار کی اہمیت پر غور کریں اور اعداد و شمار کی روشنی میں ملاحظہ کریں کہ ہندوستان میں بچوں کی اموات کس قدر زیادہ اور کس قدر تیزی سے واقع ہو رہی ہیں اور ان کے انسداد کے لیے کیا عملی قدم اُٹھایا جا سکتا ہے۔

بچوں کی اس قدر اموات کی کئی وجوہات ہیں۔ لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ماؤں کی صحت کمزور ہونے کے باعث اولاد بھی کمزور پیدا ہوتی ہے اور ماؤں کی کمزوری خود کئی وجوہ پر مبنی ہے جن میں سے اہم ترین یہ ہے کہ اسکولوں میں لڑکیوں کی صحت کی جانب پوری توجہ نہیں دی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی ہو کر تندرست اور توانا عورتیں نہیں بن سکتیں۔

بعض حضرات اس بات پر یہ اعتراض کریں گے کہ تعلیمِ نسواں کو شروع ہوئے تو بہت ہی کم عرصہ ہوا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے بچوں کی اموات بھی مقابلتہً بہت کم ہوا کرتی تھیں۔ لڑکیاں دن بھر کے کام کاج میں مشغول رہتی تھیں اور صحت خود بخود درست رہتی تھی۔ آج کل بھی دیہات میں جہاں تعلیمِ نسواں عملی طور پر معدوم ہے، بچوں کی اموات شہروں کی نسبت کم واقع ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہاں ہسپتالوں، باغات اور "سیر گاہوں" کی بہت کمی ہے۔ عورتیں اور لڑکیاں باہر کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ سادہ اور مقوی غذا استعمال کرتی ہیں۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت اُن کے لیے قدرتی سیر گاہ اور قدرتی ہسپتالوں کا کام دیتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیہاتوں کی تقلید میں شہروں میں بھی تعلیمِ نسواں کا خاتمہ کر دیا جائے۔

بلکہ یہ کہ یہاں تعلیم کے اصولوں میں اس قسم کی تبدیلیاں کی جائیں کہ ہماری طالبات صحت کے لحاظ سے دیہات کی لڑکیوں کا مقابلہ کر سکیں۔

یہ امر قابلِ مسرت ہے کہ طالبات کے بعض اسکول ایسے ہیں (گو ان کی تعداد بہت کم ہے) جن میں کھیل کو تھوڑی بہت اہمیت دی جاتی ہے اور لڑکیوں کے لیے ہر روز کچھ وقت کھیل میں گزارنا ضروری خیال کیا جاتا ہے لیکن ان میں بھی بعض ضروری امور کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً سردست لباس کو ہی لے لیجیے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ طالبات کھیل کے دوران میں بد وضع اور غیر موزوں لباس میں ہوتی ہیں۔ وہ اس حقیقت کو قطعاً فراموش کر دیتی ہیں کہ سڈول اور خوبصورت دکھائی دینا اچھی صحت کی علامت ہے۔

بہت سے کھیل اس قسم کے ہوتے ہیں، جو اپنی نوعیت کی بنا پر لڑکیوں کو متوقع فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ مثلاً اتھلیٹکس، جمناسٹکس، مختلف قسم کی چھلانگیں، وزن پھینکنا اور ہاکی وغیرہ۔ اگر خوبصورتی اور صحت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے، تو پیراکی، تیر اندازی، شہسواری، ٹینس اور بیڈمنٹن وغیرہ ایسے کھیل ہیں، جن کا نعم البدل ممکن نہیں لیکن انگلستان کے اسکولوں کی تقلید میں ہم نے ہر ایک کھیل کو طالبات کے لیے یکساں طور پر اہم اور مفید سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ بہت سے ممالک کے ماہرینِ تعلیم و صحت اس بات پر متفق ہیں کہ بہت سے کھیل جو طلبہ کے لیے مفید ہیں، طالبات کے پھیپھڑوں اور سلسلۂ تنفس کے لیے از حد مضر و نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ ممکن ہے، یہاں یہ اعتراض ہو کہ کئی مثالیں ایسی موجود ہیں، جن میں لڑکوں کے کھیلوں میں لڑکیوں نے ریکارڈ مات کیے ہیں، لیکن اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ مستثنیات تو قوانینِ قدرت میں بھی موجود ہیں اور یہ کسی صورت میں جائز نہیں کہ مستثنیات کو ہمہ گیر قوانین کی حیثیت دے کر انھیں روزانہ زندگی میں عائد کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسی مثالوں کو بھی مستثنیات ہی تصور کیجیے۔ نیز کھیل کا انتخاب چونکہ ذاتی ذوق پر منحصر ہے۔ لہٰذا انگلینڈ

اُور دوسرے ممالک میں اس معاملے میں کسی قسم کی پابندی عاید نہیں کی گئی۔

اب ضروری ہے کہ ان کھیلوں کے دَوران میں لباس بھی صحیح قسم کا زیبِ تن ہونا چاہیے۔ لباس کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ سادہ ہو اُور دُوسری یہ کہ جسم کے مطابق ہو۔ تاکہ دوڑ یا کھیل کے وقت ڈھیلا ڈھالا اُور بدنما معلوم نہ ہو۔ آپ خود اندازہ کیجیے کہ ٹینس یا اسی قسم کا کوئی اَور کھیل کھیلتے وقت ڈھیلے ڈھالے کپڑے، ہوا میں اُڑتے ہُوئے کتنے بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ ریشمی ساڑھیاں، جو کھیل میں ہر طرح سے رکاوٹ کا باعث ہوتی ہیں، نمائش کی علامت ہیں، نہ کہ صحت اُور خوبصورتی کی۔ نمائش اور خوبصورتی دو مختلف چیزیں ہیں، جن میں ایک بنیادی فرق حائل ہے۔

اب ذرا بالوں کی طرف توجہ کیجیے۔ گو اس بات کا زیادہ تر انحصار مختلف علاقوں کے تمدّن اُور معاشرت پر ہے کہ بالوں کا فیشن کیا ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بکھرے ہُوئے بالوں کی نسبت گندھے ہُوئے بال کھیل کے دَوران میں زیادہ بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ بالوں کا ہر وقت سامنے یا دائیں بائیں کھسک آنا کھیل میں ایک طرح کی مزاحمت پیدا کرتا ہے اُور کھلاڑی کے لیے بہت مشکل پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ایک وقت میں کھیل کی طرف بھی توجہ رکھے اُور بالوں کی طرف بھی۔

صحت مسرّت کی رُوح و رواں ہے۔ صحت کے بغیر دنیوی اُور دینی دونوں ترقیاں مفقود ہو جاتی ہیں۔ لڑکیوں کی صحت کی طرف زیادہ توجہ اس لیے ضروری ہے کہ نئی قوم کے عروج و زوال کی تقریباً تمام تر ذمّہ داری انھیں پر عائد ہوتی ہے ؎

جو کچھ بتائے گی ماں، جو کچھ سکھائے گی ماں
بچّے میں تا بہ آخر اُس کا اثر ملے گا

اگر طالبات کی صحت اچھی ہے، تو اخلاق اُور اُس کی تربیت کی جانب پوری توجّہ کی جا سکتی ہے

اور اس مقصد کو مدِ نظر رکھ کر زنانہ مدارس کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔ اخلاق کے بعد روحانی ترقی کا درجہ آتا ہے۔ آرٹ، ادب، سائنس اُور فلسفہ، اِن سب سے ضروری تعلیم روحانیت کی ہے۔ لیکن اخلاق اُور روحانی دونوں تعلیمات صحت کے بغیر نامکمل اُور ناقص ہیں۔

مشہور صاحبِ قلم خاتون، سعیدہ وحید مقیم جنیوا (سوئٹزرلینڈ) کا ایک اہم مضمون" انیسِ نسواں" ستمبر ۱۹۳۹ء میں "عورت اُور تعلیم" کے زیرِ عنوان شائع ہُوا ہے۔ جس میں محترمہ موصوف لکھتی ہیں "عورت معاشرتی کاموں میں بھی بہت زیادہ مدت تک حصہ لے سکتی ہے۔ اس کے لیے تعلیم کی اُور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ محدود تعداد باہمت خواتین کی کوشش سے اتنی بڑی قوم اُور خصوصاً طبقۂ نسواں تاریکی سے نہیں نکل سکتا۔ اس کے لیے بہت سے تجربہ کار ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ شہروں کی نناوے فی صدی عورتیں گھر میں رہ کر بیکار زندگی بسر کر دیتی ہیں۔ اُن کی ذات سے قوم کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ اُن میں سے اکثر کو گھر میں کام کرنا پڑتا ہے مگر کیا وُہ کام اتنا ہوتا ہے کہ اُن کا تمام وقت اس میں صرف ہو جائے؟ نہیں، سب کام کر کے بھی ان کے پاس اتنا وقت بچتا ہے کہ اس میں بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ متوسط خصوصاً اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے ہاں نوکروں کی کمی نہیں ہوتی اُور خواتین دن بھر بیٹھ کر باتوں میں گزار دیتی ہیں۔ تمام عمر ان کا یہی معمول رہتا ہے۔ ان کے پاس وقت صرف کرنے کے نہایت کارآمد طریقے موجود ہیں۔ مثلاً گھر کے علاوہ گلی کوچے، شہر و دیہات جہاں تک کوئی ہمت کر سکے، حفظانِ صحت کے اصولوں پر پابندی کرنا اُور کروانا طریقۂ ماندوبود میں اصلاح، طبقۂ نسواں کی اصلاح اُور بہبودی کے لیے گورنمنٹ سے بہتر قوانین کے نفاذ کی کوشش، یتیم خانوں اُور مختلف خیراتی اداروں میں اصلاح، خیرات و زکوٰۃ کے بہتر طریقے معلوم کرنا، اسکولوں کے نصاب میں ضروری تبدیلیاں، لڑکیوں کے لیے صحیح تعلیم اُور مکتبوں کے قیام کی کوشش، غرضیکہ بہت سے اس قسم کے کاموں میں خواتین کی ہمت و ایثار کی بہت ضرورت ہے۔"

میں اس اقتباس پر اپنی طرف سے کسی قسم کا تبصرہ غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ جو
جس ہمہ گیر پروگرام اور صحت کے اُصول کی پابندی کا ذکر مضمون نگار خاتون نے کیا
ایک ہلکا سا خاکہ اس پیراگراف میں موجود ہے۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

مضمون طویل ہو رہا ہے، لہٰذا اسے جنابِ مرحوم کے چند اشعار پر ختم کرنے کی اجازت چاہتا
کرتا ہوں ؎

بچے بھی ہونگے جاہل، جاہل اگر ہیں مائیں
بچے بھی ہونگے کاہل، کاہل اگر ہیں
ناقص اگر ہیں مائیں، بچے بھی ہونگے ناقص
بچے بھی ہونگے کاہل، کاہل اگر ہیں
ہونگے وہ رہ نوردِ راہِ خدا شناسی
سُوئے عبادتِ حق، مائل اگر ہیں

نشو و نما نہ ہوگی، طاقت ذرا نہ ہوگی
صحت سے اُن کی کچھ بھی غافل اگر ہیں مائیں!

شوخ اور گستاخ بچّے

از

سیّد نذر محمد، ایم اے

لالہ کلیان داس، جو کہ ایک پرانے تجربہ کار ہیڈ ماسٹر تھے، ایک دن اپنے دفتر میں بیٹھے کچھ کاغذات پر غور کر رہے تھے، جب کہ اُن کے ایک نو آموختہ نائب مدرس مسٹر ایس، کے، شکلا اپنے ایک بے قابو شاگرد کے خلاف شکایت لائے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے غور سے اُن کی بات کو سُنا اور فرمانے لگے کہ ایک نو آموز مدرّس کو جب طلبہ سے واسطہ پڑتا ہے، تو اُس کو سب سے زیادہ دقّت اُس وقت پیش آتی ہے، جب اُسے اس نوع کے طلبہ سے واسطہ پڑتا ہے، جو گستاخ ہوں، لیکن سماجی یا معاشرتی اسباب کے پیشِ نظر اُنھیں فہمائش نہ کی جا سکے۔

مسٹر شکلا غصّے سے لال پیلے ہوتے جا رہے تھے اور زبانِ حال سے اپنی بے بسی کی فریاد کر رہے تھے۔ بے اختیار اُن کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ بہت سے والدین اپنے بچوں کو اپنے دوستوں اور ہمسایوں سے شوخی اور گستاخی کرنے کی ڈھیل دے دیتے ہیں، اور اُن کے اخلاق سنوارنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کا یہ طرزِ عمل بالکل صحیح ہے۔ شاید وہ اسے ذہانت خیال کرتے ہیں اور بچّے کی شوخی کو ذہانت سے منسوب کر کے یہ بُری عادت اُس میں مستحکم کر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ ہمیں بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ عادت اُنھیں گھر میں پڑ جاتی ہے اور مدرسے میں بھی جاری رہتی ہے اور ایسے طلبہ ہمارے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔

لالہ کلیان داس جنھیں تیس سال کا تجربہ تھا۔ جو ہر قسم کے نشیب و فراز دیکھ چکے تھے۔ بھانت بھانت کی طبائع سے واسطہ رکھ چکے تھے۔ بیشمار طلبہ اُن کے ہاتھوں سنور کر مراتبِ جلیلہ پر فائز ہو چکے تھے، نہایت دھیمی طبیعت کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے نہایت متانت سے ساری بات سُنی اور طالب علم کو بُلا کر سخت سست کہہ کر اُس کی جماعت میں بھیج دیا اور چلتے وقت یہ بھی کہہ دیا کہ میں تمھارے والد صاحب کو ملوں گا۔ مسٹر شکلا سب کچھ سُنتے رہے اور چپکے چپکے زہر کے گھونٹ پیتے رہے۔ وُہ طالب علم کے خلاف تو تھے ہی اور اب لالہ کلیان داس سے بھی جلے جا رہے تھے کہ اُنھوں نے طالب علم کو خاطر خواہ سزا نہیں دی۔

طالب علم کے چلے جانے کے بعد لالہ کلیان داس نے مسٹر شکلا کو اپنے قریب بٹھا لیا اور فرمانے لگے: "فی الحقیقت طالب علم کے لیے یہ شعار اختیار کرنا نہایت مذموم ہے اور والدین کو نہیں چاہیے کہ بچّوں کی ایسے فعل میں حوصلہ افزائی کریں۔ عام بچّے کی تو خیر، لیکن ایک ذہین بچّہ اگر ایک دفعہ گستاخی کا موقع پالے اور اُسے کوئی روکنے والا نہ ہو، تو وہ اپنے بڑوں کا ناک میں دم کر دیتا ہے۔ وُہ اُن کے کمزور پہلوؤں پر خوب فقرے چُست کرتا ہے اور عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کر کے اچھے بھلے شریف آدمی کو خجل کر دیتا ہے اور جب اُسے فہمائش کی جائے، تو ایسے ایسے جملے کہہ نکلتا ہے کہ سُننے والے بھی جل جاتے ہیں . . . . ."

مسٹر شکلا ہیڈ ماسٹر صاحب کے لیکچر سے جل گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ طالب علم کو سخت سزا ملے گی اور وُہ فخر کرتے ہوئے آئیں گے اور اُسے جماعت میں شرمندہ کرینگے۔ اب یہاں ایک لمبی چوڑی تقریر شروع ہو گئی، جو ختم ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ ہیڈ ماسٹر کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ جھلا کر بولے۔ "لالہ جی سب ٹھیک ہے۔ جماعت شور کر رہی ہوگی، میں جاتا ہوں اور اگر مجھ سے پوچھیں، تو ایسے مرض کا ایک ہی علاج ہے اور وُہ ہے، ڈنڈا۔ ایسے نالائق کو پکڑ کر پان سات لگا دیں۔ دیکھیں، تو

کیسی جلدی مزاج درست ہو جاتا ہے۔"

لالہ کلیان داس کی بات ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ اُنھیں مسٹر شکلا کی یہ باتیں سُننا پڑیں۔ لیکن وہ بالکل نہ گھبرائے اور فرمانے لگے کہ آج تو خیر وقت نہیں۔ مگر کل کسی فارغ وقت میں مَیں آپ سے عرض کروں گا کہ بچے کیونکر گستاخ ہوتے ہیں اور اُن کی درستی کیسے ممکن ہے۔ فی الحال مَیں اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ اگر طالب علم کو چٹاخ پٹاخ بلا تامل دو چار لگا دی جائیں، تو خواہ وہ طالب علم اس وقت بالکل خاموش رہے اور معلوم ہو کہ درست ہو گیا ہے، لیکن یہ اُس کے مرض کا صحیح علاج نہیں ہوتا۔ بچہ دل میں یہ کہیگا کہ اچھا تم نے مجھے پیٹ لیا۔ مگر اس لیے کہ تم مجھ سے زیادہ طاقت ور ہو، ورنہ . . . . . اور دل میں سزا دینے والے کے خلاف سخت کینہ رکھنا شروع کر دیگا۔

مسٹر شکلا نے سُنا اور اپنی جماعت میں واپس آ گئے۔ اُنھیں تمام طلبہ کی حرکتوں میں گستاخی کا رنگ نظر آتا تھا۔ وہ اپنے دل میں شرمندگی سی محسوس کرتے تھے۔ اُنھیں وہ طالب علم بالخصوص بُرا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی ہنسی، اُس کی خاموشی، اُس کا بیٹھنا، اُس کا اُٹھنا غرض ہر فعل قابلِ اعتراض معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ آج کل روزگار مشکل سے ملتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو بڑے آدمی کے بیٹے سے معاملہ بڑھا کر اپنی پوزیشن خراب کر لیں۔ اپنے کام میں مشغول ہو گئے اور اسکول کا وقت پورا کیا۔ اسکول سے چھٹی ہونے پر گھر آ گئے۔

مسٹر شکلا کے والد بڑے سمجھدار آدمی تھے۔ اُنھوں نے اپنے لڑکے کے چہرے سے اندازہ کیا کہ مسٹر شکلا کی طبیعت ملول ہے۔ سبب دریافت کیا، تو مسٹر شکلا آبلے کی طرح پھوٹ بہے اور سارا ماجرا سُنا دیا۔

مسٹر شکلا کے والد کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور سمجھ گئے کہ شکلا اپنی جوانی کے جوش میں تیزی میں آ گئے اور ہیڈ ماسٹر کی بات پر غور نہیں کیا۔ شکلا کو ادھر اُدھر کی باتوں میں لگا لیا اور جب

اُن کی طبیعت ٹھیک ہُوئی، تو اُنھیں سمجھایا کہ ہیڈ ماسٹر بہت ہی سمجھدار آدمی ہے۔ وُہ اُن کا بھی اُستاد ہے۔ اُس نے بہت سے نوآموز مدرسین کو تجربہ کی باتوں سے فائدہ پہنچایا ہے اُور تمھیں بھی اُن سے سیکھنے میں دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

مسٹر شکلا رات کو آرام سے سو گئے اُور صبح ذرا جلدی اُٹھ بیٹھے۔ اب اُن کا مزاج بالکل صحیح تھا۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ طالب علم کو مَیں نے اپنی غلطی سے مدِمقابل بنا لیا تھا۔ واقعی زیادہ تر اُنھیں کی غلطی تھی۔ اگر وہ برافروختہ نہ ہوتے اُور تحکمانہ لہجے کے بجائے پیار سے کام لیتے، تو بچہ گستاخی سے پیش نہ آتا۔ لیکن یہ ساری قیاسی باتیں تھیں۔ اُنھوں نے حال ہی میں ٹیچر کی زندگی اختیار کی تھی۔ وُہ اپنے تجربہ کی بنا پر کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ آخر یہ فیصلہ کیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے اتنے تجربہ سے ضرور فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ آخر مدرسی ہی میں وقت کاٹنا ہے۔ ٹھوکریں کھا کر سنبھلنے کے بجائے ایک سنبھلے ہُوئے شخص سے کیوں نہ کچھ حاصل کر لیا جائے۔ یہ سوچ کر اُنھوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ روزانہ وقت پا کر ہیڈ ماسٹر صاحب کی صحبت میں بیٹھا کریں گے اُور اُن سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ خصوصًا اس وقت جبکہ ہیڈ ماسٹر صاحب خود موقع دے رہے ہیں، اس سے ضرور فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

اس دن اسکول سے فارغ ہو کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ ساتھ اُن کے گھر کی طرف چل پڑے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اس معاملے پر وضاحت سے روشنی ڈالیں۔ جس میں اُنھیں اس قدر رنج سہنا پڑا۔ لیکن اس کے برعکس ہیڈ ماسٹر صاحب چاہتے تھے کہ مسٹر شکلا کو بچوں کے اس خاصے کے آغاز، نشوونما، تکمیل، غرض کہ تمام ارتقائی منازل سے واقف کیا جائے اُور مختلف مثالوں سے اس نقص کو دُور کرنے کا طریقہ بھی بتایا جائے۔ یا کم از کم مختلف صورتوں میں مختلف برتاؤ بتائے جائیں، جو ایک قابل اُستاد کو استعمال میں لانے چاہییں۔ چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مسٹر شکلا سے کہا کہ مَیں آپ کی طبیعت کا مطالعہ کرتے ہُوئے کہہ سکتا ہوں کہ

ٓپ کوکل کے معاملے میں کافی رنج پہنچا ہے اور آپ ضرور اس کا حل سمجھنا چاہتے ہونگے۔ مگر اس سے بیشتر کہ میں اس خاص معاملے پر روشنی ڈالوں، چاہتا ہوں کہ آپ سے اپنی تمام عمر کا نچوڑ بیان کروں، اکہ آپ یہی نہیں، بلکہ ایسے تمام معاملات کا حل خود ہی سمجھ لیا کریں۔ یہ کہہ کر لالہ کلیان داس نے یک نظر مسٹر شکلا کے چہرے پر ڈالی اور انھیں رضامند پاکر اپنے طویل لیکچر کی یوں ابتدا کی:۔

"عزیز من۔ بالجملہ بچوں میں گستاخی کا ظہور اُس وقت سے ہوتا ہے، جبکہ بچوں کے ہوٹے چھوٹے اور پیارے پیارے جملوں کو غور سے سُنا جاتا ہے اور ان پر فخر کیا جاتا ہے۔ کسی دن بچہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے، جس میں ذرا سی شوخی پائی جاتی ہے۔ لیکن ایسے حالات میں وہ فقرہ کہتا ہے کہ والدین سُن کر نہال ہو جاتے ہیں اور بچے کو منع کرنا تو درکنار وہ اس جملہ کو بچے کی موجودگی میں ن مہمان سے ذکر کرنے میں فخر سمجھتے ہیں۔ بچہ والدین کے تعجب اور لطف اندوزی میں اضافہ کرنے کے ؛ ایسے بہت سے جملے چُست کرنے کی سعی کرتا ہے۔ بچہ بعض اوقات دیکھتا ہے کہ اُس کا والد اُس الدہ کے خلاف کہے ہُوئے جملے سے خوش ہوتا ہے اور اسی طرح والدہ کو والد کے خلاف۔ وہ دونوں ری باری خوش کرتا ہُوا اپنے فن میں طاق ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اُس کا یہ خوش کن اسلوب کچھ عرصے بعد ناپسندیدہ اور بعد ازاں بیزار کن صورت اختیار کر لیتا ہے اور معمولی طریقوں سے اس کی تھام نہیں ہو سکتی۔ اس موقع پر بعض مائیں جو سمجھدار ہوتی ہیں۔ لیکن اس غلطی کا شکار ہو چکی ہیں، اپنی غلطی کا احساس کر کے کسی نہایت احسن طریقے سے بچے کی درستی کر لیتی ہیں اور بعض ہوتی ہیں، جو فقط یہ کہہ کر خاموش ہو جاتی ہیں کہ اچھا تمھیں تمھارا ماسٹر خود ہی سنوار لے گا، ند ہی دنوں کے بعد یہ بگڑا ہُوا بچہ پاس کے اسکول میں طالب علموں اور مدرسین کے لیے زحمت بن جاتا ہے۔ کبھی تو یہ اپنے ہم جماعتوں کو بھلی بُری سُناتا ہے۔ کبھی اپنے سے بڑوں کو ے کستا ہے اور کبھی اُستاد کی بھی درگت بنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ابھی اُس کے دل میں نہ تو

اُستاد کے احترام کا احساس اُور نہ خوف ہی کا جذبہ پیدا ہونے پاتا ہے۔ ایسے بچّے کو سزا دینا سراسر غلطی ہے۔ وہ ابھی افعال کے معائب و محاسن میں فرق نہیں کرتا۔ فعل و قول کے حسن و قبح میں تمیز کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔ سزا دینے کے چند ہی لمحوں کے بعد وہ سزا کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اور پھر اپنا عمل جاری کر دیتا ہے۔ اگر اُس کو دوبارہ سزا دے کر اُس کی بُرائی کا احساس دلانے کی بے سُود کوشش کی جائے، تو وہ رو تو دے گا، لیکن چونکہ اس کے قوائے ذہنی پوری نشوونما نہیں پا چکتے، اس لیے سمجھ نہیں سکیگا کہ وہ سزا کا مستوجب کیوں ہُوا اور آئندہ کے لیے کیا احتیاط برتے ......"

آگے ہیڈ ماسٹر صاحب چاہتے تھے کہ مسٹر شکلا کو بچّے کی اس کمزوری کو رفع کرنے کی تدبیر بتائیں کہ مسٹر شکلا اُن کی بات کاٹ کر جھٹ بول اُٹھے کہ صاحب پھر اس کا اُور علاج بھی کوئی نہیں۔ ڈنڈا تو بگڑوں کا پیر کہلاتا ہے۔ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے کہ بچّے کو خوب ڈنڈے پڑیں اور پھر وہ اپنی غلطی محسوس نہ کرے اُور آئندہ کو محتاط نہ ہو۔ وہ تو جناب ایسا سنورے گا کہ پھر جب بھی کبھی کوئی بات کہنے لگے گا، تو ڈنڈے کی یاد اُس کے بدن میں کپکپی پیدا کر دے گی اُور وہ فوراً ایسا کرنے سے رُک جائیگا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب یہ سُن کر مسکرائے اُور کہنے لگے کہ مَیں پہلے ہی سے خیال کر رہا تھا کہ آپ کے دل میں لازماً یہ خیال پیدا ہُوا ہوگا۔ مگر صاحب جو علاج آپ نے تجویز کیا ہے، یہ تو ایسا ہے، جیسے کسی ہونہار بروا کو اُکھاڑ کر پھینک دیا جائے کہ وہ چکنے چکنے پات کیوں نکال رہا ہے۔ بچے کی اس شوخی کی قوت کی رَو کو قابو میں لا کے اُس کے بدن کے انجن کو عمدگی سے چلانے میں مدد لینے کے بجائے رَو پیدا کرنے کی کل ہی بگاڑ دیں اور انجن کا ستیا ناس ہی کر دیں؟

مسٹر شکلا علاج سُننے کے لیے بیقرار ہو رہے تھے اُور چاہتے تھے کہ بھلا دیکھیں ہیڈ ماسٹر صاحب اس کا کیا حل بتاتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اُنھیں بھانپ کر جلدی سے سزا کے نقائص بیان کر کے اپنے اصلی موضوع پر آنے لگے اُور فرمایا "مسٹر شکلا۔ ایک لائق اُستاد کے لیے

ہے کہ وہ نہایت صابر ہو، ہمدرد ہو اور بچوں کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔ ڈنڈے
ستعمال تو ایک وحشیانہ حربہ ہے۔ ڈنڈا جنگل کا قانون ہے۔ ایک مہذب انسان کے لیے بیشمار
یقے ہیں، جن سے وہ انسان کے بچے کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سزا کو
لحت ترک کرنے سے گزر نہیں ہو سکتی۔ لیکن بدنی سزا آخری حربہ ہے۔ ابتدائی نہیں۔ اُستاد کو چاہیے
ہے بچے کی اس قوت کو اس طرح قابو میں لائے کہ یہ قوت دیگر قوتوں کی مُمد و معاون بن جائے۔ ہم
چکے ہیں کہ اس قوت کی بنیاد خود نمائی سے پڑی۔ بچے نے شروع میں تو ایک آدھ جملہ یوں ہی
ے سمجھے کہدیا اور والدین خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ لیکن بعدازاں بچے میں ایسے فقرے کہنے
ت رکھنے کا مظاہرہ کر کے والدین کو خوش کیا۔ غرضکہ خودنمائی سے خودنمائی اور شوخی پیدا ہوئی
یہ قوت بڑھتی جائے، تو گستاخی تکبر، غرور، نخوت اور رفتہ رفتہ باغیانہ خیالات پیدا کر دیتی
لیکن یہ قوت اگر بچے کی اصلی خصلتوں کی نمائش میں تبدیل کر دی جائے، تو بہت مفید
نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً اگر بچے کو گانے میں دلچسپی ہو، تو اس کی اس میں حوصلہ افزائی کی
۔ بچے کی خودنمائی کی پیاس رفع ہونا شروع ہو جائے گی۔ اسی طرح تصویر کشی میں،
یں، کسی دستکاری میں اُس کی خودنمائی کی قوت لگائی جا سکتی ہے۔ بچہ ذرا بڑا ہو، تو خوش خلقی
سے خودنمائی کا موقع دیا جا سکتا ہے ......"

مسٹر شکلا نے طبیعت پر جبر کرتے ہوئے، یہ ساری باتیں سُنیں اور یہاں پر اعتراض کا
الکر جھٹ بول اُٹھے کہ صاحب اِن باتوں سے فارغ ہونے کے بعد بچہ اپنی شوخیوں میں پڑ
رجب دیگر بچوں میں کھیلیگا، تو پھر مصیبت کا باعث ہوگا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ نہیں۔ اوّل تو اُس کی خودنمائی کے
کا بیشتر حصہ اِن باتوں میں صرف ہو جائے گا اور جو باقی رہے گا، وہ اس کو بچوں میں کھیلنے کا موقع

دینے سے جاتا رہے گا۔ گھر پر تو والدین بچے کے کھیل کا سارا سامان خود مہیا کر دیتے ہیں، لیکن جب ایک بچے کو دوسرے بچوں سے کھیلنا ہو، تو اُسے اُن کے ساتھ اُن جیسا بن کر رہنا پڑتا ہے۔ اَور اگر وہ شوخیوں سے کام لے، تو دیگر بچے الگ ہو بیٹھتے ہیں اَور وہ اکیلا ہی رہ جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ والدین کا اکلوتا بچہ زیادہ شوخ اَور گستاخ ہوتا ہے، بہ نسبت اُن بچوں کے جو ایک گھر میں بہت سے ہوں۔۔۔۔۔"

مسٹر شکلا فوراً بول اُٹھے کہ صاحب یہ تو اس لیے ہوتا ہے کہ اکیلا بچہ والدین کی نازبرداریوں سے خراب ہو جاتا ہے۔ وُہ اُسے کچھ کہتے نہیں۔ اُس کی فہمائش ہوتی نہیں۔ اُسے روک تھام کا ڈر نہیں ہوتا اَور وہ شوخ اَور گستاخ ہو جاتا ہے۔ زیادہ بچوں میں والدین سختی بھی لیتے ہیں اَور کسی بچے کو مطلق العنانی کی اجازت نہیں دیتے۔ بچے ٹھیک رہتے ہیں اور اگر ایک بڑے قبیلے میں بھی والدین بچوں سے وہی برتاؤ کریں، جو اکیلے بچے کے والدین کرتے ہیں، تو یقیناً اُن کی بھی حالت اُس بچے کی سی ہو جائے۔

لالہ کلیان داس مسٹر شکلا کا یہ بظاہر معقول اعتراض سُن کر خوش ہُوئے، لیکن اس کا جواب اس طرح سے دیا کہ صاحب آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر آپ نے اپنے اعتراض میں خود ہی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ بچے کے شوخ ہونے میں قصور والدین کا ہوتا ہے۔ والدین کے خیال نہ کرنے سے اَور بچوں کو ڈھیل دینے سے بچے بگڑ جاتے ہیں، خواہ وہ اکیلا بچہ ہو، یا زیادہ ہوں۔ مجھے اس میں کلام نہیں، لیکن اس وقت ایسا کہنے سے مطلب یہ ہے کہ تجربے میں آیا ہے کہ اگر والدین ایک ہی طبائع کے واقع ہوئے ہوں اور ایک گھر میں ایک بچہ ہو اَور ایک میں بہت سے تو اکلوتا بچہ زیادہ والوں کی نسبت زیادہ بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ زیادہ بچوں میں اکٹھے کھیلنے سے مروت کا مادہ پیدا ہوتا ہے اَور شوخی اَور دست درازی کے بجائے لحاظ اَور رواداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر

مدرسے میں شوخ بچوں کو دوسرے بچوں میں مل کر کھیلنے کا موقع دیا جائے، تو دوسرے بچے ان شوخ بچوں کی عادات خود ہی درست کر دیتے ہیں۔ اگر یہ اُن میں مل جُل کر نہ رہیں گے، تو نکّو بن جائیں گے اور کھیل تماشے میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ تو گویا چھوٹے شوخ بچوں کی اصلاح کا یہ بھی ایک عمدہ طریقہ ہے۔

مسٹر شکلا نے لالہ کلیان داس کی رائے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ بیشک چھوٹے بچوں کا آپس میں مل جُل کر کھیلنا رواداری پیدا کر دیتا ہے، لیکن ایسا بھی تو ممکن ہے کہ شوخ بچہ اپنے ساتھیوں سے تو رواداری برتے، لیکن بوڑھوں سے شوخی اور گستاخی سے پیش آئے۔

لالہ کلیان داس جو ان تمام اعتراضات کے لیے پہلے ہی سے تیار تھے، بولے کہ آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ لیکن اوّل تو چھوٹے بچوں میں کھیلنے سے بچے کی طبیعت بہت کچھ سدھر جائیگی۔ رہی سہی اُس کی اچھے رنگ میں خود نمائی کرنے میں درست ہو جائیگی۔ اور اگر پھر بھی موجود ہے، تو ایسے بچوں کو اپنے سے بڑے بچوں میں کھیلنے کا موقع دینا چاہیے۔ خصوصاً بڑے طلبہ کی ماتحتی میں کرکٹ وغیرہ کھلانا تو نہایت ہی مفید ثابت ہُوا ہے۔ بڑے لڑکوں سے تعلیمی اسباق میں یا کھیل میں مقابلہ کرانا اور بڑے لڑکوں کی گفتگو اور سلوک میں مسابقت۔ سماجی زندگی میں ایک دوسرے کے جذبات کی لڑکوں کے سامنے تعریف، ایک اچھا اثر پیدا کرتی ہے۔ بعض اوقات شوخ اور گستاخ بچوں کے نقائص پر چشم پوشی کرتے ہُوئے، اُن کے اخلاق کے اچھے پہلوؤں کی تعریف کر دینا بھی مفید ثابت ہُوا ہے۔ لیکن تعریف ایک سنجیدہ رنگ میں ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ مذاق ہی بن جائے اور وہ نیک پہلو بھی بد میں تبدیل ہو جائیں، بلکہ اس کے برعکس ایسا خوشگوار اثر پیدا کرے کہ بچے میں نیکی اور بدی کے فرق کا پورا احساس پیدا ہو جائے اور وہ روز بروز زیادہ سے زیادہ تعریف حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اگر ذرا سی بھی ترقی کرے، تو اُس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

تختِ طاؤس

مصنفہ

مولوی محمد عبداللطیف خان کشتہ قادری

یہ کتاب مولانا کشتہ قادری کی ہفت سالہ تحقیقی و تفتیشی مساعی کا نتیجہ ہے۔ تختِ طاؤس عہدِ مغلیہ کی زرگری، جواہر تراشی و خوش مذاقی کا مرقع تھا اور اُس کی صنعت، صنعتِ ایران و ہندوستان کی دلآویز سنگم تھی۔ جس کی زیارت کے لئے دُور دُور کے ملکوں کے لوگ صعوباتِ سفر ہنسی خوشی برداشت کر کے آتے اور تازگیِ نظر و تفریحِ قلب تحیّر کا پرشاد لے کر جاتے اور یہ تبرک مدت دراز تک ان کو تر زبان و خوش بیان رکھتا تھا۔ کتاب ہذا اسی بے مثل تخت کے وقائع تاریخی پر مشتمل ہے۔ حقیقتاً اس تخت کے پردے میں ایشیائی دماغی لطافتوں کے سینکڑوں مرقعے پوشیدہ تھے۔ جن کو منظرِ عام پر لا کر مولانائے موصوف نے ملک اور قوم پر ایک زبردست احسان کیا ہے اور اُن کی یہ کدو کاوش قابلِ شکر گزاری ہے۔

ہمارے یہاں کی بہت کم تاریخی کتب ایسی ہیں، جن میں وسعتِ مطالعہ، غور و تحقیق، تفتیش، تنقید، علمی و منطقی استدلال و آزادہ خیالی سے کام لیا گیا ہو اور اُن مؤلفین و مصنفین نے روایت و درایت کی علمی جانچ پڑتال کی ہو۔ اپنی طبیعت سے کسی نتیجے پر پہنچے ہوں۔ پیچیدہ مسائل کو تقسیم و تحلیل کرتے ہوئے کوئی انکشاف کیا ہو اور اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھا کر اس طرح ترتیب دیا ہو کہ اُن کی حالت نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مگر پیشِ نظر کتاب تاریخ "تختِ طاؤس" ان تمام اوصاف سے متصف ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

کو ہر طرح سے اپنی فوقیت کا عملی ثبوت دیا جائے۔ اُستاد بچوں کے لیے واقعی ایک نمونہ بنے۔ اپنے کام میں اپنی قابلیت کا ایسا اظہار کرے کہ طلبہ خود بخود ہی گرویدہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ خوش باش بھی ہو۔ بدمزاج نہ ہو اور اگر اُستاد میں مطلوبہ اوصاف ہوں اور پھر طالب علم گستاخی کرے، تو فی الحقیقت طالب علم قصوروار ہے۔ ایسی حالت میں طالب علم کو ضرور ہیڈ ماسٹر کے سپرد کر دینا چاہیے، جو اُسے قرار واقعی سزا دے اور جرمانہ کرے۔

مسٹر شکلا سمجھ گئے کہ واقعی طالب علم سے ایک لمبی چوڑی مذہبی بحث میں پڑ گئے تھے اور غلط دلیلیں دے کر زبردستی اُسے منوانا چاہتے تھے۔ وہ وہاں تو خاموش رہے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے اجازت حاصل کی، لیکن آئندہ کے لیے بہت محتاط ہو گئے اور اپنی باقی عمر نہایت اچھی بسر کی۔ پھر کبھی اُنھیں ایسا موقع پیش نہ آیا۔ جس میں اُنھیں طلبہ سے گستاخی کے معاملے میں اُلجھنا پڑے۔

تعلیمِ بالغاں پر ایک تنقیدی نظر

از

محمد انوار نبی قریشی، بی اے، بی ٹی، ڈپٹی انسپکٹر مدارس بہاولپور گورنمنٹ بہاولپور

"لو جی اور سنو۔ بوڑھے منہ ہمارے کہتے ہیں کہ تم بھی تعلیم حاصل کرو، بھئی خوب کہی"۔ ایک بولا۔ دوسرے نے جھٹ جواب دیا۔ "یوں نہیں، بلکہ یوں کہیے کہ کہیں بوڑھے طوطے بھی پڑھا کرتے ہیں"۔ یہ جواب ہے، جو عام طور سے کسی بالغ کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمیں دیا جاتا ہے۔ مگر ایسے جوابات بھی عام طور سے اَن پڑھ اور جاہلوں ہی کے منہ سے نکلتے ہیں۔ ہزار سر پٹکو کہ میاں یہ تمہارے اپنے فائدے کی چیز ہے اور تمہارے کاروبار اور روزانہ مشغلہ میں اس سے نہایت مفید مطلب امداد پہنچیگی۔ لاکھ کہو عام مقولہ ہے کہ "پیر شو بیاموز" بڑھاپے تک تعلیم حاصل کرتے رہو اور کیا تم نے نہیں سنا کہ ع بے علم نتواں خدا را شناخت۔ کہ بے علم خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ مگر وہ ہیں کہ ٹس سے مس ہونے کا نام تک نہیں لیتے۔ اور اگر کچھ زیادہ زور دیا، تو یہ جواب ملتا ہے۔ "ارے صاحب! رہنے بھی دیجیے۔ تعلیم، تعلیم! کیا ملتا ہے تعلیم سے؟ عبدالرؤف کے لڑکے نے تعلیم پائی، بیچارہ اپنے کام سے بھی گیا۔ نوکری تو کیا ملتی اور وہ دیکھو میاں عبدالمجید کے لڑکے کو۔ بیچارہ پڑھ کر دھوبی کا کتا بن کر رہ گیا۔ نہ گھر کا رہا، نہ گھاٹ کا۔ بیوی بچوں والا ہو گیا۔ نوکری نہ ملنی تھی، نہ ملی۔ جب ہمارے بچوں کو ہی پڑھ کر کچھ نہ ملا۔ تو ہمیں کیا ملنا ہے۔ خاک ڈالو، ایسی پڑھائی پر"۔

یہ ذہنیت ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ذہنیت خود جہالت کا ہی نتیجہ ہے اور اگر

بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے، تو ایسی ذہنیت اَور جہالت ہی ہندوستان کے ادبار اور بدترین ذلّت کا باعث بن رہی ہے۔ جہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ذہنیت جہالت کا نتیجہ ہے۔ وہاں یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اس میں اگر تبدیلی ہوسکتی ہے، تو وہ تعلیم ہی سے۔ جب تک تعلیم کا مدّعا ملازمت سمجھا جاتا رہیگا، ہندوستان میں بیکاری بڑھتی جائیگی اور ایک دن وہ آجائیگا کہ ہم میں سے بہتوں کو فاقہ کشی کی موت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یہ موقع اس بحث کا تو ہے نہیں۔ آیا تعلیم کا مدّعا کیا ہے اور نہ ایسے امور جاہل عوام کو اپیل کرسکتے ہیں۔ ہمیں تو اس موقع پر یہ دیکھنا ہے۔ آیا عوام سے یہ نظریہ کس طریق سے دُور ہو سکتا ہے اَور اس کا کیا علاج ہے۔ اس کا واحد علاج تعلیم بالغاں ہے۔ جس کے لیے گورنمنٹ ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں روپیہ خرچ کر رہی ہے محکمہ تعلیم نے تعلیمِ بالغاں کی تحریک کا بیڑا نہ صرف اس وجہ سے اُٹھایا ہے کہ یہ تعلیم سے تعلق رکھتی ہے، بلکہ اس غرض سے بھی کہ اس کا اثر آئندہ نسلوں اَور اُن کی تعلیم و تربیت پر بھی پڑتا ہے اَور یہی ایک طریق کار ہے، جس سے آنے والی نسلوں سے جہالت دُور ہوکر باعثِ فلاح و بہبودیِ ملک ہوگا۔

عام طور سے دیکھنے میں آیا ہے کہ پڑھے لکھے والدین کی اولاد بھی پڑھنے کی شائق ہوتی ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے کہ اولاد اپنے والدین کو پڑھتے لکھتے دیکھتی ہے۔ آپ نے ننھے بچّوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ خواہ مخواہ کوئی کاغذ کا پرزہ یا قلم دوات لے کر اُوں اُوں کرنے لگتے ہیں یا کیڑے مکوڑے کھینچنے شروع کر دیتے ہیں۔ دوسری وجہ تعلیم یافتہ والدین کے بچوں کو تعلیم سے رغبت ہونے کی یہ ہے کہ والدین خود اپنے بچّوں کو تعلیم کی قدر و عافیت جانتے ہوئے تعلیم کی رغبت دلاتے ہیں۔ اُن کو تعلیم دلانے کے لیے بچّوں کے ساتھ ہزار جتن کرنے پڑتے ہیں۔ لالچ دیتے ہیں۔ ترغیب تحریص دلاتے ہیں۔ بچّہ ناسمجھ ہے، تو مٹھائی کا یا کسی اَور ایسی ہی مرغوب شے کا لالچ اَور اگر کچھ

سمجھدار ہے، تو گھوڑا، گاڑی موٹر عمدہ کپڑوں کا لالچ دیا جاتا ہے۔ یہ بات تو بارہا تجربہ میں آ
ہے کہ جہاں کہیں بستی میں دس پندرہ آدمی ایسے نکل آئیں، جو کچھ بھی لکھے پڑھے ہوں، وہاں
مدرسے بہت آباد ہوتے ہیں۔ کیونکہ کچھ تو اُن کے بچوں کے ساتھ، اُن کے ساتھی یا دوست بچے
چلے آتے ہیں اور کچھ اس وجہ سے مدرسہ میں داخل ہو جاتے ہیں کہ "عبداللہ اسکول جاتا ہے۔ چلو
ہم بھی چلیں"۔

اس تمہید سے میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ اگر ہم ہندوستان سے جہالت کا بھوت
دفع کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں کوئی ایسا متنفس نظر نہ آئے، جو علم سے
بے بہرہ ہو اور جس کو اچھا شہری نہ کہا جا سکے اور اگر ہم محکمہ تعلیم کے افراد یہ چاہتے ہیں کہ مضافات
مدرسے بارونق ہوں اور بچے شوق اور ذوق سے مدرسہ میں آئیں اور تعلیم حاصل کریں۔ اگر ہم
یہ چاہتے ہیں کہ بجائے جبریہ تعلیم دینے کے لوگ بہ شوق خود بچوں کو اسکول میں بھجوائیں اور اگر ہم
یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایسے بیہودہ عذرات پیش نہ کیے جائیں کہ ہمارا لڑکا پڑھ کر کیا لیگا،
اپنے کام سے بھی جائیگا۔ اب ڈھور تو چرا لیتا ہے۔" تو اس کا ایک اور صرف ایک علاج ہے۔ وہ
یہ کہ تعلیم بالغان کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے اور اس کو کامیاب بنایا جائے۔ اس بارے
میں جہاں حکومت کا فرض ہے کہ وہ دل کھول کر روپیہ صرف کرے، وہاں محکمہ تعلیم کے افراد کا بھی
فرض ہے کہ وہ کسی لالچ یا حرص کی وجہ سے نہیں، بلکہ صرف ملک و قوم کی خدمت کی غرض سے
نہایت تن دہی اور دیانت داری سے کام کرے۔ میرا خطاب زیادہ تر مدرسین صاحبان سے ہے۔
یہ درست ہے کہ ع مزدور خوش دل کند کار بیش۔ مگر اول تو اس کام کے لیے الاؤنس دیے
جا رہے ہیں۔ اگر نہ بھی ہو، تو بھی جبکہ تمام ملک کی باگ ڈور ہمارے ہاتھوں میں ہو، تو کیا ہمیں
اپنے فرائض سے پیچھے ہٹنا چاہیے۔ کیا اس ملک میں جس پر بوجہ جہالت اور گمراہی تمام دُنیا

کی انگلیاں اُٹھتی ہیں، آپ اور ہم نہیں رہتے اور کیا اپنے ملک و قوم کی حالت دیکھ کر ہمیں شرم نہیں آنی چاہیے۔ ان سوالات کا جواب سوائے اثبات کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ افسوس کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ہم تباہ ہو رہے ہیں، مگر ایک بھائی اُٹھ کر دوسرے کی امداد نہیں کرتا اور یہ خودغرضی نہیں، تو کیا ہے؟ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ صرف آئندہ آنے والی نسلوں کے افراد کو زیادہ سے زیادہ جمع کر کے تعلیم دینے سے آپ ہندوستان کو قعرِ مذلت سے بچا سکتے ہیں، تو غلط ہے، کیونکہ اس طرح سے کافی عرصہ لگے گا۔ اتنے عرصے میں اور قومیں جہاں پڑھے لکھوں کی اوسط ۹۰ اور ۹۵ فی صدی ہے، کہیں سے کہیں جا پہنچے گی۔

مگر ہمارا خیال ہے کہ بہت کم مدرسین ایسے ہیں، جو تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے، اپنے ملک کی بے بسی، گمراہی اور جہالت سے متاثر نہ ہوتے ہوں۔ ہم اپنے بھائیوں کو یقین دلاتے ہیں کہ محکمۂ تعلیم بالعموم اور مدرسین بالخصوص وہ طبقہ ہے، جو ملک میں تہلکہ برپا کر سکتا ہے۔ حکومتوں کو زیر و زبر کر سکتا ہے۔ دُور کیوں جائیے چین اور ٹرکی کے انقلابات اس امر کے اب تک شاہد ہیں کہ ایک مدرس کی کیا ہستی ہے اور وہ کس طرح سے ملک کی حکومت کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ تو کیا ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہم کم از کم اپنے ملک کی جہالت ہی دُور کر دیں۔ ع "قطرہ قطرہ بہم شود دریا" اگر آپ روزانہ وقت میں سے تالاب کے مقابلے کا ایک قطرہ جتنا ہی وقت تعلیم بالغاں پر دیانت دارانہ اور سچی ہمدردی رکھتے ہوئے صرف کر ڈالیں، تو ایک وقت میں تالاب بھر جائیگا اور لاکھوں اس چشمے سے سیراب ہو کر آپ کو اور آپ کی آئندہ نسلوں کو عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

اس بارے میں اغلباً بہت سے سوالات پیدا ہونگے۔ مثلاً تعلیم بالغاں کو کس طریق سے ترغیب و تحریص دی جائے۔ کون سا وقت ہو، کیسی کتب ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ مگر سب میں بڑی چیز جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، وہ بالغوں کو تعلیم دینے کا سوال ہے۔ تاکہ وہ بے محل اعتراضات بالائے طاق رکھ کر

اسکول کی طرف کھچے چلے آئیں۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم بالغان کے سوال پر اب تک بہت سی ہو چکی ہے اور نہایت ممکن ہے کہ یہ خیالات بعض صورتوں میں اعادہ ہی اعادہ ہوں۔ مگر اعادہ کیا ہے۔ تعلیم میں تو جہاں دیکھیں اعادہ ہی اعادہ ہے اور یہی اعادہ ہمیں بالغوں کو ترغیب دینے میں کا بنائے گا اور بار بار کہتے رہنے سے ایک نہ ایک دن یہ لوگ راہِ راست پر آ ہی جائیں گے۔

بالغوں کی تعلیم کے لیے اُستاد کیسے اوصاف سے متصف ہو۔ طریقۂ تعلیم کیا ہو۔ کتب (ا) کیسی ہوں۔ اخراجات کہاں سے ہوں۔ وقتِ تعلیم کیا ہو، وغیرہ وغیرہ اُمور تو اپنے اپنے وقت بحث ہوگی۔ سرِدست ہمارے پیشِ نظر یہ مسئلہ ہے کہ ان بوڑھے طوطوں کو تعلیم کی طرف مائل کس طریق سے کیا جائے۔

اس اصلاحی کام کی باگ ڈور جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں، زیادہ تر مدرسین حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ یہ درست ہے کہ اُن کا وقار بلحاظ تنخواہ و اختیار سوسائٹی میں بہت گرا ہُوا ہے۔ مگر باوجود ان امور کے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر نہایت کم درجے کے مدرسین نے اپنا ذاتی اور مجلسی وقار اس درجے کا رکھا ہُوا ہے کہ اُن کا کہنا لوگوں کے دلوں پر پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ یہی ذاتی رسوخ دائر اور ایک مدرس کا مجلسی وقار جو خود مدرس کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے اور وہ کسی بستی یا گاؤں میں ایک طرح کا سرکردہ شخص سمجھا جانے لگتا ہے۔ یہی مجلسی وقار اور اُس کا ذاتی اثر ہے جو بالغوں کو بھی متاثر کر سکتا ہے اور اگر چند ایک پر ایسا اثر پڑ گیا، تو نہ صرف یہ کہ لوگ اس کے ممد و معاون ہوں گے، بلکہ اوروں کے لیے زندہ مثال اور خود مدرس کے لیے بے دام نائب اور خدمت گار رہیں گے۔ ایسے اور صرف ایسے مدرسین جو صرف اپنی ذاتی منفعت کو ملک کی خدمت پر قربان کر دیں اور اپنا نام ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائیں، اس تحریک میں یقینی طور سے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مدرس کے دیگر اوصاف اور طریقِ تعلیم پر بحث تو اپنے مقام پر ہوگی۔ اس جگہ مدرس

کے متعلق اتنا لکھ دینے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ تعلیمِ بالغان کی اشاعت اور بالغوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنے میں مدرس کا ذاتی رسوخ، اثر اور اس کا مجلسی وقار بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ روزمرہ کی بات چیت اور گفتگو کے ذریعے سے اپنے ہم جلیسوں کو کافی متاثر کر کے ان کو تعلیم کی رغبت دلا سکتا ہے علاوہ ازیں اس ترغیب وتحریص کے لیے متعدد مواقع مدرس خود پیدا کر سکتا ہے۔ مثلاً کسی مقامی تحریک یا کھیل میں نمایاں حصہ لینا شروع کر دے۔ جس میں اہالیانِ دہ دلچسپی رکھتے ہوں۔ یا ماہوار جلسہ کر کے اس میں تقریروں، ڈراموں، کہانیوں اور قصوں (جنھیں عوام الناس سُننے کے بہت مشتاق ہوتے ہیں) اور نظموں کے ذریعے سے اثر ڈالے، جلوس نکالے، جس میں تصویروں اور پوسٹروں کو نمایاں طور پر استعمال کیا جائے۔

اغلباً مدرس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے اور وہ بھی صرف ایسے، جو مذکورہ بالا اوصاف سے متصف ہوں اور جن کے دل میں ملک و قوم کا درد ہو۔ البتہ تعلیمِ بالغان میں گورنمنٹ مدرس کا مت کچھ ہاتھ بٹا سکتی ہے۔

(۱) گراموفون۔ ایسے گراموفون ریکارڈ، جو تعلیمِ بالغان کی اشاعت کے متعلق ہوں، میں نے آج تک نہ دیکھے اور نہ سُنے۔ البتہ اگر گورنمنٹ کچھ ایسے ریکارڈ تیار کرانے کا بندوبست کرے، اس تحریک کو اُبھاریں، تو اُس میں بہت خرچ نہیں ہوگا۔ ریکارڈوں کے گانے اور نظمیں، جو ں صوبے کی زبان میں ہوں، اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہیں گی۔

(۲) ریڈیو جو دیہاتی لوگ جوق در جوق بڑے ہی شوق سے سُنتے ہیں۔ اگر روزانہ پروگرام ں صرف پندرہ منٹ ہی تعلیمِ بالغان کی اشاعت پر صرف کیے جائیں، تو مجھے یقین ہے کہ مدرس لے لیے بہت سی سہولت پیدا ہو جائیگی۔ میں نے دیکھا ہے کہ ریڈیو کا پروپیگنڈا گھروں تک پہنچتا ہے ر بچے اور بڑے گھروں میں جا کر جو کچھ سُنتے ہیں، بیان کرتے ہیں۔ اس طرح عورتیں تک متاثر ہو کر تعلیم

کے لیے تیار ہو سکتی ہیں۔ یہ علیحدہ سوال ہے کہ بالغ عورتوں کی تعلیم کے لیے کیا انتظام کیا جائے

(۳) سفری سینما اور میجک لالٹین۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں کہ میجک لالٹین اور سینما کس حد تک تعلیم کی اشاعت میں ممد ہو چکے ہیں۔ تعلیم بالغاں کے لیے خاص طور سے سلائیڈز اور فلمیں تیار کرانی ہوں گی۔

(۴) اس مطلب کے لیے اخبار اور رسالے، جو باتصویر ہوں، جاری کیے جائیں۔

(۵) بڑی بڑی تصویریں رنگین اس تحریک کے متعلق بنوا کر نمایاں مقامات پر آویزاں کی جائیں مندرجۂ بالا اُمور تو ایسے ہیں، جو کھیل تماشے کے ذریعے سے بالغوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے مؤثر ثابت ہونگے۔ ہم اس امر کو پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان پر روپیہ صرف کرنا ضائع کرنا نہیں، بلکہ یہ صحیح مصرف ہے۔

اب ہم چند تجاویز ایسی بتاتے ہیں: جن پر اگر گورنمنٹ کے محکمہ جات عمل کریں، تو اس تحریک کی کامیابی میں کافی امداد کر سکتے ہیں۔

(۱) مدرس کی امداد تو اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ بروقت دورہ، نہ صرف افسران، نمبرداران ذیلداران اور دیگر معززاراکین وِہ کو تعلیم کے فائدے جتاتے ہوئے، اُن کو خود تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب، بلکہ اوروں کو بھی ترغیب دے کر مدرس کے سپرد کرنے کا انتظام کریں۔ اس کام کے لیے ایک رجسٹر بھی رکھا جائے۔ جس میں بوقت دورہ اس تحریک میں امداد دینے والوں کے متعلق آراء ہوں۔ افسرانِ دورہ (تحصیلداران وغیرہم) کے فرائض میں نمایاں طور سے اس فرض کو بھی داخل کیا جائے اور اس کا جائزہ لیا جاتا رہے۔

(۲) نمبرداران و ذیلداران کے فرائض میں ایک فرض یہ بھی ہو کہ وہ اس تحریک میں نمایاں حصہ لے کر مدرس کی امداد کریں۔

(۳) صرف وہی شخص بطور ممبران و ذیلداران منتخب کیے جائیں، جو پڑھے لکھے ہوں اور اس کی سند پیش کریں۔ یہ ہر سہ اُمور ایسے ہیں، جن سے مدرس کا وقار مقامی لوگوں کے دلوں میں کافی بڑھ جائیگا۔

(۴) جیل خانے کے افسران قیدیوں کو تعلیم دینے کا انتظام کریں اور جو قیدی پڑھ لکھ جائے اُس کی قید میں چند ماہ کی تخفیف کر دیں۔ تعلیم کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جاہل قیدی کی ذہنیت میں کس قدر انقلاب پیدا ہوا ہے۔

(۵) چپراسی، چوکیدار وغیرہ سے بالائی ادنیٰ ملازمتوں کے لیے پڑھے لکھوں ہی کو لیا جائے اور جو موجود ہوں، اُن کو بھی مجبور کیا جائے کہ وُہ کسی قریبی ایڈلٹ اسکول میں تعلیم حاصل کر کے اپنے آپ کو اس اسامی کا اہل ثابت کریں۔

(۶) اسی طرح سے میونسپل، ڈسٹرکٹ بورڈ اور پنچائتی کمیٹیوں کے ممبر صرف ایسے لوگ منتخب ہوں، جو نوشت و خواند کی سند رکھتے ہوں۔

(۷) اس میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ اگر محکمہ تعلیم ایسے طلبہ کو جن کے والدین کسی ایڈلٹ نائٹ اسکول میں تعلیم پاتے ہوں، خاص رعایتوں از قسم معافی فیس، وظیفے وغیرہ سے نواز دیا کرے۔

(۸) اسی طرح سے دیگر محکمہ جات مثلاً پولیس، و فوج بھی اپنے سپاہیوں پر آئندہ نوشت و خواند کی سند کی پابندی لگا کر پڑھے لکھے رنگروٹ بھرتی کر سکتے ہیں اور جو موجود ہیں، ان کو بھی مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی سند کسی نائٹ اسکول میں داخل ہو کر حاصل کریں۔

(۹) اسی طرح سے میونسپلٹیاں اپنے ہاں کے بھنگی، ماشکی، ٹانگہ، موٹر، لاری وغیرہ چلانے والوں پر ایسی سند کی پابندی عائد کر سکتی ہے اور محکمہ باغات کے بیلدار، مالی اور محکمہ انہار و تعمیرات کے میر آب وغیرہ سب لکھے پڑھے ہو سکتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ بڑی فیکٹریوں اور ملز

مل کام کرنے والے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیے جا سکتے ہیں۔

الغرض کوئی محکمہ ایسا نہیں، جہاں ایسی صورتیں پیدا نہ کی جا سکتی ہوں، جن سے اُ
تحریک کو کافی امداد پہنچے اور یہ بھی ہو سکتا ہے، جب کہ گورنمنٹ کے ہر محکمہ کے اعلیٰ افسر
دل میں اپنے ملک اور قوم کا درد حقیقی موجزن ہو اور وہ سچے دل سے اشتراکِ عمل پر آمادہ
ان تدابیر سے بشرطیکہ وہ ملک کے طول و عرض میں یکساں طور سے پابندی کے ساتھ جاری
جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ تحریک بہت جلد کامیاب ہو جائے گی۔

بہر حال یہ ضروری ہے کہ بالغوں کی صورت میں تحریص صرف وہی کام دے گی،
بالغ کے نکتہ خیال اور اُس کے ذاتی مفاد کے تعلق سے شروع کی جائے۔ ترغیب اگر کسی ایس
بات سے شروع کی جائے گی، جس سے بالغ طالب علم کو کوئی دلچسپی یا لگاؤ نہ ہو، تو وہ فضول
اور بے معنی ہوگی۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے جو بھی ذرائع اور وسائل اختیار کیے
جائیں، بالآخر حقیقت میں اس کی روح رواں ہمارے مدرس صاحبان ہی ہیں۔ اس لیے اس حصّہ
مضمون کو ختم کرنے سے قبل میں ایک دفعہ اور اُن سے مخاطب ہو کر یہ کہوں گا کہ اگر
وہ اپنے ملک و قوم کا حقیقی درد رکھتے ہیں اور اُس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے
تیار ہیں، تو وہ اپنا مجلسی وقار قائم کریں اور یہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ اُس
کا گر یہی ہے کہ مدرس اہالیانِ دِہ کی دھڑے بندی میں شریک نہ ہو کر اپنے آپ کو حقیقی
معنوں میں بلا ذاتی مفاد و طمع کے ان میں سے ہر ایک کا بلا تمیز سچا ہمدرد بنے۔ اُن کی
شادی غمی، دُکھ سکھ، غرضیکہ اُن کے ہر شغل میں ایسے طریق سے ہمدرد رہے کہ وہ اُس کو
اپنا سچا رہنما اور ہمدرد خیال کرنے لگیں اور یہی ایک طریق کار ہے، جس سے وہ دِہ کے
بالغان کو اپنا بنا کر اُنھیں تعلیم کے حصول کے لیے تیار کر سکتا ہے اور بالغان اگر کچھ لکھنا

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۰	نورالدین جہانگیر . . .	۲/۴
۴۱	امیر تیمور	۲/۷
۴۲	پرتھوی راج	۲/۷
۴۳	محمود غزنوی	۲/۶
۴۴	مصر کی داستان	۲/
۴۵	جاپان کی کہانی	۳/۶
۴۶	چین کی کہانی	۳/۶
۴۷	مستورات چین و جاپان . . .	۴/
۴۸	ایران کی کہانی	۳/۶
۴۹	ایشیائی روم	۲/۷
۵۰	ٹرکی (یورپی روم)	۲/۷
۵۱	لنکا	۱/۱۱
۵۲	بصرہ و بغداد	۵/
۵۳	یونان	۲/
۵۴	امرت و رشا	۳/۲ پائی
۵۵	تین سوال	۲/۷
۵۶	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبر۱ داؤد بادشاہ	۳/۹
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اول	۳/۹
۵۸	″ حصہ سوم ″	۴/۴
۵۹	خوفناک خواب	۲/
۶۰	ہیرالال	۲/۶
۶۱	دولت کی پٹاری	۲/۱
۶۲	سادھو کی چکی	۲/
۶۳	نیلا باز	۲/۱۱
۶۴	بہلول شہزادہ مصر .	۲/۱

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۶۵	برقی صلح	۲/
۶۶	جواہرات کا خزانہ	۳/۷
۶۷	چھوٹا اور سونا چڑا (باتصویر)	۲/
۶۸	علی بابا چالیس چور	۲/
۶۹	علاؤ الدین و عجیب و غریب لیمپ	۳/۳ پائی
۷۰	ملا دو پیازے کا سفر	۳/
۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم کشتان	۳/
۷۲	نیشاپور کا سوداگر	۲/۱۱
۷۳	پرستان کا موچی	۳/
۷۴	سندر پیاری	۳/
۷۵	چاندی کی کنجی	۳/
۷۶	سلک جواہر نمبر۱ (حکمرانی کا گُر)	۲/۶
۷۷	″ ″ نمبر۲ (اوج دلپستی)	۱/۶
۷۸	″ ″ نمبر۳ (شہید الفت)	۱/۶
۷۹	سلک جواہر۔ مرد میدان	۱/۶
۸۰	″ ″ نیک و بد	۱/۹
۸۱	″ ″ عیب و ہنر	۱/۴
۸۲	″ ″ جہاں گرد	۱/۶
۸۳	″ ″ جواب باصواب	۱/۱۰
۸۴	″ ″ سخاوت کی انتہا	۱/۲
۸۵	″ حسن تدبیر	۱/۶
۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہرت	۱/۳
۸۷	ڈرامہ غم خوار عالم . . .	۱/۷
۸۸	مہاراجہ بکرماجیت اور اس کا تخت	۱/۶

پنجاب کی تعلیمی خبریں

الوداعی سپاسنامہ پروفیسر جی۔سی چیٹر جی صاحب کو گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبہ نے، ان کے تبادلہ بحیثیت پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور پر ایک الوداعی ایڈریس پیش کیا۔ جس میں صاحب موصوف کی گورنمنٹ کالج میں اٹھارہ سالہ ملازمت اور اعلیٰ خدمات کو سراہا گیا۔ اس تمام عرصے میں آپ نے اپنی حسن کارکردگی سے گورنمنٹ کالج کے تعلیمی، سوشل اور جسمانی پہلوؤں اور دوسرے شعبوں کو ترقی دی۔ بالخصوص وہاں کی طالبات کی بہبودی کا لحاظ رکھا جن کے آپ ٹیوٹر بھی تھے۔ صاحب موصوف نے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ میں کالج میں دو چیزیں اپنے فرائض کی یادگار کے طور پر چھوڑے جاتا ہوں۔ اول شعبہ فلسفہ کا احیاء اور دوسرے تجرباتی نفسیات کے سلسلے میں اس مضمون کا دارالتجربہ جو پنجاب ہی نہیں، بلکہ شمالی ہند میں ایک جدید چیز ہے۔ آپ نے فلسفہ کے مطالعہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہٹلر نے اپنے ملک کے نامور فلاسفہ مثلاً کانٹ اور ہیگل کی تعلیم کو حاصل کیا ہوتا، تو آج اُس نے ابتدائی وحشیانہ اور فرسودہ عقائد کی پیروی نہ کی ہوتی اور اُسے معلوم ہوتا کہ اخلاق کی بنیاد ہمیشہ عالمگیر رواداری پر ہوتی ہے، نہ کہ محض قومی نام آوری اور ذاتی اعزاز پر۔ خاتمے پر آپ نے پرنسپل ڈنی کلف صاحب کی کارکردگی پر تحسین و آفرین کی، جو حال ہی میں گورنمنٹ کالج کو خیرباد کہہ کر حکومتِ ہند کے ریسرچ کیمسٹ مقرر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر ڈنی کلف صاحب نے اپنے دورانِ قیام میں کالج کے طلبہ کے لیے نئی روایات اور نیا معیار قائم کرکے ان کی زندگی میں نئی آزادی کی رُوح پھونکی ہے۔ جو اُن کے جانشینوں کے حق میں مفید اور قابلِ قدر ہے۔

آنریبل وزیرِ تعلیم کا گجرات میں ورودِ مسعود

۱۴ اکتوبر کی تاریخ گجرات کے سرکاری نارمل اسکول کی تاریخ میں قابلِ یادگار رہیگی جب کہ آنریبل وزیرِ تعلیم نے مدرسہ ہذا کا معائنہ فرمایا۔ گجرات کو تشریف لے جاتے ہُوئے، جبکہ ڈپٹی کمشنر صاحب، انسپکٹر صاحب مدارس راولپنڈی، اَور انسپکٹر صاحب ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ آنریبل میاں صاحب موضع کالرہ اَور موضع غازی چک کے مدارس بالغاں کے معائنے کے لیے ٹھیرے۔ ٹھیک دس بجے آنریبل وزیر صاحب موصوف کی موٹر نارمل اسکول کے احاطے میں آکر ٹھیری اَور اسکول کے ہیڈ ماسٹر پیرولایت شاہ صاحب نے آپ کا استقبال کیا۔ اسکول کے اسکاوٹ اعزازی دستہ بنا کر آپ کے حضور میں پیش ہُوئے۔ ۲۵ مدرسہ ہائے بالغان کے طلبہ، جن کی تعداد سَو کے قریب تھی، اپنے اسباق پڑھنے میں مصروف پائے گئے۔ ڈرائیوروں کے اسکولوں نے سپاسنامہ پڑھا۔ جس میں بتایا گیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے اردگرد علم کی روشنی پھیلانے کا فرض ادا کیا ہے اَور اس مفید تحریک، یعنی تعلیمِ بالغاں پر جس کے بانی حضور وزیرِ تعلیم ہیں، ان کا شکریہ ادا کیا گیا۔ ایک اَور بالغ طالب علم نے، جو سبزی منڈی کا چودھری ہے، مہمانِ معزز و محترم کی خدمت میں تازہ تازہ سبزیوں کا ایک ٹوکرا پیش کیا۔ اس کے بعد صوبیدار شیر عالم صاحب ساکن کھیپر والہ نے نارمل اسکول کی کوششوں پر قدردانی کا اظہار کیا اَور دیہاتی آبادی کی طرف سے آنریبل وزیر صاحب سے درخواست کی کہ وہ ان کا پیغامِ وفاداری حکام تک پہنچا دیں۔ آنریبل موصوف نے اس خطبے کے جواب میں اسکول ہٰذا کی لگاتار علمی کوشش کو قدر کی نظر سے دیکھا اَور فرمایا کہ ہماری تعلیمی حکومت کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ملک سے جہالت اَور بے علمی کو دُور کیا جائے اَور درحالیکہ دوسرے صوبوں میں خواندگی کی تحریک کی علم برداری فقط سِن رشد کے طلبہ تک ہی محدود ہے۔ ہم اس تحریک کو ہر عمر کے انسان کے لیے جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس قدر ارشاد فرمانے کے بعد آپ نے بالغان

کو اپنا اپنا سبق سنانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد آپ نے اسکول کے مختلف کمروں کی گشت لگائی جہاں تازہ طریقوں، مثلاً منصوبی طریق و کھیل اور کہانی کے طریق کے مطابق اسباق پڑھائے جا رہے تھے۔ تعلیمی نمائش اس تمام پروگرام کا ایک خاص جزو تھی۔ جس کے دوران میں اسکول کے طلبہ لوگوں کو کاپی نویسی، تیل اور صابون سازی، نواڑ بننا اور سائن بورڈ لکھنا سکھا رہے تھے۔ فزیکل ٹریننگ، فسٹ ایڈ کا سبق اور کتب خانے کا معائنہ فرما لینے کے بعد مہمانِ محترم نہایت محظوظ ہو کر رخصت ہوئے۔

سانگلہ میں تعلیم بالغان کے مرکز کا افتتاح

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ریلوے اسٹیشن سانگلہ پر بالغان کی خواندگی کے مرکز کی رسمِ افتتاح ادا کی گئی۔ شیخ سخاوت حسین صاحب اسٹیشن ماسٹر نے اس موقع پر جلسے کی صدارت کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مع تمام اسٹاف موجود تھے۔ ریلوے کے تیس ملازمین جماعت میں داخل ہونے کے لیے آئے۔ لالہ ہری چند رئیس سانگلہ نے ازراہِ کرم مٹھائی تقسیم کی اور گورنمنٹ اسکول کی طرف سے طلبہ کو قاعدے اور تختیاں مفت تقسیم کی گئیں۔ گورنمنٹ اسکول کے مدرس انچارج تعلیم بالغاں، ہیڈ ماسٹر صاحب اور سیکنڈ ماسٹر صاحب نے مختصر تقریریں کیں اور بالغوں کو ترغیب دی کہ وہ علم حاصل کرنے میں پیچھے نہ ہٹیں اور پڑھ کر علم کی روشنی دوسروں تک پہنچائیں تاکہ آنریبل وزیرِ تعلیم پنجاب کے اِس شریفانہ مشن کو تقویت پہنچے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے شیخ سخاوت حسین کے دلی اشتراکِ عمل اور دلچسپی کا شکریہ ادا کیا۔ ساتھ ہی لالہ ہری چند کی سخاوت کی تعریف کی اور بالغان کو تاکید کی کہ وہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھائیں۔

چھپڑ کا میلہ

اس سال ۱۶ / ۲۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کی تاریخوں میں ضلع لدھیانہ کا سب سے بڑا دیہاتی میلہ منعقد ہوا۔ اس میں دو لاکھ سے زیادہ لوگ شامل ہوئے اور اس طرح فیض رسانی

محکموں کو دیہات سدھار کے کام کا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا۔ میلے میں محکمۂ تعلیم، محکمۂ صحت عامہ، محکمۂ زراعت، محکمۂ انجمن ہائے امدادِ باہمی اور محکمۂ بیطاری سبھی نے لوگوں کی تعلیم کی غرض سے اپنی اپنی دُکانیں کھولی تھیں۔ ان سب میں ضلع کے تعلیمی محکمے کا کام خاص طور پر نمایاں رہا۔ اس محکمے نے دیہاتی کھیلوں، سکاؤٹوں کی خدمات، ایک تعلیمی نمائش، دیہات سدھار کا پروپیگنڈا، ڈرامے وغیرہ کا انتظام کیا تھا۔ تعلیمی کیمپ ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ ایک ورنیکلر مڈل اسکول کے معلمین نے ایک خاص دکان اس غرض سے کھولی تھی کہ وُہ پندرہ منٹ کے اندر ایک اَن پڑھ آدمی کو اپنا نام لکھنا سکھا دیتے تھے۔

میلے کا ایک امتیازی پہلو یہ تھا کہ اس میں ۲۸ر تاریخ کو حضور وزیر صاحبان محکمہ تعلیم اور ڈیولپمنٹ بھی شامل تھے۔ آنریبل وزرا صاحبان نے پندرہ ہزار کے مجمعے کو موجودہ گورنمنٹ کی فیض رساں تدابیر سے آگاہ کیا۔ آنریبل وزیر تعلیم نے حاضرین سے بے علمی کو دُور کرنے کے متعلق پر زور اپیل کی۔ اس تقریر کو حاضرین نے محویت کے عالم میں سُنا اور اس کا مجمعے پر نہایت اچھا اثر ہُوا۔ چار سو کے قریب بالغ طلبہ بھی موجود تھے۔ آنریبل میاں صاحب ستر بالغ طلبہ کو جنھوں نے اپنا کورس ختم کر لیا تھا، خواندگی کے سرٹیفکیٹ عطا فرمائے۔ اس میلے میں جناب انسپکٹر ورنیکلر تعلیم بھی تشریف فرما ہوئے۔

نارمل اسکول گجرات ۹ر اکتوبر کو گورنمنٹ نارمل اسکول گجرات میں خاں صاحب چودھری بشیر احمد خاں ایم آر اے ایس (لنڈن) ناظم انڈین ریڈ کراس سوسائٹی پنجاب نے طلبائے مدرسہ کے سامنے تقریر کی اور اپنی تقریر میں ریڈ کراس سوسائٹی کی تاریخ اور کارناموں کا ذکر کیا اور اس حقیقت کو خاص طور پر واضح کیا کہ سات ایمبولینس کے دستے جو اسکول نے قائم کیے ہیں، ایک بہت بڑا کارنامہ ہے، جس پر مدرسے کو ناز کرنا چاہیے۔ آپ نے بتایا کہ یہ

تحریک صرف لڑائی میں ہی مدد دینے کی غرض سے جاری نہیں کی گئی، بلکہ اس علاقے میں بنی نوع انسان کی حفاظت اور بہبودی کے لیے بھی ضروری ہے۔ آپ نے عملی طور پر اپنی قدردانی کا اظہار کیا، یعنی ریڈ کراس کے ضروری لٹریچر اور سٹریچر (چارپائی) مفت اِن دستوں کو عطا کیے اور یہ بھی فرمایا کہ میں نے جتنے نارمل اسکول دیکھے ہیں، اِن سب میں گجرات کے پیوپل ٹیچر سب سے زیادہ صاف ستھرے، چست اور باسلیقہ ہیں۔

خاتمے پر خان بہادر چودھری میراں بخش پی سی ایس نے ایک مؤثر تقریر کی۔

کیتھل میں ناخواندگی کے خلاف پرزور کوشش

گورنمنٹ اسکول کیتھل میں تعلیم بالغاں کی کمیٹی اس تعلیم کے متعلق پر عملی کارروائی کر رہی ہے۔ ۳ اکتوبر ۳۹ء کو مسٹر فاروقی بی آنرز، لنڈن، ہیڈ ماسٹر کیتھل اسکول کے زیرِ صدارت ایک اجلاس ہوا جس میں یکم نومبر ۳۹ء سے مدرسہ شبینہ برائے بالغان جاری کرنے کا فیصلہ ہوا ہے۔ ہیڈ ماسٹر اور چار اساتذہ نے اپنی خدمات پیش کیں۔ چودھری محمد صدیق صاحب ناظم نے ذمہ لیا کہ وہ بیس بالغوں کو پڑھائی شروع کرا دینگے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ہر اُستاد چند طالب علم رضاکاروں کی مدد سے نائٹ اسکول میں باری باری ایک ہفتے تک کام کریں گے۔ پنڈت ستھانو دت سنسکرت ٹیچر نے کسی ایک بھرے مندر میں مدرسہ بالغاں جاری کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں، جیسا کہ ناظم صاحب نے مسجدوں میں یہی کام جاری کرنے کا ذمہ لیا ہے۔ پنڈت جی نے کام شروع بھی کر دیا ہے اور پبلک کی طرف سے اس کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ مقامی مڈل اسکول برائے طالبات کی اوّل معلمہ سے درخواست کی گئی کہ وہ بھی اس کام میں مدد دیں اور مستورات کے مدرسہ شبینہ میں اپنے اسکول کی دس لڑکیاں بھیجیں۔ تیس بالغ عورتیں لکھنے پڑھنے کے لیے رضامند پائی گئیں اور یہ تحریک کے حق میں ایک اچھا شگون ہے۔ گویا اس موسم سرما میں بالغان کے لیے

وہاں ایک وقیا مندرجاری ہوگیا ہے اور دو مدارس شبینہ ایک زنانہ دوسرا مردانہ
گورنمنٹ اسکول کے ۴۰ طلبہ نے بہت سے بالغان کو پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ اس
نیک کام کے لیے کمیٹی کے تمام ممبران مسٹر فاروقی ہیڈ ماسٹر کے ممنونِ احسان ہیں، جن کی
سرگرمی اور قابلیت کے سبب سے تمام اسٹاف اور ملت اس شریفانہ فرض کے ادا کرنے
میں تن دہی کے ساتھ مصروفِ کار ہے۔

مجلس ترقی جغرافیہ سیر و سیاحت عجائب و نوادر کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ممبران سوسائٹی
نے پروفیسر محمد ناظر صاحب و پروفیسر محمد منیر صاحب کی ہمراہی میں ۲۰ نومبر ۳۹ء کو پریت نگر کی سیر
کی عشقیہ قصوں اور کہانیوں میں تخئیلی پریت نگر کے نام سے دلچسپ اور لطیف اخبارات کے منسوب
ہونے کی وجہ سے سبھی کے دل رومانی آشاؤں سے اچھلے پڑتے تھے اور معجزہ یہ کہ انھوں نے
اپنی تخئیل کی بستی کو بہت حد تک عملی اور حقیقی رنگ میں دیکھا۔ پریت نگر کے باسیوں نے مہمانانِ
عزیز کا شگفتہ روئی اور خلوص سے خیر مقدم کیا۔ بستی کے کامن روم میں جناب سردار گربخش سنگھ
جی بی ایس سی ای (امریکہ) بانی و روحِ رواں پریت نگر نے اپنی بستی کے اغراض و مقاصد پر
روشنی ڈالی۔ سردار صاحب موصوف نے چند جدید خیال انقلاب پسندوں کی ایک جماعت
بنائی ہے، جس کا نام سنسار پریت منڈل رکھا ہے۔ وسط پنجاب میں امرتسر سے سولہ میل
شمال کی جانب قصبہ لوپوکے کے نزدیک پریت نگر کی بستی اس کا مرکز ہے۔ پریت نگر اس ویران
بیابان میں کسی طرح بھی فردوسِ نگاہ سے کم نہیں۔ اور اگر دو صدی پہلے کا کوئی راہ گزار آج بھی
اس بھیانک راستے سے وہاں پہنچے، تو حاتم کی طرح اس بستی کو کسی پری، اور اس کی سہیلیوں کی
قیام گاہ سمجھ کر ٹھٹھک کر رہ جائے۔ رہائشی بنگلے جو سب اطراف سے سرسبز اشجار اور گھاس کے
قطعات سے گھرے ہوئے ہیں اور جدید فنِ تعمیر کا نمونہ ہیں۔ ایک خوبصورت خواب کی عملی تصویر

پیش کرتے ہیں۔

سنسار پریت منڈل کا مقصد تنگ ولانہ فرقہ داری اور انفرادیت کو دُور کرکے انسان اُور انسانی سوسائٹی کی عالمگیر برادری کا خلعتِ زیبا پہنانا ہے۔ انسان کی ذات سے وفاداری اس سوسائٹی کا فرض اوّلیں ہے۔ عوام میں ہر فرقہ کے لیے رواداری کا جذبہ پیدا کرنا اُور بین الاقوامی اجتماعیت کے مسئلہ کی نشر و اشاعت اس کے خاص مقاصد ہیں۔ "مساوات، انصاف و پریت" ارکانِ جماعت کا مقولہ ہے۔

اپنے خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے یہ جماعت ایک ماہواری اخبار "پریت لڑی" اُردو، ہندی اور پنجابی زبان میں۔ ایک ہفتہ وار "پریت سینک" پنجابی زبان میں شائع کرتی ہے۔ دو صد ایکڑ زمین زراعتی فارم اُور ڈیری، آٹا پیسنے اُور دھان کوٹنے کی مشینیں، پریس اُور ٹیوب ویل و رہائشی بنگلے جماعت کی قابلِ ذکر ملک ہیں۔

پریت نگر کے پریت پاٹھکوں کی آزاد اور پُر رشک دنیا میں چند ٹھنڈے سانس لیکر الوداعی چائے پینے کے بعد جغرافیے کے پرچی واپس عازم لاہور ہُوئے۔

اشتہار

دیہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لئے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس کا مضمون حال ہی میں ورنیکلر فائنل کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لیے مخصوص ہوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر کوئی جامع کتاب نہ تھی۔ طلبہ کی اس وقت کا احساس کرتے ہوئے زرِ کثیر صرف کر کے مجوزہ اسکیم کے عین مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ بہ سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب، برائے جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے۔ جس کی عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ اور ہر امر کو روزمرہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ تصاویر سے واضح کیا گیا ہے اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے۔ سلسلہ ہذا طلبہ کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔ اس کے مطالعے سے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان و دیگر سائنس کے مدرسین اصحاب اپنے مدارس میں جاری کرا کے جہاں ہمیں ممنون و مشکور فرمائیں گے، وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبودی میں بھی خوشی محسوس کریں گے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت ۵ آنے ۴ پائی
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	〃 ۵ 〃 ۲ 〃
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	〃 ۷ 〃 ۱۰ 〃
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	〃 ۱۴ 〃 ۲ 〃

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

اشتہار

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
[illegible]	نورالدین جہانگیر ...	۲/۳ پائی
۴۱	امیر تیمور	۲/۷ ″
۴۲	پرتھوی راج	۲/۷ ″
۴۳	محمودِ غزنوی	۲/۶ ″
۴۴	مصر کی داستان	۴/
۴۵	جاپان کی کہانی	۳/۶ پائی
۴۶	چین کی کہانی	۳/۶ ″
۴۷	مستورات چین و جاپان ...	۴/
۴۸	ایران کی کہانی	۳/۶ ″
۴۹	ایشیائی رُوم	۲/۷ ″
۵۰	ٹرکی (یورپی رُوم)	۲/۷ ″
۵۱	لنکا	۱/۱۱ ″
۵۲	بصرہ و بغداد	۵/
۵۳	یونان	۲/
۵۴	تین سوال	۲/۷ ″
۵۵	امرت ورشا	۳/۱۰ ″
۵۶	زمانہ سلف کے قصّے کہانیاں نمبر ا داؤد بادشاہ	۳/۹ ″
۵۷	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اوّل	۳/۹
۵۸	″ ″ ″ دوم	۴/۵ ″
۵۹	خوفناک خواب	۲/
۶۰	ہیرالال	۲/۶ ″
۶۱	دولت کی پٹاری	۲/۱ ″
۶۲	سادھو کی چکی	۲/
۶۳	نیلا باز	۲/۱۱ ″
۶۴	بہادر شہزادہ	۲/۱ ″
۶۵	جوتی موتی	۲/۱۰ ″

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۶۶	جواہرات کا خزانہ ...	۳/۷ پائی
۶۷	چھوا اور سونا ہُوا ... (باتصویر)	۲/
۶۸	علی بابا چالیس چور	۴/
	علاؤالدین و عجیب و غریب لیمپ ..	۴/۲ پائی
۷۰	ملاّ دوپیازے کا سفر	۳/
۷۱	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳/
۷۲	نیشاپور کا سوداگر	۲/۱۱ پائی
۷۳	پرستان کا موچی	۳/
۷۴	سندر پیاری	۳/
۷۵	چاندی کی کنجی	۳/
۷۶	سلک جواہر نمبر ا (حکمرانی کاگُر)	۲/۶ ″
۷۷	″ ″ نمبر ۲ (اوج و پستی)	۱/۶ ″
۷۸	″ ″ نمبر ۳ (شہیدِ الفت)	۱/۶ ″
۷۹	سلکِ جواہر۔ مردِ میدان	۱/۶ ″
۸۰	″ ″ نیک و بد	۱/۹ ″
۸۱	″ ″ عیب و ہنر	۱/۴ ″
۸۲	″ ″ جہاں گرد	۱/۶ ″
۸۳	″ ″ جواب باصواب	۱/۱۰ ″
۸۴	″ ″ سخاوت کی انتہا	۱/۲ ″
۸۵	″ ″ حُسنِ تدبیر	۱/۶ ″
۸۶	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہرت ..	۱/۳ ″
۸۷	ڈرامہ غم خوار عالم	۱/۷ ″
۸۸	مہاراجہ بکرماجیت اور اُس کا تخت ..	۱/۶ ″

کتب خانہ جامعہ ملیہ دہلی
DELHI.

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

نمبر (۱۱)	فروری سنہ ۱۹۴۰ء	جلد (۶)

فہرستِ مضامین

۱	اداریہ		۱
۲	جدید تعلیم کا فلسفہ	خواجہ ڈاکٹر الیف ایم شجاع، منتعی	۵
۳	مہاتما گاندھی کا تعلیمی نظریہ	پنڈت وشستہ پرشاد فدا، بی اے	۱۸
۴	تعلیم بالغاں اور زبانِ اُردو	محمد عبد اللہ کامل، ایم اے	۲۳
۵	ہمارے امتحان	این سکندر خاں	۳۰
۶	ہکلاپن	مسٹر آر، اے گوسائیں بی اے	۴۴
۷	پنجاب کی تعلیمی خبریں		۵۲

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DEL

اداریہ

دسمبر ۱۹۳۹ء میں سر رادھا کرشنا کے زیرِ صدارت، آل انڈیا تعلیمی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے اجلاس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ مدت سے تعلیم کا نصب العین یہ رہا ہے کہ انسان کی اصلاح انفرادی حیثیت سے کی جائے لیکن فی زمانہ کسی فرد کو سماج سے علیحدہ کر کے اس کی یکتائی پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ فرد سماج ہی کا جزو ہے اگر کوئی فرد بشر مہذب اور تعلیم یافتہ ہو جائے۔ تو اُس کی ہستی ان تمام انسانی گروہوں میں جو تعلیم کی روشنی سے محروم ہوں، گم ہو جائیگی۔

ایک اور پتے کی بات پنڈت جی نے یہ کہی کہ افراد کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ وہ ایسے ماحول میں رہیں، جو ہر وقت اُنھیں تنزل کی طرف لے جائے۔ ہمارا ماحول پست خیالات، تعصبات اور توہمات سے بھرا ہوا ہے۔ اس لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اس ماحول کو تبدیل کیا جائے تاکہ ہم افراد کو ایک ایسی سماج کے سانچے میں ڈھال دیں۔ جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ یہ حالت افسوسناک ہے کہ آج ہمارا سماجی نظام بوسیدہ ہو چکا ہے۔ اُس کے بجائے ہمیں ایک نئی سماج درکار ہے جس میں چند افراد ہی کی بہتری نہیں، بلکہ مشترکہ انسانی بہبودی کو مدِ نظر رکھا جائے۔ ہمیں ایسی سماج تیار کرنا چاہیے جس میں رہ کر افراد ایک دوسرے کے ساتھ اشتراکِ عمل کریں اور انسانی ترقی کی غرض سے مختلف قومیں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

یہ سوشل نصب العین واقعی بہت بلند ہے۔ لیکن اگر تمام سماج کی حالت گری ہوئی ہو، تو اُس کی صلاح افراد کی درستی کے بغیر کیونکر ممکن ہے؟ سماج کی ترکیب افراد ہی سے ہوتی ہے۔ انسانی ترقی اور

سدھار کی گذشتہ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ ہر قوم میں پہلے چند نفوس ایسے پیدا ہوتے ہیں جو دوسروں کو سدھار کر راہ راست پر لاتے ہیں۔ تہذیب کے یہی علمبردار اپنے ابنائے جنس کے لیے مشعلِ ہدایت بن جاتے ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ سماج کو سدھارنے کا کام ایک دن کا نہیں۔ ایک سال کا نہیں۔ اس میں برسوں بلکہ صدیاں صرف ہو چکی ہیں اور ہونگی۔ باقی رہا تعلیم کے لیے ماحول پیدا کرنا۔ اس کے لئے بھی مدت درکار ہے۔ سردست ہندوستان کے موجودہ ماحول کو تبدیل کرنے سے پنڈت جی کی مراد، اس کا اقتصادی ماحول بدل ڈالنے سے ہے۔ چنانچہ اپنی تقریر میں اُنھوں نے آگے چل کر بتایا کہ ہندوستان جیسے غریب ملک کی تعلیم کے لیے وار دھا کی بنیادی تعلیم نہایت مفید ہے۔ اس لیے کہ ملک کے لاکھوں آدمی بھوکے اور بیروزگار ہیں۔ ان کے دل بجھے ہوئے ہیں اور مایوسی ان کے چہروں سے عیاں ہے۔ وہی سکیم ان کے حق میں مفید ہو سکتی ہے، جو اُنھیں روزی کے قابل بنائے۔

ایسے حالات سے ظاہر ہے کہ ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم ملک کے لئے مہنگا ثابت ہو رہا ہے۔ اگر وار دھا سکیم کو نہ بھی اختیار کیا جائے، تو بھی ہمیں کسی ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت ہے، جس کے لئے شہری آبادی سے قطع نظر ہم دیہاتی لوگوں میں تعلیم کو عام کر دیں اور اُسے سستے داموں پھیلا سکیں۔ ملک کے بعض صوبوں میں اس طریق کے مطابق کام کی ابتدا آزمائشی طور پر ہو چکی ہے۔ اگر ہمارے صوبے میں آنریبل وزیرِ تعلیم پنجاب کی جاری کی ہوئی تعلیم بالغاں کم و بیش اسی اصول کے مطابق چلائی جائے، تو اس سے نہ فقط اقتصادی مشکل کسی حد تک حل ہو سکیگی۔ بلکہ عوام کو تعلیم کے ساتھ زیادہ دلچسپی پیدا ہو جائیگی۔ اگر دیہات کے لوگوں کو محض لکھنا پڑھنا سکھانے کے بجائے کسی دستکاری سے بھی روشناس کرا دیا جائے یا اسی کو ایک مرکز قرار دے کر لکھائی پڑھائی کرائی جائے، تو یہ شکایت نہ رہیگی کہ جاہل لوگ لکھنے پڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مسیحی مشنریوں کی مثال قابلِ تقلید ہے۔ یہ لوگ لگاتار کوشش سے کامیابی کے ساتھ مصروفِ کار ہیں۔ مثال کے طور پر علاقہ بمبئی میں پونہ کے قریب مسیحی انجمنیں ایک عرصے سے

کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر صنعتی اصول پر کاربند ہیں اور دستکاری کے ذریعے اپنے اسکول وغیرہ چلا رہی ہیں۔ پنجاب میں کلارک آباد، مارٹن پور، امد ینگ سن آباد اور موگہ میں کم و بیش ایسے ہی سلسلے جاری ہیں۔ پونہ (اعلاقہ بمبئی) سے تین میل پر کیٹر گاؤں میں ایک مسیحی صنعتی مرکز قائم تھا۔ یہاں ایک مشنری مدرسہ اسی مرکز کی آمدنی کے بل پر چلتا رہا اور غالباً اب بھی چل رہا ہے۔ وہاں مسز راما بائی پنڈتانی کے ماتحت امریکہ کی مشنری عورتیں کام کرتی تھیں۔ مسز راما بائی عیسائی ہو چکی تھیں۔ انھیں مرے ہوئے پچیس سال کے قریب ہو چکے۔ ان کے ماتحت امریکن عورتوں نے مکتی فوج والوں کی طرح ہندوستانی لباس اور خوراک اختیار کر لی تھی۔ بمبئی کی عام خوراک میں اُبلے چاول اور تیل والی سبزیاں بکثرت شامل ہیں۔ ان چیزوں کی غذائیت کا درجہ، مغربی خوراک سے کہیں کم ہے۔ لیکن مذہبی حرارت کے اثر سے، یہ لوگ ہر قسم کا ایثار کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ جب ان عورتوں سے پوچھا گیا کہ آپ کیا تنخواہ لیتی ہیں، تو اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمیں صرف روٹی کپڑا اور رہائش کے لیے مکان ملتا ہے، ماہانہ تنخواہ نہیں ملتی۔ اگر صنعتی مرکز کی مصنوعات کی فروخت سے کچھ روپیہ بچ جائے، تو اُسے ہم سب کام کرنے والیوں میں یکساں بانٹ دیا جاتا ہے اور فی کس اوسط حصہ چالیس پچاس روپے سالانہ سے متجاوز نہیں ہوتا۔

پادری ہائنرک نے ۱۶؍جنوری ۱۹۳۸ء کو سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ایک لیکچر دیتے ہوئے ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں کے زنانہ اسکول کی عیسائی معلمہ کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ یہ جوان معلمہ اپنے خاوند سمیت اس گاؤں میں شادی کراتے ہی تعلیم دینے کی غرض سے چلی گئی۔ وہ شہری زندگی بسر کرنے کی عادی تھی۔ اس لیے دیہاتی فضا میں بود و باش اس کے لیے قدرے مشکل تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ گاؤں کے لوگ متعصب اور عیسائیت کے دشمن تھے اور علم کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ ایک بنجر اور شور زمین میں علم کا بیج بونا آسان کام نہ تھا۔ لیکن معلمہ نے ہمت نہ ہاری۔ گاؤں والوں کو بے رُخ دیکھ کر اُس نے اپنے تیار کیے ہوئے، درزیوں اور سلائی کے کام کے نمونے نکال کر نمائش کے طور پر

فرش پر پھیلائے اور خود سلائی میں مصروف ہو گئی۔

چند دنوں تک گاؤں کی عورتیں تماشا دیکھتی رہیں اور معلمہ کا گھر اچھی خاصی زیارت گاہ بن گیا رفتہ رفتہ بہت سی عورتیں موزہ بافی اور سلائی سیکھنے لگیں۔ اسی کے ساتھ معلمہ نے گاؤں کی لڑکیوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اسے تنخواہ کے سوا کسی قسم کی مالی امداد نہیں دی گئی۔ اب اس گاؤں میں ساٹھ لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ محکمہ تعلیم نے اس مدرسے کو مسلمہ قرار دے دیا ہے اور اب وہاں ایک نائب اُستانی کی ضرورت ہے۔

کیا یہ واقعات ہمارے نوجوان شہری معلّمین کے لیے بصیرت افروز نہیں؟ آج ہمارے ہاں بہت کم ایسے مدرسین ملیں گے، جو اس بات پر آمادہ ہوں کہ شہری دلچسپیوں سے روگردانی کر کے اپنے دیہاتی بھائیوں کی خاطر اس قسم کی روح اپنے اندر پیدا کریں اور اپنی زندگی کو تعلیم جیسے بلند مقصد کے لیے وقف کر دیں کہ ان کا نصب العین اپنے ارد گرد روشنی پھیلانا، گرے ہوئے انسانوں کو اُبھارنا اور اُن کی زندگی میں مسرت اور راحت پیدا کرنا ہو۔ ایسے طریقِ عمل سے ہم اپنی ان پڑھ، جاہل اور متعصب سماج کی حالت کو بدل سکتے ہیں۔ جس کی طرف پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مدرسین کا طبقہ اپنے طریقِ کار کو نئے سرے سے سمجھنے کی کوشش کرے اور ایثار کے ذریعے مشنری روح پیدا کرے۔ تاکہ ان کی کارکردگی سے مایوس چہرے شگفتہ ہو جائیں۔ بھوکے اور بے روزگار لوگ روزی پیدا کرنے کے قابل اور بجھے ہوئے دل شاداب ہو جائیں۔

جدید تعلیم کا فلسفہ

از
خواجہ ڈاکٹر ایف ایم شجاع، منعمی، ایم اے
ایم ایس سی، ایم ایچ ایس ایس (امریکہ)، پی ایچ ڈی
ایم آر ایس ایل (لنڈن)
پروفیسر ایس ای کالج، بہاولپور

گزشتہ جنگِ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) کا اختتام ہماری دنیا کی ذہنی ترقی کی تاریخ میں ہمیشہ ایک نئے باب کا آغاز مانا جائے گا۔ اس جنگ نے ہمارے جنگ کے معیار کو بدل دیا۔ لڑائی کے سازوسامان اور طریقوں میں تبدیلی پیدا کر دی۔ اس کا نتیجہ ہم آج کی جنگ میں دیکھ رہے ہیں۔ فریقین آمنے سامنے مقابل پڑے ہوئے ہیں۔ مگر آگے بڑھنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی۔ یہ مانا کہ تباہ و برباد کرنے کے آلات اور حملہ کرنے کے ہتھیار بہت ترقی یافتہ اور پیچیدہ ہو چکے ہیں۔ مگر مدافعت اور بچاؤ کرنے کے لیے بھی ایسے طریقے ایجاد کر لیے گئے ہیں کہ حملہ کرنا گویا موت کے منہ میں جانا ہے۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ جدید لڑائی گھڑی دو گھڑی کی موج نہیں۔ یہ حسن اور عشق کا بندھن ہے جو نہیں معلوم کب ٹوٹے یا اس سے کب جان چھوٹے۔

اس غیر معمولی فضا میں قوم کی قوتوں پر شدید بار پڑتا ہے۔ ہر قوت کش مکش میں حصہ لیتی ہے۔ علمی، عملی، اندرونی، ظاہری، اقتصادی، انتظامی وغیرہ اور اُسے اپنے انتہائے اعلیٰ پر کام کرنا پڑتا ہے۔

تاکہ قوم کو جنگ میں جیت ہو۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ کوئی نکتہ اپنے فرائض سرانجام دینے میں اپنے بہترین وظائف سے فراہمی کم نہ نہ جائے۔ قوم کے شیدائی یہی کر کے دکھاتے ہیں۔ مثلاً توپ کے گولے بنانے کی ایک مشین ہے۔ اس پر پانچ آدمی کام کرتے ہیں۔ مشین بنانے والے سائنس دان نے اس چال پر بنائی ہے کہ دن بھر میں وہ چھ گولے تیار کر سکے۔ مگر وہ پانچ آدمی جو زور اور محنت سے کام کرتے ہیں، مقررہ وقت کے علاوہ بھی کام کرتے ہیں اور دن بھر میں چھ کے بجائے آٹھ یا دس گولے تیار کر لیتے ہیں۔ یہ فعل اُن کی حسن کارگزاری کی فہرست میں لکھا جاتا ہے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ اس کا اثر کام کرنے والوں پر کیا پڑتا ہے؟ اعضا کمزور ہو جاتے ہیں۔ دل و دماغ میں وہ جسارت اور ندرت نہیں رہتی۔ اندازے سے زیادہ کام کرنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ آرام کم اور کام زیادہ۔ تو قوم کے نگہبان اور اس کارخانے کے قافلہ سالار ان مزدوروں کو چند روز کی چھٹی دے دیتے ہیں، تاکہ وہ اپنے دل و دماغ کو تازہ کر آئیں۔ باہر کہیں سیر و سیاحت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ گزشتہ جنگِ عظیم نے ہماری ذہنی تربیت اور علمی تعلیم کے معیار میں کیا تبدیلی پیدا کر دی تھی؟ اس نے ثابت کیا تھا کہ جنگ یعنی انسان کا انسان کو تباہ و برباد کرنا، جس میں کبھی صرف حیوانی قوتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ اب اس کے لیے بھی عقل اور علم کی ضرورت ہے۔ جنگ اب تلوار چلانے، لاٹھیاں مارنے یا بارود کی سرنگیں اُڑانے کا نام نہیں۔ موجودہ جنگ کیا ہے؟ بڑی خوفناک چیز۔ اس کے تصور سے خیال منتشر ہو جاتا ہے۔ اس قدر کہ اسے سوچنا نہیں چاہتا۔ بڑی بڑی مہیب توپیں سترہ انچ دہانے سے زائد، جو چالیس پچاس میل تک مار کریں۔ ہوائی جہاز، سرنگیں، گیس اور کیا کیا بلائیں، جن کے ناموں سے آپ کچھ نہ کچھ آشنا ہیں۔

مگر یہ آفت یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ آج کل کے تمام امیر ممالک کی دولت کارخانوں میں پیدا ہوتی ہے۔ یعنی مشینیں مختلف ساخت کا مال بنا کر دساور کو بھیجتی ہیں اور اس کے عوض روپے کے

دیہاتوں کی طرف بہتے چلے آتے ہیں۔ تمام زراعتی ممالک غریب اور پست حالت میں ہیں۔ جب جنگ شروع ہوتی ہے، تو یہ کارخانے سامانِ حرب بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دولت کا دریا بہتا ہوا رک جاتا ہے اور اقتصادی نظام بگڑ جاتا ہے۔ غالباً دنیا کا کوئی ملک بھی ایسا نہیں جس کے اندر اس کی ضروریات کی تمام چیزیں میسر آسکیں۔ انھیں باہر سے تجارتی مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ کارخانوں کے لیے کچا مال، کھانے پینے کی چیزیں، پہننے کے لیے سامان، یہ کام تجارتی جہاز کرتے ہیں۔ جنگ کی وجہ سے کچھ جہاز تو جنگی سامان لانے لیجانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کچھ سمندر کی تجارتی شاہراہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ یہ نظام بھی بگڑ گیا اور اقتصادی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔

سماجی نظام پر بھی اثر پڑتا ہے۔ پختہ عمر اور تنومند لوگ میدان میں چلے جاتے ہیں۔ کچھ لڑائی کرنے کے لیے، کچھ ان کے ساتھ مدد دینے کے لیے۔ انجنیر، ڈاکٹر اور دوسرے علمی پیشوں کے لوگ۔ ان کے بجائے جوان یا نوجوان لوگ وطن کی خاک میں کام کرتے ہیں۔ یہ انتظام بھی بدل گیا۔ دورِ جدید کا ایک بڑا حربہ پروپیگنڈا سمجھا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے بہت لمبے چوڑے اور پیچیدہ اور مضبوط جال بچھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ان کا طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ شکاری کے جال کی طرح وہ شکار کو نظر نہ آئیں۔ نہیں تو کھیل بگڑ جائے گا۔ محنت اکارت جائیگی۔ قوم کے بعض بہترین دماغ اس کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تاکہ وہ دوسرے کم نکتہ رس دماغوں پر حاوی ہو کر اُنھیں بیوقوف بنا سکیں یا اپنے ڈھب پر لا سکیں۔ یہ نہایت لازمی ہے، تاکہ قوم کا شیرازہ بندھا رہے اور وہ تن، من، دھن سے دشمن کا مقابلہ کرنے پر تیار رہے۔ اس علمی اور مکتبی نظام میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

ثابت ہوا کہ عہدِ جدید کی جنگ صرف میدانِ جنگ ہی کی جنگ نہیں ہوتی۔ اس کا حلقہ وسیع بھی ہے اور اپنے اثرات میں شدید بھی۔ وہ ایک نقطے سے بڑھ کر اپنی آگ کے شعلوں کو اطراف و جوانب میں نہیں پھیلاتی، جیسا کہ گزشتہ زمانوں میں کبھی کبھی ہوا کرتا تھا کہ حملہ آور فتح کے بعد لوٹ مار کرتا

کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ بلکہ عہدِ جدید کی جنگ جب شروع ہوتی ہے، تو قوم کا ہر فرد اس کی موجوں کے نیچے غرقاب ہو جاتا ہے۔ اس کو اپنا کام، کاملاً یا جزواً چھوڑ کر وطن کے لیے جنگی خدمات سرانجام دینی پڑتی ہیں۔ اگرچہ وہ بظاہر اپنا فرضِ منصبی سرانجام دیتا ہے، مگر حقیقت میں وہ جنگ کو فتح کرنے کے لیے قوم کی امداد کرتا ہے۔ یعنی قوم کی تمام قوتوں کا استعمال اس وضع پر کیا جاتا ہے کہ دشمن مغلوب ہو جائے۔ تمام مغربی مہذب ممالک میں آجکل جبری فوجی بھرتی کا قانون ہے اور قوم کی تمام قوتیں حکومت کے قبضے میں ہیں، تاکہ ان کا جائز استعمال فتح حاصل کرنے کے لیے کیا جا سکے۔

تو گویا جدید جنگ صرف عسکر یا چند لوگوں کی جنگ نہیں۔ یہ ایک قوم کی دوسری قوم سے جنگ ہے۔ ایک وطن کی دوسرے وطن سے لڑائی جس میں اس وطن کے تینوں عالم۔ عالمِ حیوانات، عالمِ نباتات، عالمِ جمادات حصہ لیتے ہیں، بلکہ چوتھا عالم، عالمِ فضا بھی اس میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک اور مورِ ناتواں سے لے کر بحرِ بیکراں تک مصروفِ پیکار ہوتے ہیں۔ ملک اور قوم کی قوتوں کا رُخ اس طرح سے بدلا جاتا ہے کہ وہ جنگی خدمتوں کے لیے استعمال کی جا سکیں۔ آتش و آب، خاک و باد سب جنگ میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ زمین آسمان سے جنگ جنگ کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور اس کا خیال دن رات دل و دماغ پر حاوی رہتا ہے۔

گزشتہ جنگِ عظیم (۱۹۱۴–۱۹۱۸ء) نے اس امر کو نمایاں طور پر واضح کر دیا تھا کہ آئندہ ایسا ہُوا کرے گا۔ قافلہ سالارانِ ملت اور نکتہ ورانِ قوم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آئندہ جنگ یہ صورت اختیار کرے گی۔ اُنھوں نے ۱۹۱۸ء کے بعد سے فوراً ہی اپنے سیاسی، اقتصادی، تعلیمی وغیرہ نظاموں میں اسی طرح کی تبدیلیاں کر لیں۔ یہ بھی معلوم تھا کہ جنگ ہُوئے بغیر نہ رہے گی۔ تو اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ گزشتہ جنگ نے تعلیم کے نظریے پر کیا اثر ڈالا اور دُنیا کے دماغوں نے جدید تعلیم کا فلسفہ کن اصولوں پر قائم کیا۔ یہ بات تعلیم کے بعض ماہروں کو اگرچہ واضح طور پر معلوم نہ ہو سکی ہو۔ چونکہ معلم اور تعلیمی متخصص (ماہرِ خصوصی)

محدود فضا میں رہتا ہے اور اس کی دنیا کتابوں کے اوراق میں بند ہوتی ہے ۔ مگر سیاسی ماہروں نے اسے خوب سمجھ لیا تھا۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ ہر متمدن ملک کی تعلیمی پالیسی کو سانچے میں ڈھالنے والی آخری قوت وہاں کی سیاست ہوتی ہے۔ آخر ملک کا انتظام چونکہ اسی کے ہاتھ میں ہے تو سیاست دانوں نے تعلیم کے رُخ کو بدل کر قوم کے لیے مفید مطلب بنا لیا، جو آئندہ جنگ میں ان کے کام آسکے۔

ملک اور قوم کی تمام قوتوں کو بر سرِ کار لایا گیا اور ان کی تربیت کی گئی۔ تاکہ اس پرورش اور توجہ سے وہ بڑھیں، پھولیں اور ان کو خوب فروغ حاصل ہو۔ مثلاً اگر کہیں جنگل تھے، تو ان میں نئے درخت لگائے گئے۔ اگر کہیں خشک زمین پڑی تھی، تو اُس کے لیے نہریں نکالی گئیں۔ اگر کہیں کانیں تھیں، تو ان میں سے کچا مال نکالنے کا پہلے سے بہتر انتظام کیا گیا۔ اگر کارخانے تھے، تو ان کو بہتر اور زیادہ منظم کر دیا گیا۔ ان میں جدید طریقے اور سائنس کے اصول استعمال کیے گئے تاکہ ساختہ مال بہتر، عمدہ اور مقدار میں زیادہ ہو۔

اس جنگ نے کارخانہ داروں اور زندگی کے عملی شعبوں کے سرپرستوں کی ذہنیت میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی۔ پہلے معاملات کو اپنے آپ بڑھنے اور ترقی کا قدرتی راستہ اختیار کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ مگر اب کاوش اور محنت سے ترقی کرنے کے طریقے پیدا کیے گئے۔ ہر کارخانے نے اپنے اپنے تحقیق کے شعبے (ریسرچ ڈیپارٹمنٹ) کھول دیے۔ لوہا، کپڑا، سیمنٹ، سب نے خاص آدمی اس کام پر مقرر کیے کہ ساختہ مال کو کس طرح سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ سرکاری محکموں، مثلاً ریل، پبلک ورکس وغیرہ نے جہاں یہ مال کھپتا تھا، اپنے اپنے ریسرچ کے ملازم رکھے۔ جب یہ مال ان کے پاس پہنچتا، تو وہ اس کا اپنی طرف سے امتحان کرتے کہ اس میں کوئی نقص یا کمزوری تو نہیں۔ سرکاری اداروں نے بھی ریسرچ کی طرف خاص توجہ دینا ضروری سمجھا۔ زراعت، انہار، طب، غرضکہ ہر شعبے میں خاص آدمی ریسرچ کے لیے رکھے گئے۔ تاکہ ترقی سرعت کے ساتھ ہو اور صحیح طریقے پر ہو۔ ریسرچ

کے کل ہر شعبوں میں جمعیت کیا گیا۔ اہل صنعت، ماہرین تجارت، [illegible] وغیرہ میں ملک کے کونے کونے میں کالجوں کے ساتھ ملا دیئے گئے۔ یہاں یہ طے ہو گیا کہ ملک کے تمام حصولات کا بہتر استعمال قوم کے لیے کیا جا سکے۔

اب قوموں میں مقابلے کا جذبہ پیدا ہو گیا اور انھوں نے میدان ترقی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ قوم کے تمام ثروت اور قوت حاصل کرنے کے ذرائع کو مرتب اور منظم کیا گیا۔ ان کی تربیت کی گئی اور ان کے حصولات کی مقدار اور خوبی دونوں میں اضافہ کرنے کی بہت کوشش کی گئی۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مرد قوم کی سب سے بڑی دولت ہے۔ جتنے ذرائع ثروت اور قوت حاصل کرنے کے ہیں، ان سب پر اس شعبے کو جو انسانی ذوات پر مشتمل ہے، فوقیت حاصل ہے۔ اگر قوم کے افراد صحت مند، جفاکش، قابل اور ذہین ہیں، تو وہ ملک کے تمام ذرائع کا بہتر استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر ان میں یہ قابلیت ہی نہ ہو، تو تمام ذرائع بیکار رہ جاتے ہیں۔ آج بھی دنیا میں بہت سے ملک ہیں، جہاں معدنیات کی کثیر دولت زمین کے جگر میں مدفون ہے۔ مگر وہ قارون کا خزانہ ہے۔ نہ اس کے کام کا، نہ کسی کے مطلب کا۔ تو قوم کے بچوں کو بہترین انسان بنانا اور ان کی تمام قوتوں کو بروئے کار لانا ضروری سمجھا گیا۔

پہلے تو تعلیم کسی مخصوص حلقے تک محدود تھی۔ اب عام کر دی گئی، بلکہ لازمی اور مفت۔ ہر بچے کو پڑھایا جائے۔ کسے معلوم ہے، ان میں کتنے سقراط اور جالینوس ہوں، جو تعلیم سے محروم اور مناسب تربیت نہ ملنے کے سبب گل صحرائی رہیں اور ان کی خوشبو کسی تک نہ پہنچ سکے۔ بچوں کو پڑھاؤ، تاکہ ساری قوم کے دماغوں کی تربیت ہو۔ پھر ان میں جو ذہین اور عقیل ہوں گے خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔ وہ پڑھیں گے، آگے بڑھیں گے۔ انھیں کے شانوں پر قوم کی حفاظت اور ترقی کا بوجھ ہوگا۔ وظائف دینے اور ذہینوں کی طرف متوجہ ہونے کا ایک مقصد یہ بھی ہے

فرض کیجیے لڑائی گرم ہے۔ مقابل کی فوجوں میں پانچ پانچ سو جوان ہیں۔ ایک تو آج سے دو سو سال پہلے کے آلاتِ حرب سے مزین ہیں۔ نیزہ، ڈھال، تلوار، بندوق، بھرت کی توپ، گوپیے، گولے، قلعہ شکن توپیں، ہاتھی گھوڑے وغیرہ۔ اور دوسری فوج میں آج کل کے تمام عسکری ساز و سامان ہیں۔ ہوائی جہاز، ۱۷ انچ دہانے کی توپیں، مشین گنیں، فوجی بندوقیں، ڈائنامائیٹ، بم وغیرہ وغیرہ۔ تو آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ کون جیتے گا۔ پرانے ہتھیار تو حقیقت میں کیا، خیال میں بھی موجودہ عسکری آلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح سے گزشتہ زمانے کی عقل موجودہ زمانے کی عقل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ عقل بھی علم اور واقفیت سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم چونکہ ابتدا ہی سے گراموفون، بجلی، ریل وغیرہ کو دیکھتے چلے آئے ہیں، اس لیے ہمیں یہ چیزیں معمولی اور روزمرہ دکھائی دیتی ہیں۔ اگر کوئی آج سے دو سو سال پہلے کا آدمی پھر زندہ ہو جائے، تو وہ یا تو ان کو معجزہ سمجھے یا خوف کے مارے مر جائے کہ ان میں بھوت پریت ہے۔

تو ثابت ہوا کہ ہمیں قوم کے بچوں کو نئی عقل سکھانی چاہیے اور دنیا کی تمام جدید ضروریات سے انھیں روشناس کرانا چاہیے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہو کہ ہمارا وطن کہاں واقع ہے۔ اس کی مدافعت کن طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ اس میں پیدا کیا ہوتا ہے۔ ہماری زندگی کی ضروریات کیا ہیں اور وہ کہاں سے آتی ہیں۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے باہر سے کیا کچھ حاصل کرنا ضروری ہے۔ مالِ تجارت میں سے ہم دساور کو کیا بھیجتے ہیں اور کون سا کچا مال ملک میں آتا ہے۔ اس سے زیادہ ضروری ان کی ذہنی تربیت ہے۔ انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ موجودہ عہد میں علمی اور عملی ترقی کہاں تک ہو چکی ہے۔ ہوائی جہاز، ریڈیو، ریل، تار وغیرہ۔ اقتصادی، سیاسی معاملات کے متعلق ان کے خیالات پختہ اور راسخ ہونے چاہییں۔ وہ مضمون جسے ہم "عام واقفیت" کہتے ہیں طلبا سب کو اچھی طرح یاد ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ جب انسان کہیں ایسے کسی آلے کو دیکھے تو گنوار کی طرح سے آنکھیں کھلی اور منہ بند کیے نہ رہ جائے۔ بلکہ سوچ اور فکر سے کام لے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔ جب ہم نے ہر بالغ مرد عورت کو اپنے ملک کے انتظامی

معاملات میں حصہ لینے کے لیے حقوق دے دیے، تو یہ لازمی ہے کہ ان کو سکھایا جائے۔ ان کے حقوق ہیں کیا۔ ان کے حقوق کے معنی کیا ہیں اور ان حقوق کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔ اس لیے نئی تعلیم کے مطابق بچوں کو یہ سب کچھ سکھانا ضروری ہے۔ جس طرح سے کہ میدانِ جنگ میں پرانے ہتھیاروں والے سپاہی نئے اسلحہ جات سے مسلح فوج کے مقابلے میں آسانی سے ہار جاتے ہیں۔ اسی طرح دلیل اور علم کے میدان میں پرانی عقل والا آدمی نئی عقل والے آدمی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نئی پود کو نئی عقل سکھانا ضروری ہے۔

تعلیم کے اس نئے فلسفے نے ہمارے طریقِ تعلیم میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ پہلے تو مکتب صرف چند کتابیں رٹنے، ادب اور تہذیب کے چند سبق پڑھنے کے لیے ہوتا تھا۔ کالجوں میں سائنس کے معمل بھی اگر تھے، تو ان کا مقصد آلات سے نظریے کا ثبوت بہم پہنچانا تھا۔ سائنس کے اصولوں کو عملی زندگی میں استعمال کس طرح سے کیا جاتا ہے، یہ نہ تھا۔ طالب علم صرف مشینوں کے نمونوں سے کام کرتا تھا۔ اس کے پاس ماڈل ہوتا تھا اور وہ غالباً طالب علمی کی ساری مدت میں اصل کو نہ دیکھتا تھا۔ اب طالب علم کا رجحان اصل کی طرف کرایا گیا۔ عملی زندگی میں ہم کیا کچھ کرتے ہیں اور یہ جو کچھ تم کتاب میں پڑھ رہے ہو، حقیقی زندگی میں ہمارے کس کام آتا ہے۔ گویا طالب علم صرف تہذیب ہی نہیں سیکھتا بلکہ عملی عقل بھی۔ اس کی عقل نظری علم کے دائرے سے نکل کر عملی زندگی کی طرف بڑھتی ہے اور وہ اپنے ماحول سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اس کی واقفیت کہانیوں اور داستانوں کے حلقے میں ہی بند نہیں رہتی، بلکہ اس نئے علم کے ذریعے وطن کی مادی چیزوں کے ساتھ اس کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ ساحل کے اجزا کے ساتھ اس کو اپنی زندگی کی کئی چیزیں مشترک معلوم ہوتی ہیں اور اس لیے خاکِ وطن سے اس کی محبت بڑھ جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو کتاب کا نہیں، بلکہ اپنے وطن کا جزو سمجھنے لگتا ہے۔ پہلے تو اس کا نصب العین کتابی علم حاصل کرنا تھا۔ اب اس کا مدعا اس کتابی علم کے ذریعے وطن کی خدمت کرنا ہو گیا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچوں کی طبعی کیفیتوں کو دو بڑی قسموں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو ایسے مزاج کے بچے ہوتے ہیں کہ وہ ہر واقفیت یا امر کو فلسفیانہ یا شاعرانہ رنگ میں دیکھتے ہیں۔ چاند، ایک سنہری دُنیا ہے جس میں ہمیشہ نور برستا رہتا ہے۔ گرمی سردی نہیں ہوتی اور غالباً اس میں ہمارے چندا ماموں رہتے ہیں۔ بچوں کا دوسرا طبقہ۔ چاند ایک بہت بڑا گولہ ہے۔ زمین کے گرد گھومتا ہے۔ ٹھوس مٹی کا بنا ہوا۔ مادی حقیقت سے اُوپر ان کا خیال آگے نہیں بڑھتا۔ قصور ان میں سے کسی کا نہیں۔ ان کا مزاج ایسا ہی ہے۔ دونوں کو اپنے اپنے خیالات کے مطابق نشو و نما پانے کی اجازت دینی چاہیے۔ ہاں ان کے عمل اور علم میں زور سے نہیں، بلکہ واقفیت سے اضافہ کرنا چاہیے۔ بعض بچے ایسے بھی ہوتے ہیں، جن میں دونوں مزاجوں کی کیفیتیں موجود ہوتی ہیں۔ کم و بیش ایک یا دوسری۔ ان کا ذہن دونوں طرف لڑتا ہے اور یہ بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

عہدِ قدیم کے مکتب میں صرف ایک قوت کو جلا دی جاتی تھی۔ بچوں کی تربیت صرف شاعرانہ اور فلسفیانہ علوم کے شعبوں میں کی جاتی تھی۔ مادی عمل اور کیفیتوں کو دخل نہ تھا۔ اگر علم عملی بھی ہوتا، مثلاً طب یا مساحت، تو اس میں بھی اس قدر فلسفہ اور من گھڑت باتیں گھسیڑ دی جاتیں کہ وہ مدرسے کی چار دیواری میں عمل سے دُور ہو جاتا۔ تعلیم کی ترکیب اور معلم کی طبیعت کا رجحان ہی اسی طرح سے تھا کہ وہ خیالی یا نظری قوتوں کی تو خوب تربیت کرتا۔ مگر عملی یا مادی قوتوں کو چھوڑ دیتا تھا۔

وہ ایک حد تک سچا بھی تھا۔ مکتب سے نکل کر ساری عمر آخر اُس نے دُنیا میں گزارنی ہے۔ وہ خود بخود عملی کام سیکھ لیگا۔ بلکہ دنیا کی کشمکش اُسے یہ سیکھنے پر مجبور کرے گی، تو دورانِ تعلیم میں طالب علم کا وقت عملی چیزیں سکھا کر کیوں ضائع کیا جائے۔ نظریہ اُسے پڑھا دو اور سمجھا دو، وہ خود اُسے عملی زندگی میں پرکھتا رہے گا۔

مگر جدید تعلیم کے فلسفے نے ہمارے اس خیال کو بدل دیا۔ اس مدعا سے کہ قوم کے بچوں کی

تربیت مکمل ہو جائے اور وہ دونوں کی ذہنی اُستادی دونوں تربیتوں سے آشنا ہو جائیں۔ ان کو علم اور عمل دونوں کی تعلیم دی گئی۔ ان کی نظری اور عملی دونوں قوتوں کو صیقل کیا گیا۔ یعنی ان کی تعلیم مکمل کر دی گئی۔

بعض دفعہ آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ کچھ طالب علم جماعت میں بڑے گھٹیا طالب علموں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُستاد انہیں غبی سمجھتا ہے اور کند ذہن ہونے کا الزام ان پہ عائد کرتا رہتا ہے۔ مگر جب یہ لوگ دنیا کے میدان میں جاتے ہیں، تو بہت چمکتے ہیں اور ذہین ثابت ہوتے ہیں۔ وہ طالب علم جو جماعت میں اوّل رہتے ہیں اور تمغے حاصل کرتے ہیں، وہ بعد میں سب سے ذہین اور قابل شمار نہیں ہوتے۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ اُستادوں کے بنائے ہوئے معیار اور اصولِ امتحان کے مطابق ایک لڑکا غبی قرار پائے اور دنیا کے بنائے ہوئے معیار اور اصول کے مطابق وہ ذہین سمجھا جائے۔ یہی عملی زندگی کا فرق ہے۔ اس کا مزاج عملی ہوتا ہے۔ وہ کام کرنا چاہتا ہے۔ اس کی طبیعت اشیا کے مادی تغیرات، عملی نقصان اور فائدے کی طرف متوجہ ہونا چاہتی ہے۔ مکتب کی تعلیم میں ایسا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ اس غریب کی تمام عقل بند کی بند لپٹی ہوئی رہ جاتی ہے۔ اس کو اپنے ذہن کے استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ آخر کار مایوس ہو جاتا ہے۔ اس کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے اور وہ سبق میں دل لگانا چھوڑ دیتا ہے۔ اُستاد کہتا ہے۔ لاپرواہ ہے، غبی ہے۔ جب وہ دنیا کے طوفان میں اپنے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے، تو اس کو ہر طرف عمل کا بوستان نکھار پر نظر آتا ہے۔ اس کی عقل رباب آپ سے آپ نغمے پیدا کرنے لگتا ہے اور دنیا ان کی مستی میں محو ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹری اور وکالت کا پیشہ دو عملی پیشے ہیں۔ ان دو مضامین کے وہ طالب علم جو جماعت میں ہمیشہ اوّل رہے ہیں، وہ عملی زندگی میں سب سے زیادہ کامیاب نہیں ہوتے۔ وکالت کو لیجیے۔ نظریہ دیکھا۔ قانون یاد کر لیا۔ دفعات رٹ لیں۔ اوّل ہو گئے۔ مگر جب وہ عدالت کے دروازے میں گھستے ہیں تو دنیا ہی اور ہوتی ہے۔ بقول شخصے وہاں مکر و حیلہ کا بازار گرم ہے۔ حق ناحق کا تو سوال نہیں۔

وہاں قانون پر بحث ہوتی ہے۔ دلیلیں گھڑی جاتی ہیں۔ وجوہات نکالی جاتی ہیں۔ اس کو مقدمے پر بحث کرنا کہتے ہیں۔ اب وہ خوب کتاب کا کیڑا اور نظریے کا پرستار کیا جائے کہ یہ کام کس طرح سے کیا جاتا ہے۔ اگر اس کے مزاج میں صلاحیت بھی ہوتی اور وہ عملی زندگی کی پیچیدگیوں پر حاوی ہو گیا، تو کامیاب۔ نہیں تو زمانے کی رو دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیتی ہے اور عملی طبیعت کے لوگ بازی لے جاتے ہیں۔ دنیا میں کامیاب ہونے کے لیے صرف کتابی علم کی ہی ضرورت نہیں، بلکہ معاملہ فہم دماغ اور نکتہ رس طبیعت بھی چاہیے۔

تو ماہرانِ تعلیم کی مجلس میں اب یہ قرار پایا کہ بچوں کی نظری اور عملی دونوں قوتوں کو بیدار کیا جائے۔ نئے کورس جو لکھے گئے، وہ اسی فلسفے کی بنا پر تھے۔ جغرافیہ اس طرح سے لکھا گیا کہ وطن کے مختلف حصوں کی پیداوار، درآمد، برآمد کو طالب علم اپنے ذہن میں رکھ سکے۔ جیسے کہ وہ عملی زندگی میں موجود ہوتے ہیں۔ تاریخ میں مشہور ہستیوں کو خاص جگہ دی گئی۔ تاریخی مقامات سے طالب علموں کو متعارف کرایا گیا۔ جانوروں، پرندوں سے ان کو روشناس کیا گیا۔ پودوں کی زندگی کے متعلق سبق دیا گیا۔ گویا انھیں عملی دنیا کے بہت قریب کر دیا گیا اور وہ اسکول کی چار دیواری میں رہ کر دنیا کی باتوں کو سمجھنے لگے۔ ان کا دماغ مدرسے کی فضا سے باہر نکل کر دنیا کی سیر کرنے لگا۔ جس سے وہ بہتر انسان بننے کے قابل ہو گئے۔

اس کے علاوہ چھوٹے طالب علموں کو دنیا کا علم سکھانے کے لیے کئی اور چیزوں کا استعمال کیا گیا۔ چڑیا گھر، عجائب گھر، سیر و سیاحت، تحریک باہمی، کھیلیں، اجتماعی ڈرل، اسکول کا باغیچہ وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے اپنے نظری علم کو دنیا کے کاموں میں استعمال کرنا شروع کیا۔ آجکل کے تمام مہذب ممالک میں کم عمر طالب علموں کی پارٹیاں استادوں کی نگرانی میں چڑیا گھر، عجائب گھر وغیرہ میں جاتی ہیں اور وہاں ان کو سبق پڑھایا جاتا ہے۔ تاکہ ان کی واقفیت دنیا کے متعلق بڑھ جائے۔ انھیں کارخانوں میں

لے جاتے ہیں۔ جہاں مختلف چیزیں کپڑا، لوہا یا سامانِ حرب بنتا ہے۔ اسی طرح سے دخانی جہاز، ہوائی جہاز ان کو دکھلائے جاتے ہیں۔ گویا ان کو عملی زندگی کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے صرف بڑے بڑے شہروں میں ایسی چیزیں میسر آسکتی ہیں، بلکہ وہاں بھی کم آسکتی ہیں۔ تاہم جو کچھ بھی ممکن ہوسکتا ہے، اس کے متعلق معلّمین کو چاہیے کہ وہ کوشش کریں۔ اگرچہ یہ کتاب یا کورس میں لکھا نہ ہو، مگر بچوں کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے۔ انھیں رات کو تارے، ان کا مقام، ان کی حرکت سمجھائی جائے۔ سورج کے طلوع سے عملی طور پر سمتوں کا سبق دیا جائے۔ کھیتوں میں لے جاکر مختلف پودوں کی شناخت کرائی جائے۔ مختلف فصلوں اور پھلوں کے موسم سمجھائے جائیں۔ جانوروں، پرندوں کی شکلوں کا مطالعہ کرایا جائے۔ کبھی کبھی ان کی پارٹیاں بنا کر باہر سیاحت کے لیے لے گیے۔ کوئی بڑی عمارت، تاریخی مقام یا نہر کا ہیڈ دکھایا۔ اگر کہیں کارخانہ ہو، تو اس کو دیکھ لیا۔ مگر اس تمام وقت میں یہ یاد رہے کہ مقصد تعلیمی ہے۔ تفریح نہیں۔ طالب علموں کو ان مقامات کی وجوہات بتائی جائیں اور ماہیت کی تشریح کی جائے، تاکہ وہ اپنے نظری علم کو عملی دنیا کے ساتھ وابستہ کرسکیں۔

میرا مطلب کالج کے لڑکوں سے نہیں، بلکہ وہ لڑکے اور لڑکیاں جو ۶ اور ۱۲ سال کی عمر کے ہیں۔ ان کی حدودِ نگاہ اور مایۂ علم میں وسعت پیدا کرنا لازمی ہے۔ ہندوستان کے اس عمر کے طالب علموں نے روزمرہ کے استعمال کی مشینوں کو بھی نہیں دیکھا ہوتا، سمجھنا تو درکنار۔ سائنس کی جدید معلومات اور اس کے اصولوں پر بنا کردہ آلات کو بھی وہ نہیں جانتے۔ اگر انھیں ان چیزوں کے متعلق معلومات بہم پہنچادی جائیں، تو بڑی بات ہے۔ مثلاً گھڑی کی بناوٹ اندر سے کس طرح کی ہوتی ہے اور وہ کیسے چلتی ہے۔ گراموفون میں کون کون سے پرزے ہوتے ہیں اور یہ کیوں بولتا ہے۔ تار ایک جگہ سے دوسری جگہ کس طرح جاتی ہے۔ خط کس طرح سے پہنچائے

جاتے ہیں۔ مگر انھیں ڈاک خانے اور تار گھر میں لے جاکر دکھایا جائے کہ دیکھو تار بابو اس طرح سے کام کر رہا ہے۔ ہم میں سے بڑے بڑے بزرگ اور دیہاتی لوگ اب تک یہ سمجھتے ہیں کہ تار کے ذریعے سے بابو بولتا ہے یا حرف لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ یا ممکن ہے، تار کا راستہ سیدھا ہے۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس لیے خط اس کے اوپر رکھ دیا اور وہ فی الفور منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ ریل کا انجن، موٹر کار، جہاں موقع ہو اور جو چیز میسر آسکے، بچوں کو جمع کر کے دکھائی اور اس کی تشریح کر دی، تاکہ وہ ان چیزوں کو جادو کا کھیل نہ سمجھیں، بلکہ عقلِ انسانی کی تجویز کردہ مشینیں جن کو وہ خود بھی بنا سکتے ہیں۔ ان باتوں سے ان کی نگاہ میں وسعت اور قلب میں فروغ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے وہ بہتر شہری بن سکتے ہیں اور آئندہ زندگی میں قوم اور وطن کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

مہاتما گاندھی کا تعلیمی نظریہ

از

پنڈت وِستہ پرشاد فدا بی، اے

کچھ عرصے سے اس بات پر بہت کچھ لے دے ہو رہی ہے کہ صحیح معنوں میں بچوں کی تعلیمی ضرورتیں کیا ہیں۔ گاندھی جی کا خیال ہے کہ تعلیم کو اس نہج سے چلایا جائے کہ وہ اپنا خرچ اپنے آپ نکال لے۔ آپ لکھتے ہیں۔ "تعلیم سے میری مُراد یہ ہے کہ بچے اور آدمی کی جسمانی، ذہنی اور روحانی خوبیوں کی بہترین نشوونما کی جائے۔ تعلیم کا انتہائی مقصد خواندگی یعنی لکھنا پڑھنا سکھانا۔ یہ تو فقط ایک ذریعہ ہے جس سے مردوں اور عورتوں کو تعلیم دی جاسکتی ہے۔ لکھنا پڑھنا بذاتِ خود تعلیم نہیں۔" اور اس نظریے کی بنا پر مہاتما جی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم کسی مفید صنعت یا دستکاری کے ذریعے ہونی چاہیے اور وہ بھی ایسے طریقے سے کہ وہ ابتدا ہی سے کچھ نہ کچھ بنانا شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہر ایک اسکول اپنے اخراجات خود بخود نکال سکے اور اس پر ایک لازمی شرط یہ لگادی جائے کہ حکومت اِن اسکولوں کی بنائی ہوئی چیزوں کو خرید لے۔

مہاتما جی کی رائے میں انسان کی روحانی اور ذہنی تربیت کی بہترین صورت اسی قسم کی تعلیم سے برآمد ہو سکتی ہے۔ صرف اس بات کا خیال لازمی ہے کہ جو صنعت یا دستکاری سکھائی جائے، وہ محض سطحی طور پر نہ ہو، بلکہ پوری طرح سے سائنس کے اصولوں پر مبنی ہو۔ یعنی اس طریق پر کہ بچہ ہر ایک طرزِ عمل کا اصل منشا بخوبی سمجھ جائے اور اس کے چون وچرا سے بخوبی واقف ہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں کسی قدر وثوق کے ساتھ یہ بات احاطہ تحریر میں لا رہا ہوں اور میرا تجربہ بھی میرے نظریے کی تصدیق

کرتا ہے۔ یہ طریقہ چرخہ کاتنے کے سلسلے میں بہت حد تک کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اس طریقے کی مدد سے تاریخ اور جغرافیے کی تعلیم بھی دی جا سکتی ہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ مضامین زیادہ آسانی سے زبانی طور پر سکھائے جاتے ہیں۔ لکھائی پڑھائی کی نسبت زبانی بول چال کے ذریعے دس گنا زیادہ تعلیم دی جا سکتی ہے۔ حروفِ تہجی بعد میں پڑھائے جا سکتے ہیں، جبکہ بچے کے مذاق کی کسی قدر تربیت ہو چکے۔ میری یہ تجویز تعلیمی اصولوں کے منافی نظر آئے گی اور بعض آدمی اسے سابقہ نظریوں کا بالکل اُلٹ قرار دیں گے۔ لیکن اس سے بہت کچھ محنت بچ جاتی ہے اور طالب علم ایک سال میں اتنی باتیں سیکھ جاتا ہے، جنھیں وہ لکھائی پڑھائی کی مدد سے چند سالوں میں بھی نہ سیکھ سکے۔ صرف وقت ہی کی کفایت نہیں، بلکہ ہر قسم کی سہولتیں اس میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ ایک صنعت یا دستکاری میں دسترس حاصل کرتے وقت طالب علم علمِ ہندسہ میں بھی مہارت حاصل کر رہا ہے۔"

مہاتما جی نے پرائمری تعلیم پر بہت زور دیا ہے اور وہ اسے باقی تمام درجوں سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں اور اُنھوں نے پرائمری تعلیم کا نصاب انگریزی کو چھوڑ کر میٹریکولیشن کے نصاب کے ساتھ ساتھ جا ملایا ہے اور اُن کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ اگر تمام کالج کے طلبہ یکایک حافظے کی خرابی سے اپنی تمام معلومات سے بے بہرہ ہو جائیں، تو اس سے چنداں نقصان نہ ہوگا۔ بمقابلہ اُس ناقابلِ تلافی نقصان کے جو قوم کے تیس کروڑ آدمیوں کی جاہلیت کی وجہ سے ہمارے ملک کو پہنچ رہا ہے۔ دیہات کے کروڑوں آدمیوں میں جس قدر گمراہی اور جہالت پھیل رہی ہے، اُس کا صحیح اندازہ فقط ناخواندگی کے اعداد و شمار سے نہیں لگایا جا سکتا۔

مہاتما جی کے نظریے پر بحث

ابتدائی منزلوں میں بچوں کی تعلیم کسی صورت میں بھی اپنا خرچ نکالنے والی نہیں ہو سکتی۔ بچوں کی بنائی ہوئی چیزوں کو کوئی آدمی سستے سے سستے داموں بھی لینا پسند نہ کرے گا اور اگر یہ کہا جائے

کہ حکومت اُنھیں خرید لے۔ یہ تو ایک طرح سے نقصان کی تلافی کا ایک ذریعہ پیدا کرنے کا مترادف ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہُوئے کہ اُس نقصان کو اسکول برداشت نہ کریں، بلکہ حکومت اپنے کھاتے میں ڈال لے۔ یہ تو ایک طرح پر اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے اور خواہ مخواہ ایک غلط دعویٰ باندھنا ہے کہ تعلیم نے اپنا خرچ نکال لیا ہے۔

اپنے خرچ پر حاوی تعلیم سے مہاتما جی کی غالباً یہ مراد نہیں کہ ہر سال بچہ اپنی تعلیم کا خرچ اپنے ہاتھوں کی محنت سے پورا کر سکیگا۔ یہ ایک تنگ نظریہ ہے، جو ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔ مہاتما جی کا بیس بسوے یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ روپے پیسے کے لحاظ سے نہیں، بلکہ بچے کی آئندہ خدمات کے لحاظ سے، جو ایک تربیت یافتہ شہری کی حیثیت میں انجام دے سکیگا۔ اُس کی تعلیم اپنے اخراجات کو بخوبی نکال سکے گی۔ کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آجکل لکھائی پڑھائی اور حساب میں دیہاتی بچوں کو تھوڑی بہت مشق جو کرائی جاتی ہے، چند سال میں اس کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے اور وقت پاکر جو وقت اور روپیہ اُن پر خرچ کیا جاتا ہے، اکارت جاتا ہے۔ لیکن اگر اُن کی تعلیم و تربیت صحیح طریقے پر کی جائے، تو اگرچہ ہر سال وہ اپنا خرچ نہ نکال سکیں۔ پھر بھی سات سال کی تعلیم کے بعد ملک کے ان نونہالوں میں ضرور کچھ نہ کچھ روزی کمانے کی اہلیت پیدا ہو جائے گی اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بڑی جماعتوں میں جاکر ان بچوں کی دستکاریوں سے مدرسین کی تنخواہ ادا کرنے کے لیے کافی آمدنی حاصل ہو جائے۔ پہلے دو سالوں میں نقصان ہوگا اور بعد کے تین سالوں میں پورے اخراجات برآمد ہو سکیں گے اور آخری دو سالوں میں اگر پہلے دو سالوں کے نقصان کی تلافی ہو جائے، تو کوئی عجب نہیں۔

اس کے علاوہ جیسے کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر بچوں کی تربیت شہری اصولوں پر کی جائے اس سے جو فائدہ مقصود ہے، اُس کے لیے ہر ا بھی حکومت کو ہر قسم کے اخراجات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ان کو اگر متعلقہ ذیل دستکاریوں میں پوری دسترس حاصل ہو جائے، تو پھر اُن کی مصنوعات کی فروخت

میں کوئی وقت حائل نہ ہوگی۔ کاتنا، رنگنا، کپڑا بُننا، سلائی کا کام، چٹائیاں بنانا، ٹوکریاں بنانا، ظروف سازی، چمڑے کا کام، بڑھئی کا کام، لوہار کا کام، پیتل اَور کانسی وغیرہ کے برتن بنانا، کاغذ بنانا، گڑ بنانا، کولھو کا کام، شہد کی مکھیوں سے شہد حاصل کرنا وغیرہ وغیرہ۔

کسی دستکار کے پاس کام سیکھنے سے بھی ابتدا ہی سے اُجرت حاصل نہیں ہوتی۔ پہلے پہل کچھ عرصے تک اُسے خسارے پر کام کرنا پڑتا ہے۔ بعد میں اُسے کچھ نہ کچھ مزدوری ملنا شروع ہو جاتی ہے اَور آگے چل کر وہ اپنا خرچ بخوبی نکالنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

برطانوی سلطنت سے پہلے دیہاتی اسکولوں کے اخراجات کی بہم رسانی کے لیے لوگوں کی طرف سے زمین کے کچھ قطعات وقف تھے۔ جن کی پیداوار سے مدرسین کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ اب حکومت کسانوں سے ٹیکس لیتی ہے، تو اس کا زیادہ تر حصّہ دیہاتی تعلیم کے لیے صرف کیا جاتا ہے۔ کسانوں کے لڑکوں کو اپنے والدین کے کام کاج میں دلچسپی دلانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

واردھا اسکیم کی خاص باتیں

مہاتما گاندھی کے رائج کیے ہُوئے نصاب کو واردھا اسکیم کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ نصاب سات سالوں کی تعلیم پر مشتمل ہے۔ جس کی رُو سے لڑکوں اور لڑکیوں کو سات سے چودہ سال تک کی عمر تک لازمی طور پر تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم کسی نہ کسی دستکاری کے ذریعے دی جائیگی۔ مثلاً سُوت کاتنا۔ اب اسی دستکاری کے ساتھ ساتھ جملہ مضامین کی تعلیم بھی بہم پہنچائی جائے گی۔ بچّے کی روزمرّہ زندگی اَور مقامی دستکاری کے مختلف پہلوؤں کی بنا پر اُسے تمام مضامین سکھائے جائیں گے۔ ان سات سالوں میں بچوں کو انگریزی کے علاوہ اَور تمام مضامین میں امتحان میٹریکولیشن جتنی تعلیم ضرور مکمل کرنا ہے۔ لکھنا پڑھنا سکھانے سے پہلے بچوں کو ڈرائنگ سکھائی جائیگی، تاکہ اُسے

خطوط اور دائرے ٹھیک طرح سے کھینچنے آجائیں۔ پڑھنا پہلے سکھایا جائے گا۔ بارہ سال کی، بعد طلبہ کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنے لیے کوئی صنعت چن لیں۔ چودہ سال کی عمر تک طلبہ پورے کاریگر تو نہ بن سکیں گے۔ تاہم انھیں اتنی مہارت ضرور حاصل ہو جائے گی، جس سے وہ اپنی زندگی کا شغل لیے مخصوص و معین کر سکیں گے۔

اس اسکیم کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ ذہنی تربیت کسی دستکاری کے ذریعے حاصل کرنی چاہیے موجودہ طریقۂ تعلیم عام تعلیم پر زور دیتا ہے اور اس کے بعد دستکاری یا صنعت کی طرف توجہ جاتی ہے۔ جن حالتوں میں ذہنی تربیت کو فوقیت دی جاتی ہے۔ بچے کے ہاتھ پاؤں بندھے رہتے اور وہ ہاتھ پاؤں سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے۔ بچپن میں اس کے ہاتھ پاؤں کو دستکاریوں سے محروم رکھنا اسے ہمیشہ کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانے کے ناقابل بنا دیتا ہے۔

موجودہ قسم کی تعلیم بچے کی شخصیت کی بھی نشو و نما نہیں ہونے دیتی۔ مہاتما گاندھی کے طریقہ تعلیم کی رو سے مدرس کا کام اس کے گاؤں کی زندگی کے ہر ایک کام سے ظاہر ہوگا۔

تعلیمِ بالغاں اور زبانِ اُردو

از
محمد عبداللہ کامل، ایم اے

جب سے پنجاب میں تعلیم بالغاں کا چرچا ہوا ہے۔ ہر طرف سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ ان لوگوں کو تعلیم دینے کے ایسے اصول اور طریقے استعمال کیے جائیں۔ جن سے کم از کم وقت میں اور تھوڑی سے تھوڑی محنت سے وہ "خواندگی" کی لیاقت پیدا کر سکیں اور ان کا شمار "خواندہ" لوگوں میں ہو سکے۔ اس سلسلے میں پنجابی اور ہندی پڑھنے والے بھی کافی تعداد میں ہونگے۔ لیکن زیادہ تعداد اُردو پڑھنے والوں کی ہے۔ اس لیے اُردو کے حروفِ تہجی اور ترکیبِ ہجا پر آئے دن بحث ہوتی رہتی ہے اور اس طرح زبانِ اُردو پر کئی اعتراض کیے جاتے ہیں۔ جن میں سے اکثر کا جواب تو "خموشی" کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ زیادہ تر زبان کی خصوصیات اور قواعد سے ناواقفیت پر مبنی ہیں۔ لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہیں، جو قابلِ غور اور قابلِ اصلاح نظر آتی ہیں اور اگر عام طور پر نہیں، تو خاص اس ضرورت کے لیے بیشک اس قابل ہیں کہ ان پر غور کی جائے۔

میرا ارادہ ہے کہ ایسی باتوں پر غور کروں اور جو اصلاح کی صورت نظر آئے۔ وہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دوں، تاکہ وہ حضرات بھی اِسے اپنے علم اور تجربے کی کسوٹی پر کس کے دیکھیں۔ اگر میری تجویز مفید ثابت ہو، تو اس پر عمل کریں۔ ورنہ اس کی خامیوں سے اطلاع دیں اور اُسے بہتر اور زیادہ مفید بنانے میں ممد و معاون ہوں۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے سے ہمارے کالج میں بھی بالغوں کے چند گروہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جن میں سے پندرہ

بیس شخصوں کا ایک گروہ میری نگرانی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے اور اسی نگرانی کی وجہ سے مجھے اس معاملہ میں اس قدر دلچسپی لینے اور اس پر غور کرنے کا موقع ملا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ اُردو حروف کی شکلیں مختلف حالتوں میں مختلف ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک حرف 'ب' کی مختلف صورتیں حسب ذیل ہیں:-

بُت بچ بُر بس بد صَبر

اسی پر اور حروف کو قیاس کر لو۔ مبتدی کو ایک حرف کے لیے ایک شکل یاد کرنے کے بجائے کئی کئی شکلیں یاد کرنی پڑتی ہیں اور اس لیے ابتدائی تعلیم کا کام زیادہ لمبا اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر ہندی کی طرح ہر ایک حرف کی صورت ہر حالت میں ایک ہی رہے، تو یہ کام بہت مختصر اور آسان ہو جائے۔ یہ اعتراض ایسا ہے، جو صرف وانا دشمنوں کی طرف سے پیش نہیں کیا جاتا بلکہ نادان دوست بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس پر پورا پورا غور کیا جائے اور اگر ممکن ہو، تو اس کی اصلاح کی کوئی صورت نکالی جائے۔

سب سے پہلے یہ بات قابلِ غور ہے کہ جو صورتِ حالات ہے۔ یہ کیوں ہے اور حروف کی شکل و صورت میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ کسی ضرورت یا اصول پر مبنی ہیں یا محض اٹکل پچو۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ زبان کا مقصد صرف یہ نہیں کہ اس کے حروف چند 'بالغ' یا 'نابالغ' مبتدیوں کو تھوڑے عرصے میں یاد ہو جائیں، بلکہ اس سے بلند تر اور اس سے اعلیٰ مقصد بھی اس کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ اس کی کتابت میں اختصار ہو۔ تاکہ لکھنے میں کم محنت، کم وقت اور کم جگہ صرف ہو۔ چند روز یا چند ماہ کا ابتدائی زمانہ تو جوں توں کر کے گزر ہی جائے گا۔ لیکن باقی ساری عمر میں منٹوں اور گھنٹوں نہیں، بلکہ مہینوں اور سالوں کی بچت ہو جائیگی۔ اس لیے اگر شروع شروع میں کسی طالب علم کے دس بیس روز زیادہ صرف ہو جائیں، تو کوئی خاص حرج نہیں۔ اگر اُردو کی

ر کتابت کا امتحان کرنا ہو، تو کسی اُردو عبارت کو ہندی میں لکھ کر دیکھ لو۔ اُردو میں جو عبارت ایک طر میں آجاتی ہے۔ ہندی میں اس کو چار سطریں درکار ہونگی۔ اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں :۔

(۱) اُردو کے مفرد حروف ہندی کے مفرد حروف سے بہت مختصر اَور سادے ہیں۔ مثال کے لیے دونوں زبانوں کے چند حروف پیش کیے جاتے ہیں :۔

اُردو	ہندی
ا	अ
ہ	ह
ک	क
ب	ब
س	स

علیٰ ہٰذا القیاس تمام حروف کا مقابلہ کرنے سے آپ فوراً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہندی کا ایک حرف اُردو کے تین تین حرفوں سے بھی زیادہ لمبا اَور مشکل ہے۔

(۲) اُردو حرف جب مرکب ہوتے ہیں، تو اُن کی صورت اَور بھی مختصر اَور آسان ہو جاتی ہے۔ ـ صرف (کـ) رہ جاتا ہے۔ 'ب' (بـ) ہو جاتی ہے اَور 'س' (سـ) ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو ـ کی کتابت میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ ہر ایک مجموعہ حروف، یعنی لفظ خواہ وہ کتنا ہی لمبا کیوں نہ ہو۔ ایک ہی کشش سے لکھا جائے۔ اس کے مقابلے میں ہندی کی یہ حالت ہے کہ ایک حرف لکھتے تین تین بار قلم اُٹھانا پڑتا ہے۔ (زیادہ وضاحت کے لیے دیکھو صفحہ ۶۹۹ پنجاب ایجوکیشنل جرنل نگریزی، بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۳۷ء)۔

زبان کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ جب دو حرف آپس میں ملیں، تو ایسے معلوم نہ ہوں کہ دو اجنبی

بیٹھے ہیں، بلکہ دونوں حرف آپس میں ایسے گھل مل جائیں کہ یک جان دو قالب نظر آئیں اور ان میں سے ہر ایک زبانِ حال سے اس طرح گویا ہو کہ

من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس کے علاوہ جن بزرگوں کے ہاتھوں زبان کی یہ ترکیب سرانجام ہوئی۔ انھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ ہر ایک حرف کی شکل ہر حالت میں موزوں و متناسب ہونے کے علاوہ خوبصورت ہو اور اسی بات پر ہزاروں خطاطوں اور کاتبوں نے اپنی عمریں صرف کر دیں۔ جب جا کر یہ صورت پیدا ہوئی کہ کتابت محض کام چلانے کا آلہ نہ رہی، بلکہ ایک آرٹ اور صنعت کے درجے تک پہنچ گئی اور اسی فن کی بدولت ہزاروں کاتب اور خوشنویس زندہ جاوید ہو گئے اور بڑے بڑے خوشنویس کاتبوں کے لکھے ہوئے نسخے مدتوں سے آج تک ان کی یادگار چلے آتے ہیں۔ غرضکہ یہ فن اس معراج تک پہنچ چکا ہے کہ اس پر کسی قسم کا اعتراض کرنا چاند پر تھوکنے کے برابر ہے اور اگر کسی زبان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کے حروف ہر حالت میں یکساں رہیں، تو اُردو اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ کیونکہ اس کے حروفِ ہجا کی انفرادی شکل پہلے سے موجود ہے۔ جس سے ہر اُردو خواں کو پہلے ہی دن واسطہ پڑتا ہے اور جس سے کوئی اُردو کا طالب علم بھی ناواقف نہیں۔

یہاں تک تو اعتراضات کا جواب تھا۔ اب رہی یہ صورت کہ جن لوگوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ اُنھیں تھوڑے سے وقت میں اُردو لکھنا پڑھنا آ جائے۔ اگر ان کو حرفوں کے اس جوڑ توڑ سے نجات مل جائے، تو یقیناً مفید بات ہے۔ لیکن اس کے لیے صرف ارادہ ہی درکار ہے اور کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اُردو حروف کی انفرادی شکل پہلے سے موجود ہے۔ ہندی اور انگریزی کی طرح وہی شکلیں مرکبات میں بھی استعمال کی جائیں۔ یہ ایک معمولی سی بات ہے اور ہر ایک اُردو داں نہایت

آسانی سے کرسکتا ہے۔ صرف اس میں اوپراپن سا ہے، جو اُمید ہے کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے دُور ہو جائے گا:۔

دو حرفی مرکبات:۔ اب ڈر مت۔ چ پ رہ۔ ٹ و اب ج ا۔
تُ م (تم) چ ل (چل) دو۔ تُ م (تم) ل ے (لے) ل و (لو)

سہ حرفی مرکبات:۔ رات دال زور اور دوڑ دُور

ص اف ب ال چ ار ب ات ب اغ ب ول اگ ر۔
(صاف بال چار بات باغ بول اگر)

ب ع د چ ل و ل کھ ے پ ڑھ ے ک س ی
(بعد چلو لکھے پڑھے کسی)۔

عبارت:۔ ک س ی ن ے ح ک ی م س ے پ و چھ ا کھ ان ا ک س
(کسی نے حکیم سے پُوچھا کھانا کس

و ق ت کھ ان ا چ اہ ی ے؟ ب ول ا۔ ام ی ر ک و ج ب
وقت کھانا چاہیے؟ بولا۔ امیر کو جب

بھ وک ل گ ے اور غ ر ی ب ک و ج س و ق ت م ل ے۔
بھوک لگے اور غریب کو جس وقت ملے)۔

نظم:۔ س ار ے ج ہ اں س ے اچھ ا ہ ن د و س ت اں ہ م ار ا
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہ م ب ل ب ل ے ں ہ ے ں اس ک ی و ہ گ ل س ت اں ہ م ار ا
ہم بُلبُلیں ہیں اس کی وُہ گلستاں ہمارا

م ذہ ب ن ہ ی ں س کھ ات ا آپ س م ے ں ب ی ر رکھن ا
مذہب نہیں سِکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ہ ن دی ہ ے ں ہ م وطن ہ ے س ارا ج ہ اں ہ م ارا
ہندی ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اِق ب ال ک وءی م ح رم اپ ن ا ن ہ ی ں ج ہ اں م ے ں
اِقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں

م ع ل وم ک ے ا ک س ی ک و د ر دِ نِ ہ اں ہ م ارا
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر طالب علم کو اس طریقے سے پڑھایا جائے، تو اُسے پڑھنا تو ضرور آجا لیکن پڑھے گا کیا؟ اس قسم کی کتابت نہ کسی کتاب میں مل سکتی ہے اَور نہ کسی اَور جگہ۔ اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں یہ تکلیف محسوس ہوگی۔ لیکن جب یہ فیصلہ ہوگیا کہ اس طرزِ کتابت کا استعمال ہے، تو یہ بھی ضروری ہوگا کہ ابتدائی قاعدے اَور پہلی، دوسری کتابیں اسی رسم الخط میں لکھی جائیں تاکہ ان کتابوں کو پڑھتے پڑھتے خواندگی کی معمولی مشکلات ختم ہوجائیں اَور طلبہ کو معمولی عبارت پڑھنے کی کافی مہارت ہوجائے۔ اس کے بعد قدیم رسم الخط سے واقفیت پیدا کرنا ایسا مشکل نہیں ہوگا۔ ہشیار طالب علم تو اس وقت تک خود بخود ہی اس عبارت کو پڑھنے کے قابل ہوجائے گا۔ معمولی قابلیت کے طالب علموں کے لیے دو چار روز کی مشق کافی ہوگی۔ بہرحال سمجھدار طالب علموں کے لیے حروف کی انفرادی شکل سے ترکیبی شکل تک پہنچنا کوئی خاص دقّت پیش نہیں کرے گا۔ کیونکہ جس کام کو آجکل ہر ایک بچہ صرف الف بے پڑھنے کے بعد چند روز میں کرلیتا ہے۔ اسی کام کو دو تین کتابیں پڑھا ہُوا سمجھدار آدمی بہت جلد اَور نہایت آسانی سے کرلے گا۔

طلبہ کو اس خط سے مانوس کرنے سے ایک اَور بھی بڑا بھاری فائدہ ہے اَور وہ یہ کہ اس قسم کا ٹپ نہایت آسانی سے بن سکتا ہے اور اس قسم کے ٹائپ کو کمپوز کرنا اَور چھاپنا نہایت آسان ہے۔ ریہ خط عام لوگوں میں مقبول ہو جائے، تو اُردو کی ہر قسم کی کتابیں نہایت سُرعت اَور آسانی سے انگریزی کی طرح ٹائپ میں چھپ سکتی ہیں۔ جس سے اُردو بھی دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی برابری کا دعویٰ کر سکتی ہے اَور جس کام پر سینکڑوں عالم برسوں سے دماغ سوزی کر رہے ہیں، ایک لمحے میں ختم ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم قدیم طرزِ کتابت کے اختصار اَور اُس کی خوبصورتی کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

آخر میں قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وُہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس تجویز کی آزمائش کریں۔ تاکہ اگر یہ تجویز کامیاب اَور مفید نظر آئے، تو اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے۔ سردست چونکہ اس قسم کے قاعدے اور کتابیں نہیں مل سکتیں، اس لیے تختۂ سیاہ پر یا سطحِ زمین پر اپنے ہاتھ سے سبق لکھ کر کام چلالیں۔

ہمارے امتحان

از

این سکندر خاں، گورنمنٹ ہائی اسکول قصور

"اور ہمیں امتحان میں نہ ڈال" (مسیح علیہ السلام)

مسز ای، پی، بروننگ کی نظم The Coy of Children غالباً آپ کی نظر سے گزر
معصوم اور کمسن بچے لوہے کی بھاری بھاری کلوں میں دن رات، دن رات کام کر رہے ہیں اُ
اُن کے رونے اور سسکنے کو نہیں سُنتا۔ وہ لکھتی ہیں۔"اُن کے چہرے زرد اور مرجھائے
ہیں۔ انھیں دیکھنے سے دُکھ ہوتا ہے۔ وہ تھکے ہوئے ہیں اور اُن کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے
یادش بخیر کیا آپ کو یہ الفاظ پڑھ کر اپنا کالج کا زمانہ یاد نہیں آجاتا کہ امتحان کے ایام میں
آدھی رات خشک کتابوں کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ سردیوں کی راتیں ہیں اور نرم اور گرم بستر
آغوش پھیلائے، خاموش دعوتِ استراحت دے رہا ہے۔ لیکن امتحان کا بھوت بھی اپنی منحوس شکل
ایک کونے میں بیٹھا ہے اور ہم پڑھے جا رہے ہیں۔ پڑھے جا رہے ہیں، جب تک کہ سر جھک جاتا
اور آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں اور کتاب ہاتھ سے گر جاتی ہے۔ پھر متواتر کئی ماہ کی اس طرح کی محنت
شاقہ کے بعد چہرے زرد اور مرجھا جاتے ہیں۔ آنکھیں اندر کو دھنس جاتی ہیں۔ جسم میں جان نہیں
اور نیم مُردہ صورت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح نے مردے کو "قم" کہہ کر زندہ تو کر دیا ہے
لیکن اُسے زندگی کی راحت نہیں بخشی۔

امتحان ایک عربی لفظ "محن" سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں "سختی، تکلیف، محنت

بزرگانِ دین رب العزت کے حصولِ قرب کے لیے اپنے آپ کو رنج و محن میں ڈال کر اپنی سچائی اور اخلاص کا ثبوت دیتے تھے۔ اس سختی میں گو ان کے جسم تو زار و نحیف ہو جاتے، لیکن رُوح کو بالیدگی اور تر و تازگی میسر ہوتی اور جسمانی مشکلات سے قطع نظر، ان کے قلب نورانی ہو جاتے اور اس محنت و مشقت میں ایک سرور اور وجدانی کیفیت حاصل ہوتی اور یہ ایک بڑی کامیابی ہوتی تھی۔ اب اس رفعت کا کوئی ہماری پستی سے مقابلہ کرے۔ ہم اپنے امتحانات تعلیم میں کامیاب ہیں، تو نتیجے کے طور پر صحتِ جسمانی مفقود، سرور روحانی کالعدم اور اجرِ محنت بے پتہ اور اگر ناکام ہیں، تو ان انعامات کے علاوہ نقصانِ مایہ اور شماتتِ ہمسایہ بھی اس فہرست میں شامل فرما لیجیے۔

امتحانات کا سلسلہ کس نے شروع کیا؟ کہتے ہیں کہ ماضی بعید میں اس کارِ خیر کی ابتدا چین سے ہوئی۔ معلوم نہیں، اس میں کس قدر صداقت ہے۔ لیکن اُس وقت غالباً امتحانات کو یہ عالمگیری نصیب نہ ہوگی، جو اُنھیں آج کل ہے۔ انگلستان میں امتحاناتِ عامہ کا سلسلہ جنگِ کریمیہ کے بعد سے شروع ہُوا۔ اس جنگ میں وزارتِ جنگ کے اصحابِ بست و کشاد سے افسوسناک ناقابلیت کا اظہار ہُوا۔ اس لیے سول سروس میں امیدواروں کا انتخاب، جو پہلے نامزدگی کے ذریعے سے ہُوا کرتا تھا اب امتحانات کے ذریعے سے ہونے لگا۔

اس میں کلام نہیں کہ امتحان تعلیمی معیار کو پرکھنے، محنت اور مشقت کو جانچنے اور علمی قابلیت یا ناقابلیت کی پڑتال کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہیں۔ ان سے علمی ضبط کے قیام میں امداد ملتی ہے لیکن راقم الحروف کو امتحانات کے اس طریقے سے، جو آجکل اسکول اور کالجوں میں رواج پا گیا ہے، اتفاق نہیں ہے۔ امتحانات اپنی ذات میں قابل اور ناقابل، غبی اور ذہین، مستعد اور غیر مستعد میں تمیز کرنے کا ایک پسندیدہ طریقہ ہیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ ایک چیز بالنفسہٖ نافع ہو اور ہم اُسے اس طرح استعمال کریں کہ بجائے فائدے کے نقصان حاصل ہو۔ آپ طالب علم برادری کے کسی فرد سے دریافت فرما لیجیے۔

آپ پر واضح ہو جائے گا کہ جن لوگوں کے لیے اس ہنگامہ میں سے گزرنا لابدی اور لازمی ہے، میں سے ایک بھی اُسے اخلاص اور اطمینان کی نظر سے نہیں دیکھتا اور رائے عامہ بالکل امتحا کے خلاف ہے۔ انھیں طلبہ کا دشمن، تعلیمی سدباب، گھوڑے بازی کی چکی اور دلیل و ذہانت کے فقدان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر جو مخفی قابلیت اور ذہنی نشو و نما کا امکان ہے، بالترتیب ان کا اظہار اور تکمیل ہو جائے، لیکن وہ طریقۂ امتحان جو ہمارے بدقسمتی سے رائج ہے، تعلیم کے ان مقاصد کو بار آور نہیں ہونے دیتا۔ امتحانات کے زیرِ اثر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مقاصد کا دائرہ تنگ ہو گیا ہے اور اُس کے نظریے کی نشو و نما مسدود ہو گئی ہے۔ کیونکہ فی زمانہ تعلیم کا مقصد اور معیار ذہنی ترقی اور انسان کی مخفی قابلیتوں کا اظہار نہیں ہے، بلکہ امتحان میں کامیابی ہے اور اس طرح سے تعلیم کے اعلیٰ مقاصد امتحان کی بھینٹ چڑھا دیے گئے ہیں۔

اور نہ صرف یہی ہوا کہ تعلیم کے اعلیٰ مقاصد امتحان کی نذر ہو گئے، بلکہ محض امتحان ہی تعلیم کی کامیابی کا تنہا معیار رہ گیا۔ حالانکہ کتابی درس و تدریس کے علاوہ تعلیم میں چند ایسے ارفع اور اعلیٰ اجزا بھی ہیں، جو بمنزلۂ تعلیم کی رُوح کے ہیں اور جن کا مروجہ طریق پر امتحان ہو ہی نہیں سکتا۔

مزید برآں امتحان کا سلسلہ ہمارے تعلیمی نصاب پر بھی اثر انداز ہوا اور اب کوئی تعلیمی ادارہ اپنی انفرادی اور ذاتی حیثیت قائم نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ سب کا مقصد اور نصب العین محض امتحان کی کامیابی رہ گیا ہے۔

اور جب ہم امتحان کو تعلیم کی کامیابی کا واحد معیار قرار دیتے ہیں، تو ہم اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تعلیم ایک ایسی چیز نہیں، جو ماپی اور تولی جا سکے۔ تعلیم کا تعلق دماغی رجحان اور داخلی کاوشوں سے ہے۔ جن کو ہم مٹھی میں پکڑ کر نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس قدر ہیں۔ لیکن ناقابلِ گرفت ہونے

کے باوجود بھی یہ چیزیں وجود رکھتی ہیں۔ پھول کی خوشبو کو کون تول اور ماپ سکتا ہے۔ لیکن اس کے وجود سے انکار بھی کس کو ہے اور اگر پھول کی مہک کو تولا نہیں جا سکتا، تو تعلیم کو بھی ترازو کے پلڑے میں نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ اس کا تعلق ذہن اور خیالات کی دنیا سے ہے، جو خوشبو کی مانند بے وجود اور ناقابلِ گرفت ہیں۔

امتحانات کی جن خرابیوں کا ذکر میں کر چکا ہوں، وہ بادی النظر میں واضح نہیں ہیں۔ لیکن ان میں بعض نقائص ایسے بھی ہیں، جو پہلی ہی نظر میں واضح ہو جاتے ہیں۔ سہولیتِ ترتیب کے لیے انھیں چار حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:-

(۱) امتحان میں اُستاد اور طالب علم کا حصّہ (۲) ممتحن کا حصّہ (۳) دورانِ امتحان میں امیدوار کی کیفیت (۴) پرچوں پر نمبر لگانا۔ میں اب ان اجزا پر جداگانہ بحث کروں گا۔

(۱) اُستاد اور طالب علم کا حصّہ۔ سب سے کم درجے کا یونیورسٹی امتحان، جس کے لیے اُستاد اپنی جماعت کو تیار کرتا ہے، میٹرکولیشن ہے۔ اس امتحان کا نصاب اور اس کے ممتحن صاحبان وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں۔ طلبہ کو تیار کرتے ہوئے عام حالات میں اُستاد کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مضمون میں زیادہ سے زیادہ فی صدی نتیجہ دکھا سکے۔ لیکن اس کے لیے وہ کم از کم مشکل راستہ اختیار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب امتحان کے نصاب کے اندر ذہانت اور قابلیت کو زیادہ جگہ نہیں دی گئی، تو کون سر پھرا اُستاد ایسا ہوگا، جو سال بھر لڑکوں کے ذہن کی نشوونما کرتا رہے۔ اپنے مضمون میں زیادہ سے زیادہ نتیجہ دکھانے کے لیے پہلا کام جو اُستاد کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ممتحن کے قلبی رجحان اور اس کے بنائے ہوئے گزشتہ سالوں کے سوالات کا بغور مطالعہ کرتا رہے۔ تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ ممتحن صاحب کو طبعی طور پر کیا باتیں مرغوب ہیں اور اگر وہ سالِ گزشتہ فلاں فلاں سوال پوچھ چکے ہیں، تو امسال کیا کیا سوال پوچھے جانے کا امکان ہوگا۔ کتاب کے جن حصّوں میں سے سوالات

پانچے جا چکے ہیں۔ اُستاد انھیں نظر انداز کر دیگا۔ اضافی حصّوں پر زور دیگا اور ہر ممکن طریقے سے
از بر کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا طریقۂ تعلیم امتحان سے مرعوب و مغلوب ہو جائیگا۔ اب امتحان
زیادہ نمبر حاصل کون کریگا۔ وہ طالب علم جو قابل اور ذہین ہے لیکن اُستاد کے بتائے ہوئے طریقے پر زور
نہیں لگاتا یا وہ طالب علم جو دن رات بکریا بہ بخشا بُرے حالے ما کی رٹ لگا رہا ہے۔ عام اس سے
وہ مضمونِ متعلقہ پر دسترس رکھتا ہے یا نہیں۔

اُستاد کے اس طرزِ تعلیم سے قابل اور ذہین لڑکا کنارہ کش ہو جاتا ہے اور کچھ حاصل نہیں کر سکتا او
برخوردار رٹ باز، بازی لے جاتا ہے۔ گو زبانی یاد کیے ہوئے مضمون میں اس کی گرفت ناقص اور غیر یقینی
ہوتی ہے، لیکن اُستاد چاہتے ہی یہی ہیں کہ جوں توں طالب علم چند باتوں کو امتحان کے دن تک اپنی
یادداشت میں محفوظ رکھ لیں۔ انھیں پرچوں پر اُگل دیں اور پھر بھول جائیں۔

اس طرح امتحان نہ صرف ذہانت اور قابلیت کے راستے میں حائل ہیں، بلکہ یہ طلبہ کی خود اعتمادی
اور ذاتی کوشش کا بھی سدّباب کرتے ہیں۔ طالب علم ہر وقت اپنے اُستاد کے بتائے ہوئے ضروری اجزا
اور ضروری سوالات کی تلاش میں رہتا ہے اور اپنے طور پر کوشش نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر ممکن
امتحانی سوال کا جواب اسے بغیر محنت کے لکھا لکھایا مل جائے۔ اُستاد بھی اس قسم کی تیاری میں اس کا ممد و
معاون ہوتا ہے۔ جو کسر اس سے رہ جاتی ہے؛ اسے نوٹ اور فرہنگ پورا کر دیتے ہیں، جو طلبہ سے کمال
ہمدردی رکھنے والے کتب فروش صاحبان اُن کی کامیابی کے لیے ارزاں اور با افراط مہیا کر دیتے ہیں۔

تو گویا امتحان کے رعب اور دبدبہ کے ماتحت تعلیم جو ذہنی نشوونما کی تکمیل اور اظہار کا ایک ذریعہ
تھی، اس کی بربادی کا باعث ہوتی ہے اور طلبہ "بھاڑے کا ٹٹو" بن کر رہ جاتے ہیں کہ جب تک اُستاد انھیں
ایڑ لگاتا جائے، وہ چل رہے ہیں اور اگر اُستاد اور فرہنگ ان سے علیحدہ ہو جائیں، تو وہ منزل پر نہیں پہنچیں گے اور
کیا اُستاد صاحبان بھی اس طرح اپنے فرائض سے سبکدوش ہو رہے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ حالانکہ مباحثہ طریق پر

امتحانی تیاری میں اُستاد بعض ضروری حصّوں پر زور دیتے ہیں اور اپنے مضمون کی تکمیل نہیں کرتے۔ یہ اُن کے فرائض کی پہلی کوتاہی ہے۔ طلبہ ساری کتاب میں دسترس نہیں رکھتے، جو اُستاد کی دوسری کوتاہی ہے اور پھر اگر قیاس کردہ سوالات امتحان میں نہ آئیں یا ممتحن صاحب اپنا طرزِ سوال بدل ڈالیں یا فوری ضروریات کے ماتحت اُن کی جگہ ایک نیا ممتحن مقرر ہو جائے، تو یہ اُستاد کی سب سے بڑی کوتاہی اور ناکامی کا پیش خیمہ ہوگا۔ کیونکہ اس طرح نہ صرف وہ اپنے ہی کھیل میں ناکام ثابت ہوگا، بلکہ یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ وہ ایک بدشوق اور ناقابل اُستاد ہے اور جن طریقوں کو وہ امتحان کی کامیابی کی کلید سمجھتا ہے، وہ غلط ہیں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ موجودہ سلسلۂ امتحان نہ صرف ایک بدعت اور تعلیمی عیب ہے، بلکہ یہ اُستاد و شاگرد دونوں کو کام چور اور بددیانت بناتا ہے۔ مزید برآں اس طرح دماغی اور ذہنی طاقتوں کے خداداد عطیہ کو پھولنے پھلنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہ گھوٹنے باز کا دوست اور طلبہ کے انوکھے پن کا دشمن۔ محض یادداشت پر زور دینے سے یہ غور و خوض اور سوچ بچار کی عادت کو تباہ کر دیتا ہے۔

(۲) ممتحن کا حصّہ۔ ممتحن صاحبان کی جماعت میں دو قسم کے افراد شامل ہیں۔ ممتحن اعلیٰ جو ایک یا دو ہوتے ہیں اور جن کا کام سوالات کا پرچہ مرتب کرنا اور جوابات پر نمبر لگانے کے مراحل کی نگہبانی اور رہنمائی کرنا ہے اور ممتحن نائب، جو تعداد میں کئی ہوتے ہیں اور جن کا کام محض یہ ہوتا ہے کہ وہ ممتحن اعلیٰ کے بنائے ہوئے طریق پر ان جوابی پرچوں پر جو اُنھیں پہنچیں، نمبر لگائیں۔ میں فی الحال ممتحن اعلیٰ کے فرائض کے متعلق عرض کروں گا۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس تو اب و کمال کے ساتھ کوئی شخص اپنے اور اپنے گھربار کے حسن و قبح سے آگاہ ہو سکتا ہے، وہ کسی اجنبی کا حصّہ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے اہل و عیال کا مزاج شناس ہوں۔ ان کی خوبیوں اور کمزوریوں سے خوب واقف ہوں اور اپنی رسائی اور قابلیت کی حد تک اُن کی رہنمائی بھی کرتا رہتا ہوں۔ لیکن یونیورسٹی کے کرتا دھرتا صاحبان جب میٹریکولیشن کے لیے ممتحن اعلیٰ مقرر کرتے ہیں، تو

اس معمولی نفسیاتی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ آپ اس امتحان کے اعلیٰ ممتحن صاحبان کی فہ
ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہوگا، جو اسکول ٹیچر ہو۔ حالانکہ ہائی کلاسز کے تجربہ کا؛
کہنہ مشق اُستاد امتحانِ میٹرک کے پرچے بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ قابلیت اور اہلیت رکھتے ہیں
لیکن یونیورسٹی اس سے قطع نظر یہ خدمت عام طور پر چند نام نہاد ماہرانِ تعلیم کے سپرد کرتی ہے، جنھیں
اسکول کے طلبہ سے کوئی ہمدردی ہوتی ہے اور نہ اُستاد صاحبان سے کوئی لگاؤ۔ انھیں اسکول کی تعلیمی
مشکلات کا علم اور اندازہ نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے، تو ذاتی اور شخصی نہیں ہوتا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس قدر
کوئی صاحب اپنے فن میں ماہر ہونگے، اُسی قدر وہ عدیم الفرصت بھی ہونگے۔ جب یونیورسٹی میٹرکولیشن
کے مضامین کی کتابیں ہر متعلقہ ممتحنِ اعلیٰ کے پاس بھیج دیتی ہے کہ وہ اُنھیں بغور پڑھ کر فلاں تاریخ تک
سوالات کے پرچے مرتب کر کے اُنھیں بصیغۂ راز دفتر میں پہنچا دیں، تو ممتحنِ اعلیٰ کو اپنی پیشہ ورانہ اور بلاواقی
مصروفیتوں سے فراغت ہی نہیں ہوتی کہ وہ ان کتابوں کا بغور مطالعہ کر سکیں یا پرچہ بنانے سے قبل کسی
اُستاد سے تبادلۂ خیال کر سکیں اور ایسا کرنا اوّل تو وہ ایک ماہرِ فن ہونے کی حیثیت سے اپنی سبکی تصور
فرمائیں گے۔ دوسرے یقیناً یونیورسٹی اس کی اجازت نہیں دیگی۔ کیونکہ اس طرح سوالات کا راز اور اخفا
قائم نہیں رہتا۔ ممتحنِ اعلیٰ کی مصروفیتوں کا یہی حال رہتا ہے اور وہ نصاب کی کتابوں کو ابھی پڑھنے بھی
نہیں پاتے کہ پرچہ بھیجنے کی تاریخ سر پر آجاتی ہے اور وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ نہ کتابیں ہی پڑھ سکتے
ہیں اور نہ پرچہ ترتیب دے سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات نصاب کے اہم اجزا نظر انداز
ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ایک ہی کتاب کے متعدد سوالات پوچھے جاتے ہیں اور دوسری کتابوں کو
پس پشت ڈال دیا جاتا تھا۔ ممتحن صاحب جن امور کو ضروری اور قابلِ امتحان سمجھتے ہیں، وہ اُستاد صاحبان
کے نقطۂ نظر سے غیر ضروری ہوتے ہیں اور وہ جن کو اُستاد صاحبان قابلِ توجہ سمجھتے ہیں، ممتحن صاحب اُنھیں
ٹھکرا دیتے ہیں۔ اس طرح اُستاد اور ممتحن صاحبان کا نظریہ ایک نقطے پر نہیں آتا اور نزلہ برعضوِ ضعیف، اس

دیہاتی سائنس کے پڑھنے والے طلبہ کے لئے

نایاب تحفہ

جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو معلوم ہے کہ دیہاتی سائنس کا مضمون حال ہی میں ورنیکلر کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لیے مخصوص ہوا ہے۔ چونکہ اس نئے مضمون پر جامع کتاب نہ تھی۔ طلبہ کی اس دقت کا احساس کرتے ہوئے زرِ کثیر صرف کر کے مجوزہ اسکیم کے مطابق دلچسپ دیہاتی سائنس موسومہ بہ سائنس کی پہلی کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب برائے جماعت پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم تیار کرائی ہے۔ جس کی عبارت نہایت سادہ اور سلیس ہے اور امر کو روزمرہ نظر آنے والے مشاہدات، آسان تجربات اور نہایت دلچسپ تصاویر سے واضح کیا گیا اور چھپائی و کاغذ عمدہ ہے۔ سلسلہ ہذا طلبہ کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔ اس کے مطالعے سے وہ فائنل کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان و دیگر سائنس کے مدرسین اصحاب اسے مدارس میں جاری کرا کے جہاں ہمیں ممنون و مشکور فرمائیں گے، وہاں طلبہ کی صحیح رہنمائی و بہبود میں بھی خوشی محسوس کرینگے۔

دیہاتی سائنس کی پہلی کتاب	قیمت ۵ آنے ۴ پائی
دیہاتی سائنس کی دوسری کتاب	″ ۵ ″ ۲ ″
دیہاتی سائنس کی تیسری کتاب	″ ۷ ″ ۱۰ ″
دیہاتی سائنس کی چوتھی کتاب	″ ۱۴ ″ ۲ ″

المشتہر — تاجران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

وہ اپنے آرام اور صحت کو یک قلم بھول جاتے ہیں۔ کھانے پینے اور پہننے میں اُن کے لیے کوئی لطف باقی نہیں رہتا۔ رات کی نیند اُن کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ ہر وقت ایک پریشانی اور حواس باختگی کا عالم رہتا ہے اور امتحان کا خوف اُن کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیتا ہے۔

یہ تو امتحان سے پہلے کا نقشہ ہے۔ اب ذرا کمرۂ امتحان میں اُمیدواروں کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے جب وہ کئی ماہ کی جانگسل دماغی کاوش اور پریشانی کے بعد امتحان کے دیو سے نبرد آزما ہونے کو آتے ہیں۔ یہاں اُن کے صبر کی آزمائش کے لیے اور ہی سلسلے کارفرما ہیں۔ یہاں سپرنٹنڈنٹ صاحب اور اُن کا ماتحت عملہ اُن کی ہر ہر حرکت کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ حواس باختہ اُمیدوار جنھیں پہلے ہی امتحان کی تیاری نے نیم جان کر رکھا ہے۔ ان صاحبان کے غیر ہمدردانہ سلوک سے اور بھی بدحواس ہو جاتا ہے۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ اس قدر دماغی بوجھ اور قلبی پریشانی کے درمیان ایک اُمیدوار امتحان کی ذمے داری سے کس طرح بہ احسن الوجوہ عہدہ برآ ہو سکیگا اور اگر وہ کامیاب ہو بھی جائے، تو اُس کی صحت اور جسمانی نشو و نما امتحان کی نذر ہو جائیگی اور اس ساری ہنگامہ آرائی اور نام نہاد کامیابی کے بعد کسبِ معاش کے لیے، منڈی میں اس کی کیا قیمت پڑے گی۔

کمرۂ امتحان میں جب امیدوار سوالات کے پرچے کا حل لکھتے ہیں، تو اُن کے جسم میں بخار کی سی حدت ہوتی ہے۔ ان میں اکثر بے سوچے سمجھے جواب لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور جن لڑکوں نے اُستاد کے بتائے ہوئے ضروری جوابات کو "گھوٹا" لگایا ہوا ہے اور اس قسم کا کوئی سوال پرچے میں نہیں پاتے، ہ بالکل بے دست و پا ہو جاتے ہیں اور اس لیے کہ سپروائزر (نگراں) یا اُن کے رفقا یہ نہ سمجھیں کہ یہ مرت بالکل کورے ہیں، وہ بے ضرورت اپنے رٹے ہوئے جوابات کو کہیں نہ کہیں گھسیڑ ہی دیتے ہیں۔ رکچھ نہیں، تو اس طرح سے خالی پرچہ دینے اور قبل از وقت کمرے سے باہر چلے آنے کی ندامت سے یں گے۔

یہ کچھ تو طلبہ اور اساتذہ کی حالت ہے۔ اب ذرا ممتحن اعلیٰ کی گلکاری ملاحظہ فرمائیں۔ سوالات کے پرچے میں سوالات کی تعداد آٹھ یا دس سے زیادہ نہیں ہوتی اور اُن کے اندر انتخاب کی گنجائش بھی واجبی ہی ہوتی ہے۔ ان کتابوں سے جو سینکڑوں صفحوں پر مشتمل ہوں، صرف آٹھ، دس سوال مرتب کرنا اور پھر اس چیستاں کو اُمیدواروں کے پیش کر کے اُن کی ذہانت اور واقفیت کا امتحان لینا، اگر مذاق نہیں، تو اور کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ایک اُمیدوار امتحانی پرچے کے چند سوالات کا جواب نہ جانتا ہو اور پھر بھی مضمون امتحان سے اس کی واقفیت تسلی بخش ہو۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ گاہے گاہے ایک مسلمہ قابلیت اور عقل و دانش کا مالک ایک بے سمجھ نادان بچے کی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوگا کہ جواب نہ دینے والے کے مقابلے میں سوال کرنے والا، صاحبِ علم و فہم ہے۔ پس ممتحن صاحبان اپنے مخصوص انداز میں بسا اوقات اُمیدوار کی واقفیت کا اندازہ نہیں کرتے، بلکہ اُس کی ناواقفیت کا۔

سوالات کی قلیل تعداد نہ صرف طلبہ کی محنت اور واقفیت کا صحیح اندازہ لگانے میں سدِ باب ہے، بلکہ گھوٹے بازی کی ممد و معاون ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اُستاد صاحبان ممتحن کا رجحانِ قلبی اور اُس کا سوال بنانے کا طریق مطالعہ کرنے کے بعد یہ کوشش کرتے ہیں کہ امتحانِ آئندہ کے سوالات کے متعلق قیاس آرائی ہو سکے اور یہ سعی اُستاد صاحبان تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس کارِ خیر میں کتب فروش صاحبان بھی شامل ہو جاتے ہیں اور اُن کی بدولت یونیورسٹی امتحانات سے پہلے بے شمار قیاسی پرچے شائع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے امتحانات میں سوالوں کی تعداد کو بہت زیادہ کر دیا جائے، تو اوّل تو اس اضافہ شدہ تعداد کے متعلق صحیح قیاس آرائی ہی کرنا مشکل ہو جائیگا اور اگر کبھی ایسا ممکن ہو، تو اس قدر سوالات کے جوابات حفظ کرانے میں اُستاد کو بہ امرِ مجبوری اپنے سارے مضمون اور مکمل کتاب پر زور دینا پڑے گا اور اس طرح گھوٹا بازی نیست و نابود ہو جائے گی۔ کیونکہ اس قسم کی گھوٹے بازی میں جس کا

مدعا اسّی، نوّے سوالات کے جوابات یاد کرنا ہو تو دیانت دارانہ محنت میں کوئی فرق نہیں رہیگا۔

مَیں آٹھ دس سوالات کی جگہ اسّی نوّے سوالات کی وکالت کر رہا ہوں۔ آپ پوچھیں۔ جب تین گھنٹوں کے اندر اندر آٹھ دس سوالات کے جواب دینا بسا اوقات مشکل ہو جاتا ہے، تو اس میں اسّی نوّے سوالات کا جواب کیونکر دیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سوالوں کی اس بڑھی ہوئی کو پُرانی قسم کے سوالات سے جن کا جواب عبارت آرائی اور مضمون نویسی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا، یہ مختلف ہونا چاہیے۔ یہ سوالات ایسے ہوں، جن کے جوابات نہایت مختصر، عقل و دلیل کے پابند اُ غور و خوض کے محرک ہوں اور جو اُمیدوار کی ناواقفیت کا امتحان نہ لیں، بلکہ اس کی واقفیت اور ذہانت کا جائزہ لے سکیں۔

اگر سوالات کی تعداد کو زیادہ کر دیا جائے، تو وہ نصاب کے ایک وسیع دائرے پر حاوی ہو جائیں گے اور انھیں حل کرتے ہوئے اُمیدوار زیادہ مطمئن ہونگے۔ موجودہ طریقہ امتحان میں ممتحن اپنا ہاتھ طالب علم کے ذہنی خزانے میں ڈالتا ہے اور جو چیز اُسے وہاں ہاتھ لگتی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کی ذہانت اور علم و واقفیت کا ایک صحیح نمونہ ہے۔ حالانکہ ممتحن کے ہاتھ کے ساتھ اتفاق کا ہاتھ بھی شامل ہوتا ہے اور جس قدر کم مرتبہ اور کم وسیع طور پر ممتحن طالب علم کے ذہنی خزانے کا جائزہ لے گا۔ اتفاق کا حصّہ اسی قدر بڑھتا چلا جائے گا اور اس نسبت سے ناکام اُمیدواروں کی ناکامی اور کامیاب اُمیدواروں کی کامیابی اتفاقیہ ہوگی۔

(۴) جوابات کے پرچوں پر نمبر لگانا۔ مَیں عرض کر چکا ہوں کہ اُمیدواروں کے جوابی پرچوں پر نمبر لگانے کا کام متعدد نائب ممتحن صاحبان کے سپرد ہوتا ہے۔ ممتحنِ اعلیٰ اپنے مضمون کے امتحان سے ایک دو روز بعد تک نائب ممتحن صاحبان کے پاس نمبر لگانے سے متعلق مکمل ہدایات ارسال کر دیتے ہیں۔ نائب صاحبان ان ہدایات کے ماتحت ایک آزمائشی قسط پر نمبر لگا کر ممتحنِ اعلیٰ کی خدمت میں معیار

کی منظوری کے لیے بھیج دیتے ہیں تاکہ تناسب کی سختی یا آسانی کی درستی ہوسکے اور سب نائب صاحبان ایک یکساں معیار پر اپنے اپنے پرچوں پر نمبر لگاسکیں۔

یہ کوشش جو ہزارہا پرچوں کے دیکھنے میں ایک ہموار اور یکساں معیار قائم کرنے کے لئے کی جاتی ہے لائق صد تحسین و ستائش ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جب تک ایک نائب ممتحن اپنے آپ کو انسانی خامیوں اور کمزوریوں، روز مرہ کی زندگی کے ترش و تلخ اور دیگر خارجی تاثرات سے بالکل پاک اور مبرا نہ کر دے اور اپنے نمبر لگانے کے کام کو ایک مشین کے کام کی طرح نہ بنا دے۔ یہ معیار قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی اپنی طبیعت کا رجحان، اس کے دن بھر کے مشاغل، اس کے دماغ کی تر و تازگی یا تھکاوٹ اس معیار کے قیام میں دخل انداز ہوتی ہے۔ اگر ممتحن صبح کے وقت تازہ دماغ اور بشاش طبیعت لیکر بیٹھتا ہے، تو پرچوں پر فیاضانہ نمبر لگائیگا اور اگر گھر میں کوئی ایسا واقعہ پیش آگیا ہے، جس سے اس کی طبیعت بدمزہ ہوگئی ہے، تو نمبر لگاتے ہوئے ضرور اس بدمزگی کا اظہار ہوگا اور وہ مقررہ شدہ معیار سے چوکیگا۔ پچاس یا کم و بیش پرچوں کی پہلی آزمائشی قسط میں ایک ممتحن اپنی ذہنی کیفیت اور داخلی رجحانات اور دیگر امور کو حتی الوسع اثر انداز ہونے نہیں دیتا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ ممتحن اعلیٰ اس کی قسطِ اول پر نظر ثانی کے لیے حکم دیں گے۔ لیکن ممتحن اعلیٰ کی منظوری کے بعد وہ اپنے رجحاناتِ داخلی نمبر لگانے میں دخل انداز ہونے سے نہیں روکتا۔ کیونکہ اب اس کے کام کی مزید جانچ پڑتال نہیں ہوگی۔

لیکن کیا پرچوں پر نمبر لگانے کا ایک یکساں معیار قائم کرنا ممکن بھی ہے اور کیا ایک نمبر لگایا ہوا پرچہ اگر دوسرے ممتحن کے پاس نظر ثانی کی غرض سے بھیجا جائے، تو وہ اس پر اسی قدر نمبر دے گا کم و بیش؟ نمبر لگانے اور یکساں معیار قائم رکھنے کا عمل کس قدر مشکل ہے اور اس میں ممتحن کی داخلی کیفیت کو کتنا دخل ہے۔ ذیل کے واقعے سے بخوبی واضح ہوگا۔

کسی مقابلے کے امتحان میں چھ ممتحن صاحبان تاریخ کے پرچوں پر نمبر لگا رہے تھے۔ سو میں

کم ازکم ساٹھ نمبر لینا پاس ہونے کے لیے ضروری تھا۔ ہدایات یہ تھیں کہ اگر کسی اُمیدوار کا پرچہ ہونے کی حدتک تو پہنچ جائے، لیکن وہ پاس نہ ہو، تو اُسے نظرِ ثانی کے لیے باقی ممتحن صاحبان بھیج جائے۔ ان میں سے ایک ایسے صاحب نے جو اپنے فرض کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے اپنی رہنمائی کے لیے امتحانی پرچے کے ایسے جوابات لکھے، جنھیں وہ اپنی دانست میں صحیح ترین تاکہ نمبر لگاتے ہوئے، وہ اُمیدواروں کے جوابات کا اپنے جوابات سے مقابلہ کرسکیں۔ لیکن یہ پرچہ سے فیل شدہ امیدواروں کے پرچوں میں مل گیا اور اس طرح باقی ممتحن صاحبان کی خدمت میں آ اندازے کے لیے پہنچا۔ جنھوں نے اُسے ایک اُمیدوار کے پرچے کی حیثیت سے پڑھا اور پانچ میں دو نے اس پر ساٹھ سے کم نمبر دیے۔ اس طرح خود ممتحن صاحب صحیح ترین جوابات لکھنے کے باوجود اپنے دو رفقا کی دانست میں پاس ہونے کے لائق نہ تھے۔

پرچوں پر نمبر دیتے ہوئے ایک یکساں و یکرنگ معیار وضع کرنا اور اس پر قائم رہنا ممتحن کی مشکل ہے اور اگر اس مشکل کا حل ممکن بھی ہوسکے۔ تو دوسری مشکل اُس کے راستے میں یہ حائل ہوگی کہ فرائض کی بجاآوری میں اس بات کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر ہے کہ مختلف ذہانت کے اُمیدواروں نے اپنے امتحانی مضمون کو کس قدر اہمیت دی ہے اور اس کی تیاری میں کس قدر وقت اور محنت سے کام لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک روشن دماغ اُمیدوار تھوڑی ہی محنت سے تیار ہوجائے گا لیکن اس کے مقابلے میں ایک غبی اور کند ذہن اُمیدوار شبانہ روز کی محنت سے بمشکل پاس ہونے کے لائق نمبر حاصل کرے گا۔ لیکن دونوں حالتوں میں محنت یقینی طور پر مؤخرالذکر حالت میں زیادہ کی گئی ہوگی۔ مگر نمبر دیتے ہوئے ممتحن کے پاس اس بات کا اندازہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ روشن دماغ اُمیدوار کس آسانی اور سہولت سے اور بیچارا کند ذہن کس شب بے داری اور دماغ پاشی سے اس کے مضمون میں عہدہ برآ ہوسکا ہے۔ وہ ان دونوں کے پرچوں کو اُن کی ظاہری قیمت پر پرکھیگا اور زیادہ ذہین مگر کم محنت کرنے

والے کو زیادہ اور کم ذہین لیکن زیادہ محنت کرنے والے اُمیدوار کو تھوڑے نمبر دے گا اور اس طرح سے کم ذہین طالب علم کو اس کی محنت اور شب بیداری کی داد نہ ملیگی اور ممتحن کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہو سکتا جس سے وہ ان دونوں حالتوں کا فرق معلوم کر سکے لیکن باوجود اس کے یہ کہا نہیں جاسکتا کہ اس کا فیصلہ درست اور منصفانہ ہے۔

ایک تیسری مشکل جو ممتحن کے راستے میں حائل ہے، وہ یہ ہے کہ نمبر دیتا ہوا کوئی ممتحن زبان دانی اور عبارت آرائی سے قطع نظر نہیں کرسکتا۔ فرض کیجیے کہ ممتحن تاریخ کے پرچے دیکھ رہا ہے۔ اس کی دانست میں ایک ایسا پرچہ جو صحیح اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے، اس پرچے کی نسبت زیادہ قابلِ قبول ہوگا۔ جس میں سوالات کے جوابات تو ہر طرح سے مکمل اور درست ہیں۔ لیکن جس کی زبان دانی کم درجے کی ہے۔ اس طرح سے اچھی زبان دانی ایک اُمیدوار کو بلندی اور کم اچھی زبان دانی ایک دوسرے کو مقابلۃً پستی پر لے آتی ہے۔ حالانکہ امتحانی مضمون میں ان دونوں کے جوابات ایک ہی معیار پر ہیں۔ زبان دانی کے ساتھ ساتھ ایک اچھا دستخط، پرچوں کی صفائی، ہجوں کی درستی اور قواعد دانی، الفاظ کی مناسبت اور کئی دیگر اُمور امیدوار کے جوابات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ زبان دانی سے اثر انداز ہوئے بغیر ممتحن کسی پرچے پر نمبر لگا ہی نہیں سکتا۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ زبان دانی میں قابلیت حاصل کرنے کا انداز اور طریقہ تاریخ میں قابلیت حاصل کرنے کے انداز اور طریقے سے بالکل مختلف ہے اور وہ ممتحن جو اُمیدوار کی تاریخ کی قابلیت کا اندازہ کر رہا ہے، حقیقت میں تاریخ اور زبان دانی کی قابلیت کا اندازہ کر رہا ہے۔

مَیں نے سطورِ مندرجۂ بالا ایک اُستاد کی حیثیت سے سپردِ قلم کی ہیں۔ میرا یہ مضمون تخریبی رنگ میں ہے۔ آئندہ کسی وقت امتحانات کے تعمیری پہلو پر بھی بحث کروں گا۔"

ہکلاپن

از

مسز آر، اے گوسائیں، بی اے (آنرز)

(گزشتہ سے پیوستہ)

ہکلے پن کو دور کرنے کی تدابیر:-

جب بچے کی بول چال میں تتلاہٹ پائی جائے، تو وہ ہمیشہ ایک ہی آواز کو نکالنے میں غلطی کرے گا۔ اس لیے اُسے اس غلط آواز کو درست طریقے پر نکالنے کی مشق کرائی جائے لیکن جو ہکلا ہوگا، وہ اکثر الفاظ پر رُک جائے گا اور بعض دفعہ بالکل ٹھیک طور پر ادا کر دے گا۔ اُسے ایک علیحدہ کمرے میں اپنے آپ سے گفتگو کرنے کا موقع دیا جائے۔ ایسے طریقے سے وہ بغیر کسی تکلیف اور ہچکچاہٹ کے رواں گفتگو کر سکے گا۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ احتیاط نہایت ضروری ہے کہ بچے کی غلطیوں کی نئے سرے سے اصلاح نہ کی جائے، بلکہ وہ تمام مشکلات جو اُس کے رستے میں حائل ہوتی ہیں۔ اُن کا انسداد کرنا چاہیے بڑی رکاوٹ جو اکثر ہکلوں کو پیش آتی ہے، وہ سانس کی بے قاعدگی ہے۔ لہٰذا باقاعدہ سانس لینے کی مشق کرانی چاہیے۔ چنانچہ اگر ہم اسی تدبیر کو ہکلاپن کی درستی کی بنا سمجھیں، تو بہتر ہوگا۔ سانس کی باقاعدگی کی مشق کے بے شمار طریقے ہیں۔ مگر یہاں چند نہایت اہم اور فائدہ مند مشقوں کا ذکر ہی کافی ہوگا:-

بچے کا سر تکیے پر رکھ کر اُسے بالکل سیدھا لٹا دو۔ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھیں اور ٹھوڑی سہلاؤ۔ حتیٰ کہ اُس کے اعضاء مکمل طور پر ڈھیلے پڑ جائیں۔ پھر نہایت آہستہ سے اُس کا ایک ہاتھ

ہمیشہ کے لیے بڑی عزت سے یاد کیا جائے گا۔ جبکہ اس کے سالانہ جلسہ تقسیم انعامات کی کرسی صدارت کو مسٹر جی، ڈی سوندھی ایم اے، آئی ای ایس گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے ہندوستانی پرنسپل نے زینت بخشی۔ اُن کی آمد پر لالہ کرپارام ایم اے، ہیڈ ماسٹر اسکول ہذا اور ممبران مینیجنگ کمیٹی نے اسکول بینڈ اور سکاؤٹ طلبہ کی حاضری میں استقبال کیا۔ جلسے کی کارروائی کے آغاز پر صاحبِ موصوف کو ایک ایڈریس پیش کیا گیا۔ زاں بعد اسکول کے جمناسٹک گروپ نے حاضرین کو اپنے عجیب و غریب کھیلوں سے محظوظ کیا۔ پھر ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسکول کی سالانہ رپورٹ مفصل طور پر پیش کی۔ جس میں اسکول کے نہایت شاندار نتائج، اسکول اسکاؤٹس کی وادی کشمیر کی سیر، اسکول میں میوزک کلاس کا کھلنا اور لڑکوں کی جسمانی ترقی کے لیے مکمل انتظامات کا ذکر خاص طور پر کیا۔ بعدازاں دلچسپ نظموں، مزاحیہ اور ادبی تقریروں اور شاندار گانوں کا ایک بہترین پروگرام طلبائے اسکول کی طرف سے پیش کیا گیا۔ عزیز بلدیو طالب علم جماعت ہشتم کی مؤثر تقریر سے خوش ہو کر ڈاکٹر نرائن سنگھ جی، ایم بی بی ایس نے دو روپیہ کا قابلِ قدر عطیہ عزیز مذکور کو اسی موقع پر عطا فرمایا۔

تقسیم انعامات سے پہلے مسٹر جی، ڈی سوندھی نے ایک شاندار تقریر فرمائی۔ انھوں نے ہیڈ ماسٹر اور سٹاف کو اسکول کی ہر لحاظ سے شاندار ترقی پر مبارک باد دی۔ وہ اس بات پر بڑے خوش ہوئے کہ اُن کے پرانے اسکول کی عمارت بڑی شاندار بن چکی ہے۔ جس میں کھیلنے کے لیے بڑے بڑے وسیع میدان موجود ہیں۔ اُنھوں نے اسکول میں میوزک کلاس کے کھلنے کو بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور انھوں نے فرمایا کہ اسکول ہٰذا نے پنجاب یونیورسٹی کے لیے جو کہ اسکولوں میں میوزک کے شروع کیے جانے کے سوال پر ابھی غور کر رہی ہے، ایک مثال قائم کر دی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مستحق طلبہ کو اپنے دست مبارک سے انعامات عطا

جائے۔ ایک، سوا ایک، ڈیڑھ، پونے دو، دو، سوا دو، ڈھائی، پونے تین، تین۔ اسی طرح دو تین کہے اور جب ختم کر چکے، تو اُسے بتایا جائے کہ اس دوران میں وہ بالکل کسی لفظ یا ہندسے پر نہیں رُ
بعد ازاں اس پر اچانک سوالات کیے جائیں۔ مثلاً کیا وقت ہے؟ یا وہ فلاں کام کس وقت کرتا ہے غرضیکہ کوشش کی جائے کہ بچہ فوراً جواب دینے کا عادی ہو جائے۔

جیسا کہ پیشتر بیان کیا گیا ہے، ہکلوں کی آواز اور لفظوں کی بے ترتیبی کو درست کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ بچوں کو بعض دفعہ کچھ پُر مذاق اور خندہ آور چٹکلے اور شعر کہنے کے لیے دیے جائیں۔ تاکہ اُن کی گفتگو میں روانی پیدا ہو۔ مثلاً

روٹی ہم نے کھائی ہے ۔۔۔ سبزی خوب چبائی ہے
گدھا اُونٹ اور چھوٹا گھوڑا ۔۔۔ مار سبھی نے کھائی ہے

یا

لے ری لڑکی سروا لے ۔۔۔ سب کو تھوڑا تھوڑا دے
سردی سے سُوں سُوں نہ کر ۔۔۔ حلوا اور سویاں لے

علاوہ ازیں بچوں سے جلدی جلدی کچھ سوالات پوچھنے چاہییں۔ تاکہ بچہ بھی جلدی جواب دے، مثلاً

گھاس کا رنگ کیا ہے؟ ـــــــ سبز
تمھاری ٹوپی کا رنگ کیا ہے؟ ـــــــ سیاہ
برف کا رنگ کیا ہے؟ ـــــــ سفید
تمھارا نام کیا ہے؟ ـــــــ سعید

آہستہ آہستہ ان سوالوں کو ذرا اور مشکل بنا دینا چاہیے۔ مثلاً میز کس چیز سے بنی ہے؟ تم نے کیا پہنا ہوا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بچّوں کو کہانی اور چھوٹی چھوٹی حکایتیں سُنانی چاہییں اور جملوں کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے وقفہ کرنا چاہیے اور درمیان میں کچھ الفاظ چھوڑ دینے چاہییں۔ یہ کمی بچّوں سے پوری کرائی جائے، تو اُن کی دلچسپی بڑھتی ہے اور وہ فوراً الفاظ ادا کریں گے۔ مثلاً

(۱) ایک لڑکا صبح ہی صبح گھر سے نکل کر...... پر چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ ایک باغ میں پہنچا جہاں بہت خوبصورت...... اُگ رہے تھے۔ ہکلے پن کی وجہ سے بچے کبھی صحیح الفاظ مہیا نہیں کر سکیں گے، اس لیے اُن کے غلط الفاظ پر ہی اکتفا کی جائے، تو بہتر ہے۔

سب سے دلچسپ مشق یہ ہے کہ کہانی یا قصّے کو سنانے کے بجائے خاموشی سے اُس کی نقل اتاری جائے، یعنی حرکات میں ہی قصہ بیان کرنا چاہیے۔ مثلاً تین (اُنگلیوں سے گنو)۔ اندھے (آنکھوں کو بند کرو اور چھوڑو)۔ چوہے (اُنگلیوں کو زمین پر ایسی حرکت دو، جیسے چوہے دوڑ رہے ہیں)، دیکھو وہ کیسے دوڑ رہے ہیں (انگلیوں کو اپنے جسم پر دوڑاؤ)۔ وہ سب کسان کی بیوی کی طرف دوڑے۔ (کسان کی بیوی نہایت خوف زدہ ہو کر ایک کرسی میں پناہ لے)۔ وہ ایک چاقو سے اُن کی دُمیں کاٹ دیتی ہے: (کسان کی بیوی اُٹھ کر چاقو ڈھونڈتی ہے اور تین اُنگلیوں کو کاٹنے کا اشارہ کرتی ہے۔ پھر چاقو رکھ کر کرسی سے الگ ہو جاتی ہے اور چوہوں کے فرضی بلوں میں جھانک کر اطمینان کا سانس لیتی ہے)۔ اس دوران میں بولنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اسی طریقے سے لمبی لمبی کہانیاں اور نظمیں بھی سنائی جا سکتی ہیں۔ اس مشق کا مقصد یہ ہے کہ بچّوں کی تمام تر توجہ خیالات پر مجتمع ہو جائے اور وہ اپنے الفاظ کی غلطیوں کو تھوڑے عرصے کے لیے فراموش کر دیں۔

اسکول میں ہکلے پن کی اصلاح :-

جب بچہ کچھ بڑا ہو جاتا ہے، تو اُسے اسکول میں بھیج دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اساتذہ کی بے توجہی سے اُن کے ہکلے پن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اُن کو چاہیے کہ ہکلے بچوں میں غیر معمولی طور پر دلچسپی لیں اور

جہاں تک ہو سکے، بچوں کو اپنی اس کمزوری کا پتہ نہ لگنے دیں۔

ہکلا بچہ دیگر بچوں کے مقابلے میں کلاس میں استاد کے لیے قدرے دشواری پیدا کرتا ہے۔ مگر استاد کو چاہیے کہ بچے کی دل شکنی نہ کرے، بلکہ اُسے خوب بولنے کا موقع دیا جائے۔ ورنہ یہی ہکلا کلاس میں اُس کی نالائقی اور کم ہمتی کا عذر بن جائے گا اور وہ اس کی آڑ میں اپنے سبق کو سیکھنے سے جائے گا۔

اسکول میں ہکلے بچوں کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ایک کو انفرادی تعلیم دی جائے۔ یعنی ہر بچے پر علیحدہ توجہ دی جائے اور اُستاد کو چاہیے کہ اُن سے زیادہ سوالات زبانی دریافت نہ کرے، بلکہ اُن کے جوابات اُن سے لکھوائے۔ ایسے طریقے سے بچے از خود رفتہ ہو کر جواب لکھیں گے اور ہکلے پن کو بھول جائیں گے۔ کلاس میں اُستاد کے لیے لازم ہے کہ ایسے سوالات پوچھے، جن کا جواب نہایت مختصر ہو۔ اگر یہ مشق علیحدہ علیحدہ بچوں کو کرائی جائے، تو زیادہ مفید ہے۔ اُستاد کو کسی حالت میں بھی بڑے بڑے اور مشکل الفاظ کو استعمال میں نہیں لانا چاہیے۔ جو بچے کسی لفظ کی خاص آواز پر رُک جائیں، اُن کے لیے اُستاد کو فوراً دوسرا لفظ مہیا کر دینا چاہیے۔ مثلاً اگر بچہ لفظ "تعطیل" کی 'ط' پر رُک جاتا ہے، تو لفظ "چھٹی" تجویز کرنا بہتر ہے۔

ہکلے بچوں خصوصاً لڑکوں کے لیے چھوٹے چھوٹے ڈراموں میں اداکاری نہایت مفید ہے۔ اُنھیں ایسے پارٹ دینے چاہییں، جس میں اُنھیں بآوازِ بلند بولنا پڑے یا ایک بہت بڑی مصنوعی تقریر ہو۔ یا وہ ایک مسخرے کا پارٹ ادا کریں۔ یہ کام ہکلے کے لیے نہایت دلچسپ ثابت ہوگا۔ کیونکہ سامعین اور حاضرین اُس کی حرکات پر خوب ہنسیں گے۔ اُس وقت بچہ بخوبی سمجھ رہا ہوگا کہ لوگ اس کی زبان پر نہیں، بلکہ اُس کی حرکات سے محظوظ ہو کر ہنس رہے ہیں۔ لہٰذا ایسی تراکیب سے آہستہ آہستہ اُس کے ہکلے پن کی اصلاح ہو جائیگی اور اُسے کسی مجمع میں یا اجنبی سے گفتگو کرتے وقت جھجک محسوس نہیں ہوگی۔

اساتذہ کو دیگر اصلاحوں کے علاوہ مندرجہ ذیل سات اصول مدِّ نظر رکھنے چاہییں اور بچوں کو ان پر عمل کرانا چاہیے :-

(۱) ہمیشہ بولنے سے پہلے لمبی سانس لو۔

(۲) بات کرتے وقت پسلیوں کو مت اُبھارو۔

(۳) الفاظ کو صاف اور صحیح طور پر بولو۔

(۴) کبھی خاص الفاظ یا حروف کے ادا کرنے میں مت جھجکو۔

(۵) جب بھی بولنا چاہو، بلا تامّل بولو۔

(۶) ہمیشہ اطمینان سے بولو۔

(۷) سانس کی باقاعدگی کی روزانہ ورزش کرو۔

اُستاد کی انتہائی کوشش ہونی چاہیے کہ وہ بچّے کے دماغ سے یہ خیال بالکل نکال دے کہ وہ ہکلا ہے۔ وہ بولتے وقت صرف اس بات کا دھیان رکھے کہ وہ کیا بولنا چاہتا ہے۔ بجائے اس کے کہ بولنے سے پیشتر اس فکر میں رہے کہ وہ فلاں لفظ ادا نہیں کر سکے گا۔

جب ہکلے بچے کو یہ یقین دلایا جائے گا کہ وہ بھی دوسرے بچوں کی طرح بآسانی بول سکتا ہے، تو یقیناً اُسے اپنی زبان پر قابو ہو جائے گا اور وہ اس کمزوری کو دُور کرنے میں کوشاں رہے گا۔ لیکن اگر استاد بچے کو جھڑکیاں دے کہ وہ نالائق ہے یا ہکلے پن کے باعث کلاس میں پسنڈی ہے، تو بلاشک بچہ کم ہمّت اور پست حوصلہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اُستادوں کی کم و بیش کوشش سے بھی ہکلے پن میں معقول اصلاح اور کمی ہو سکتی ہے۔

یہ سب تدابیر اور تجاویز تو بچوں کے لیے فائدہ مند ہیں۔ مگر جو بچّے بدقسمتی سے بچپن میں والدین کی بے پروائی اور اساتذہ کی بے توجہی کے سبب ہکلے ہی رہتے ہیں۔ اُن کے لیے بھی چند تدابیر کا بیان

لازمی ہے۔ جن پر عمل پیرا ہونے سے اس مرض سے نجات مل سکتی ہے۔ بچوں کی اصلاح بڑ
مقابلے میں قدرے مشکل ہے۔ کیونکہ وہ اس نقص کے اسباب اور وجوہات سے بے خبر ہو
اُن کے لیے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ جب وہ بولتے وقت ہکلاتے ہیں، تو کتنے
معلوم ہوتے ہیں۔ مگر بڑی عمر کے لوگ فوراً اپنی خامی کو محسوس کرتے ہیں اور بخوبی اندازہ لگا سکتے
کہ دوسروں کے مقابلے میں اُن میں ایک بڑا بھاری نقص پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ہر قسم کی تج
کو بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ عمر رسیدہ ہکلے اگر ذاتی اصلاح کا بیڑا اُٹھائیں، تو وہ بغیر کسی علا
امداد کے خود بخود اس شکایت سے خلاصی پا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے اُنھیں اپنے دماغ سے چند ایک شکوک اور غلط فہمیاں دُور کرنی چاہ
مثلاً یہ کہ :۔

(۱) ہکلاپن ایک مرض ہے۔

(۲) یہ اُسے دوسروں سے مختلف بنا دیتا ہے۔

(۳) یہ مرض اُسے ورثے میں ملا ہے۔

(۴) کئی الفاظ بولنے میں اُسے مشکل پیش آتی ہے۔

(۵) اُس کا ہکلاپن اُس کے چہرے اور زبان کی عجیب بناوٹ پر منحصر ہے۔

(۶) وہ ہمیشہ اپنے ہکلے پن کا خیال کرتا رہے اور اسی دھیان میں لگا رہے کہ مبا
اس کی زبان بے قابو ہو جائے۔

بڑی عمر کے ہکلے عموماً اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اُن کا ہکلاپن اُن کی اعصابی کمزوری
کی وجہ سے ہے۔ اُن کا یہ خیال کسی حد تک درست ہے۔ مگر یہ شکایت بچپن میں ہی جڑ پکڑتی ہے۔
ہکلے کی تمام تکلیفات اور اُن حالات کا جن کے زیرِ اثر اُسے اس مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بغور مطالعہ

کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ ان تمام نکات پر بحث کرنی چاہیے۔ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ اُسے باتوں باتوں میں کامل یقین دلا دیا جائے کہ اُس کے لیے اس شکایت کو دور کرنا نہایت سہل ہے۔

تین معمولی عادتیں ہکلوں میں پائی جاتی ہیں۔ اُن کی اصلاح لازمی ہے۔ اوّل یہ کہ ہکلا آدمی شاذ و نادر ہی مخاطب کردہ کے چہرے کی طرف دیکھے گا۔ اُسے اس بات کی جرأت دلانی چاہیے کہ آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرے۔ دوم، وہ بہت کم مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے گا اور اگر کبھی بھلا ایسا کرے گا بھی، تو اُس کے ہاتھ کانپیں گے۔ سوم، وہ بمشکل ہی سیدھا چل سکے گا۔ اُسے چاہیے کہ چلتے وقت اپنے سر کو سیدھا رکھے اور اشیا کو جھک کر نہ دیکھے۔

ہکلے کو کسی بات کے بارے میں غلط یا غیر صحیح رائے نہیں دینی چاہیے۔ اس مرض کے ایک ماہر ڈاکٹر کی رائے ہے کہ جب ہکلا بات کرنے میں ہچکچائے، تو اُسے فوراً اپنی اُنگلیوں کو چٹخانا چاہیے۔ یا بہت بلند آواز نکالے تاکہ اُس کا رجحانِ طبع اور خیال کسی اور طرف مائل ہو جائے۔

ہکلے کے لیے اپنے سے بہت زیادہ ذہین اور قابل آدمی کے ساتھ میل جول اور رسم و راہ بھی نقصان دہ ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ہر لحظہ اُسے اپنی ناکامی اور کمتری کا احساس ہوگا۔

سیانے ہکلوں کی جماعت میں اُستاد کو چاہیے کہ ہر ہکلے کو وقتاً فوقتاً موقع دے کہ وہ جماعت کو وہ تمام مشقیں کرائے، جو اُستاد کرانا چاہتا ہے۔ اس ترکیب سے وہ آزادانہ طور پر ذاتی اصلاح کے قابل ہو جائیں گے۔

اگر ان تمام تدابیر پر بغور توجہ کی جائے، تو ہکلا پن کا دور کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ہمارے اُستاد صاحبان اور والدین کو چاہیے کہ اس شکایت کا بچپن ہی سے انسداد کریں اور دوسروں کو بچوں کا مذاق اُڑانے کا موقع نہ دیں۔

پنجاب کی تعلیمی خبریں

تعلیمِ بالغاں گوہانہ آنریبل جناب وزیر تعلیم صاحب پنجاب کی مخلصانہ تحریک تعلیم بالغاں کے پیش نظر اور اس ڈویژن میں رانا عبدالحمید خاں صاحب ایم اے، پی ای ایس، انسپکٹر مدارس کی خاص ہدایات کے بموجب شیخ محمد اسمٰعیل صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول گوہانہ کی مساعیِ روز و شبانہ سے گوہانہ جیسے تاریک و پسماندہ قصبے میں ایک مدرسہ شبینہ اسکول کی عمارت میں مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۳۹ء سے باقاعدہ جاری ہے۔ اگرچہ عام لاعلمی اور جہالت تحریک کے مؤید نہیں، مگر انجمن مخالفِ بے علمی اور اسکول اسٹاف کی انفرادی و اجتماعی کوشش و سعی سے مدرسہ شبینہ کی روز افزوں ترقی، ہر دل عزیزی و شہرت بیش از پیش یومیہ ترقی پذیر ہے۔ تعداد طلبہ بتدریج ۱۰۹ تک پہنچ گئی ہے۔ جن میں زیادہ تر غریب مزدور، کاریگر، کاشتکار اور دکاندار ہیں۔ جملہ اساتذہ نہ صرف رات کو رضاکارانہ جوش سے تعلیم ہی دیتے ہیں، بلکہ مختلف عنوانات تعلیم، حفظِ صحت، زراعت، دیہات سدھار، امدادِ باہمی اور دیگر مفید امور پر لیکچر دیتے ہیں، تاکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان میں مہذب شہریت اور دورِ حاضر کی زندگی کا احساس بھی پیدا ہو۔ صحتِ جسمانی کی تربیت کے لیے مدرسہ کے روز و شب کے طلبہ کے مابین کبڈی، رسہ کشی اور فٹ بال کے میچ بھی کرا دیے جاتے ہیں۔ غرض کوئی امکانی پہلو ایسا نہیں، جس کے لیے دشمنانِ جہالت کی فوج دیوآوار سرگرمِ عمل نہ ہو۔

ارشاد احمد

سکرٹری انجمن معلمین، گورنمنٹ ہائی اسکول گوہانہ

کارروائی اجلاس یوم الوالدین، مڈل اسکول، بڑوہ

آج مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو اجلاس "یوم والدین" مڈل اسکول بڑوہ کے احاطہ میں زیر صدارت ٹھاکر سوہن سنگھ صاحب ذیلدار علاقہ بڑی آن بان کے ساتھ منعقد کیا گیا جس کو قبل ازیں بذریعہ دعوت نامہجات وطلبہ مشتہر کیا جا چکا تھا۔ معزز اصحاب علاقہ ووالدین طلبہ سَو کے قریب اشخاص شامل اجلاس ہوئے۔

کارروائی اجلاس ایشور پرارتھنا سے شروع کی گئی۔ جس کے بعد گراموفون باجہ میں "ویر ابھیمنیو" ناٹک سنایا گیا اور موجودہ جنگ کے حالات حاضرین کی خدمت میں پیش کرکے اس ڈرامہ کی جنگ سے تعلق دے کر پرارتھنا کی گئی کہ وہ گورنمنٹ برطانیہ کی اس حق بینی کی جنگ میں تن، من اور دھن سے امداد کریں۔ پھر ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایڈریس سواگت پڑھا۔ طلبہ نے دو پہاڑی راگ گا کر سنائے، جن میں بچوں کو اسکول بھیجنے کی خوبیاں واضح کی گئی تھیں اور جو خاص اس موقعے کے لیے تیار کئے گئے تھے۔

پنڈت دیولال صاحب ایس، وی ٹیچر و ٹھاکر پیار سنگھ جے، وی ٹیچر نے اپنے اپنے مضامین پڑھ کر سنائے، جن میں اسکول اور پبلک کے تعلقات اور زمیندار و تعلیم کے موضوع پر مدلل بحث کی گئی تھی اجلاس ہٰذا کا سب سے دلچسپ پہلو ایک پہاڑی زبان کا ڈرامہ "تعلیم" تھا۔ جس کو لالہ دیوان چند صاحب گپتا ہیڈ ماسٹر نے بڑی محنت سے پہاڑی زبان میں مرتب کیا تھا۔ اس کو طلبہ نے نہایت سلیقے سے پیش کیا۔ جس میں لڑکوں، لڑکیوں اور بالغان کی تعلیم کی ضرورت کو بڑی صفائی سے پیش کیا گیا۔ حاضرین اس ڈرامے کو دیکھ کر نہایت محظوظ ہوئے۔ پنڈت سند سیادت صاحب وئیدا انچارج ڈسپنسری بڑوہ نے تعلیم اور صحت کے متعلق تقریر فرمائی۔

بعد میں لالہ دیوان چند صاحب گپتا ہیڈ ماسٹر نے نہایت دردناک پیرائے میں اسکول کی حالت حاضرین کے سامنے بیان کی اور ایک کمرے کی اشد ضرورت کو محسوس کرایا۔ جس کا حاضرین پر بڑا اثر ہوا۔ قریب یکصد روپے کے وعدے ہوئے اور مزید امداد کا تعین دلایا گیا۔ چندے کی فراہمی وغیرہ کے لیے ٹھاکر

اپنے اپنے مدارس سے چیدہ چیدہ نمونے کانفرنس کے جنرل سکرٹری پروفیسر گو
کو بھیجیں ۔

بچوں کی نقاشی پر لیکچر

۹ر نومبر ۳۹ء کو اس موضوع پر مسٹر لے سی سی ہروے، ایم اے،
پرنسپل گورنمنٹ کالج لدھیانہ نے سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور میں ا
اور عالمانہ لیکچر دیا۔ مس آئی ای ٹامس، ڈپٹی ڈائرکٹرس، سررشتہ تعلیم پنجاب نے اس ا
صدارت فرمائی۔ مقرر صاحب نے فرمایا کہ نقاشی کو نصاب تعلیم میں داخل کرنے کا مقصد یہ نہ
کو یہ پیشہ سکھایا جائے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی قوت کا اظہار کر سکیں۔ ہم سب خالق کی مخلو
اور ہم اس کے عطا کیے ہوئے ورثے کا اظہار اس وقت کرتے ہیں، جبکہ ہم کچھ پیدا کرکے
بیج میں ازلی ہیجان موجود ہوتا ہے، جو اپنے آپ کو ایک پھول کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ پرند
رنگدار پروں کی نشو ونما کرنے یا سریلے گیت گانے اور ہوا میں خوبصورتی کی اڑان کا ناچ ناچ
بھی اسی کا اظہار کرتا ہے۔ اسی طرح بچوں میں بھی بعض قدرتی ہیجانات ہوتے ہیں، جنھیں وہ م
بھری نقل و حرکت، اچھل کود، ناچ گانے، ڈرائنگ، نقاشی، قصہ گوئی اور قصہ نویسی کے ذر
ظاہر کرتے ہیں۔ اصل تعلیم وہی ہے، جو بچوں کے ان فطری اور تخلیقی میلانات کے کھولنے اور ا
کرنے کا موقع پیدا کرنے کے لیے مناسب حال فضا پیدا کرے۔ ہمیں بچوں میں بالغانہ خیالات ن
ٹھونسنے چاہییں، بلکہ ایسے حالات پیدا کرنے چاہییں کہ بچہ اپنی تعلیم خود حاصل کر سکے۔ تعلیم کا مقص
مقرر کے نزدیک بچے میں تخلیقی شخصیت کا پیدا کرنا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ دنیا میں فقط چند ہستیا
ہی صناع پیدا ہوئی ہیں۔ ہر انسان میں کم و بیش یہ مادہ موجود ہے۔ لیکچر کے خاتمے پر صاحب م
نے چند سلائڈ دکھائیں، جو بچوں کے تخلیقی فن کے مختلف منازل کو ظاہر کرتی ہیں۔

سالانہ جلسہ تقسیم انعامات

۲۴ر دسمبر ۳۹ء کا دن بعورام دوآبہ ہائی اسکول جالندھر شہر کی تاریخ

فرمائے۔

جلسہ کی کارروائی کے اختتام پر انہیں اسکول کے پرانے طلبہ کی طرف سے ایٹ دیا گیا۔

نیاز کیش

مستزاد اسس چرپڑہ

اعلان

آفیسر صاحب اون سپیشل ڈیوٹی محکمۂ دیہات سدھار نے اطلاع دی ہے کہ اُن کے محکمہ نے ایک اور پمفلٹ موجودہ جنگ کے سلسلے میں تیار کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے "ہٹلریت کیا ہے اور اس کو تباہ کرنا کیوں ضروری ہے"۔ یہ پمفلٹ اُردو اور گورمکھی میں محکمہ ہذا سے مل سکتا ہے۔ اس امر کی خاص کوشش کی گئی ہے کہ یہ پمفلٹ دیہات میں زمینداروں تک پہنچ سکے۔ اُمید ہے کہ پبلک اسے محکمہ ہذا سے منگا کر پڑھے گی۔

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۶/
۲	〃 〃 دوسری 〃	۷/۴ پائی
۳	〃 〃 تیسری 〃	۹/۹ 〃
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶/
۵	〃 〃 دوم	۳/۷ 〃
۶	〃 〃 سوم	۷/
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲/
۸	〃 〃 دوم	۳/۷ 〃
۹	〃 〃 سوم	۷/
۱۰	امرت کہانیاں نمبر۱	۹/۲ 〃
۱۱	〃 〃 نمبر۲	۱۰/۳ 〃
۱۲	〃 〃 نمبر۳	۲/۵ 〃
۱۳	انوار سہیلی کے انمول موتی 〃 〃 حصہ ۱ 〃	۸/۲ 〃
۱۴	〃 〃 حصہ ۲ 〃	۱۰/۳ 〃
۱۵	〃 〃 حصہ ۳ 〃	۲/۵ 〃
۱۶	دلچسپ تاریخی کہانیاں 〃 حصہ اوّل 〃	۸/۷ 〃
۱۷	〃 〃 حصہ دوم 〃	۱۱/۸ 〃
۱۸	〃 〃 حصہ سوم 〃	۷/

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۹	کام کی باتیں حصہ اوّل	۲/۹ پائی
۲۰	〃 〃 〃 حصہ دوم	۲/۳ 〃
۲۱	قصص ہند حصہ اوّل	۳/۲ 〃
۲۲	〃 〃 〃 دوم	۳/۸ 〃
۲۳	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ . . .	۱۱/
۲۴	حسینہ اور وحشی	۵/۱ 〃
۲۵	شہزادہ مہربان	۶/۲ 〃
۲۶	راما سیتا	۱۰/۱ 〃
۲۷	جادو کا مٹکا مسٹر ریلیا رام	۳/
۲۸	مہاراجہ رنجیت سنگھ . . .	۶/۴ 〃
۲۹	دروپدی	۸/۱ 〃
۳۰	خلیفہ ہارون الرشید . . .	۴/
۳۱	راجہ اشوک	۵/
۳۲	مہارانا پرتاپ	۲/۱ پائی
۳۳	شہاب الدین شاہجہان .	۱۰/۲ 〃
۳۴	شیر شاہ سوری	۱۱/۲ 〃
۳۵	نصیر الدین ہمایوں	۱۰/۲ 〃
۳۶	اورنگ زیب عالمگیر	۸/۲ 〃
۳۷	شہاب الدین غوری	۸/۲ 〃
۳۸	سلطان علاؤالدین خلجی . . .	۱۱/۲ 〃
۳۹	فیروزالدین تغلق	۳/

گورنمنٹ ہائی اسکول دھرم سالہ اور لالہ بالک رام گپتا اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر کانگڑہ کی معیت میں سردار دیوا سنگھ صاحب ایم اے، پی ای ایس انسپکٹر مدارس جالندھر ڈویژن نے ۴؍اگست ۱۹۳۹ء کو برانچ اسکول ساکوہ کا معائنہ کیا۔ یہ سب اصحاب اسکول کا کام دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ اسکول ہذا میں چھوٹے بچوں کو مشغول رکھنے کے لیے دلچسپ اور تازہ ترین طریقوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ انسپکٹر صاحب نے مدرسہ کی لاگ بک میں حوصلہ افزائی کے الفاظ درج کیے۔

سانگلہ میں تعلیم بالغاں کے سنٹر کا افتتاح

بروز ہفتہ مورخہ ۱۴؍اکتوبر ۱۹۳۹ء بوقت ساڑھے چار بجے شام گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ کی طرف سے مقامی ریلوے اسٹیشن پر تعلیم بالغاں کے سنٹر کی افتتاحی رسم ادا کی گئی۔ شیخ سخاوت حسین صاحب اسٹیشن ماسٹر نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ نے مع جملہ اسٹاف اس میں حصہ لیا۔ محکمہ ریل کے تینتیس ۳۳ بالغ ملازمین اس میں داخل ہونے کے لیے حاضر ہوئے اور انھیں داخل کیا۔ لالہ ہری چند صاحب رئیس سانگلہ کی طرف سے مٹھائی تقسیم کی گئی۔ قاعدے اور تختیاں گورنمنٹ ہائی اسکول کی طرف سے مفت تقسیم کی گئیں۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ کے تعلیم بالغاں کے انچارج صاحب اور سیکنڈ ماسٹر صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے مختصر تقاریر میں بالغاں کو نصیحت کی کہ تعلیم کے حصول میں مستقل مزاجی سے کام لیں اور وہ لکھ پڑھ چکیں۔ تو اس تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھیں اور اس طرح دوسروں کو بھی علم سے مستفید کریں۔ تاکہ جناب آنریبل وزیر تعلیم صاحب پنجاب کے اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے میں بھی مدد دے سکیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے شیخ سخاوت حسین صاحب اسٹیشن ماسٹر کا اُن کے دلی تعاون

لصنا سیکھنے کے بعد صرف اتنا سمجھنے لگیں کہ ان کے اُوپر ملک و قوم کے کیا فرائض ہیں؟
ن کے ملک و قوم کی گزشتہ تاریخ کیا ہے اور اب کس حال میں ہیں اور وہ کون سے
اُمور ہیں، جن پر کسی ملک اور قوم کی ترقی کا انحصار ہے، تو بہت کچھ حاصل ہوگیا۔

(باقی آئندہ)

وزیر توسیع تعلیم افغانستان

۲۱ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو مسٹر جمال الدین احمد صاحب ایم اے بی ٹی۔ پی ای ایس، حال وزیر توسیع تعلیم افغانستان نے اپنے بارہ سال کے قیام افغانستان اور اس ملک میں تعلیم کو فروغ دینے کے تجربات کو سٹاف اور طلبہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے روبرو ایک دلچسپ لیکچر کے دوران میں پیش کیا۔ آپ نے پہلے افغانستان کے جغرافیہ اور طبعی خط و خال پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے عہد سے موجودہ عہد تک ایک ایسے ملک میں تعلیم پھیلانے کی مشکلات کا ذکر کیا، جہاں کے لوگ جدید خیالات کے مخالف تھے۔ لیکن اب بتدریج اُنھیں قبول کرنے لگے ہیں۔ آپ نے حصۂ پرائمری، ثانوی اور یونیورسٹی کی تعلیم کے متعلق دلچسپ اعداد و شمار پیش کیے اور ایک نارمل اسکول کے قیام کا ذکر بھی کیا۔ لیکچر ہذا کے صدرِ محترم جناب جی سی چیٹرجی صاحب ایم اے، آئی ای ایس پرنسپل کالج ہذا تھے۔ حاضرین اس لیکچر سے بے حد محظوظ ہوئے۔

جنھیں ہم آزمائشی طور پر صرف ایک فقرے میں بیان کر سکیں۔ موپساں کے افسانچہ "موتیوں کا ہار" کی مثال لو۔ اس کا تمام پلاٹ کیا بلحاظ جدت اور کیا بلحاظ پیچیدگی اور منتہا فقط ایک جملے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ نے یہ افسانچہ پڑھا ہے، تو ایک جملے میں اس کا خلاصہ یہ ہے:-

"ایک غریب عورت میتھلڈا کسی تقریب پر جانے کی غرض سے اپنی کسی امیر سہیلی سے موتیوں کا ہار مستعار لیتی ہے اور اس کے کھو جانے پر قرض لیتی ہے تاکہ نیا ہار خرید کر واپس دے۔ مگر سالہا سال تک قرض اتارنے کے بعد اُسے معلوم ہوتا ہے کہ جو ہار مستعار لیا گیا تھا، وہ جھوٹے موتیوں کا تھا۔"

ایک یا دو جملوں کے ذریعے اعلیٰ پلاٹ کی جانچ کرنے کا اصول واقعی نہایت معقول ہے۔ مبتدی کو چاہیے کہ چند اچھے اور مستند افسانچوں کو پڑھ کر انھیں ایک دو جملوں میں ادا کرنے کی کوشش کرے۔ افسانچہ لکھنے کی غرض سے ذیل میں پلاٹ کی چند مشقیں درج ہیں۔ ان پر طبع آزمائی کیجیے اور دیکھیے کہ آپ کہاں تک مؤثر پلاٹ مرتب کرنے کے اہل ہیں:-

مشقیں:- (۱) کسی شادی کی تقریب پر، عین نکاح خوانی کے وقت دولھا میاں غائب ہیں۔

(۲) ایک غیر آباد مکان میں شور و غل سُنائی دیتا ہے۔

(۳) سڑک پر کسی کا ہینڈ بیگ ملتا ہے۔ اسے کھولنے پر ایک خون آلودہ چھرا، ایک انگوٹھی اور رومال نکلتا ہے۔

(۴) اخبار کے اشتہاری کالم میں "گم شدہ کی تلاش" کا عنوان۔

(۵) مرنے والے کی وصیت

(۶) ایک زہریلی دوا کی شیشی غلطی سے بیمار کے سرہانے رکھ دی گئی۔

(۷) مولوی یا پنڈت کا لالچ میں آنا۔

(باقی آئندہ)

ایڈیٹوریل

ارسطو یونانی تہذیب اور علم کا بہترین نمونہ ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یونان اس دور
تہذیب کے کمال تک نہیں پہنچا۔ لیکن اس یونانی تہذیب کا غور و فکر صرف منطقی دلیلوں تک
محدود تھا۔ تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ علم انسانی کی جانچ اور پرکھ نہ کی جاتی تھی۔ علم طبیعات
کے ایک عام مسئلے کو لیجیے اور سنیے کہ ارسطو کا منطق بھی تجربہ اور مشاہدے کی مدد کے بغیر کس قدر
ناقص تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بلندی سے پھینکے جانے پر بھاری چیز ہلکی چیز کے مقابلے میں
زمین پر جلد پہنچے گی یعنی آپ اپنے مکان کی چھت پر چڑھ جائیے۔ ایک پانچ سیر کا پتھر لیجیے اور
ایک سیر بھر کا۔ دونوں کو ایک ہی وقت میں زمین پر پھینکیے، تو پانچ سیر وزنی پتھر زمین پر پہلے
گرے گا۔ دنیا نے ارسطو کے اس طبیعاتی دعوے کو منطق کی کسوٹی پر پرکھا۔ ریاضی کا اربعہ اور تناسب
لگایا اور تسلیم کر لیا۔ اُنیس سو سال تک لوگ اس بات کو سچ مانتے رہے لیکن سولھویں صدی یعنی
سنہ ۱۵۹۰ء میں اٹلی کے ایک ریاضی داں نے اس بات کی تردید کی۔ علما کو دعوت دی۔ ایک
مینار پر چڑھ گیا۔ وہاں سے دو پتھر جو ایک پانچ سیر کا تھا اور دوسرا ایک سیر کا، ایک ہی وقت
زمین پر پھینکے اور یہ ثابت کر دیا کہ دونوں خواہ ان کا وزن مختلف ہی کیوں نہ ہو، ایک ہی وقت
میں گریں گے۔ دنیا نے اس معاملے کو زیادہ اہمیت نہ دی لیکن غور فرمائیے، تو اس ایک واقع
نے دنیا کی صورت بدل دی۔ ہمارے شعور و فراست کو یہ معلوم ہو گیا کہ صرف منطق کی زبانی دلیلیں
حقیقت اور سچ کے دریافت کے لیے کافی نہیں۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر بیان کی پرکھ
کے لیے اس کا تجربہ کیا جائے۔ یعنی علم انسانی میں تحقیق اور تلاش کی ضرورت پیدا کر دی اور تحقیق و

آپ اسکول کی فضا میں ابھی نوعارد ہیں اور اگر یہ بھی نہیں، تو پھر آپ نے سبق پڑھانے
ی نہیں فرمائی۔

درسی قابلیت اکثر حالات میں ایک فطری عطیہ ہے لیکن وہ حضرات جن کو یہ چیز
کی فیاضی سے عطا نہیں ہوئی، وہ اُسے متواتر کوشش اور مشق سے حاصل کر سکتے ہیں۔
ت میں جانے سے پہلے خود اور کوشش سے نئے سبق کی تیاری فرمائیں۔ اسے متعدد
ں تقسیم کریں۔ مناسب سوالات بنائیں اور انھیں سبق کے ہر جز کے بعد اعادے کے
پوچھیں تاکہ آپ کا آموختہ طلبہ کے دلنشین ہو جائے۔ مزید براں آپ کو جماعت میں
لہنا ہو، اس کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب کریں اور اپنی گفتگو کو دلچسپ اور دلپذیر
یں سعی بلیغ فرمائیں اور جب یہ تیاری مکمل ہو جائے اور آپ ہر سبق سے پہلے متواتر
تے رہیں، تو بہت جلد اس غیر ضروری حجاب اور بے اعتمادی سے نجات حاصل
گے۔

طلبہ میں ضبط۔ اُستاد کے ان ضروری اور لابدی فرائض میں سے، جو اُس کی
انہ زندگی کو ممتاز بناتے ہیں، طلبہ کے اندر ضبط قائم کرنا ایک اہم امر ہے۔ لفظ
پنے اندر متعدد معانی رکھتا ہے۔ اس سے اولاً تو یہ مراد ہے کہ اسکول کے اندر معلم
کے مابین تعلق کی ابتدا ادب سے ہو۔ ثانیاً جماعت کے اندر دورانِ سبق میں طلبہ
ش رہیں اور ثالثاً یہ کہ جو کچھ اُستاد پڑھائے، اُسے توجہ سے سُنیں اور رابعاً یہ کہ اسکول
قوانین و قواعد پر عمل کریں، وغیرہم۔

ظاہر ہے کہ طلبہ کے دل میں ادب اور احترام پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ
احبان پہلے تو اپنے آپ کو عزت اور احترام کے قابل بنائیں، تاکہ طلبان کے احکام

کالج۔ فنی تعلیم و تربیت کے کام میں عورتوں نے بڑا حصّہ لیا ہے۔ انگورا میں عصمت انونو کا مدرسہ ترکیہ جدید کی آزاد عورت کے لئے کھولا گیا ہے۔

اجنبی اثرات۔ ترکی نظامِ تعلیم کی تشکیل میں ترکی سیاسیئن نے کسی ملک کی نقالی نہیں کی۔ بادی النظر میں تو یہ نظامِ تعلیم لنگا جمنی سا معلوم ہوتا ہے۔ کہیں کہیں امریکی، فرانسیسی اور جرمنی اثرات نظر آتے ہیں۔ ابتدائی مدارس کے نصاب میں کنڈرگارٹن کے خدوخال نمایاں ہیں۔ فنی تربیت میں امریکی فنی اداروں کے اصول صاف دکھائی دیتے ہیں اور لیسے مدارس کی ساخت فرانسیسی لیسے سے ملتی جلتی ہے۔ درحقیقت ترکی سیاسیئن کو جہاں کہیں بھی کوئی اچھی بات نظر آئی تو انھوں نے دوسرے کی پیروی کرنے میں تامل نہ کیا۔ تاہم غیر ملکی اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے انھوں نے یہ حقیقت پیش نظر رکھی کہ ترک بچے کا ذہنی ارتقاء اس کی جبلت اور پیدائشی خصلت مختلف ہیں اور اسی لیے انھوں نے غیر ملکی نصاب اور طریق میں مناسب ترمیم اور تبدیلی کر دی۔ آج اگر کوئی حکومت کسی شعبے کی اصلاح کا کام اپنے ہاتھ میں لیتی ہے، تو وہ سب سے پہلے ان تحقیقاتی اور اصلاحی اقدامات کی مکمل معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے، جو اس سلسلے میں غیر ممالک میں عمل میں لائے گئے۔ ترکیہ جدیدہ نے بھی یہی کیا۔ نیز حکومت کے دفاتر ان نوجوان ترکوں سے بھرے ہوئے ہیں، جنھوں نے غیر ممالک میں تعلیم پائی۔ انھیں میں سے بعض ترقی کرکے محکموں کے افسرِ اعلیٰ بھی ہو گئے۔ قصرِ تعلیم کو بلند کرنے میں ان سب لوگوں کا حصّہ ہے اور اسی لیے ترکی نظامِ تعلیم میں گنگا جمنی رنگ نمایاں ہے۔

تعلیمی مسائل اور مشکلات۔ اگرچہ لیسے مدارس کا معیارِ تعلیم پرانے اعدادیہ مدارس سے بہت اونچا ہے۔ تاہم ترکیہ جدید اس سے مطمئن نہیں، بلکہ وہ ان کو بہترین یورپی اداروں کا مدّمقابل بنانا چاہتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے واسطے ہر ممکن کوشش عمل میں لائی جا رہی ہے۔ لیسے